علیم الحق حقی کلیکشن

(ڈائجسٹوں کی شاہکار کہانیاں)

(1)

وقت کے فاصلے
استعارہ
اعتراف
شب احتساب
جرم کے سائے
مافیا یونیورسٹی
ایکشن ری پلے
کٹھ پتلیاں
دروازہ

سر منزل حیات بلور کی کہانی جسے محبت کا آتش سیال سونپ دیا گیا تھا

علیم الحق حقی

وقت کے فاصلے

محبت ایک کیفیت کا نام ہے جو اپنی صفات میں پانی کی طرح ہے جیسے پانی جس برتن میں ہو، اسی کا رنگ روپ اختیار کرتا ہے ویسے ہی محبت جس دل میں ہو، اسی کا رنگ اپنا رنگ اپنا لیتی ہے اسی لیے زیادہ تر وہ محبت نہیں رہتی، کوئی پست جذبہ بن جاتی ہے کیونکہ آج کل دل کو سنوارنے کی فرصت کسے میسر ہے۔ لیکن جب کسی شرطِ اہلیت کے بغیر بے حساب نوازنے والا کریمی فرمائے تو کوزے پر سمندر اتر آتا ہے، ذرہ آسمان بن جاتا ہے اور خاک کو عظمت و رفعت مل جاتی ہے مگر اس کے ساتھ بے اندازہ کرب کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ یہ آسمان زاد محبت سے چھلکتے ان لمحوں کا احوال ہے جب منہ بند معصوم کلیوں کے بطن میں لافانی خوشبو جنم لیتی ہے۔

دو گھنٹے بعد وحید کو آئی سی یو سے وارڈ میں منتقل کردیا گیا۔ حمید احمد تو اسے گھر لے جانا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر نے منع کردیا "ابھی تو ہم نے بچے سے اس کی کیفیت بھی نہیں پوچھی ہے۔" اس نے کہا "اور ویسے بھی سر کی چوٹ میں انڈر آبزرویشن رکھنا ضروری ہوتا ہے۔"

اسی وقت اماں بھی اسپتال پہنچ گئیں۔ وحید مقررہ وقت پر گھر نہیں پہنچا تو ایک گھنٹا پریشان ہونے کے بعد وہ اسکول پہنچیں۔ وہاں سے انہیں حادثے کا پتا چلا اور وہ ہانپتی کانپتی اسپتال آگئیں۔ حمید احمد نے انہیں تسلی دی کہ اب وحید کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ پھر بھی وہ بیڈ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر گردش کررہی تھیں، ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے اور وہ وحید پر نجانے کیا کیا پڑھ کر دم کررہی تھیں۔

اس وقت اماں کی موجودگی کے باوجود حمید احمد کو تنہائی کا احساس بہت شدت سے ہورہا تھا۔ زندگی میں کوئی بڑا بحران آجائے تو تنہائی پسند آدمی بھی تنہائی برداشت نہیں کرسکتا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ اگر ان کے ساتھ اماں بھی نہ ہوتیں تو وہ کتنے اکیلے ہوتے۔ اس وقت ان کے لیے کتنا بڑا سہارا ہے اماں کا۔ اور انہیں احساس ہوا کہ اس طرح کی صورت حال میں ضرورت بھیڑ بھاڑ کی نہیں ہوتی۔ بس آدمی کے ساتھ دو چار ایسے افراد ہوں، جو اس سے محبت کرتے ہوں، اسے سمجھتے ہوں۔ جنہیں اس کو تسلی دینا اسے بہلانا آتا ہو۔

اماں نے سر اٹھا کر ان کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ ان کی انگلیاں ٹھہر گئیں۔ ہونٹ ساکت ہوگئے "حمید.... تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا؟" ان کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

پہلی بار حمید احمد کو احساس ہوا کہ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ لیکن ابھی بھوک تھی بھی نہیں۔ ہاں سوچنے پر چائے کی طلب ضرور ہونے لگی "اماں.... کھانا تو آپ نے بھی نہیں کھایا ہے۔" انہوں نے کہا۔

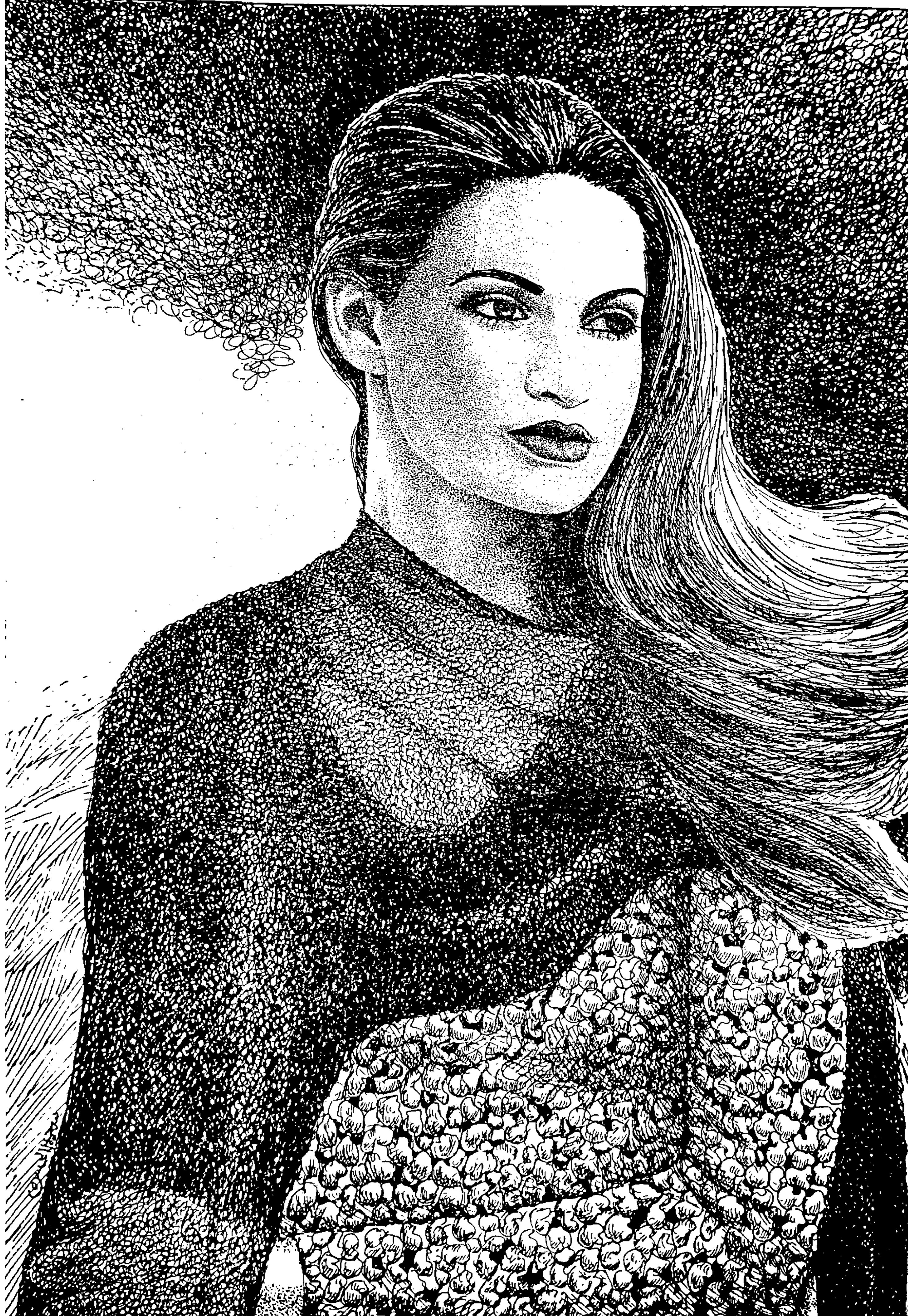
"میں نے تو کھالیا تھا۔" اماں نے جلدی سے کہا۔

حمید احمد جانتے تھے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اماں تو ان کی واپسی تک بھوکی رہتی تھیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وحید کی واپسی سے پہلے انہوں نے کھانا کھالیا ہو۔ لیکن انہوں نے بحث نہیں کی۔ یہ معاملہ بات کرنے کا نہیں، عملی طور پر کچھ کرنے کا تھا۔

"تم باہر ہو آؤ۔ میں یہاں بیٹھی ہوں وحید کے پاس۔" اماں نے کہا "کھانا کھاؤ۔ تازہ دم ہوجاؤ۔ بچے کو یہ روتی صورت نہ دکھانا۔"

حمید احمد خاموشی سے باہر نکل آئے۔ وہ اسپتال کی کینٹین کی طرف چل دیے۔ ایک بار پھر انہیں تنہائی کا احساس ستانے لگا۔ کینٹین میں چائے کا پہلا گھونٹ لینے کے بعد انہوں نے اس پر سوچا۔ تنہائی کا یہ احساس کیوں؟ جبکہ وہ بھیڑ بھاڑ کے قائل بھی نہیں ہیں اور اماں ان کے ساتھ ہیں۔ وہ نہ ہوتیں تو وحید کی پرورش کیسے ہوتی؟ وہ کیا کرتے؟ کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا انہیں۔ لیکن پھر بھی انہیں کسی کمی کا احساس ہورہا تھا۔ وہ کمی کیا ہے؟

وہ چائے پیتے ہوئے اس پر غور کرتے رہے۔ اچانک بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ اگر اس وقت ان کے ساتھ سلمہ ہوتی تو زندگی میں کوئی کمی نہ رہتی۔ تنہائی کا احساس بھی نہ ہوتا۔ بحران یہی ہوتا۔ لیکن وہ نسبتاً پرسکون ہوتے۔




NOVELS LOVERS
I ♥ BOOKS
0342:8678391
RJ

کیوں؟ ان کے ذہن میں سوال ابھرا۔ وہ استدلال کے آدمی تھے۔ اس کے بغیر انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔

وہ اس سوال کا جواب سوچنے لگے۔ جواب میں انہیں وہ بات یاد آئی، جس پر انہوں نے برسوں پہلے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک سماجی حقیقت ہے کہ انسان بے شمار رشتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، جو اس کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ وہ ماں باپ کی اولاد ہوتا ہے۔ پھر دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، ماموں، پھوپی، خالہ.... اور ان کے بچے۔ وہ پیدا ہوتا ہے تو ان رشتوں کی ڈور سے بندھا ہوتا ہے۔ لیکن دو رشتے ایسے ہوتے ہیں، جو اس کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ اور ماں باپ، بہن بھائی کے ساتھ وہ سب سے قریبی رشتے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک دوستی کا رشتہ ہوتا ہے اور ایک ازدواجی۔

حمید احمد ایسے حالات میں جیے تھے کہ وہ کبھی کسی کو دوست نہیں بنا سکے۔ ماں کے انتقال کے بعد ان کا کسی سے قریبی تعلق نہیں رہا۔ لیکن جب شادی ہوئی تو انہیں پتا چلا کہ قربت کیا ہوتی ہے۔ شاید دنیا میں میاں بیوی کے رشتے سے زیادہ پہلودار کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ سلمہ ان کے لیے سب کچھ تھی۔ وہ ان کی مونس، ہمدم اور غم گسار تھی۔ وہ ان کے لیے ذہنی اور جسمانی آسودگی کا باعث تھی۔ وہ ان کی بہترین دوست تھی، جسے وہ اپنے مسائل سنا کر مشورہ طلب کرسکتے تھے اور کبھی وہ کوئی دکھ بیان نہ کرنا چاہتے تھے تو وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس میں ان کی شریک بن جاتی۔ وہ اس کی قربت میں، اس کے جسم کی چھاؤں میں ستاتے اپنی ہر تھکن سے چھٹکارا پالیتے۔ وہ اس کے ساتھ مذاق کرتے، ہنستے بولتے۔ اسے کچھ لا کر دیتے تو انہیں خوشی ہوتی۔ وہ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتی، ان کی آسودگی، ان کی طمانیت کے لیے کوشش کرتی تو انہیں خوشی ہوتی۔ وہ زندگی سے ان کا رابطہ جوڑنے والی سب سے اہم کڑی تھی۔

لیکن وہ ساتھ صرف تین سال کا تھا۔ پھر سلمہ انہیں چھوڑ گئی۔ لیکن اس نے زندگی سے ان کا رابطہ نہیں ٹوٹنے دیا۔ وہ جاتے جاتے زندگی کی ایک اور کڑی سے انہیں جوڑ گئی.... بیٹے وحید سے۔ اور اس وقت ان کی اپنی عمر تیس سال تھی.... صرف تیس سال۔

وہ استدلال کے آدمی تھے۔ انہوں نے پہلے ہی دن خود سے تفصیلی بحث کرلی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں، جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ اور ایسا ہر رشتہ وہ ابتدا سے ہی کھوتے آئے تھے۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو ماں نہیں دے سکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا۔ ہاں.... اس کی پرورش کے لیے اہتمام وہ کرسکتے تھے۔ انہوں نے مزید حساب لگایا۔ ان کی اپنی ضرورت چھوٹی نہیں، بہت بڑی تھی۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کے مقابلے میں اہم نہیں تھے۔ ان کا بیٹا مستقبل تھا۔ وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر کرتے تو بچے کی پرورش اس انداز میں کی جانی ناممکن ہوجاتی، جو وہ چاہتے تھے۔

اس سوچ کے ساتھ انہیں فیصلہ کرنا تھا اور وہ انہوں نے کرلیا۔ وہ اپنی تمام ضرورتوں کو بھول گئے۔ بیٹے کی پرورش کو انہوں نے زندگی کا محور بنالیا۔ وہ ابتدا ہی سے ایسے آدمی تھے، جس کے لیے سب سے اہم چیز زندگی تھی۔ زندہ رہنے کے لیے محرومیوں کو ذہن سے جھٹک دینا ان کی عادت تھی۔ ایسے میں انہیں اپنی کوئی محرومی یاد نہیں آتی تھی۔

لیکن آج انہیں اس کمی کا احساس ہوا تھا۔ کوئی ہوتا جو ان کے بالوں میں انگلیاں لہرا کر کہتا.... پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ کسی کے کندھے پر سر رکھ دیتے۔

اس انداز میں سوچتے ہوئے اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ اب بھی ایک پھل دار درخت کی طرح ہیں، جس پر پھول کھلتے ہیں۔ لیکن پھل بننے کے بجائے سوکھ کر گر جاتے ہیں۔ انہوں نے لاکھ بھول جانے کی کوشش کی ہو۔ لیکن وہ اب بھی وہی ہیں جو سلمہ کی موت اور وحید کی پیدائش کے وقت تھے۔

انہیں یاد آیا کہ ان کا بیٹا ابھی کچھ دیر پہلے زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھا اور وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اور انہیں دلاسا دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلے تھے.... بالکل تنہا۔

اسی لمحے ان کے اندر سے تردید ابھری۔ ایسی بات تو نہیں۔ دلاسا دینا تو چھوٹی بات ہے۔ کسی نے ان کی عملاً مدد کی.... اور ایسی مدد، جو وہ تلاش کر رہے تھے اور انہیں کہیں نہیں مل رہی تھی۔ ہاں.... ان کے بیٹے کی زندگی کسی کے خون کی مرہون منت تھی۔

اب وہ مدیحہ کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھے۔ اس نے ان پر بہت بڑا احسان کیا تھا اور جتانا تو دور کی بات، اس نے ان کا سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ انہیں یاد آیا، مدیحہ نے کبھی ان سے کہا تھا۔ شاید میں کبھی آپ کے کام آسکوں اور انہوں نے بہت رعونت سے کہا تھا.... یہ تقریباً ناممکن ہی ہے مگر آج وہ ان کے اس طرح کام آئی تھی کہ جس کا وہ صلہ دے ہی نہیں سکتے تھے۔ اور اس نے آخری ملاقات میں کہا تھا.... اب کبھی ہم ملے تو اس کا سبب آپ ہی کی کوئی ضرورت ہوگی، میری نہیں.... اس کی یہ بات بھی سچی تھی۔ لیکن اس نے ان کی ضرورت پوری کردی تھی اور ملی پھر بھی نہیں تھی۔

حمید احمد کے اندر جھنجلاہٹ ابھری۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سوچا تو بات آگے بڑھے گی اور یہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ انہیں زندگی میں پیچیدگیاں پسند نہیں تھیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ اسپتال سے انہیں اس کا پتا بھی مل سکتا تھا اور فون نمبر بھی۔ فون کرکے شکریہ ادا کرنے میں کوئی قباحت نہیں

تھی۔ لیکن انہیں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں.... خوف زدہ ہیں۔ وہ اس کی محبت سے خوف زدہ تھے۔ جب انہیں اس کی محبت کا علم ہوا تھا، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا مرکز و محور وہ خود ہیں، تو انہوں نے دو باتیں سوچی تھیں۔ ایک یہ کہ کاش ایسی محبت انہوں نے ہی کسی سے کی ہوتی۔ دوسرے انہوں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر کبھی ایسی محبت کوئی ان سے بھی کرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن اس وقت بھی انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کاش یہ محبت اس لڑکی نے ان سے کی ہوتی اور بعد میں انہیں پتا چلا کہ وہ ان سے محبت کرتی ہے تو انہیں بہت برا لگا تھا۔ مگر یہ اوپر کی بات تھی اور شاید وہ اندر کی بات سے خوف زدہ تھے۔ وہ کریدنا.... اندر جھانکنا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی ایسی بات نہ نکل آئے، جو شرمندگی کا باعث ہو۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کاؤنٹر سے اماں کے لیے بسکٹ کا پیکٹ اور پیپر کپ میں چائے لے لی تھی۔

○☆○

مدیحہ اسپتال فون کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ روز فون پر نسرین سے بات کر لیتی تھی۔ اگلے روز اسے پتا چلا تھا کہ بچے کی حالت خطرے سے باہر ہے اور اگلے روز اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

تیسرے روز نسرین نے اسے بتایا کہ حمید احمد بہت پریشان ہیں۔ تاہم انہوں نے اب تک کالج سے چھٹی نہیں کی ہے۔ لیکن وہ ذہنی طور پر الجھے ہوئے ہیں۔ ان کی غائب دماغی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بہت بڑی پریشانی سے دوچار ہیں۔

مدیحہ سوچتی رہی۔ یہ طے تھا کہ پریشانی بچے ہی کی طرف سے ہوگی۔ لیکن کیا.... خدانخواستہ....؟

کئی بار ارادے باندھنے اور توڑنے کے بعد بالآخر اس نے اسپتال کا نمبر ملا ہی لیا "میں ڈاکٹر شاہد سے بات کرنا چاہتی ہوں؟"

"وہ شام پانچ بجے ڈیوٹی پر آئیں گے۔" اسے بتایا گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں شام کو فون کرلوں گی۔"

شام چھ بجے اس نے دوبارہ فون کیا تو ڈاکٹر شاہد سے بات ہو گئی "اوہ مس حامد، او نیگیٹو والی؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"جی ہاں۔ یہ بتایئے، وحید اب ٹھیک ہو گیا ہے نا؟"

"آپ تو اس کی خالہ ہیں۔ ڈائریکٹ معلوم کر سکتی ہیں۔ آپ اسے دیکھنے بھی نہیں گئیں؟" ڈاکٹر نے الٹا سوال کیا۔

مدیحہ صرف ایک لمحے کو ہچکچائی "دراصل ہمارا ملنا جلنا نہیں ہے۔"

"میرا اندازہ بھی یہی تھا۔" دوسری طرف سے ڈاکٹر نے کہا "اس روز پروفیسر صاحب نے کہا کہ ان کی کوئی سالی نہیں ہے۔ اور مجھے پتا چلا کہ بچے کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ لوگ سسرال سے تعلق توڑ لیتے ہیں۔"

"سبزیاں کھایا کرو۔ ان سے تمہارے رخساروں کا رنگ بدل جائے گا۔"
"لیکن میں تو نہیں چاہتی کہ میرے رخسار سبز رنگ کے ہو جائیں۔"

"ڈاکٹر.... میرے لیے اس بچے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ وہ آپ کی مرحوم بہن کی نشانی ہے نا۔"

ڈاکٹر نے گہری سانس لی "دراصل ہم سر کی چوٹ کی طرف سے تشویش میں تھے۔ اسکین کرایا تو ایک اور پرابلم سامنے آئی۔ بچے کے دماغ میں چھوٹی سی رسولی ہے۔"

"رسولی؟" مدیحہ پریشان ہو گئی "معاملہ سنگین ہے؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ ہم نے نیورو سرجن سے بات کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپریشن ضروری ہے۔ رسولی بڑھ گئی تو پیچیدگیاں بھی بڑھ سکتی ہیں۔"

"چانسز کیا ہیں؟"

"نیورو سرجن ڈاکٹر اشفاق پُرامید ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ عام GROWTH ہے تو بچہ مکمل طور پر شفایاب ہو جائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ...."

"اللہ نہ کرے۔" مدیحہ نے ڈاکٹر کی بات کاٹ دی "یہ بات حمید صاحب کو بتا دی گئی؟"

"جی ہاں۔ پروفیسر صاحب پریشان ہو گئے تھے۔ دراصل یہ بہت مہنگا آپریشن ہے۔ اسی لیے وہ ہچکچا رہے ہیں۔"

مدیحہ کی الجھن تو رفع ہو گئی۔ مگر دوسری الجھنیں شروع ہو گئیں "کتنا خرچ ہوگا ڈاکٹر صاحب؟"

"ہمارا اندازہ اٹھارہ ہزار روپے کا ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔"

"یو آر ویل کم۔"

ریسیور رکھنے کے بعد مدیحہ سوچتی رہی۔ حمید صاحب پریشان تھے۔ وہ اور کیا کر سکتے تھے؟ وہ سمجھ سکتی تھی کہ ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہوگی۔ اور وہ ایسے آدمی بھی نہیں تھے کہ کسی سے مدد مانگتے۔ جبکہ یہ ان کے بیٹے کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔

مدیحہ کو اس سلسلے میں صرف ایک ہی زاویے سے سوچنا تھا۔ یہ اللہ کی عنایت تھی کہ وہ ان کی مدد کر سکتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایسے خوددار آدمی کی کس طرح مدد کی جائے جو اپنی ضرورت کسی کو بتائے بھی نہیں۔ اب یہاں تو خوش قسمتی سے پتا چل گیا تھا کہ ان کی ضرورت کیا ہے۔ مدد اس طرح کرنی تھی کہ انہیں احساس نہ ہو

کہ ان کی مدد کی جارہی ہے۔ اس انداز میں کرنی تھی کہ وہ انکار نہ کرسکیں۔ ان کی انا کو‘ ان کی خودداری کو ٹھیس بھی نہ لگے۔

یہ کام ویسے بھی آسان نہیں تھا۔ جبکہ یہاں تو ایک اور مسئلہ بھی تھا۔ مدیحہ خود براہِ راست کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ سامنے آجاتی تو حمید احمد بری طرح بھڑک جاتے۔ پھر تو وہ کسی بھی طرح مدد قبول نہ کرتے۔

مدیحہ غور کرتی رہی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس معاملے میں اسے ایک نہیں‘ کئی جھوٹ بولنے ہوں گے۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی۔ لیکن معاملہ ایک انسانی زندگی کا ہی نہیں‘ اس کے محبوب کی سب سے قیمتی متاع کا بھی تھا۔

وہ سوچتی رہی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس معاملے میں اسے پاپا سے مدد لینا ہوگی۔ پاپا کو قائل کرلینا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔



بلقیس بیگم دیکھ رہی تھیں کہ حمید احمد اب بھی پریشان ہیں!

وحید کو تیسرے دن اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا تھا۔ وہ اسے گھر لے آئی تھیں۔ حمید احمد کالج گئے ہوئے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے کالج سے چھٹی نہیں کی تھی ”اماں.... کالج تو بس چند روز کا ہے۔ پھر چھٹیاں ہوجائیں گی۔“ انہوں نے کہا تھا ”مگر اس عرصے میں چھٹی نہیں کرسکتا۔ اسٹوڈنٹس کے لیے یہ ایک ایک دن اہم ہے۔ امتحان کی تیاری کا معاملہ ہے۔“

بلقیس بیگم کو حمید احمد پر ہمیشہ فخر ہوتا تھا۔ اس بار بھی ہوا۔ وہ کتنے ذمے دار آدمی تھے۔ معاملہ اکلوتے بیٹے کا تھا‘ جس کے نام پر انہوں نے اپنی ذات‘ اپنی ضروریات کو تج دیا تھا۔ وہ زندہ ہی اس کی خاطر تھے۔ مگر ایکسیڈنٹ کے بعد سے انہیں سونے کا کجا‘ آرام کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ دو صبحیں ایسی گزری تھیں کہ وہ صبح چھ بجے گھر واپس گئے۔ وہاں سے تیاری کرکے وہ کالج گئے ہوں گے۔

بلقیس بیگم نے ایک پورا دن اسپتال میں وحید کے ساتھ گزارا تھا۔ ڈاکٹر شاہد انہیں بہت اچھے لگے تھے۔ وہ ہر لحہ مسکرانے والے ملنسار آدمی تھے۔ وہ اسپتال آئی نہیں تو بہت پریشان تھیں۔ اور انہوں نے وحید کے متعلق ڈاکٹر شاہد سے پوچھا تھا۔

”اب یہ ٹھیک ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر شاہد نے کہا تھا ”لیکن آپ پروفیسر صاحب کو سمجھائیں۔ انہیں اپنے سسرال والوں سے صلح کرلینی چاہیے۔ اچھے لوگ ہیں۔ اس وقت ان کی سالی نے خون نہ دیا ہوتا تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔“

بلقیس بیگم کو یہ بات عجیب لگی۔ حمید احمد نے کبھی انہیں اپنے سسرال کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا۔ لیکن نہ پوچھنا اپنی جگہ۔ یہ سوچنا تو چاہیے تھا نہیں۔ سسرال تو ہوگا حمید احمد کا۔ اور اس طرح کی صورتِ حال میں ایسا ہوتا ہے۔ لڑکی کے ماں باپ بچہ مانگ لیتے ہیں پالنے کے لیے۔ انہیں اعتبار نہیں ہوتا کہ ان کا داماد دوسری شادی نہیں کرے گا۔ انہیں یقین نہیں ہوتا کہ وہ بچے کی اچھی طرح پرورش کرسکے گا۔ اور حمید احمد اپنا بیٹا کسی کو نہیں دے سکتے تھے۔ اس پر ناراضگی ہوئی ہوگی۔ بات بڑھی ہوگی.... اور اس حد تک کہ تعلقات ختم ہوگئے ہوں گے۔

”توحید کی خالہ نے خون دیا تھا۔“ انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اس پر ڈاکٹر شاہد نے انہیں او نیگیٹو کی کمیابی کے متعلق بتایا۔

”اس کا نام کیا تھا؟“

”آپ کو بھی نہیں معلوم؟“ ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت اور بے یقینی تھی۔

بلقیس بیگم ایک لمحے کو گڑبڑائیں۔ پھر انہوں نے بات بنادی ”کئی خالائیں ہیں نا اس کی۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ خون کس نے دیا ہے۔“

”اوہ۔ ان کا نام مدیحہ تھا۔“

صورت حال ایسی تھی کہ انہیں مدیحہ کا نام یاد نہ آتا۔ لیکن جب وہ گھر آئی تھی تو انہوں نے محسوس کیا تھا کہ وہ حمید احمد سے محبت کرتی ہے اور وہ انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ سچ یہ ہے کہ اس کے بعد وہ اپنی واحد محرومی یعنی بہو کے بارے میں پُرامید ہوکر سوچنے لگیں۔ اور جب اس نے اپنا نام بتایا.... مدیحہ.... تو انہوں نے سوچا تھا کہ یہ نام حمیدہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ صرف حروف کے الٹ پھیر کی بات تھی۔

تو انہیں مدیحہ یاد آگئی ”اچھا‘ مدیحہ۔ ہاں‘ بہت پیاری لڑکی ہے وہ۔“ انہوں نے کہا۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی وہ مدیحہ کے بارے میں سوچتی رہیں۔ وہ ہمیشہ سے اس بات کی قائل تھیں کہ کوئی بات‘ کوئی کام‘ کسی کا کسی سے ملنا.... کچھ بھی بے سبب نہیں ہوتا۔ دنیا میں کوئی کام اتفاق سے نہیں ہوتا۔ اتفاق انسان اسے کہتے ہیں‘ جس کے پیچھے لگے ہوئے اسباب کا تسلسل انہیں نظر نہیں آتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بس اچانک.... بغیر کسی وجہ کے ہوگیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ وہ مسبّب الاسباب رب کا منظم و مرتب حکم ہوتا ہے۔

مدیحہ گھر آئی۔ اس نے چائے پی‘ ان سے باتیں کیں‘ حمید احمد کی شادی کا البم دیکھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گی۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی تھی کہ اس کا آنا اتفاق نہیں ہے۔ وہ حمید احمد سے ملی تھی۔ ان کے درمیان کچھ تھا۔ اور یقیناً حمید احمد نے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ ورنہ وہ یہ نہ کہتی کہ وہ یہاں دوبارہ نہیں آئے گی۔ تو یقیناً یہ اتفاق نہیں تھا۔

پھر وحید حادثے میں زخمی ہوا۔ معاملہ سنگین نہیں تھا۔ بس

اسے خون کی ضرورت تھی.... فوری طور پر۔ اور اس کا خون ایسے گروپ کا تھا' جو آسانی سے تو کیا' کبھی مشکل سے بھی نہیں ملتا۔ اور خون ملنے میں تاخیر معاملے کو سنگین بنا رہی تھی۔ زندگی کو خطرہ لاحق ہونے لگا تھا۔ غیر اہم بات اہم ہوگئی۔ تو یہ جو وحید کا خون تھا' یہ تو پیدائش سے ہی اس کے جسم میں تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا کہ اس کے خون کا گروپ او نیگیٹو تھا۔ یہ رب کی مرضی تھی' مشیت تھی۔ اور مجبور باپ بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے خون کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ اور جن لوگوں کی رگوں میں اس گروپ کا خون تھا' وہ سب کے سب گھر بدل چکے تھے۔ یہ بھی اتفاق نہیں تھا۔ یہ مسبب الاسباب رب کا حکم تھا۔

اور مدیحہ کو اس کالج میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس حادثے کا علم ہوگیا' یہ بھی اتفاق نہیں تھا۔ اور وہ اسپتال آئی.... اور اس کے خون کا گروپ بھی وہی تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ یہ رب کا سوچا ہوا' ترتیب دیا ہوا اسباب کا سلسلہ تھا۔ یہ طے ہے کہ اللہ نے وحید کی زندگی لکھی تھی تو اس کو خون دینے کے لیے کسی کو تو آنا تھا۔ اور اللہ چاہتا تو کوئی بھی آجاتا۔ لیکن نہیں.... اللہ نے یہ کام اس مدیحہ کو ہی سونپا تھا۔ یہ اسی کے ذریعے ہونا تھا۔

تو مدیحہ کی کوئی اہمیت تھی.... حمید احمد کے' وحید کے' اس گھر کے لیے۔ ورنہ قدرت نے یہ کام کسی اور سے لے لیا ہوتا۔

یہ خیال بے حد خوش آئند تھا۔ بلقیس بیگم کے ذہن میں ایک لفظ گردش کرنے لگا.... ہو! اللہ کرے' ایسا ہو جائے۔

لیکن اس روز حمید احمد گھر واپس آئے تو بہت پریشان تھے۔ اور وہ دیر سے بھی آئے تھے۔ بلقیس بیگم نے وجہ پوچھی تو بولے کہ کالج میں کام زیادہ ہے۔ چھٹیاں ہونے والی ہیں اور اس کے بعد امتحان ہوں گے۔

حمید احمد نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بلقیس بیگم ان سے مدیحہ کے متعلق بات کرنے کو بے چین ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بات شروع کر ہی دی "اللہ کا شکر ہے کہ وحید خیریت سے گھر آگیا۔ اللہ نے بڑا کرم فرمایا۔"

"جی اماں۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"سنا ہے' خون کا بڑا مسئلہ ہوگیا تھا۔"

"ہاں اماں۔ اس کا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے' جو بہت کم لوگوں کا ہوتا ہے۔ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر بات نہیں بنی۔ میں تو مایوس ہی ہوگیا تھا۔"

"تو پھر؟"

"کسی نے خود ہی اسپتال آکر خون دے دیا۔" حمید احمد نظریں چرانے لگے۔

بلقیس بیگم تجاہل عارفانہ سے کام لیتی رہیں "وہ تو رحمت کا فرشتہ ہی ہوا ہمارے لیے۔ بڑا احسان ہے اس کا ہم پر۔"

"جی ہاں اماں۔ اللہ جس سے جو کام چاہے' لے لیتا ہے۔ اللہ

کا شکریہ۔" حمید احمد نے دھیمی آواز میں کہا۔
"کون تھا وہ؟"
حمید احمد نے یوں پہلو بدلا' جیسے اس جواب سے بچنے کی راہ تلاش کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے کہا "کوئی لڑکی تھی اماں؟"
"تم نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا؟"
"نہیں۔ میں نے بتایا نا اماں کہ وہ لڑکی تھی۔" حمید احمد کے لہجے میں جھنجلاہٹ آگئی۔
"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ احسان تو احسان ہے' کسی نے بھی کیا ہو۔"
"میرے پاس اس کا پتا نہیں ہے۔"
حمید احمد چھپا رہے تھے۔ اور اب بلقیس بیگم انہیں پکڑ کر شرمندہ ہی کرتیں "ارے میاں' ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ میں اسپتال والوں سے بات کرلوں گی۔"
"آپ کچھ نہ کریں۔ میں معلوم کرلوں گا اور اس کا شکریہ بھی ادا کردوں گا۔" حمید احمد نے گھبرا کر کہا۔ پھر وہ اٹھ ہی گئے "کچھ کام نمٹانا ہے اماں۔"
بلقیس بیگم ان کی پریشانی دیکھ کر پریشان ہوتی رہیں۔ ان کی سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آرہی تھی۔ بیٹا خیریت سے گھر آگیا۔ اب کیا بات ہے۔
رات کے کھانے کے بعد بلقیس بیگم نے ان سے پوچھ ہی لیا "تم بہت پریشان ہو بیٹے۔ کیا بات ہے؟"
"کچھ بھی نہیں اماں۔"
بلقیس بیگم کی تشویش زبان پر آگئی "وحید کی طرف سے کوئی پریشانی ہے؟ کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟"
اس پر حمید اور بری طرح بھڑکے "کیسی بات کرتی ہیں اماں۔ اسے کوئی خطرہ ہوتا تو اسپتال والے اسے چھٹی کیوں دیتے۔"
یہ بات معقول تھی.... سمجھ میں آنے والی۔ بلقیس بیگم مطمئن ہوگئیں "تو پھر کیا بات ہے؟"
"کالج کے کچھ معاملات پریشان کر رہے ہیں اماں۔"
بات ختم ہوگئی۔ لیکن اس رات انہوں نے دیکھا کہ حمید احمد سوتے سوتے اٹھے اور وحید کے پاس جاکر اسے بہت غور سے دیکھنے لگے۔ پھر وہ اس کا سر سہلانے لگے۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ اپنے بستر پر جالیٹے۔ اس رات انہوں نے ایسا کئی بار کیا۔
بلقیس بیگم نے مداخلت نہیں کی کہ پریشان آدمی کو اور پریشان کرنے سے کیا حاصل اور وہ بے اولاد تھیں۔ لیکن سمجھ سکتی تھیں کہ حمید احمد اکلوتے بیٹے کی طرف سے کتنے خوف زدہ ہوگئے ہیں۔ انہوں نے تقریباً اسے کھو ہی دیا تھا۔ ان کا خوف فطری تھا۔
صبح انہوں نے حمید احمد سے کہا "بیٹے.... ڈرو مت۔ اللہ کی امانت ہے۔ اللہ ہی حفاظت کرے گا۔ اور اس نے کی بھی۔ شکر ادا کرو اس کا۔"
حمید احمد کے ہونٹوں پر بجھی بجھی مسکراہٹ ابھری "میں بلاوجہ کبھی نہیں ڈرتا اماں۔ اچھا.... آج میں دیر سے گھر آؤں گا۔"

○☆○

حمید احمد بہت پریشان تھے!
جس روز وحید ڈسچارج ہوا' وہ کالج سے پہلے اسپتال گئے اور ڈاکٹر شاہد سے ملے۔ ڈاکٹر نے انہیں جو کچھ بتایا' اس نے انہیں دہلا دیا۔ اٹھارہ ہزار روپے! جبکہ وہ جانتے تھے کہ سب مل ملا کر جو اخراجات ہوں گے' وہ پچیس ہزار سے کم نہیں ہوں گے۔ اور ان کے بینک میں بمشکل تین ہزار ہوں گے۔
وہ اسپتال سے گھر آئے تو ان کے دماغ پر وہی پچیس ہزار چھائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کی باتیں ان کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ آپریشن جتنی جلدی ہوجائے' بہتر ہے۔ جتنا وقت لگے گا' اتنا ہی معاملہ بڑھنے اور بگڑنے کا خدشہ ہے۔ صرف تین دن لگیں گے۔ تین دن بعد آپ بچے کو گھر لے جائیں۔
ان سے نہ ٹھیک سے کھانا کھایا گیا' نہ سویا گیا۔ رات کو کئی بار وہ اٹھے اور انہوں نے وحید کو دیکھا۔ اس کا سر سہلاتے ہوئے انہوں نے دل میں کہا۔ بیٹے.... کیا تم کھو جاؤ گے؟ نہیں.... میں نے سب کچھ گنوا کر صرف تمہیں پایا ہے۔ تم بہت قیمتی ہو۔ تمہاری خاطر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ خود کو بھی بھول گیا۔ مجھے تمہارے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے۔ تم صرف میرے نہیں ہو میرے بیٹے.... تم میرے باپ دادا' میری نسلوں کی امانت ہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔
وہ رات بھر سو نہیں سکے۔ سوچتے رہے۔ پچیس ہزار کا بندوبست کہاں سے کریں۔ زندگی میں انہوں نے کوئی دوست نہیں بنایا تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا' جس سے وہ اتنی بڑی رقم مانگ سکتے۔ اور آپریشن جلد سے جلد کرانا تھا۔ ایک ہفتے بعد کالج کی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں.... پندرہ دن کی۔ اس عرصے میں انہیں لازمی طور پر وحید کا آپریشن کرالینا تھا۔ کیونکہ پھر امتحان شروع ہوں گے اور وہ مصروف ہوجائیں گے۔ پہلے INVIGILATION۔ پھر امتحانی پرچوں کی چیکنگ کا کام۔ اس میں انہیں اچھی خاصی رقم مل جاتی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ وحید کی طرف سے پریشان نہ رہیں۔ یعنی آپریشن ہوچکا ہو۔
وہ پچیس ہزار کے بارے میں سوچتے تو انہیں اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا۔ وہ کہاں سے بندوبست کریں اس رقم کا۔ نہ وہ کسی سے مانگ سکتے ہیں۔ نہ کسی سے مل سکتی ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں' جسے بیچ کر یہ ضرورت پوری کرسکیں۔
اسی لمحے ان کے ذہن میں روشنی سی ہوگئی۔ ایک ایسی چیز ہے ان کے پاس۔ ایک ہی چیز ہے۔ زندگی میں وہی ایک چیز تو انہوں نے بنائی ہے.... مکان! ہاں یہ اس ضرورت میں ان کے کام آئے گا۔ وحید کی زندگی سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں۔ اللہ وحید کو زندگی

دے۔ وہ کرائے کے مکان میں بھی رہ سکتے ہیں۔ مکان تو نہیں پھر بھی مل سکتا ہے۔ اور ملے نہ ملے' یہ اتنی بڑی بات نہیں۔ بس وہ مکان بیچ دیں گے۔

اس فیصلے کے بعد انہیں سکون آگیا اور وہ سو گئے۔

اگلے روز کالج سے واپسی پر وہ اس مشن پر نکلے۔ انہوں نے علاقے کی اسٹیٹ ایجنسیوں میں بات کی۔ اس کے نتیجے میں ان کی مایوسی بڑھ گئی۔ انہوں نے تو سوچا تھا کہ وہ اپنا مکان بیچیں گے' پیسہ ہاتھ میں آئے گا اور ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پتا چلا کہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔

ان کا مکان لیز نہیں تھا۔ کاغذات ہوتے تو وہ انہیں رکھوا کر بینک سے قرضہ لے سکتے تھے۔ لیکن اس میں بھی دفتری کارروائی میں وقت لگتا۔

"وقت کی گارنٹی کہیں سے بھی نہیں مل سکتی ماسٹر صاحب۔" اسٹیٹ ایجنٹ نے ان کا مرتبہ کم کرتے ہوئے کہا "دیکھیں۔ یہ بات تو آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ یہ دو پارٹیوں کا کھیل ہے۔ بیچنے والا موجود ہے' خریدنے والا نہیں تو بات کیسے بنے گی۔ اور خریدنے والا پیسہ لیے کھڑا ہے' بیچنے والا نہیں ہے تو بھی کام نہیں ہوگا۔ یہ ان دو پارٹیوں کا کھیل ہے۔ ہم تو بس تیسری پارٹی ہیں.... دو پرسینٹ والی۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد سودا کرا کے اپنا محنتانہ لیں۔"

"مگر مجھے جلدی ہے۔" حمید احمد نے کہا۔

"میں نے کہا نا ماسٹر صاحب' خریدار کے بغیر تو کچھ نہیں ہوتا۔ میں کوشش کروں گا۔ تلاش کروں گا۔"

"مجھے جلدی نہ ہوتی.... فوری ضرورت نہ ہوتی تو مکان کسی قیمت پر نہ بیچتا۔" حمید احمد کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"یہ بات دوسری پارٹی کو پتا نہ چلنے دینا ماسٹر صاحب۔" اسٹیٹ ایجنٹ نے ناصحانہ انداز میں کہا "ورنہ آپ کی پراپرٹی کے دام گر جائیں گے۔"

"کچھ بھی ہو جائے۔ دام گر جائیں۔ میری ضرورت تو وقت پر پوری ہو جائے۔"

اسٹیٹ ایجنٹ نے انہیں ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا "دیکھو ماسٹر جی' ان کاموں میں وقت لگتا ہے۔ پارٹی پکی ہو' تب بھی بارگیننگ میں تین چار دن تو لگتے ہیں۔ پھر پارٹی کہتی ہے کہ دو دن بعد بیعانہ لے کر آئے گی۔ کبھی اس میں بھی دو کی جگہ چار دن لگ جاتے ہیں۔ پھر پارٹی بیعانہ دے کر فل پے مینٹ کے لیے وقت مانگتی ہے۔ کبھی مہینہ' کبھی دو مہینے۔ یہ سودا کھڑے کھاٹ تو نہیں پٹتا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا "لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم حرام کی کھاتے ہیں۔ پر کوئی کام کرے تو پتا چلے۔ دونوں پارٹیوں کے بیچ گھومتے گھومتے جوتے گھس جاتے ہیں' ٹانگیں دکھ جاتی ہیں' تب کہیں تو پرسینٹ ملتا ہے ہمیں۔"

حمید احمد کو اس وقت اپنی ضرورت کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ نہ وہ کچھ سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا "میں تمہیں منہ مانگا کمیشن دوں گا۔ بس تم یہ کام جلد سے جلد کرا دو۔ زیادہ سے زیادہ دس دن میں۔"

"ماسٹر صاحب' ہم کو بس اپنے کمیشن سے غرض ہوتی ہے۔" اسٹیٹ ایجنٹ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "پر آپ سادہ آدمی ہیں۔ ضرورت مند بھی ہیں۔ مجھے آپ پر ترس آتا ہے۔ دیکھیں' اتنی جلدی یہ کام ہوتا نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ آپ اپنا مکان کوڑیوں کے مول بیچ دیں۔ تو یہ تو بہت بڑا نقصان ہوگا۔"

"مثلاً؟"

اسٹیٹ ایجنٹ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا "میں نے آپ کا مکان دیکھا ہے۔ اچھی جگہ ہے۔ ٹھیک ٹھاک بنا ہوا بھی ہے۔ میرے خیال میں اس کی قیمت تین لاکھ سے اوپر ہونی چاہیے۔ آپ مجھے وقت دیں تو میں اسے ساڑھے تین میں ضرور بکوا دوں گا۔ ممکن ہے' کوئی اس کا چار بھی دے مرے۔ لیکن دس دن....! اب ماسٹر صاحب' آپ کہیں کہ یہ آپ ایک لاکھ میں یا پچاس ہزار میں بیچ رہے ہیں۔ تو یہ فوراً بھی بک سکتا ہے۔"

حمید احمد نے سوچا۔ فرق بہت بڑا تھا۔ اور مکان ان کی زندگی بھر کی کمائی تھی۔ وہ جھجکنے لگے۔ پھر انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا

"میں کیا کروں۔ مجھے فوری طور پر رقم کی ضرورت ہے۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"آپ ایسا کرو۔ کل تک سوچ لو۔ پھر مجھے بتا دینا۔ پر ایسے سودے میں ہمیں کچھ ملتا نہیں۔ پھر ایسے مکان بکنے لگیں تو ہم لوگوں کا تو دھندا ہی ختم ہو جائے گا۔"

حمید احمد بچے نہیں تھے۔ انہیں اسٹیٹ ایجنٹ کے چہرے پر سچ صاف لکھا نظر آ گیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ ان کے لیے گاہک ہرگز تلاش نہ کرتا۔ اتنے سستے داموں تو وہ خود ہی ان کا مکان خرید لیتا۔ یوں اسے بھاری منافع ہوتا "ٹھیک ہے۔ میں کل آؤں گا۔" انہوں نے کہا۔

وہ باہر آئے تو ان کے قدم ہی نہیں، دل بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ دوسری اسٹیٹ ایجنسیوں پر صورتِ حال اس سے بھی بدتر رہی تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ بے حد مایوس تھے۔

اگلا دن بھی یونہی گزرا۔ اس روز سب سے پہلے وہ لیز آفس چلے گئے۔ وہاں اور تلخ تجربہ ہوا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ مکان لیز کرا کے، اس کے کاغذات جمع کرا کے قرضے کے لیے اپلائی کریں گے۔ مگر پتا چلا کہ لیز کرانا بھی آسان کام نہیں۔ دفتری کارروائیاں اتنی طویل اور ایسی ہیں کہ روٹین میں اس کام کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اور اگر ہوا تو مہینوں لگ جائیں گے۔ ہاں.... پندرہ ہزار روپے خرچ کیے جائیں تو کام تین دن میں ہو سکتا ہے۔ اور پندرہ ہزار ان کے پاس ہوتے تو وہ یہ سب کچھ کرنے کے بجائے وحید کو اسپتال ہی لے جاتے۔

اس روز وہ صرف اسی اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس گئے، جس نے انہیں سوچنے کو کہا تھا۔ انہوں نے اس کے مشورے پر عمل کر کے سوچا بھی تھا۔ ساڑھے تین لاکھ کے مکان کو ایک لاکھ میں بیچنا بہت بڑی بے وقوفی تھی۔ لیکن وہ اس کا کیا کرتے کہ یہ مجبوری بھی تھی۔ وحید کی زندگی سے بڑھ کر تو کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ ان کی اپنی زندگی بھی نہیں۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ یہ سودا تو ضرورت سے ایک دن پہلے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہی کرنا ہے تو اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے دن اور جگہ کوشش کر لی جائے۔ کچھ نہ بنا تو یہ راستہ تو ہے۔

اس روز اسٹیٹ ایجنٹ زیادہ اپنائیت سے پیش آیا "آؤ ماسٹر صاحب۔ چائے پیو گے یا ٹھنڈا منگاؤں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اب گھر جا کر آرام کروں گا۔ رات ہو رہی ہے۔" حمید احمد نے کہا۔

"پھر کیا سوچا آپ نے؟"

"یہ بتاؤ، تم میرا مکان ایک لاکھ روپے میں اس طرح بکوا سکتے ہو کہ چوبیس گھنٹے کے اندر رقم مجھے مل جائے۔"

ایجنٹ نے انہیں بہت غور سے دیکھا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کی پیشانی پر لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ پھر اس نے کہا "اس بات کی گارنٹی تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ مگر میں آپ کی خاطر سب کچھ کر لوں گا۔ پورا پے مینٹ نہ بھی ہوا تو پچیس ہزار فوری طور پر ضرور دلوا دوں گا۔"

حمید احمد مطمئن ہو گئے۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے "بس اب میں سودے کی بات کرنے ہی آؤں گا۔"

لیکن گھر کی طرف جاتے ہوئے ان کا دل کٹنے لگا۔ ساڑھے تین لاکھ کا مکان... وہ بھی اسٹیٹ ایجنٹ کے بازار کے حساب سے۔ ان کے حساب سے تو اس کا کوئی مول ہی نہیں تھا۔ اور وہ صرف ایک لاکھ میں بک جائے گا اور وہ بے گھر ہو جائیں گے۔ دوسرا مکان بنانے کی انہیں مہلت ملے نہ ملے۔ ایک عمر درکار ہوتی ہے مکان بنانے کے لیے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ ابھی ان کے پاس آٹھ دن کی مہلت ہے۔ اللہ اس میں کوئی سبیل کر دے تو....

انہیں نہیں معلوم تھا کہ سبیل ہو چکی ہے!



اماں نے ان سے کھانے کا پوچھا تو انہوں نے انکار کر دیا "بھوک نہیں ہے اماں۔"

اماں پریشان ہو گئیں "کیا بات ہے بیٹے؟ بہت پریشان ہو؟"

"نہیں اماں۔ بس تھکا ہوا ہوں۔" حمید احمد اماں کو یہ سب کچھ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اچانک اماں کو کچھ یاد آ گیا "ارے ہاں.... تم سے ملنے کوئی صاحب آئے تھے.... بڑی سی گاڑی میں۔ کافی دیر بیٹھے۔"

حمید احمد الجھنے لگے۔ گاڑی میں ان سے ملنے کون آ سکتا ہے۔ انہیں فوراً مدیحہ کا خیال آیا۔ لیکن اماں کے بیان کے مطابق وہ کوئی مرد تھا "کیا نام بتایا تھا؟"

"نام تو مجھے یاد نہیں۔ کچھ دے کر گئے ہیں تمہارے لیے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے.... حمید صاحب سے میری سفارش کرنا بس کہ میرا کام کر دیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔"

اماں نے انہیں جو چیزیں لا کر دیں، ان میں ایک وزیٹنگ کارڈ تھا، ایک رقعہ تھا اور ایک بند لفافہ۔ حمید احمد کا تجسس سے برا حال ہو گیا۔ انہوں نے کارڈ کو نظر انداز کر دیا اور سب سے پہلے رقعہ کھولا۔

"حمید صاحب،

ہم دونوں ایک دوسرے سے ناواقف ہیں۔ لیکن مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میری بیٹی انٹر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ اسے شہریت کے لیے ٹیوشن چاہیے۔ کسی نے مجھے آپ کے متعلق بتایا اور میں حاضر ہو گیا۔ امتحان تک آپ اسے پڑھا دیجیے تو مجھ پر احسان ہو گا۔ اس کا صلہ تو میں آپ کو نہیں دے سکتا۔ اپنی بساط کے مطابق چھوٹا سا ایک نذرانہ پیش کر رہا ہوں۔ لفافے میں چیک ہے۔ اسے قبول کر لیں۔ نامنظور ہو تو اسے پھاڑ کر پھینک دیجیے گا۔

تیار ہوں تو فون کر کے مجھے وقت بتا دیجیے۔ میں گاڑی بھجوا دوں گا۔ میرا خیال ہے، آپ ایک گھنٹا پڑھا دیں تو کافی ہوگا۔ گاڑی آپ کو چھوڑ بھی جایا کرے گی۔ میں بہت شکر گزار ہوں گا۔ فقط
ایچ ایچ صدیقی"

اس رقعے کو پڑھ کر حمید احمد کشمکش میں پڑ گئے۔ یہ ان کا اصول تھا۔ انہوں نے کبھی ٹیوٹر بننا گوارا نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت انہیں پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ ایسی کہ وہ اس کے لیے اپنا مکان بھی بیچ سکتے تھے۔ تو کیا وہ ٹیوشن نہیں....

انہوں نے حساب لگایا۔ اگر ابھی سے پڑھائیں تو یہ صرف ایک ماہ کا معاملہ ہے۔ اور ایک مہینے کی فیس کوئی کتنی دے سکتا ہے.... زیادہ سے زیادہ ہزار.... دو ہزار! اور اس سے کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں!

ان کا جی چاہا کہ تینوں چیزیں پھاڑ کر پھینک دیں۔ مگر اندر سے کوئی چیز انہیں روک رہی تھی۔ خاصی دیر وہ ہچکچاتے رہے۔ پھر انہوں نے بڑی احتیاط سے لفافہ کھولا۔ اس میں چیک کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے چیک کو دیکھا۔ ہندسوں میں جو کچھ لکھا ہوا تھا، اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ۳۰۰۰۰/-

وہ ہندسوں کو گھورتے رہے، جیسے وہ ان کا وہم ہیں اور کسی بھی لمحے تحلیل ہو جائیں گے۔ لیکن ہر صفر اپنی جگہ ضدی پن سے ڈٹا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک ماہ تک ایک گھنٹا روز پڑھانے کا معاوضہ اتنا کون دے سکتا ہے۔ تین ہزار بھی بہت زیادہ ہی کہلائے گا۔ یقیناً ایک صفر زیادہ لگ گیا ہے غلطی سے!

لیکن انہوں نے عبارت دیکھی تو عبارت انہی ہندسوں کی تصدیق کر رہی تھی.... تیس ہزار روپے!

اندر کا ہیجان دھیرے دھیرے سرد ہو تا گیا اور وہ مطمئن اور پرسکون ہوتے گئے۔ یہ تو اللہ کی طرف سے مدد ہے۔ ان کے اندر سے کسی نے کہا۔ لیکن وہ ٹیوشن پڑھانے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ ان کا اصول ہے! ضرورت اصول سے بڑی ہے۔ اندر کی آواز نے جواب دیا۔ اس پیشکش کو ٹھکرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگلے روز انہوں نے صدیقی صاحب کو فون کیا "میں پانچ بجے سے چھ بجے تک پڑھا سکوں گا۔" انہوں نے کہا۔

"مناسب ہے۔ لیکن میری بیٹی کہہ رہی تھی کہ کالج کی چھٹیوں کے ساتھ یہ سلسلہ شروع کیا جائے تو بہتر ہے۔ آج ۲۳ تاریخ ہے۔ میں ۲۹ کو شام چار بجے آپ کے لیے گاڑی بھجوا دوں گا۔"

حمید احمد کا دل یوں دھڑکا جیسے آخری بار دھڑک رہا ہو۔ یہ بھی اللہ کی تائید ہی تھی۔ ورنہ وہ تو آج سے ہی جاتے۔ ایک مہینے کی ٹیوشن کے تیس ہزار روپے دینے والے کو ٹہلایا تو نہیں جا سکتا۔ مگر اب اتنے دن میں تو وحید آپریشن سے نمٹ سکتا ہے "جی بہت بہتر۔" انہوں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں حمید صاحب"

شائستگی

اپنی ایک نہایت ناپسندیدہ شخصیت کو مجبوراً خط لکھتے وقت اقلیم صاحب نے لکھا:

"میری سیکریٹری چونکہ ایک معزز خاتون ہے اس لیے میں اس سے وہ الفاظ لکھوانا نہیں چاہتا جو میں آپ کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں خود بھی چونکہ ایک خاندانی اور شائستہ آدمی ہوں اس لیے وہ الفاظ تحریر نہیں کر سکتا.... لیکن آپ چونکہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہیں اس لیے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ میں در حقیقت کیا کہنا چاہتا ہوں...."

I AM REALLY GRATEFUL



وحید آپریشن کے بعد اسپتال سے رخصت ہو کر گھر آ چکا تھا۔ حمید احمد خود کو ایسا ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے کہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اللہ نے ان کی بہت بڑی مشکل کس طرح آسان کر دی تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اس پر زندگی بھر اللہ کا شکر ادا کریں گے۔

ڈاکٹر نے یقین دلایا تھا کہ وحید اب پوری طرح صحت مند ہے۔ رسولی عام سی تھی۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

۲۹ سے کالج کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ اس روز صبح ہی سے حمید احمد اپنی اس شاگرد کے بارے میں سوچنے لگے۔ وہ ان کے لیے وی آئی پی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کی بہت بڑی مشکل آسان ہوئی تھی۔ وہ اسے اتنی اچھی طرح پڑھائیں گے کہ حق ادا کر دیں گے۔ انہیں بے تابی ہو رہی تھی۔

ٹھیک چار بجے گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ لپک کر باہر نکلے۔ ڈرائیور نے ان کے لیے عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئے۔

سفر کے دوران وہ اپنی اس شاگرد کے بارے میں سوچتے رہے، جسے انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ یقیناً اس مضمون میں کمزور ہوگی۔ بہت کمزور۔ ورنہ ایک ماہ کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے کیوں دی جاتی۔ وہ کچھ پریشان ہو گئے۔ اتنے کم دنوں میں کچھ ہو سکے گا۔ انہیں بہت محنت کرنی ہوگی۔ اور وہ شاید کند ذہن بھی ہو۔ کوئی بات نہیں۔ وہ اسے زیادہ وقت دے دیں گے۔ دے سکتے ہیں۔ وقت ہے ان کے پاس۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکیں گے اس کے لیے؟

وہ چونکے۔ گاڑی اب شارع فیصل سے کالا پل کی طرف مڑ رہی تھی۔ انہیں مدیحہ یاد آ گئی۔ برسات کا وہ دن یاد آ گیا۔ اس

سڑک پر وہ اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں.... اور کہیں کمر کمر تک پانی میں چلے تھے۔ اور یہاں وہ مین ہول میں گر رہی تھی۔ انہوں نے کتنی مشکل سے اسے بچایا تھا۔

گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ لیکن ان کے خیال' ان کی یادوں کی رفتار اس سے ہم آہنگ تھی۔

گاڑی پل سے گزر رہی تھی۔ یہ وہ جگہ ہے' جہاں مدیحہ نے ان پر اپنے اعتراف کا دھاکا کیا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر اس جگہ کو دیکھا۔ پھر وہ رخصت ہوگئی تھی۔ اس نے انہیں ساتھ آنے سے روک دیا تھا.... شور مچانے کی دھمکی دے کر۔ اور یہ وہ جگہ ہے' جہاں آتے جاتے بے شمار لوگوں کے درمیان سے گزر کر وہ انہیں جاتی دکھائی دی تھی۔ اور یہ وہ موڑ ہے' جسے مڑ کر وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

گاڑی اس موڑ سے مڑی تو یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سوچیں رہ گئیں تو اس طرف گئی تھی مدیحہ۔ وہ یہاں پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ آگے ایک دوراہا تھا۔ ایک راستہ کسی کچی بستی کی طرف جا رہا تھا۔ دوسرا ڈیفنس سوسائٹی میں داخل ہو رہا تھا۔ گاڑی اب بنگلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔

مدیحہ بھی تو ڈیفنس سوسائٹی میں رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے' ابھی کہیں اس سے سامنا ہو جائے۔ ہوگیا تو کیا ہوگا؟ اللہ نہ کرے۔ انہیں احساس بھی نہیں ہوا کہ یہ بات انہوں نے بلند آواز میں کہی ہے۔

"جی سر؟" ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں بے خیالی میں بول گیا تھا۔" حمید احمد نے کہا اور دل میں سوچا.... میں اب کبھی اس لڑکی کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔

اسی لمحے ڈرائیور نے گاڑی ایک بنگلے کے کھلے ہوئے گیٹ میں موڑ دی....



مدیحہ کے لیے وہ دن بڑا عجیب تھا۔ پورے دن متضاد کیفیتیں اس پر طاری رہیں۔ یہ خیال خوش آئند تھا کہ آج وہ اتنے عرصے کے بعد حمید احمد کو دیکھ سکے گی۔ لیکن وہ خوف زدہ بھی تھی۔ کہیں وہ انہیں دیکھنے کے بعد پہلے جیسی نہ ہو جائے۔ اور وہ ان کے ردِ عمل سے بھی خوف زدہ تھی۔ وہ اس پر برس نہ پڑیں۔

پھر اس نے سوچا' اب جو ہو سو ہو۔ اصل کام تو ہو چکا ہے۔ اب کوئی پروا نہیں۔ چاہے وہ اس کی بے عزتی کر دیں۔ اس نے یہ کھیل بہت سوچ سمجھ کر کھیلا تھا۔ اگر حمید احمد اسی دن اسے پڑھانے آجاتے تو یقینی طور پر وہ رقم واپس کر دیتے اور اسے پڑھانے سے انکار کر دیتے۔ خیر پڑھنے کی تو اسے ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وحید کے آپریشن کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ اسی لیے اس نے ۲۹ تاریخ سے پڑھائی شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ طے تھا کہ اس دوران حمید صاحب وحید کا آپریشن کرا لیں گے۔

اس پورے دن میں اس نے اور تفصیلات بھی سوچ لی تھیں۔ وہ مکمل لائحہ عمل تیار کر چکی تھی۔ نماز کے بعد اس نے اللہ سے عافیت کی دعا بھی کی تھی۔ مگر اس روز وہ اچھی نماز نہیں پڑھ سکی تھی۔ حمید احمد کے تصور سے ویسے تو اس کی کوئی نماز خالی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس روز ان کے آنے کے تصور اور اس کی خوشی نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اس کی کیفیت ہیجانی تھی۔ اس نے جیسے نماز پڑھی تھی' اس کا دل ہی جانتا تھا۔

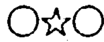
بہرحال دن بھر کی سوچ بچار اور مناسب لائحہ عمل کی تیاری کے بعد وہ قدرے پرسکون ہوگئی تھی۔ بس اب اسے انتظار تھا۔ وہ ایک ایک لمحہ گن رہی تھی۔

گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ کھڑکی کی طرف لپکی۔ خود کو پردے کی آڑ میں رکھتے ہوئے اس نے باہر جھانکا۔ حمید احمد کو کار سے نکلتے دیکھ کر اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں پھر وہ پریشان ہوگئی۔ حمید احمد بہت دبلے اور کمزور لگ رہے تھے۔

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ نسیمہ کو وہ پہلے ہی ہدایت دے چکی تھی کہ وہ سر کو اسٹڈی میں لے جائے۔ مگر اب اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گی؟ اور اگر انہیں غصہ آگیا تو؟

خوف کیسی عجیب چیز ہوتا ہے۔ جو چیز اس کے لیے بہت بڑی خوشی تھی' وہ اسی سے بہت زیادہ خوف زدہ بھی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اسے ان کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ بلکہ ان کے ساتھ ایک گھنٹا بیٹھنا بھی ہوگا۔

اس نے اپنی کتاب' نوٹ بک اور قلم اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اس رفتار سے وہ کب تک اسٹڈی میں پہنچے گی؟



دروازہ ایک ملازمہ نے کھولا "آپ بے بی کو پڑھانے آئے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

"آجائیے۔"

وہ ایک بڑے اور بے حد آراستہ ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ اس میں سے گزرتے ہوئے ان کی نظر ڈرائنگ روم پر پڑی۔ اس کی آرائش بھی دیدنی تھی۔ ملازمہ انہیں زینے کی طرف لے گئی۔ وہ اس کے ساتھ اوپری منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ اسٹڈی تھی۔ اس کی آرائش بے حد سادہ تھی۔ وہاں دو میزوں' چند کرسیوں اور ایک کاؤچ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن ہر چیز بہرحال قیمتی تھی۔

"آپ تشریف رکھیے۔ چائے پئیں گے یا شربت؟"
"کچھ بھی نہیں۔ چائے میں پی کر آیا ہوں۔" حمید احمد نے جواب دیا۔
"بے بی ابھی آتی ہیں۔" یہ کہہ کر ملازمہ چلی گئی۔
حمید احمد نے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کی طرف گئے۔ وہ لان کی طرف کھلتی تھی۔ لان کو دیکھ کر انہیں خوشی ہوئی۔ اس سے ترتیب و تنظیم کا اظہار ہو رہا تھا۔ بڑے سلیقے سے کیاریاں بنائی گئی تھیں۔ پودوں کی تراش خراش بھی توجہ کی گواہی دے رہی تھی۔
وہ کھڑکی سے ہٹ آئے۔ وہ دانستہ طور پر اس رخ سے بیٹھے کہ دروازے کی طرف ان کی پشت تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ بنگلا اور اس کی ہر چیز امارت کی مظہر ہے۔ ایسے لوگ ضرورت کے وقت ایک ماہ کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے دے سکتے ہیں۔ لیکن وہی کیوں.... اتنے بڑے شہر میں نظرِ انتخاب ان پر ہی کیوں پڑی۔ صدیقی صاحب کا کہنا تھا کہ کسی نے انہیں RECOMMEND کیا تھا۔ مگر کس نے؟
پھر وہ جھنجلانے لگے۔ یہ مسئلہ ہے ناپیسے والوں کا۔ ٹیچر انتظار کر رہا ہے اور پڑھنے والا غائب۔ بھئی معلم کی عزت نہیں کرو گے تو علم کیسے آئے گا۔ اب معلم بھاری فیس لے گا تو اسے لحاظ بھی کرنا پڑے گا۔ پڑھنے والے کا احترام بھی کرنا پڑے گا۔
عقب سے قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ جان بوجھ کر انجان بن گئے۔ پھر نسوانی آواز نے سلام کیا۔ آواز انہیں جانی پہچانی لگی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا اور فرطِ حیرت سے بُت بن گئے۔ وہ تو وہی تھی، جسے اب وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔
پہلی بات جو ان کی سمجھ میں آئی، وہ بھی عجیب ہی تھی۔ تاثرات کے اعتبار سے تو انہیں لگ رہا تھا کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہیں۔ جتنے حیران وہ تھے، اتنی ہی حیرت انہیں مدیحہ کے چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔
پھر مدیحہ کے ہونٹ ہلے "آ.... آپ؟"
حمید احمد کو شدّت سے غصہ آنے لگا "میری حیرت تو بجا ہے۔ لیکن تم کیوں حیران ہو؟"
"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ آپ ہوں گے۔"
"یہ کیسے ممکن ہے؟"
"میں نے پاپا سے بس اتنا کہا تھا کہ مجھے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آپ تک کیسے پہنچے۔ آپ چاہے، پاپا سے پوچھ لیں۔"
حمید احمد کو لگ نہیں رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اسی لمحے انہیں دروازے میں ملازمہ نظر آئی۔ انہوں نے گھبرا کر مدیحہ سے کہا "بیٹھ جاؤ۔"
"بے بی.... چائے لے آؤں یا کافی؟" ملازمہ نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔
"کافی لے آؤ۔" مدیحہ نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ پھر وہ حمید احمد کی طرف متوجہ ہوئی "آپ کا بیٹا اب کیسا ہے؟"
"تم سے زیادہ کسے معلوم ہوگا؟" حمید احمد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"میں سمجھی نہیں۔"
"تمہیں سب پتا رہتا ہے۔ تبھی تو تم اسپتال پہنچ گئی تھیں۔"
"وہ تو نسرین سے معلوم ہوا تھا مجھے۔ اس سے تو روز فون پر بات ہوتی ہے میری۔ آخری اطلاع اس نے یہ دی تھی کہ تیسرے دن وحید گھر چلا گیا تھا۔ اب ٹھیک تو ہے نا؟"
اس گفتگو نے حمید احمد کے ذہن میں ایک نازک سوال اٹھایا۔ کہیں یہ امداد تو نہیں؟ مدیحہ کو پتا چلا ہو کہ انہیں وحید کے آپریشن کے لیے رقم کی ضرورت ہے.... اور اس نے یہ چکر چلا ڈالا ہو۔ اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو پہلے بھی سوچتے تھے کہ ایک مہینے کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے کوئی نہیں دے سکتا۔
"میں نہیں مانتا کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔" وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔
"مجھے جو معلوم تھا، جس سے معلوم ہوا تھا، میں نے بتا دیا۔" مدیحہ نے کہا۔ پھر چونک کر پُر تشویش لہجے میں بولی "کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟"
حمید احمد کو اس کی وہ تشویش اداکاری نہیں لگی۔ اس کے انداز میں بے ساختگی تھی "نہیں۔ اللہ کا شکر ہے، وحید اب ٹھیک ہے۔" انہوں نے اسے آپریشن کے بارے میں نہیں بتایا۔ ملازمہ کافی لے آئی تھی۔ مدیحہ نے پیالی بڑے احترام سے حمید احمد کے سامنے رکھی "کافی پیجیے۔ اور جو جی چاہے، کہہ دیجیے۔" اس نے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"میرا خیال ہے کہ آپ مجھے پڑھانا نہیں چاہیں گے۔"
"تمہارا خیال غلط ہے مدیحہ۔" حمید احمد نے سرد لہجے میں کہا "میں صدیقی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اور وعدہ میں ہر حال میں پورا کرتا ہوں۔"
"آپ مجھے مایوس کر رہے ہیں حمید صاحب۔ سچ یہ ہے کہ میں...."
"تم مجھے اس طرح نام لے کر نہیں پکار سکتیں۔" حمید احمد نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔
"آپ مجھے بات پوری کرنے دیں حمید صاحب۔" مدیحہ کا لہجہ بھی سرد ہو گیا "اسی میں آپ کے اعتراض کا جواب بھی ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں آپ سے پڑھنا نہیں چاہتی۔ میں نے آپ سے شاگردی

کارشتہ توڑنے کی خاطر کالج چھوڑ دیا۔ میں آپ کی شاگرد نہیں بن سکتی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ پاپا نے آپ سے بات کی ہے تو میں انہیں پہلے ہی منع کر دیتی۔ اب بات آپ کے وعدے کی ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو سر بھی نہیں کہوں گی۔ آپ میرے لیے جو ہیں' ہمیشہ وہی رہیں گے۔"

حمید احمد سناٹے میں آگئے۔ توہین کے احساس سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"خدا کی قسم حمید صاحب' میں نے سچی بات کہی ہے۔ میرا مقصد آپ کی توہین کرنا نہیں تھا۔ اگر آپ کو ایسا محسوس ہوا ہو تو میں آپ کے پاؤں پکڑ کر بھی مانگ سکتی ہوں۔" مدیحہ نے جلدی سے کہا "لیکن سچی بات یہی ہے۔ آپ کی شاگردی ایک اعزاز ہے۔ لیکن میں یہ اعزاز حاصل کرنا نہیں چاہتی۔"

اس وقت کافی کی وہ پیالی حمید احمد کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ اس قدر اچانک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوئے تھے اور انہیں اس پر سوچنا تھا۔ مدیحہ کی بات نے ایک بات تو واضح کر دی تھی۔ وہ یہ کہ مدیحہ کو وحید کے آپریشن کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اس لیے ان کا امداد والا مفروضہ غلط ہے اور مدیحہ کی یہ بات بھی درست ہے کہ اس نے صرف ان سے شاگردی کا تعلق توڑنے کے لیے کالج چھوڑا تھا۔ وہ ان سے ٹیوشن پڑھنے کو کیوں کہتی۔ ان کے اخذ کردہ یہ تمام نتائج ان کے لیے طمانیت بخش تھے۔ لیکن ان کے لیے الجھنیں بھی تھیں۔ عام صورتِ حال ہوتی تو وہ مدیحہ کی صورت دیکھتے ہی الٹے پاؤں واپس چلے جاتے اور فیس واپس کر دیتے۔ لیکن وہ تیس ہزار روپے خرچ کر چکے تھے۔ فوری طور پر اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے پڑھائیں۔ محض پچیس دنوں کی تو بات ہے۔

کافی کا آخری گھونٹ لے کر انہوں نے پیالی رکھی اور فیصلہ کر لیا کہ انہیں سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ ٹھیک ہے مدیحہ۔ میرے لیے اپنے وعدے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔" انہوں نے کہا "میں تمہیں وہی سمجھوں گا جو میرے لیے تم ہو۔ تم مجھے جو جی چاہے سمجھو۔" انہوں نے گہری سانس لی "مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہیں ٹیوشن کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ میں نے تمہیں جو دیکھا اور سمجھا ہے' اس کے تحت میں کہہ سکتا ہوں کہ تم تیاری کے بغیر بھی امتحان دو تو اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ صدیقی صاحب تمہارے لیے آئے ہیں تو میں صاف انکار کر دیتا۔"

مدیحہ جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ اسی لیے تو اس نے کوشش کی تھی کہ انہیں معلوم نہ ہو "بات یہ ہے کہ پچھلے چند ماہ سے میرا بہت برا حال ہے۔ یہ بات نہیں کہ پڑھائی کی طرف میرا رجحان نہ ہو۔ لیکن سو کس کی طرف سے دل برا ہو گیا ہے۔ یہ سیکنڈ

اثر ہے۔ میں مضمون تبدیل بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے ڈر ہے کہ اس مضمون کی وجہ سے میری ڈویژن خراب ہو جائے گی۔ یہ بھی شاید بہتری ہوئی کہ آپ آ گئے۔ شاید آپ ہی مجھے پڑھا سکتے ہیں۔"

"جو مضمون اچھا نہ لگے' وہ لینا ہی نہیں چاہیے۔"

"اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ مضمون مجھ سے بہت کچھ چھین لے گا۔" مدیحہ نے کہا۔ لیکن اس کے دل نے فوراً ہی اس بات کی تردید کر دی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس مضمون کی وجہ سے اسے بہت کچھ ملا تھا۔

"اچھا۔ اب کتاب دو مجھے۔" حمید احمد نے گفتگو کا رخ بدلا۔ مدیحہ نے انہیں کتاب دی اور وہ فہرستِ ابواب دیکھنے لگے۔

"ایک بات کہوں حمید صاحب۔ آدمی کو بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔"

حمید احمد کو کرنٹ سا لگا "کیا مطلب؟" انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں نے آپ سے آخری بات بہت بڑی کہہ دی تھی۔ میں نے کہا تھا.... اب کبھی ہم ملے تو اس کا سبب آپ کی ہی کوئی ضرورت ہوگی' میری نہیں۔ لیکن اب دیکھیں' آپ میری ہی ضرورت میں میرے کام آ رہے ہیں۔"

حمید احمد کھو سے گئے۔ وہ اس سے سچ نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ اس سے کیسے کہتے کہ بڑی بات تو انہوں نے کی تھی۔ جب انہوں نے کہا تھا کہ یہ تقریباً ناممکن ہی ہے کہ وہ کبھی ان کے کام آ سکے۔ اور وہ ان کے کام آئی تھی۔ اس نے ان کے بیٹے کو وہ خون دیا تھا' جو وہ ساری دنیا کی دولت دے کر بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اور وہ اس سے کیسے کہتے کہ اس کی بات سچی تھی۔ وہ ملے تھے تو مدیحہ کی ضرورت کے تحت نہیں' اپنی ضرورت کے تحت ملے تھے۔ ان میں اتنا ظرف نہیں تھا کہ اس سے یہ سچ کہہ سکتے۔

"چلو.... اب پڑھائی شروع کرتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔



حمید احمد نے مدیحہ کو دیکھنے کے بعد جس ٹیوشن کو بہت بڑی مشکل اور آزمائش سمجھا تھا' وہ ویسی ثابت نہیں ہوئی۔ اور وہ دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکے کہ اس کا سبب بھی مدیحہ ہی تھی۔ اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ انہیں سر نہیں کہتی تھی۔ لیکن حتیٰ الامکان وہ ان کا نام لینے سے بچتی تھی۔

سب سے زیادہ تو انہیں اس کی نگاہوں کا خوف تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ اس صورتِ حال کا سامنا کیسے کریں گے۔ انہیں یاد تھا کہ یہ وہ لڑکی تھی' جو بھری کلاس میں پہلے لمحے سے پیریڈ ختم ہونے تک ٹکٹکی باندھ کر انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ جسے یہ ہوش بھی نہیں رہتا تھا کہ اسے اس بے خودی کے عالم میں کوئی دیکھ لے گا تو کتنی رسوائی ہوگی۔ اور اب یہاں تو تنہائی تھی۔ یہاں تو اسے کوئی ڈر بھی نہیں تھا۔

لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ مدیحہ بڑی توجہ سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جب بھی نظر اٹھا کر دیکھتے' انہیں وہ نظریں جھکائے بیٹھی نظر آتی۔ کبھی اس کی نظریں اٹھی بھی ہوتیں تو وہ ایک اسٹوڈنٹ کی نظریں ہوتیں۔ ایسا اسٹوڈنٹ' جو توجہ سے پڑھانے والے کی بات سن کر ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن حمید احمد کو اس پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ پہلے جیسی نہیں رہی۔ اب وہ بات مشکل سے سمجھتی تھی۔ ورنہ وہ تو بہت برائٹ لڑکی تھی۔

مگر حمید احمد اس کی وجہ بھی سمجھ سکتے تھے۔ وہ اسٹوڈنٹ جو کورس سے ہٹ کر سوچتے ہیں' وہ نصابی نہیں ہوتے۔ ان کی کامیابی ہی نصاب سے ہٹ کر سوچنے میں ہوتی ہے اور اگر وہ ایسا کرنا چھوڑ دیں تو پیچھے رہ جاتے ہیں۔

انہوں نے ایک دن مدیحہ کو ٹوک ہی دیا "تم پہلے ایسی تو نہیں تھیں؟"

مدیحہ نے نظریں اٹھا کر معصومیت سے انہیں دیکھا "کیسی نہیں تھی؟"

"تم نصاب سے جو کچھ اخذ کرتی تھیں' ان پر سوچتی تھیں' ان سے نتائج اخذ کرتی تھیں۔ انہیں تنقیدی نظر سے دیکھتی تھیں۔ ان کے محاسن و معائب پر بحث کرتی تھیں۔ اب تم نے یہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ کیوں؟"

"دلچسپی کی بات ہے۔ جب مجھے اس مضمون میں دلچسپی تھی۔ میں اسے سود مند سمجھتی تھی۔ اسے ضروری سمجھتی تھی۔ پھر میری رائے بدل گئی۔ میں نے اسے فضول سمجھ لیا۔ اب یہ میری مجبوری ہے۔ مجھے امتحان دینا ہے۔ دلچسپی نہیں ہونے کی وجہ سے میں نصاب سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔"

"جو لوگ نصابی نہ ہوں' وہ ایسے ہو بھی نہیں سکتے۔" حمید احمد نے خشک لہجے میں کہا "اب میرا مشورہ یہی ہے کہ رٹا لگانے کی کوشش کرو۔"

"وہ تو میں کر رہی ہوں۔"

دن دھیرے دھیرے گزرتے رہے۔ حمید احمد کو دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ ٹیوشن کا یہ تجربہ ان کے خدشات کے برعکس خوشگوار ثابت ہوا ہے۔



جس دن کے آنے سے وہ ڈرتی رہی تھی' وہ دن بالآخر آ گیا۔ اگلے روز سوکس کا پرچا تھا۔ اور اس روز حمید احمد کو آخری بار اس کے گھر آنا تھا۔

وہ چوبیس دن مدیحہ کے لیے بڑی آزمائش اور پریشانی کے تھے۔ ان میں پہلا دن سب سے مشکل تھا' جب اس نے پہلی بار حمید احمد کا سامنا کیا تھا۔ وہ مرحلہ دشوار ترین ہونے کے باوجود آسانی سے طے ہو گیا تھا۔ اس سے اسے بڑا حوصلہ ہوا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بات ختم نہیں ہوئی۔ آنے والا ہر لمحہ آزمائش کا ہی ہے۔

لیے بہت سی چیزوں کا پردہ رکھنا تھا۔ اس نے حمید احمد کو یقین دلا دیا تھا کہ اسے وحید کے آپریشن اور ان کی ضرورت کے متعلق علم نہیں تھا۔ اس نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اس نے پاپا سے ان کے متعلق بات نہیں کی۔ بلکہ وہ تو ان سے پڑھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ یہ اتفاق ہے۔

مگر آگے جو مرحلہ تھا' وہ اس اعتبار سے اور سخت تھا کہ اس میں تسلسل تھا۔ اسے حمید احمد کو یقین دلانا تھا کہ اسے واقعی ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ اور اسے خوشی تھی کہ وہ اس میں کامیاب رہی۔

لیکن یہ پریشانیاں اس کی خوشی کو کم نہ کر سکیں۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے تو صبر کر لیا تھا کہ اب شاید کبھی حمید احمد سے نہیں مل سکے گی.... انہیں نہیں دیکھ سکے گی۔ وہ بڑی سچائی سے کہہ سکتی تھی کہ اس نے ٹیوشن پڑھنے کا فیصلہ بڑی بے غرضی اور خلوص سے حمید احمد کی ضرورت کے تحت کیا تھا۔ اور جو قربت اسے ملی' شاید وہ اس کے خلوص کا انعام تھا۔ ان چوبیس دنوں میں اسے ان کی قربت کے تیس خوب صورت گھنٹے ملے تھے۔ وہ اس کے لیے بہت بڑا سرمایہ تھا۔

وہ پہلے ہی دن سے خود سے خوف زدہ تھی۔ اسے یاد تھا کہ کالج میں وہ کیسے از خود رفتگی کے عالم میں انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ تو اب اسٹڈی کی تنہائی میں' جہاں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا' اس کی وارفتگی کا کیا عالم ہوگا۔ مگر اسے احساس تھا کہ یہاں حمید احمد مجبور ہیں۔ وہ اسے پڑھانا نہیں چھوڑ سکتے۔ ورنہ وہ اسے ایک دن بھی نہ پڑھاتے۔ اگر وہ انہیں پہلے کی طرح دیکھے گی تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ ہاں انہیں کوفت اور دلی اذیت ضرور ہوگی۔ اور اس کا یہ عمل بلیک میلنگ کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ اس نے اسی بات کو اپنی سب سے بڑی آزمائش بنالیا۔ وہ اللہ سے دعا کرتی رہی کہ وہ اس آزمائش میں پوری اترے۔ اور اللہ نے اس کی سن لی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس میں تو اتنا ظرف نہیں تھا۔ لیکن اس نے وہ وقت اچھی طرح گزار لیا۔ وہ حتی الامکان نگاہیں نیچی رکھتی تھیں اور نظریں کبھی اٹھ بھی جاتیں تو وہ کوشش کرتی رہتی کہ ان میں کوئی کیفیت نہ جھلکنے پائے۔ اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہی۔

مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان خوب صورت' سرمایۂ حیات ساعتوں کی اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی ہے۔ آنے والے کو جانا بھی ہے۔ وقتی طور پر ملنے والے کو ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانا بھی ہے۔ اسے جدائی کا تجربہ نہیں تھا۔ قدم کیسے بھاری ہوجاتے ہیں۔ مختصر سے فاصلے بھی کتنے اذیت ناک ہوجاتے ہیں۔ پلٹ کر دیکھنے کی خواہش کتنی شدید ہوتی ہے اور پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جدائی آدمی کو سلگانے والی دھیمی دھیمی آگ ہوتی ہے۔ لیکن جدا ہوتے وقت کے چند لمحے اس بھڑکتی آگ کی طرح ہوتے ہیں' جو بڑے اذیت ناک انداز میں پورے وجود کو پھونک ڈالتی ہے۔

اور اب.... آج اسے دوبارہ اس مرحلے سے گزرنا تھا!

○☆○

اس شام حمید احمد بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ وہ بہت خوش مزاج ہو رہے تھے۔ کسی کو قید سے رہائی ملنے والی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جبکہ مدیحہ اپنی اداسی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی "اوہ.... ساڑھے چھ ہوگئے۔" حمید احمد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی.... آپ کے جانے کا وقت ہوگیا۔" مدیحہ اپنے لہجے کی اداسی کو چھپا نہیں سکی۔

حمید احمد نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں "ہم جو کچھ کر سکتے تھے' ہم نے کر لیا۔ اب ہم صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔" انہوں نے کہا "لیکن میں تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔"

مدیحہ نے خود کو دل آزاری کے لیے تیار کر لیا۔ وہ جو مشورہ بھی دیں گے' ناقابلِ عمل اور دل دکھانے والا ہی ہوگا "جی.... میں سن رہی ہوں۔"

"اب صرف ریلیکس کرو۔ پڑھنا مت۔ ہاں صبح سویرے اٹھ جاؤ تو ہر اہم باب پر سرسری انداز میں ایک نظر ڈال لینا۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر فوراً ہی وضاحت بھی کی "آخرِ وقت میں' خاص طور پر پوری رات جاگ کر جتنا پڑھا جائے' اس سے کنفیوژن ہی بڑھتا ہے۔ پچھلا پڑھا ہوا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ میرا تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی۔"

"جی۔ میں اس پر عمل کروں گی۔"

"اور میں خوش ہوں کہ میں تمہارے کسی کام آسکا۔"
مدیحہ نے حمید احمد کو بہت غور سے دیکھا۔ آج وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اسے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہے ہیں۔ وہ خاموش بیٹھی متوقع نظروں سے انہیں دیکھتی رہی "اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس عرصے کو بہت اچھی طرح گزارا۔ اسے میرے لیے مشکل نہیں بنایا۔"
مدیحہ اب بھی انہیں دیکھتی رہی۔ اس کا اندازہ تھا کہ انہوں نے اصل بات اب بھی نہیں کہی ہے۔
حمید احمد اٹھنے لگے "اب میں چلتا ہوں۔"
"ذرا رکیں۔ دس منٹ اور بیٹھیں۔ اب پھر کبھی تو آپ آئیں گے نہیں۔" مدیحہ نے اٹھتے ہوئے کہا "میں ابھی آئی۔"
حمید احمد کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ اب تک تو خیریت رہی۔ اب یہ لڑکی نجانے کیا کرے گی۔ انہوں نے سوچا۔ مگر پھر یہ سوچ کر اس فکر کو ذہن سے جھٹک دیا کہ اب کچھ بھی ہو، وہ اپنا فرض پورا کر چکے ہیں۔ اور آج یہاں ان کا آخری دن ہے۔
وہ اس بات کے بارے میں سوچ رہے تھے، جو وہ مدیحہ سے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کر نہیں پا رہے تھے۔ کیسے کریں؟ کس طرح کہیں؟ وہ ہمیشہ کے سچے، کھرے، دیانت دار آدمی تھے۔ جو بات جیسے محسوس کرتے، کہہ دیتے۔ لیکن آج یہی کام ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔
مدیحہ کی آمد نے انہیں چونکا دیا۔ اس نے ان کے سامنے کافی کی پیالی رکھی۔ اس سے اٹھنے والی بھاپ کافی کی خوشبو سے بوجھل تھی "یہ ہے آپ کی الوداعی کافی میں نے خود بنائی ہے۔" مدیحہ کے لہجے میں خوشی تھی۔
حمید احمد نے کافی کا گھونٹ لیا اور بولے "بہت عمدہ ہے۔ کافی تم بہت اچھی بناتی ہو۔"
"جی۔ محبت سے بنائی ہے۔ اس لیے یہ آرٹ پیس ہے۔"
حمید احمد کو حوالہ یاد تھا۔ انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ تو اس الجھن میں تھے کہ اپنی بات کیسے کریں۔
انہوں نے کافی کا ایک طویل گھونٹ لیا اور بالآخر لب کشائی کی "مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا ہے مدیحہ۔ تم نے وحید کو خون دے کر مجھ پر جو احسان کیا ہے، میں تمہیں کسی طرح اس کا صلہ نہیں دے سکتا۔" یہ کہہ کر وہ کچھ ہلکے ہو گئے۔
"صلہ دے سکتے ہیں آپ؟" مدیحہ نے آہستہ سے کہا۔
حمید احمد نے ایک پل اسے غور سے دیکھا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں "نہیں دے سکتا۔ مر کر بھی حق ادا نہیں ہو گا اس کا۔" انہوں نے کہا۔
"مر کر کبھی کوئی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ لیکن جی کر تو حق ادا کیا جا سکتا ہے۔" مدیحہ نے کہا۔ پھر جلدی سے بات بدلی "تو یہ بات کہنے کے لیے اتنے جھجک رہے تھے آپ؟" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔
حمید احمد بری طرح بھڑکے "تمہیں کیسے معلوم؟"
"میں بڑی دیر سے دیکھ رہی ہوں آپ کو۔" مدیحہ نے کہا "دیکھیں حمید صاحب۔ میرے نزدیک تو وہ کوئی احسان تھا ہی نہیں۔ وحید کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو میں ایسا ہی کرتی۔ لیکن آپ جس طرح بادل ناخواستہ میرا شکریہ ادا کر رہے ہیں، وہ تو اچھا نہیں ہے۔ آپ کی ہچکچاہٹ آپ کے لفظوں کی نفی کر چکی ہے۔"
"یہ بات نہیں۔ میری ہچکچاہٹ کی وجہ اور تھی۔" حمید احمد نے جلدی سے کہا "دراصل مجھے تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا ہے۔ میں نے تم سے بہت بڑی بات کہی تھی ایک موقع پر۔ میں نے کہا تھا کہ تم میرے کام کبھی نہیں آسکتیں۔ مجھے اس کی سزا مل گئی۔ تمہارے ذریعے سے میرا بہت بڑا کام نکلا۔ میرے بیٹے کی جان بچ گئی۔"
"بس حمید صاحب، یہ اللہ کی مرضی تھی۔"
حمید احمد نے پیالی سے آخری گھونٹ لے کر اسے رکھ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے "اب میں چلتا ہوں۔"
مدیحہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی "مجھے بھی ایک بات کہنی ہے آپ سے۔" اس نے کہا۔ حمید احمد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے "آپ سچے اور HONEST آدمی ہیں۔ وعدہ کریں تو ضرور پورا کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟"
حمید احمد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"آپ کو یاد ہے، آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا؟" مدیحہ نے کہا "سچا اور پکا وعدہ؟"
پہلو تہی سے فائدہ نہیں تھا۔ بات اور بڑھ جاتی۔ حمید احمد نے کہا "مجھے یاد ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں تدریس کا پیشہ چھوڑنے پر مجبور کبھی نہیں ہوں گا۔ ریٹائر کر دیا جاؤں تو وہ اور بات ہے۔"
"میں آپ کے یقین کے حق میں دعا نہیں کر سکتی۔" مدیحہ نے کہا "چلیے.... میں آپ کو نیچے تک چھوڑوں گی۔"
وہ اسٹڈی سے نکل آئے۔ اچانک حمید احمد نے کہا "ایک وعدہ تم بھی کرو مجھ سے۔ تم میرے گھر کبھی نہیں آؤ گی۔"
"آپ بلائیں، تب بھی؟"
"یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔"
"آپ پھر بڑی بات کر رہے ہیں۔" مدیحہ نے کہا "بہرحال یہ وعدہ تو میں خود سے بھی کر چکی ہوں۔"
نیچے ڈرائیور گاڑی کے پاس تیار کھڑا تھا۔ اس نے حمید احمد کے لیے دروازہ کھولا۔ حمید احمد نے پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا "وش یو بیسٹ آف لک مدیحہ!"

" How could you say so when you don't intend to be even good to me. And

you know you are my luck."

مدیحہ نے بھی ڈرائیور کی موجودگی میں انگریزی زبان سے فائدہ اٹھایا۔ پھر بولی "اچھا سر' اللہ حافظ۔ اور شکریہ۔"

وہ گاڑی کے ساتھ چلتی رہی۔ گاڑی گیٹ سے نکل گئی تو وہ گیٹ پر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ آج اس کی باری تھی کہ وہ انہیں نظروں سے دور جاتا دیکھے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا!

○☆○

آدمی جب پریشان ہو' جب کوئی بہت بڑی پریشانی' کوئی بہت بڑی ضرورت اس کے سامنے منہ کھولے کھڑی ہو تو اسے بس اس ضرورت کے پوری ہونے کی' اس پریشانی کے دور ہونے کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن وہ اچھا بھی ہو تو پریشانی دور ہونے کے بعد غور و فکر کرتا ہے۔ حمید احمد کو ضرورت کے وقت تیس ہزار کا چیک ملا تو انہوں نے سوچا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ صرف پچیس دن پڑھانے کے عوض کوئی اتنی بڑی رقم بھی دے سکتا ہے۔ سو انہوں نے اس چیک کو کیش کرایا اور اپنی ضرورت پوری کرلی۔

پھر وہ پڑھانے کے لیے گئے اور مدیحہ سامنے آئی تو انہیں اس معاملے میں گڑ بڑ کا احساس ہوا۔ انہوں نے سوچا' کہیں وہ چیک معاوضے کے بجائے امداد کا تو نہیں تھا۔ اگر اس وقت کہیں سے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ان کے بس میں ہوتا تو وہ اسی وقت لوٹ آتے اور رقم صدیقی صاحب کو واپس کردیتے۔ لیکن یہ اس وقت ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ سو مدیحہ کو پڑھانا ان کی اشد ضرورت بن گیا۔ وہ اسے نہ پڑھاتے تو وہ رقم ان پر احسان بن جاتی۔ وہ خود کو مقروض بلکہ نادہندہ سمجھتے رہتے۔ پھر مدیحہ نے بہت معقول اور مؤثر وضاحت کی۔ انہوں نے اسے تسلیم کرلیا.... قبول کرلیا۔ ان کی ضرورت جو پوری ہو رہی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا کہ اسے پچیس دن پڑھا کر وہ آزاد ہو جائیں گے۔ سودا مکمل ہو جائے گا۔ ان پر کوئی بوجھ نہیں رہے گا۔

لیکن مدیحہ کو آخری دن پڑھانے کے بعد وہ دو تین دن تو ہلکے پھلکے ہوئے۔ اس کے بعد انہیں پھر بوجھل پن کا احساس ستانے لگا۔ انہیں اس معاملے میں پھر گڑ بڑ نظر آنے لگی۔ اتنے سے دن پڑھانے کی اتنی بڑی فیس کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ گڑ بڑ کیا ہے' کس کی طرف سے ہے' ان معاملات کو انہوں نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ ان کا جی چاہا کہ اپنے کولیگز سے پوچھیں کہ کیا یہ ممکن ہے.... پچیس دن کی ٹیوشن کے تیس ہزار! مگر انہیں معلوم تھا کہ کیا جواب ملے گا۔ وہ کہیں گے.... ایسا کوئی بے وقوف ہمیں بھی دلا دو۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انہوں نے سوچ لیا کہ وہ تیس ہزار ایک قرض تھا' جو انہیں ادا کرنا ہے۔

INVIGILATION کی ڈیوٹی شروع ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگلے دو ڈھائی مہینوں میں انہیں اچھی خاصی اضافی آمدنی ہوگی۔ پھر بھی انہوں نے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض کی درخواست دے دی۔ وہ رقم ملی تو انہوں نے بینک میں جمع کرادی۔

انہیں اضافی ادائیگی ہوئی تو وہ قرض اتارنے کے قابل ہوگئے۔ اہلیت پاتے ہی انہوں نے صدیقی صاحب کو فون کیا "میں حمید احمد بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر صدیقی صاحب نے کہا "معاف کیجیے گا۔ میں نے پہچانا نہیں۔ پلیز آپ کوئی حوالہ...."

"میں نے آپ کی صاحب زادی کو ٹیوشن دی تھی۔ اتفاق ہے کہ آپ سے ملاقات آج تک نہیں ہوئی۔"

"اوہ۔ سوری سر۔ آئی ایم رئیلی سوری۔"

"کوئی بات نہیں جناب! آپ کا ایک قرض ہے مجھ پر۔ وہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔" حمید احمد نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔ آپ کس قرض کی بات کر رہے ہیں۔"

"جو فیس آپ نے مجھے ادا کی تھی' میں اس کا مستحق نہیں تھا۔ اس وقت مجھے ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے اسے قرض سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔"

"اوہ۔ تو یہ تو آپ کا اور مدیحہ کا معاملہ ہے۔" دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا گیا "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ

مختصر مختصر

- تنخواہ میں اضافہ شراب کے نشے کی طرح ہے۔ بہت لطف آتا ہے مگر تھوڑی دیر کے لیے۔
- کتاب اس لیے فلم سے بہتر ہے کہ اسے ریوائنڈ نہیں کرنا پڑتا۔ بس' بند کردیجیے' آپ وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے شروع کی تھی۔
- مخالفین سے بحث اس لحاظ سے سودمند ہے کہ اس سے آپ کو اپنے بارے میں پتا چل جاتا ہے کہ آپ کس کردار کے مالک ہیں۔
- امریکا میں آج کل نوعمر بچوں کے والدین کے لیے یہ بھی خوش خبری ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا یا بیٹی صرف کان چھدوانا چاہتی ہے۔
- وہ اتنا تیز بولتی ہے کہ اس کی بات میں دخل دینا ایسا ہی ہے جیسے چلتی ہوئی سلائی مشین کی سوئی میں دھاگا ڈالنا۔

کو کتنی فیس دی گئی۔ مدیحہ نے اپنے بینک اکاؤنٹ سے ادائیگی کی تھی۔ مجھے تو اس نے بند لفافہ دیا تھا' جو میں آپ کے گھر دے آیا تھا....."

حمید صاحب سن ہو کر رہ گئے۔

"اور مدیحہ نے مجھ سے کہا تھا کہ صرف آپ ہی اسے پڑھا سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کو رضامند کرنا آسان کام نہیں۔ آپ کبھی ٹیوشن نہیں پڑھاتے۔ اس نے کہا تھا کہ میں اس کا نام لیے بغیر آپ کو راضی کرنے کی کوشش کروں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی اور میں ایک نوٹ اور اپنے کارڈ کے ساتھ وہ لفافہ آپ کے گھر دے آیا ہوں تو وہ بہت خفا ہوئی تھی مجھ سے۔"

حمید صاحب اب بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ صرف سن رہے تھے۔ ان کی گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

"اور آپ کہتے ہیں کہ اس فیس کے مستحق نہیں تھے۔" صدیقی صاحب کی بات جاری تھی "میں کہتا ہوں' وہ جو بھی تھی کم تھی۔ آپ کی محنت کا حق ادا کیا ہی نہیں جاسکتا میں تو آپ کے گھر مٹھائی لے کر آنے والا تھا۔ مگر کیا کروں' مصروفیت اتنی ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا۔ میں نے مدیحہ سے کہا تھا کہ خود جا کر آپ کے گھر مٹھائی پہنچائے اور آپ کا شکریہ ادا کرے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئی۔"

"میں.... میں سمجھا نہیں۔" بڑی مشکل سے حمید صاحب کی زبان کھلی۔

"آپ کو پتا نہیں۔" صدیقی صاحب کے لہجے میں حیرت تھی "انٹر کا رزلٹ آگیا ہے نا۔ آپ کے سبجیکٹ میں مدیحہ نے ۸۴ مارکس لیے ہیں۔"

حمید احمد کو معلوم تھا رزلٹ کا۔ لیکن اس حوالے سے مدیحہ کا انہیں خیال ہی نہیں آیا تھا۔ وہ حیرت میں ڈوب گئے۔ اتنے اچھے مارکس آئے ہیں مدیحہ کے۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

"صدیقی صاحب' پھر بات ہوگی آپ سے۔" انہوں نے کہا۔

"یو آر ویل کم سر۔"

اس گفتگو کے بعد تو حمید صاحب کو بہت کچھ سوچنا تھا' سمجھنا تھا۔ اور انہوں نے سوچا۔ اور سمجھا بھی۔ اچھا ہوا کہ انہوں نے صدیقی صاحب کو فون کرلیا۔ وہ رقم لے کر ان کے آفس میں چلے جاتے تو کیا ہوتا۔ صدیقی صاحب کو پتا چلتا کہ ان کی بیٹی نے اتنے سے دنوں کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے دی ہے تو وہ کیا سوچتے.... ان کے بارے میں بھی اور اپنی بیٹی کے بارے میں بھی۔ وہ سب سمجھ جاتے اور کتنی شرمندگی ہوتی۔ اور مدیحہ پر بھی کیا گزرتی۔

اب پوری بات کھل گئی تھی۔ شواہد کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ مدیحہ کو کسی طرح وحید کے آپریشن کا علم ہوگیا تھا۔ اسے ان کی ضرورت کا' ان کی پریشانی کا اندازہ تھا۔ اور اسے ٹیوشن کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کتنا کچھ سوچا ہوگا تو ان کی مدد کے لیے یہ تدبیر نکالی ہوگی اور اس نے کتنے خطرات مول لیے تھے ان کی تالیفِ قلب کے لیے۔ اس نے جو اپنی بے عزتی اور رسوائی سے بہت ڈرتی تھی۔

اور بعد میں بھی اس نے انہیں شرمندگی سے بچانے کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ اس نے کس طرح خود کو ٹیوشن کا ضرورت مند ثابت کیا تھا۔ یوں کہ وہ اندازہ لگا بیٹھے کہ وہ سو کس میں پاس بھی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ اور اس نے ان پچیس دنوں میں خود پر' اپنی نگاہوں پر کتنا قابو رکھا تھا۔ ایسا تو وہ بھری کلاس میں بھی کبھی نہیں کرسکی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ پچیس دن اسے سکون سے پڑھا سکیں۔ وہ پڑھا نہ پاتے تو ان کے ضمیر پر بوجھ ہوتا۔ وہ تیس ہزار روپے ہر پل انہیں ڈستے رہتے۔ کتنا خیال کیا تھا اس نے ان کا! کون اتنا خیال رکھتا ہے کسی کا!

وہ لمحہ حمید احمد کے لیے بہت بڑی خوشی کا تھا۔ انہیں زندگی میں کبھی توجہ نہیں ملی تھی۔ سو انہوں نے توجہ کی طلب بھی کبھی نہیں کی۔ کبھی کسی نے ان کی اتنی پروا نہیں کی' ان کی تالیفِ قلب کا ایسا خیال نہیں رکھا' کبھی کسی نے ان سے اتنی محبت نہیں کی۔ انہوں نے چاہا بھی نہیں۔ اور اب بغیر مانگے انہیں اتنا کچھ مل گیا تھا۔ اور وہ ناشکرا پن کر رہے تھے۔

اس لمحے حمید احمد نے ایک بہت بڑا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے پوری طرح تسلیم کرلیا کہ مدیحہ کی محبت بے حد عظیم ہے۔ اور وہ خود بھی قابلِ فخر کردار کی مالک ہے۔ جب مدیحہ نے انہیں سب کچھ بتایا تھا تو انہوں نے بڑی حسرت سے سوچا تھا کہ کاش کسی نے ایسی محبت ان سے بھی کی ہوتی۔ مگر پھر انہوں نے ملنے پر اس محبت کی ناقدری کی' تحقیر کی۔ ناشکرا پن کیا انہوں نے۔ یہ درست ہے کہ وہ اس نعمت کو قبول نہیں کرسکتے۔ لیکن کفرانِ نعمت تو نہ کریں۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر خدا ایسی عظیم محبت انہیں بھی سونپ دے تو وہ بھی ایسے ہی مجبور اور بے اختیار ہوں گے' جیسی مدیحہ ہے۔ اور انہیں یاد تھا کہ انہوں نے یہ خواہش بھی کی تھی۔ انہوں نے مدیحہ کی کیفیات سننے کے بعد اپنے لیے بھی وہی کچھ چاہا تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ انہوں نے اب تک زندگی گزارنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔

انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ مدیحہ کی محبت قبول نہیں کرسکتے۔ لیکن اب وہ اس کی تحقیر کبھی نہیں کریں گے۔ اسے ہلکا بھی نہیں کریں گے۔ ویسے بھی اب کبھی اس سے ان کا سامنا نہیں ہوگا۔ اب وہ کبھی نہیں ملیں گے۔

ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ یہ تیس ہزار روپے وہ مدیحہ کو واپس کرسکتے تھے۔ لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ ایک تو اس سے مدیحہ کی دل آزاری ہوتی۔ اب وہ سمجھ سکتے تھے کہ مدیحہ نے یہ سب

بہکچھ جڑنے خلوص سے 'فرض سمجھ کر کیا تھا۔ دوسرے اس کے لیے انہیں پھر مدیحہ سے ملنا پڑتا۔ اور ملتے تو کچھ بھی ہو جاتا۔ وہ رقم سامنے جائے بغیر بھی اس تک پہنچا سکتے تھے لیکن اس کے جواب میں یہ بھی ممکن تھا کہ مدیحہ اپنا وعدہ بھول کر ان سے ملنے چلی آئے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اسے وعدہ شکنی کا کوئی جواز فراہم نہ کریں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ اور اس تیس ہزار کو بھول ہی جائیں۔

اگلے روز انہوں نے تیس ہزار کی رقم کو فکسڈ ڈپازٹ کردیا۔

○☆○

پچھلا ایک مہینہ بلقیس بیگم کے لیے ڈراؤنے خواب کی طرح گزرا تھا۔ اس نے انہیں جسمانی طور پر ہی نہیں' روحانی طور پر بھی تھکا دیا تھا!

پہلے وحید کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ وہ اس کے ساتھ اسپتال میں رہیں۔ پھر وحید گھر آیا تو حمید احمد پریشان رہنے لگے۔ اور ان کے پوچھنے پر بھی انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ اور انہیں یاد تھا کہ جس دن وہ صاحب آئے جو حمید کا انتظار کرتے رہے تھے اور پھر ایک خط اور ایک لفافہ دے کر چلے گئے تھے' اس دن وہ خط پڑھنے کے بعد حمید احمد پرسکون نظر آئے تھے۔ ان کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔

مگر اسی رات انہوں نے بلقیس بیگم کو ایک پریشان کن خبر سنائی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وحید کے دماغ کا ایک آپریشن ہونا ہے اور یہ بہت ضروری ہے۔ وہ یہ خبر سن کر متوحش ہو گئی تھیں "اس کے لیے تو بہت پیسوں کی ضرورت پڑے گی بیٹے۔" انہوں نے کہا۔

"ہاں اماں۔ بیس پچیس ہزار کا خرچا ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں۔ اللہ کے فضل و کرم سے بندوبست ہو چکا ہے۔"

"مگر یہ اس قدر اچانک....! یہ تمہیں کب پتا چلا۔"

"جس دن وحید کو اسپتال سے چھٹی ملی تھی' اسی دن ڈاکٹر نے مجھے بتا دیا تھا۔"

"مجھے ڈاکٹر نے کچھ نہیں بتایا۔ تم نے بھی نہیں بتایا۔"

"جان کر نہیں بتایا اماں۔ مجھے معلوم تھا' آپ بہت پریشان ہو جائیں گی۔" حمید احمد کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

بلقیس بیگم کے دل پر گھونسا سا لگا۔ تو یہ بات تھی' جس کے لیے تین دن حمید احمد پریشان رہے۔ اور ہر بار ان کے پوچھنے پر یہی بتایا کہ کالج کی کوئی پریشانی ہے۔ انہوں نے ایک بار بھی اصل بات نہیں بتائی۔ کیا گھر کے افراد کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے۔ وہ سمجھ سکتی تھیں کہ حمید احمد آپریشن کی وجہ سے نہیں' اخراجات کی طرف سے پریشان تھے۔ آپریشن تو آپریشن ہے۔ ہونا ہے تو ہونا ہے۔ اس میں تو بس دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن پیسے کی پریشانی آدمی کو بہت ہراساں کر دیتی ہے۔

"پیسوں کا بندوبست کیسے ہوا؟" انہوں نے حمید احمد سے پوچھا۔

"ایک ٹیوشن مل گئی اماں۔ جو صاحب آج آئے تھے' وہ تیس ہزار کا چیک دے کر گئے ہیں۔"

"کیا سال بھر پڑھانا ہو گا؟"

حمید احمد ہنسنے لگے "ارے نہیں اماں' مشکل سے ایک مہینہ سمجھ لیں۔"

بلقیس بیگم کو یہ بات عجیب سی لگی۔ وہ دنیا کو اتنا جانتی سمجھتی نہیں تھیں۔ لیکن اتنا سمجھ سکتی تھیں کہ ایک ماہ پڑھانے کی فیس تیس ہزار روپے نہ کوئی مانگ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دے سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ وہ وحید کے آپریشن کا سن کر دہل گئی تھیں۔ آپریشن اور وہ بھی دماغ کا!

پھر اگلے دن حمید احمد نے کہا "اماں.... آج اسپتال چلنا ہے۔ یہ معاملہ جتنی جلدی خیریت سے نمٹ جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ صرف تین دن لگیں گے۔"

چنانچہ ایک ہفتے میں دوسری مرتبہ وہ وحید کے ساتھ پھر اسپتال پہنچ گئیں۔ اسپتال کے وہ چار دن جیسے ان کی زندگی کے تھے ہی نہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ اس عرصے میں انہوں نے کتنے وظائف پڑھے۔ اللہ کے کتنے ناموں کا ورد کیا۔ بس وہ یہی کچھ کرتی رہیں۔ نماز پڑھتی رہیں اور وحید کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کرتی رہیں۔

اور آپریشن کے بعد وہ ڈاکٹر کے سامنے رو پڑیں "سب ٹھیک ہو گیا ہے اماں۔" ڈاکٹر نے انہیں دلا سا دیا۔

"یہ تو آپ نے پچھلی بار بھی کہا تھا۔" وہ شکایت بھرے لہجے میں بولیں "اور اس کے بعد آپریشن کر ڈالا بچے کا۔"

"اس میں اسی کی بہتری ہے اماں۔ یہ ضروری تھا اور آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ معاملہ سنگین بھی نہیں نکلا۔"

"مجھے یہ بتائیے کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں۔ اب انشاء اللہ اس کے ساتھ کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

وہ گھر آگئیں۔ اگلے روز سے حمید احمد کی کالج کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ اس شام کو حمید احمد تیار ہوئے۔ ان کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ انہیں ٹیوشن پڑھانے جانا ہے۔ گاڑی انہیں لینے کے لیے آئے گی اور گاڑی ہی چھوڑ کر جائے گی۔

بلقیس بیگم نے گاڑی کو دیکھا تو ان کی الجھن دور ہو گئی۔ ٹیوشن پڑھانے کے تیس ہزار تو کیا تیس لاکھ بھی مل سکتے ہیں۔

دن گزرتے گئے۔ بلقیس بیگم کے لیے وہ عرصہ بڑی اداسی کا تھا۔ انہیں غم اس بات کا تھا کہ ان کا مان ٹوٹ گیا تھا۔ وحید کے ساتھ تو وہ پہلے جیسی ہی تھیں۔ لیکن حمید احمد سے وہ بس ضرورتاً ہی بولتی تھیں۔ بس ایک بار انہوں نے حمید احمد سے پوچھا تھا "جہاں تم ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے' وہ لوگ جان پہچان کے تھے؟"

"نہیں اماں۔ اجنبی لوگ تھے۔" حمید احمد نے جواب دیا تھا۔

اس روز بلقیس بیگم کا مان بالکل ہی ٹوٹ گیا تھا۔

مہینے گزر گئے۔ حمید احمد کو احساس بھی نہیں ہوا۔ مصروفیت ہی اتنی تھی۔ پھر مصروفیت کم ہوئی تو شاید انہیں احساس ہو گیا۔ ایک دن انہوں نے ان سے کہا "کیا بات ہے اماں۔ بہت چپ چپ رہتی ہیں آپ۔ میرے پاس بیٹھتی بھی نہیں آج کل۔"

"کچھ نہیں بیٹے۔ بولوں تو کیا بولوں۔"

"کچھ بولیں نا۔ مجھ سے ناراض ہیں کیا؟"

"تم سے کیسی ناراضگی۔" وہ پھٹ پڑیں "تم تو میرے لیے اپنے ہو۔ مگر میں تو تمہارے لیے اپنی نہیں۔"

حمید احمد گھبرا گئے۔ انہوں نے جلدی سے ان کا ہاتھ تھام لیا "کیا کہہ رہی ہیں اماں۔ خدا گواہ ہے۔ میں آپ کو اپنی اماں کی طرح ہی سمجھتا ہوں۔"

"یہی کہا تھا تم نے مجھ سے پہلے دن۔" بلقیس بیگم نے اداسی سے کہا "یہ میرا گھر ہے' تم میرے بیٹے ہو اور وحید میرا پوتا ہے۔"

"ہوا کیا ہے اماں' بتائیں تو۔"

"گھر کے افراد سے کوئی کچھ چھپاتا ہے۔ تم نے مجھے وحید کے آپریشن کے متعلق نہیں بتایا۔"

"میں جانتا تھا اماں کہ آپ پریشان ہو جائیں گی۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں ایک آدمی پریشان رہے' یہ کافی ہے۔ ایک تو بچارہ ہے۔"

"اور میں تمہیں پریشان دیکھ کر پریشان نہیں ہوئی۔"

"خدا کی قسم اماں' میں آپ کو اپنی اماں ہی سمجھتا ہوں۔ میں اماں کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔"

"میں تمہارا اعتبار کیسے کروں؟ تم جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔"

حمید احمد بھونچکے رہ گئے۔ بلقیس بیگم نے بہت سخت لہجے میں بات کہی تھی "کیا کہہ رہی ہیں اماں؟"

اب تو بلقیس بیگم پھٹ ہی پڑیں "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے تم سے اتنی شکایتیں ہوں گی کبھی۔ مجھے بہت شکایتیں ہیں تم سے۔ تم نے مجھ سے چھپایا کہ وحید کو کوئی تکلیف ہے' جس کے لیے آپریشن ضروری ہے۔ تم پریشان رہے اور پریشانی کا سبب مجھ سے چھپاتے رہے۔ اور تم نے اس لڑکی مدیحہ کو سب کچھ بتا دیا...."

"یہ غلط ہے اماں۔"

لیکن بلقیس بیگم کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں "تمہیں پیسے کی طرف سے پریشانی تھی۔ تم نے مجھے پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ اور اس مدیحہ سے مدد مانگ لی۔ مجھ سے تو تم نے اس کے گھر آنے پر کہا تھا.... یہ کیا بلا پیچھے لگالی آپ نے۔ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ اور خود کیا کیا؟ یہ نہ سمجھنا کہ میں اس سے جل رہی ہوں۔ مجھے تو وہ اتنی اچھی لگتی ہے کہ میرے بس میں ہو تو اسے بہو بنالوں۔ اس گھر میں لے آؤں۔ تمہاری ناپسندیدگی دیکھ کر میں نے تم سے یہ بات نہیں کی۔ ورنہ میں تو بھانپ چکی تھی کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اور تم نے مجھ سے بالا ہی بالا اس سے اپنی ضرورت بھی کہہ دی۔ میں تمہاری ماں مرگئی تھی کیا۔"

حمید احمد منہ کھولے سن رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا "آپ پتا نہیں کیا کچھ کہے جارہی ہیں۔" انہوں نے احتجاج کیا "میں نے کسی کو اپنی ضرورت نہیں بتائی۔ مدیحہ کو تو بتا ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے تو آپ کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں مدیحہ سے رقم کیسے مانگ سکتا تھا۔"

"تم باقاعدہ جھوٹ بولنے لگے ہو۔" بلقیس بیگم نے غصے سے کہا "تم نے خود مجھے بتایا کہ تمہیں کسی نے ایک مہینے کی فیس تیس ہزار روپے دی ہے۔ کیا میں نہیں جانتی کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا کہ جہاں تم ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے' وہ جاننے والے ہیں۔ تم نے کہا' نہیں.... اجنبی ہیں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ تم مدیحہ کے گھر جاتے ہو۔"

حیرت سے حمید احمد کا منہ کھل گیا "یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"جو گاڑی تمہیں لے جاتی اور واپس لاتی تھی' وہ میں نے دیکھ لی تھی۔ اور وہ وہی گاڑی تھی' جس میں مدیحہ یہاں آئی تھی۔"

"اوہ۔" حمید احمد نے گہری سانس لی "میں نے صرف اس لیے جھوٹ بولا کہ مجھے ڈر تھا' آپ نجانے کیا قیاس کریں گی اور مجھ سے

الٹی سیدھی ضد کرنے لگیں گی۔"

"اس سے شادی نہیں کرسکتے۔ اور ماں کو چھوڑ کر اس سے مالی مدد طلب کرسکتے ہو۔" بلقیس بیگم رونے لگیں۔

اب حمید احمد کو بھی غصہ آگیا "میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں۔ آپ سے نہیں مانگ سکتا تو کسی اور سے کیا مانگوں گا۔ خدا کی قسم، میں نے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ میں تو بس اللہ سے مانگتا رہا۔ میں تو مکان بیچنے والا تھا۔"

"مجھ سے کیوں نہیں کہا تم نے؟"

"کہتا تو سوائے آپ کو پریشان کرنے کے کیا حاصل ہوتا۔ آپ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کہاں سے کرتیں؟"

"ایسا نہیں ہے حمید۔ تیس پینتیس ہزار تو میرا بینک میں پڑا ہے۔ پھر لالو کھیت والا مکان ہے۔ چار پانچ لاکھ کا تو وہ ہے ہی۔ جب سے تمہارے پاس آئی ہوں، تم نے مجھے کچھ خرچ کرنے ہی نہیں دیا۔ اور میرے پاس جو کچھ ہے، وہ تمہارا اور وحید کا ہے۔ مجھے دکھ اسی بات کا تو ہے کہ تم نے مجھے ماں کہا ہے لیکن سمجھا نہیں۔ تم اتنی معمولی سی رقم کے لیے پریشان ہوتے رہے۔ اور تم نے مجھے پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ اور مدیحہ سے...."

"بس.... اب نہ کہیے گا یہ بات۔" حمید احمد نے غصے سے کہا۔ پھر انہوں نے اماں کو پوری بات بتا دی "اب آپ جس بات پر بھی مجھ سے خفا ہیں، اسے بھول جائیے اور مجھے معاف کردیجیے۔" انہوں نے آخر میں کہا "میں پھر کہہ رہا ہوں، میں اپنی اماں کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا اور آپ میرے لیے اماں ہی ہیں۔"

بلقیس بیگم انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں "مسئلہ یہ ہے بیٹے کہ تم محبت کرنے سے بھی ڈرتے رہے ہو اور اس سے بھی کہ تم سے محبت کی جائے۔ اسی لیے تم نے کبھی کسی کو دل کی، روح کی گہرائی سے نہیں چاہا۔ کسی نے تم سے محبت کی تو تم نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس پر دھیان نہیں دیا اور تم نے محبت کی خواہش بھی نہیں کی۔ اسی لیے تم تنہا ہو۔ اسی لیے تم ڈرتے بھی ہو۔ جن کے پاس محبت کی طاقت ہو، نہ وہ تنہا ہوتے ہیں، نہ چھوٹے موٹے بحرانوں سے گھبراتے ہیں۔ وہ اپنا دکھ اپنی پریشانی کسی محبت کرنے والے کو بتاتے ہیں۔ اندر کا خوف ان کے سامنے نکالتے ہیں اور ان سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی، بہت ستانے والی کمی ہے تمہارے اندر۔" انہوں نے گہری سانس لی "تمہیں معاف کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ ہی نہیں۔ میں تم سے خفا رہ ہی نہیں سکتی۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ مجھ سے جو زبانی تعلق تم نے قائم کیا ہے، اب اسے پکا کرلیا جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم خود کو تبدیل کرلو.... میری خاطر، وحید کی خاطر اور خود اپنی خاطر۔"

حمید احمد کی آنکھوں میں آنسو آگئے "جو کہیں گی، میں کرلوں گا۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا اماں۔"



بے یقینی

"کل رات میں نے اپنی بیوی سے کہا "چلو ڈرائیو پر چلتے ہیں۔ وہ دس منٹ میں تیار ہوگئی۔ ہم کار میں سیر کرنے نکلے لیکن دریا کے پل پر کار پھسل گئی اور جنگلہ توڑ کر دریا میں جاگری۔ ہم میاں بیوی ڈوب رہے تھے کہ ایک کتا تیرتا ہوا آیا۔ اس نے ہم دونوں کو دریا سے نکالا۔ گھسیٹ کر سڑک تک لے گیا پھر اس بے چارے نے بھاگ کر ایک قریبی دکان سے ٹیلی فون کارڈ کے ذریعے اسپتال فون کیا .... ایمبولنس آگئی .... یہ تم ہنس کیوں رہے ہو؟ کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آرہا....؟"

"بھئی باقی تو سب ٹھیک ہے .... لیکن یہ جو تم نے کہا کہ تمہاری بیوی دس منٹ میں تیار ہوگئی.... یہ میں نہیں مان سکتا۔"

"میں اپنا سب کچھ تمہارے نام کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ آئندہ ضرورت کے وقت تمہیں مجھ سے مانگنا نہیں پڑے۔"

حمید احمد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں "اس کی ضرورت نہیں اماں۔ میں آپ کی، وحید کی قسم کھاتا ہوں کہ ضرورت پڑے گی تو آپ سے کہہ دوں گا۔ ویسے آپ یقین کریں، پریشانی میں مجھے یہ خیال آیا ہی نہیں تھا کہ آپ کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ ورنہ میں اتنا پریشان ہوتا بھی نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں مان لیتی ہوں۔ اب میں تم سے دوسری بات کروں گی۔ یہ مدیحہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم سے محبت بھی کرتی ہے۔"

حمید احمد کے چہرے کا رنگ بدل گیا "آپ کی دونوں باتیں درست ہیں اماں۔ لیکن دوسری پر مجھے اعتراض ہے۔"

"محبت پر کسی کا زور کب ہوتا ہے بیٹے۔ وہ تو بس ہوجاتی ہے۔ جیسے مجھے تم سے ہوگئی۔"

"لیکن اسے اس کا حق نہیں۔ اس کے اور میرے بیچ ایک بہت مختلف، بہت نازک رشتہ ہے۔"

بلقیس بیگم نے گہری سانس لی "تم بہت پڑھے لکھے ہو۔ عقل اور سمجھ میں مجھ سے بہت زیادہ ہو۔ مگر پھر بھی میں تم سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی نہیں اماں.... پلیز۔" حمید احمد گھگیانے لگے "ابھی تو میں ایک ایسی بات کو قبول کرنے کی کوشش کر رہا ہوں' جسے قبول کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔"

"بات پر بات کرو' تبھی سمجھ میں آتی ہے۔ تبھی آسان ہوتی ہے۔ غلط بات پر ڈٹ جانا تو اچھی بات نہیں۔ پڑھے لکھوں کو تو یہ زیب بھی نہیں دیتا۔"

"پلیز اماں۔" حمید احمد نے ان کا ہاتھ تھام لیا "اس پر پھر کبھی بات کرلیں گے۔ ابھی نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" بلقیس بیگم نے کہا۔ ان کا بہت بڑا بوجھ ہلکا ہوچکا تھا۔



حمید احمد باہر جانے کے لیے دروازہ کھول ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور وحید اندر آگیا "میں تمہیں دیکھنے کے لیے نکل رہا تھا۔" انہوں نے ذرا خفگی سے کہا "مغرب کی اذان ہورہی ہے۔"

وحید ہانپ رہا تھا "اسی لیے تو بھاگتا ہوا آیا ہوں۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

حمید احمد نے اس کے ساتھ کھڑے کھڑے دیکھا۔ چودہ سال کی عمر میں وہ ماشاء اللہ ان کے کندھے تک پہنچ گیا تھا "چلو.... ہاتھ منہ دھولو۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ معمول کے مطابق اسے پڑھانے کے لیے بیٹھے۔ یہ ان کے لیے ہمیشہ خوشی کا وقت ہوتا تھا۔ وہ بہت برائٹ لڑکا تھا۔ پڑھنے میں ہمیشہ دلچسپی لیتا تھا۔ انہوں نے اس کی تربیت ایسی کی تھی کہ وہ ذہن سے سوچتا تھا۔ کتاب کو صرف پڑھتا نہیں تھا' غور بھی کرتا تھا اور سمجھتا بھی تھا۔ اس سے انہیں بڑی امیدیں تھیں۔ اس کا مستقبل روشن بھی دکھائی دیتا تھا۔

وحید طبعاً بھی بہت نیک اور سعادت مند تھا۔ اس نے کبھی انہیں پریشان نہیں کیا تھا۔ باقاعدگی سے اسکول جاتا۔ وقت پر کھیلنے جاتا۔ ہوم ورک دل لگا کر کرتا۔ اس کے علاوہ بھی پڑھائی میں دلچسپی لیتا۔ وقت پر سوتا اور وقت پر اٹھتا۔ حمید احمد کو اپنے اسکول کے زمانے کے ایک ٹیچر کی بات یاد آئی۔ وہ کہتے تھے' یہ بڑے لوگوں کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ حمید احمد اللہ سے دعا کرتے کہ ان کا بیٹا ہمیشہ ایسا ہی رہے۔

ہوم ورک مکمل ہوگیا۔ حمید احمد اس سے اسکول کی باتیں کرتے رہے۔ اچانک وحید نے کہا "ابو.... آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے اچھا دوست باپ ہوتا ہے۔ کیا واقعی یہ سچ ہے۔"

حمید احمد نے اسے بہت غور سے دیکھا "بالکل سچ ہے۔ تمہیں کوئی شک ہے اس میں؟"

"شک تو نہیں ہے ابو۔ لیکن میرے دوست میرے ساتھ کھیلتے ہیں۔ آپ تو نہیں کھیلتے۔" وحید نے اعتراض کیا۔

حمید احمد کو اپنا بچپن یاد آگیا۔ انہیں کھیلنے کی کبھی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ اور بات مہلت کی بھی نہیں۔ ان کے اندر امنگ اور خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ تو ہمیشہ کچھ کرنے کچھ بننے کی کوشش میں لگے رہے "میں تمہارے ساتھ کھیلتا بیٹے۔ لیکن میں کبھی کھیلا ہی نہیں۔ مجھے کوئی کھیل بھی کھیلنا نہیں آتا۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ انہیں ایک اور زاویہ سوجھ گیا تھا "دوسری بات یہ ہے بیٹے کہ باپ بیٹے کے ساتھ کھیلنا بھی چاہے تو زیادہ عرصے تک نہیں کھیل سکتا۔ عمر کا فرق بھی آڑے آجاتا ہے نا۔ بیٹا جوان ہوتا ہے.... توانائیوں سے بھرپور۔ اور باپ مضمحل ہوتا ہے۔ اس کے پاس اسٹمنا نہیں ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں کھیل پایا۔"

انہوں نے وحید کے چہرے کو دیکھا۔ وہ ان کے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ مزید وضاحت ضروری تھی "جن لڑکوں کے ساتھ تم کھیلتے ہو' ضروری نہیں کہ وہ تمہارے دوست ہوں۔ ہاں' وہ تمہارے ہم جولی بہرحال ہیں۔" انہوں نے کہا "اصل میں دوست کی تعریف سمجھنا بہت ضروری ہے۔ دوست وہ ہے بیٹے' جو ضرورت کے وقت آپ کی مدد کرے۔ پریشانی میں آپ کی دل جوئی کرے۔ کوئی مشکل پیش آئے تو وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق آپ کو صائب مشورہ دے۔ جس سے آپ دل کی بات بے دھڑک کہہ سکیں اور وہ اسے راز رکھے۔ وہ اس بات کی تشہیر کرکے آپ کو اوروں کے سامنے شرمندہ نہ کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ سے بے غرض محبت کرتا ہو۔ آپ کی بہتری کو سب سے مقدم جانتا ہو۔ اور وہ آپ سے جواب میں کچھ بھی نہ چاہے۔ تم جنہیں دوست سمجھتے ہو' وہ تمہارے ہم جولی ہیں۔ تمہیں ساتھ کھیلنے کے لیے' وقت گزاری کے لیے ان کی ضرورت ہے اور انہیں تمہاری۔ ہاں' ان میں سے کوئی تمہارا دوست بھی بن سکتا ہے۔ وہ جو اس تعریف پر پورا اترتا ہوگا۔ مگر سب سے اچھا دوست باپ ہی ہوتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا ابو۔" وحید نے پُرخیال لہجے میں کہا "ابھی کچھ دن پہلے میں نے جاوید کو بتایا تھا کہ رات کو اکیلے گھر سے نکلتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے تو اس نے یہ بات دوسرے دوستوں.... میرا مطلب ہے ہم جولیوں کو بتادی۔ اب سب ڈرپوک کہہ کر میرا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"یہ تو چھوٹی بات تھی۔ اگر تم کوئی بڑی بات اسے بتا دیتے تو کیا ہوتا۔ نہیں بیٹے' دل کی بات صرف سچے دوست سے کہنی چاہیے۔" حمید احمد نے کہا "اور بیٹے' دوست کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا ہو' اس نے آپ سے زیادہ دنیا دیکھی ہو۔ تبھی تو وہ آپ کو صحیح مشورہ دے سکے گا۔ اچھا یہ بتاؤ' آج تمہیں یہ خیال کیوں آیا۔"

وحید ہچکچانے لگا "ابو.... میرے دوست سگریٹ پینے لگے ہیں۔ وہ مجھے بھی کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا' میں ابو کو بتائے بغیر کچھ نہیں کرتا۔ اس پر وہ مجھے ڈرپوک ڈرپوک کہہ کر مذاق اڑانے لگے

میرا۔ مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔"
حمید احمد کا دل بُری طرح دھڑکا۔ بیٹا اب حساس عمر میں داخل ہو رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے' جہاں بننے اور بگڑنے کا فیصلہ ہوتا ہے
"تمہارا دل چاہتا ہے سگریٹ پینے کو؟" انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔
وحید پھر ہچکچایا "جی ابو' چاہتا تو ہے۔"
"کیوں؟" حمید احمد نے نرم لہجے میں پوچھا۔
"اس لیے کہ میرے دوست سگریٹ پیتے ہیں۔"
"یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی۔ تمہارے دوست تو اپنے ابو سے چھپ کر سگریٹ پیتے ہیں تو اس وجہ سے کیا تم بھی ایسا ہی کرو گے؟" حمید احمد کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔
"نہیں ابو۔ اچھا آپ بتائیں۔ سگریٹ بری چیز ہے۔ سگریٹ پینا بری بات ہے؟"
"مجھے پتا نہیں۔ اس لیے کہ میں نے کبھی سگریٹ پیا ہی نہیں۔" حمید احمد نے سچائی سے کہا "مگر ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ تم بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"
وحید وہیں بیٹھا رہا۔ چند منٹ میں حمید احمد واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں گولڈ لیف کا ایک سگریٹ تھا "میں پورا پیکٹ خریدنا چاہتا تھا۔ مگر مہنگا بہت ہے۔ میں نے سوچا' تجربہ تو ایک سگریٹ میں بھی ہو سکتا ہے۔"
وحید بڑے اچنبھے سے انہیں دیکھ رہا تھا "جاؤ.... جا کر ماچس لے آؤ کچن سے۔"
وحید گیا اور ماچس لے آیا۔ حمید احمد نے سگریٹ ہونٹوں میں دبائی اور دیا سلائی جلا کر سگریٹ سلگائی "اب ایک کش میں لوں گا۔ پھر تم لینا۔ اس کے بعد اس پر بات کریں گے اور کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔"
وحید سر ہلاتے ہوئے بہت غور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ حمید احمد نے بہت گہرا کش لیا۔ دھواں تیزی سے ان کے حلق میں بھرا اور انہیں پھندا لگ گیا۔ سگریٹ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ کھانستے کھانستے دہرے ہوئے۔ وحید پریشان ہو کر ان کی پیٹھ سہلانے لگا "کیا ہوا ابو؟" وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔ حمید احمد کھانسے جا رہے تھے۔
بلقیس بیگم نے ان کے بری طرح کھانسنے کی آواز سنی تو پریشان ہو کر باہر نکلیں۔ ان کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا "کیا ہو گیا؟"
"کچھ نہیں.... اماں.... تجربہ کر رہے تھے.... پھندا لگ گیا۔" حمید احمد نے بمشکل کہا۔
"ناک چٹکی سے بند کرو اور منہ کھول کر چھوٹا سا گھونٹ لو۔" بلقیس بیگم نے ہدایت کی۔
حمید احمد نے ہدایت پر عمل کیا۔ ان کی طبیعت سنبھل گئی "آپ جائیے اماں۔ پانی کا گلاس یہیں چھوڑ جائیے۔ پھندا دوبارہ بھی لگ سکتا ہے۔"
"کر کیا رہے ہو تم دونوں۔" بلقیس بیگم نے بھنّا کر کہا۔ ان کی نظر گرے ہوئے سگریٹ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ کچن کی طرف چلی گئیں۔
حمید احمد نے وحید کی طرف دیکھا' جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "ابو.... اب اور کش نہیں لیجیے گا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" حمید احمد نے منہ بنا کر کہا "میں پاگل ہوں کہ بلاوجہ تکلیف مول لوں۔ اب تو تمہیں کش لینا ہے بیٹے۔"
وحید کا چہرہ فق ہو گیا "میں....؟ نہیں ابو۔ میں نہیں پیوں گا۔"
حمید احمد سوچ میں پڑ گئے۔ یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ انہوں نے جان بوجھ کر اس طرح کش لیا تھا کہ پھندا لگے۔ اور وحید ڈر بھی گیا تھا۔ اب وہ اسے یہیں پر چھوڑ دیتے تو تلقین ادھوری رہ جاتی۔ یہ ضروری تھا کہ وحید کش لے۔ اور اسے بھی پھندا لگے۔ لیکن یہ امکان بھی تھا کہ اسے پھندا نہ لگے۔ مگر حمید احمد اس بات پر تکیہ کر رہے تھے کہ ہر بیٹے کا آئیڈیل اس کا باپ ہوتا ہے۔ وہ ہر کام اپنے باپ کے انداز میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور انہیں معلوم تھا کہ جب وہ کش لے رہے تھے تو وحید انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ تو انہیں یہ رسک لینا ہی تھا۔ اس کے بغیر یہ سبق نامکمل ہی رہتا "نہیں بیٹے' ایک کش تو تمہیں لینا ہی ہو گا۔ اپنے لیے اچھے اور برے کا فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے۔" انہوں نے گری ہوئی سگریٹ اٹھائی اور بیٹے کی طرف بڑھائی۔
سگریٹ لیتے ہوئے وحید کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ ملتجی نگاہوں سے حمید احمد کو دیکھ رہا تھا "بس ایک کش لو.... گہرا کش۔ میں دوسرے کو نہیں کہوں گا۔" حمید احمد نے کہا۔
وحید نے ڈرتے ڈرتے سگریٹ ہونٹوں میں لی اور کش لیا۔ وہ کش کچھ زیادہ ہی گہرا تھا۔ کچھ گھبراہٹ اور خوف بھی تھا۔ اس کا حشر حمید احمد سے بھی زیادہ خراب ہوا۔ وہ تو لوٹ پوٹ ہو گیا۔ حمید احمد کا دل کٹنے لگا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ بڑی اور مسلسل تکلیف سے بچانے کے لیے یہ تکلیف پہنچانا ضروری تھا۔ انہوں نے اسے سہارا دیا اور بلقیس بیگم والی ہدایات دہرائیں۔
بلقیس بیگم پھر کچن سے نکل آئی تھیں۔ مگر ان کے پہنچتے پہنچتے وحید کی طبیعت سنبھل گئی "یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ پہلے باپ کو پھندا لگا اور اب بیٹے کو۔" وہ بگڑ کر بولیں۔
"کچھ نہیں اماں۔ ایک تجربہ کر رہے ہیں ہم لوگ۔" حمید احمد نے بے حد معصومیت سے کہا۔
مگر اس بار بلقیس بیگم کی نظر سگریٹ پر پڑ گئی۔ وہ آپے سے باہر ہو گئیں "تو سگریٹ پی رہے ہو تم لوگ۔ یہ ذلیل چیز...." انہوں نے سگریٹ کی طرف اشارہ کیا "حمید احمد' تم نے تو زندگی میں کبھی

اس بدبودار چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جھوٹ بولنے سے جو بدبو پیدا ہوتی ہے منہ میں' اس سے کچھ ہی کم بدبو ہوگی اس کی۔"

"اماں' ہم سمجھنا چاہ رہے تھے کہ لوگ سگریٹ کیوں پیتے ہیں آخر۔ کوئی لطف تو آتا ہوگا۔" حمید احمد بولے۔

"تو لطف آگیا نا۔ لوگ تو شوق میں شروع کرتے ہیں۔ پھر عادی ہوجاتے ہیں اس کے۔" بلقیس بیگم نے وحید کو لپٹالیا "میرے بچے پر تو تم رحم ہی کرو۔"

"ٹھیک ہے اماں۔ معاف کردیں۔ اب نہیں پئیں گے۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر وحید سے بولے "اسے اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

"خود ہی پھینک دو۔ یہ اسے آئندہ کبھی چھوئے گا بھی نہیں۔" بلقیس بیگم نے فیصلہ سنا دیا۔

حمید احمد نے چپل سے سگریٹ کو مسل دیا "ٹھیک ہے اماں۔ اب آپ کھانا تو پکائیں۔"

بلقیس بیگم بڑبڑاتی ہوئی کچن میں چلی گئیں۔ حمید احمد نے بیٹے سے کہا "یار' مجھے تو سگریٹ فضول چیز ہی لگی۔ لیکن ضروری نہیں کہ تم بھی میرے خیال سے اتفاق کرو۔ تو تم چاہو تو سگریٹ پی لیا کرو۔"

"نہیں ابو۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا اس سے۔ لیکن ابو' ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمیں پھندا لگا۔ میرے دوستوں کو کیوں نہیں لگتا۔"

"ایک بات یاد رکھو بیٹے۔ کوئی چیز بھی سب کے لیے ایک جیسی نہیں ہوتی۔" حمید احمد نے کہا "کوئی چیز کسی کے لیے ہوتی ہے' کسی کے لیے نہیں۔ لگتا ہے' سگریٹ ہمارے لیے نہیں ہے۔"

"جی ابو۔" وحید نے بڑی شدت سے سرہلایا "تجربے سے یہی ثابت ہوا ہے۔"

حمید احمد مطمئن ہوگئے۔ یہ امکان بہت قوی ہوگیا تھا کہ وحید اب سگریٹ کو کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا۔



وہ کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ بالکل اچانک بارش شروع ہوگئی.... تیز بارش۔ حمید احمد برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھ گئے اور صحن کے پختہ فرش پر بوندوں کا رقص دیکھنے لگے۔ صحن کا شیڈ والا بلب انہوں نے روشن کردیا تھا۔ اس روشنی میں گرتی ہوئی بارش کا منظر انہیں بے حد مسحور کن لگ رہا تھا۔

ایک گھنٹا ہوگیا۔ بارش نہیں رکی۔ انہوں نے اندر جاکر دیکھا۔ اماں بھی سوچکی تھیں اور وحید بھی۔ بارش بھی عجیب چیز ہے۔ مختلف لوگوں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کو اس سے سکون ملتا ہے۔ کچھ بے چین ہوجاتے ہیں۔ کچھ کو نیند آنے لگتی ہے اور کچھ کی نیند اڑ جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو اس سے خوشی اور سرمستی حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ کچھ لوگ یادوں سے کھیلنے لگتے ہیں۔

حمید احمد کے لیے اب یہ یادوں کو جگانے والا موسم تھا۔ ابتدا میں تو وہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ بارش جب بھی ہوتی' ان کے اور اماں کے لیے تکلیف اور پریشانیاں لاتی۔ وہ سو بھی نہیں پاتے تھے۔ پھر اللہ نے انہیں ٹھکانا دے دیا۔ تب بارش ہوتی تو انہیں پہلے دور کے' بارش کے سونپے ہوئے مصائب یاد آتے۔ وہ باہر نکلتے اور گلیوں میں اور سڑکوں پر سیلاب کی سی کیفیت دیکھتے تو بارش کے لیے ان کی نفرت دوچند ہوجاتی۔ پورے شہر کو عذاب میں مبتلا کردیتی ہے یہ بارش!

پھر ایک دن بارش کی جھڑی میں اچانک مدیحہ ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس سے پہلے انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ کچھ لوگوں کو بارش اچھی بھی لگتی ہے۔ یہ موسم انہیں پاگل کردیتا ہے۔ انہیں یہ جان کر بہت حیرت ہوئی۔

اس روز انہوں نے مدیحہ کے ساتھ آدھا دن گزارا تھا۔ وہ چند گھنٹے ان کے لیے آگہی کے تھے۔ اس روز انہوں نے بہت کچھ سمجھا' سیکھا اور جانا تھا۔ ایسا بہت کچھ جس سے وہ بے خبر تھے۔ ان کے بہت سے نظریات کی اصلاح ہوگئی تھی۔ وہ حیران ہوئے تھے کہ آدمی اپنے سے چھوٹے.... بہت چھوٹے کسی شخص سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اس روز انہوں نے بارش کو ایک اور رخ سے دیکھنا سیکھا تھا۔ بارش میں ایک پہلو لطافت کا ہوتا ہے۔ یہ مدیحہ نے انہیں بتایا تھا۔ اور اس روز انہوں نے محبت کو دیکھا اور سمجھا تھا کہ وہ کوئی کتابی اور افسانوی چیز نہیں۔ وہ تو ایک نعمت ہے' جو خوش نصیبوں کو عطا کردی جاتی ہے۔ انہیں اس کچی عمر کی لڑکی پر رشک آیا تھا اور انہیں محرومی کا احساس بھی ہوا تھا۔ انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ بارش اور محبت ہم آہنگ ہیں۔ دونوں ہی آدمی کو مست اور بے خود کردیتے ہیں۔ اور اس مستی و بے خودی میں آدمی بڑے سے بڑا خطرہ بے دھڑک مول لینے کو تیار رہتا ہے۔ اور ان چند گھنٹوں کی رفاقت نے آخر میں انہیں آزمائش میں مبتلا کردیا تھا۔

اس دن کے بعد بارش کے ساتھ ان کا رویہ تبدیل ہوگیا۔ ہاں' وہ یادیں اب بھی جگاتی تھی۔ مگر انہیں پرانے مصائب یاد نہیں آتے تھے۔ انہیں مدیحہ کے ساتھ گزرے ہوئے وہ چند گھنٹے مکمل جزئیات کے ساتھ یاد آتے تھے۔ بارش میں وہ محبت کے.... اور اس سے اپنی محرومی کے بارے میں سوچتے تھے۔ انہیں ایک شعر یاد آتا تھا....

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

اور وہ سوچتے تھے کہ انہیں وہ دل ہی نہیں ملا۔ تو شکایت کیسی؟ محرومی پر گلہ کیا؟

اس وقت بھی وہ یہی کچھ سوچ رہے تھے۔ یہ سب باتیں پانچ

سال پرانی تھیں۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے برسات کے ان چند گھنٹوں کو گزار لیا۔ مگر بات یہیں پر نہیں رکتی تھی۔ وہ مدیحہ کے ساتھ گزارے ہوئے ہر پل کو دہراتے تھے۔ اس کے گھر کی اسٹڈی میں پڑھانے سے لے کر آخری دن رخصت ہونے تک کا ہر پل۔ مگر تین سال تک بات بس یہیں تک محدود رہی۔ پھر اماں نے ایک ایسا دروازہ کھول دیا' جو انہیں کبھی نظر نہیں آیا تھا۔

انہیں یاد تھا' وحید کے آپریشن کے بعد اماں نے ان سے مدیحہ کے موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس وقت انہوں نے اماں کو ٹال دیا تھا۔ اماں بھی طویل عرصے تک صبر کیے بیٹھی رہیں۔ مگر تین سال کے بعد انہوں نے دوبارہ بات چھیڑی اور اس بار حمید احمد انہیں روک نہیں سکے۔

اماں اپنی کہتی رہیں۔ وہ مدیحہ کے قصیدے پڑھ رہی تھیں "وہ تم سے محبت کرتی ہے۔" انہوں نے آخر میں کہا۔

"آپ چاہتی کیا ہیں؟"

"اسے میری بہو بنا دو۔"

"ضرور بنا دیتا۔ لیکن وحید ابھی بہت چھوٹا ہے اماں۔" حمید احمد نے شگفتگی سے موضوع کی سنجیدگی کو مجروح کرنے کی کوشش کی۔

"مسخرا پن مت کرو۔" اماں نے بگڑ کر کہا "تم جانتے ہو' میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

حمید احمد بھی سنجیدہ ہوگئے "یہ ممکن نہیں ہے اماں۔" انہوں نے کہا "اس کی اور میری عمر میں بہت بڑا فرق ہے۔"

"کچھ ایسا فرق بھی نہیں ہے۔ تم چالیس کے ہوگے۔ اور وہ تیئس چوبیس کی تو ہے۔"

"دھاندلی نہ کریں اماں۔ وہ بیس اکیس کی ہے اور میں بیالیس کا۔ دگنے سے زیادہ کا فرق ہے اس کی اور میری عمر میں۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔" اماں نے بے پروائی سے کہا "ہمارے مذہب نے سب کچھ واضح کردیا ہے۔ ہمارے ہاں دو افراد کے درمیان شادی کے لیے صرف یہ شرط ہے کہ وہ آپس میں نامحرم ہوں اور ایک دوسرے کو ناپسند نہ کرتے ہوں۔ کامیاب شادی وہ ہے' جس میں دونوں ایک دوسرے سے خوش رہیں۔ اس میں عمر کی کوئی قید نہیں۔ اس کی دونوں مثالیں تو سیرتِ پاک میں موجود ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی۔ آپؐ نے شادی میں عمر کے فرق کی پوری طرح نفی کردی تھی۔"

حمید احمد اماں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے مدلل انداز میں بات کرسکتی ہیں۔ مگر ان کی تو پہلی ہی بات ایسی تھی کہ ان کے قدم اکھڑنے لگے' ایسے کہ سنبھلنا مشکل ہوگیا "اماں' آپ اتنا بڑا حوالہ کیوں دے رہی ہیں۔ ہم معمولی انسان ہیں...."

"گستاخانہ بات مت کرو حمید احمد۔" اماں نے تیز لہجے میں ان کی بات کاٹ دی "میں سمجھتی ہوں کہ حضورؐ نے کوئی کام بھی اپنی خوشی کے لیے' اپنی ذاتی ضرورت کے لیے نہیں کیا۔ آپؐ کا ہر فعل' ہر عمل نظیر ہے۔ امت کے لیے جائز اور ناجائز میں فرق کرتا ہے۔ امت کی رہنمائی کے لیے ہے۔ تبھی تو رسول کریمؐ کی سنت پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ تم اس پر کیسے بات کرسکتے ہو۔"

حمید احمد دم بخود رہ گئے۔ واقعی.... اب اس پر بات کیسے کی جاسکتی ہے۔ پھر بھی انہوں نے کہا "اماں.... یہ اسلامی معاشرہ کب ہے۔ یہاں تو ایسی شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

"تو کیا اس ڈر سے تم سنّتِ رسولؐ سے رہنمائی حاصل کرنا چھوڑ دو گے۔ تو پھر یہ بھی سوچ لو کہ تم کہاں ہوگے.... اس دنیا میں بھی اور اس دنیا میں بھی۔"

اس بار حمید احمد لرز کر رہ گئے "لیکن اماں' استاد اور شاگرد کے درمیان احترام کا رشتہ ہوتا ہے۔ میں اس رشتے' اس تعلق کو بدنام کرادوں۔ مطعون ہوجاؤں۔"

"ہاں۔" اماں نے گہری سانس لے کر کہا "کہتے ہیں کہ استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہونا تم؟ تو بیٹے' استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے.... احترام کے لحاظ سے۔ مگر باپ نہیں ہوتا۔ اگر استاد اور شاگرد ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہوں تو ان کی شادی میں کوئی قباحت نہیں۔ کہو تو میں مثالیں دوں.... اور وہ بھی بڑے لوگوں کی؟"

"نہیں اماں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" حمید احمد نے گھبرا کر کہا "لیکن آپ اس پر کیوں مصر ہیں کہ میں مدیحہ سے شادی کروں۔ جبکہ میں شادی بارہ سال پہلے بھی کرسکتا تھا۔ لیکن اس لیے نہیں کی کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"یہ بھی غیر فطری بات ہے۔ اور شادی کے لیے میں یوں کہہ رہی ہوں کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"میں تو نہیں کرتا اس سے محبت۔" حمید احمد نے بھڑک کر کہا۔

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ وہ تو محبت کرتی ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھے گی تو تم بھی کرنے لگو گے۔"

"دیکھیے اماں۔ شادی کی شرط یہی ہے نا کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں اور ساتھ خوش رہ سکیں۔" حمید احمد کو بھی جواب سوجھ ہی گیا "تو سچ یہ ہے کہ میں اس لڑکی کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔"

اب کے اماں بھونچکی رہ گئیں۔ پھر انہوں نے سنبھل کر کہا "تم یہ بات ضد میں کہہ رہے ہو حمید احمد۔ میں دیکھ چکی ہوں کہ تم اسے پسند کرتے ہو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں اماں۔" حمید احمد نے اس وقت اسے

اپنی کامیابی سمجھا تھا۔ لیکن بعد میں انہیں پتا چلا کہ اس روز ان کی تمام دلیلیں رد ہوگئیں۔ تمام دفاعی حصار توڑ دیے گئے۔ ان کے پاس صرف ایک جواز رہ گیا.... ناپسندیدگی کا۔ اور وہ جانتے تھے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ وہ مدیحہ کو ناپسند نہیں کرسکتے۔ کیسے کرسکتے ہیں؟ وہ تو اس پر رشک کرتے رہے ہیں۔ انہیں احساس ہوگیا کہ ان کا مؤقف کمزور پڑ گیا ہے۔

اس گفتگو کے بعد جب بھی کبھی بارش ہوئی اور انہوں نے بلا ارادہ مدیحہ کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو یاد کیا تو انہوں نے چونک کر خود سے پوچھا کہ کیا وہ ناپسندیدگی کے ساتھ ایسا کررہے ہیں۔ انہیں خود بھی یہ سوال مضحکہ خیز لگا۔ کوئی کسی کو ناپسندیدگی سے اتنی تفصیل سے تو یاد نہیں کرتا۔ پھر انہیں یاد آیا کہ انہوں نے مدیحہ سے کہا تھا کہ وہ ایک سچے اور بے حد HONEST آدمی ہیں۔ تو کیا وہ واقعی ایسے ہیں؟ اس کا جواب انہوں نے اکڑ کر دیا۔ ہاں میں ایسا ہی ہوں۔

اس کے نتیجے میں بحث چھڑ جاتی "یہ بتاؤ کہ تم جو مدیحہ کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو اس طرح یاد کرتے ہو' تو یہ محبت نہیں ہے؟" اُن کے اندر بیٹھا وکیلِ استغاثہ پوچھتا۔

"نہیں۔ یہ محبت ہوتی تو میں اپنا وعدہ پورا کرتا' جو میں نے مدیحہ سے کیا تھا۔ میں اس کے سامنے اعتراف کرتا اور اپنی کالج کی جاب چھوڑ دیتا۔"

"تو پھر کیوں یاد کرتے ہو اسے؟ اس کا کوئی سبب تو ہوگا۔" وکیلِ استغاثہ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

وہ گڑبڑا گئے "یہ احمقانہ سوال ہے۔ کوئی کسی کو کسی بھی وجہ سے یاد کرسکتا ہے۔ صرف محبت ہی تو اس کی وجہ نہیں ہوتی۔" انہوں نے اعتراض اٹھایا۔

"اعتراض مسترد کیا جاتا ہے۔" ان کے اندر بیٹھے جج نے رولنگ دی "سوال کا جواب دیا جائے۔"

حمید احمد سوچتے رہے "دیکھیے می لارڈ۔ ملزم سے کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا ہے۔" وکیلِ استغاثہ نے وار کیا۔

"میں سوچ رہا ہوں می لارڈ۔" حمید احمد نے کہا "دراصل مدیحہ سے میرا تعلق بہت گہرا ہے۔ ہمارے درمیان احسان کا رشتہ ہے۔ وہ میری محسنہ ہے۔ اس نے بروقت خون نہ دیا ہوتا تو شاید آج میرا بیٹا زندہ نہ ہوتا۔ اور اگر اس نے درپردہ میری مدد نہ کی ہوتی تو میں یہ مکان اونے پونے بیچ چکا ہوتا اور بے گھر ہوتا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی اپنے محسن کو اچھے انداز میں یاد نہ کرے۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔" آخر میں ان کا لہجہ فاتحانہ ہوگیا۔

جج نے تھوڑے سے غور و فکر کے بعد فیصلہ سنایا "استغاثہ اپنے مؤقف کو مؤثر انداز میں پیش کرنے اور فیصلہ کن شواہد سامنے لانے میں ناکام رہا ہے۔ اگرچہ ملزم کی دلیل کمزور ہے۔ اس بیان سے عدالت کی تشفی نہیں ہوتی۔ تاہم یہ عدالت شبے کا فائدہ دیتے ہوئے اسے بری کرتی ہے۔"

ہر بارش میں یہی کچھ ہوتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ پھر برآمدے میں پڑے تخت پر لیٹ کر بارش کا نظارہ کرتے ہوئے حمید احمد کو اونگھ آگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پوری طرح سو گئے۔

انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک شادی میں شریک ہیں۔ وہ ایک جوان اور خوش شکل دولہا کے پاس بیٹھے ہیں۔ نکاح خواں نکاح نامے کا فارم بھر رہا ہے۔ وہ اس میں دیکھتے ہیں کہ دلہن کے نام کے آگے مدیحہ حامد لکھا ہے۔ یہ دیکھتے ہی ان کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی ہیں۔ وہ اٹھ کر زنان خانے کی طرف بھاگتے ہیں' جہاں دلہن عورتوں میں گھری بیٹھی ہے۔ دلہن کا چہرہ سہرے میں چھپا ہے۔ وہ وہاں پہنچ کر سہرا اٹھاتے ہیں تو ان کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ وہ مدیحہ ہے۔

اب خواب میں تمام عورتیں غائب ہوگئیں۔ بس وہ اور مدیحہ رہ گئے "مدیحہ.... تم کسی اور سے شادی کررہی ہو؟" انہوں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا کروں۔ ساری عمر تو نہیں بیٹھی رہ سکتی۔ ممی اور پاپا نے مجبور کردیا مجھے۔"

"لیکن یہ نہیں ہوسکتا۔ ابھی لوگ تم سے قبول کرانے آئیں گے۔ تم انکار کردینا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ میں اپنے والدین کی بے عزتی تو نہیں کراسکتی۔"

"کوئی بے عزتی نہیں ہوگی۔ میں تم سے شادی کروں گا۔"

"اور لوگ کیا کہیں گے۔ یہ بھی سوچا آپ نے؟"

"لوگوں کی کیا اہمیت ہے۔ اصل چیز تو ہماری خوشی ہے۔"

"لوگوں کی اہمیت ہے حمید صاحب۔ بہت اہمیت ہے۔ سب سے زیادہ اہم تو لوگ ہی ہوتے ہیں۔" مدیحہ نے تلخ لہجے میں کہا "انسان معاشرتی جانور ہے۔ جہاں گنجا ہونا معیوب ہو' لوگ وہاں گنجے نہیں ہوتے۔ ہمیں اس معاشرے میں لوگوں کے درمیان رہنا ہے تو ہم وہ کچھ نہیں کرسکتے' جو اس معاشرے کو پسند نہیں۔"

حمید احمد کو یاد تھا۔ ان کی بات انہیں لوٹائی جارہی تھی "میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں انکار کرنا ہوگا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"آپ اپنے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں حمید صاحب۔ میں انکار نہیں کروں گی۔"

حمید احمد بیٹھ گئے اور مدیحہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے "مدیحہ.... تمہیں میری محبت کی قسم' انکار کردو۔"

"سوری حمید صاحب۔" مدیحہ نے کہا "میں جانتی ہوں' آپ مجھ سے کبھی شادی نہیں کریں گے۔"

حمید احمد اصرار کرتے رہے اور مدیحہ اپنی جگہ ڈٹی رہی۔ بالآخر حمید احمد دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ بس یہی کہے جارہے

تھے.... میں تم سے شادی کروں گا مدیحہ۔ میرا یقین کرو۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ لیکن مدیحہ انکار کیے جارہی تھی۔

حمید احمد کی آنکھ کھلی تو وہ بچ بچ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ ان کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ وہ ہوش اور بے اختیاری کے درمیان معلق تھے۔ انہیں احساس تھا کہ وہ خواب سے بیدار ہوئے ہیں۔ لیکن خواب کی کیفیت کو جھٹکنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ابھی تک خواب کے اس منظر میں موجود تھے۔ چند لمحوں میں کیفیت کچھ بہتر ہوئی۔ ان کی دھاڑیں ہچکیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ لیکن آنسو اب بھی بہے جارہے تھے۔ اور وہ مسلسل کہے جارہے تھے۔ میں تمہیں کسی اور کی نہیں بننے دوں گا۔ میں تم سے شادی کروں گا مدیحہ....

ان کی ہچکیاں تھمیں۔ ہوش و حواس بحال ہوئے‘ تب بھی ان کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ انہیں ایک جھٹکا سا لگا۔ الفاظ ٹوٹ گئے۔ لیکن وہ ان کی یادداشت میں موجود تھے.... گونجے جارہے تھے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ برسات تھم چکی تھی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو پتا چلا کہ اندر کی برسات جاری ہے۔ ان کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے ہیں۔

”اب ملزم سے پوچھا جائے می لارڈ کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔“ اندر بیٹھے وکیلِ استغاثہ نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

”ملزم جواب دے۔“ جج نے ان سے کہا۔

”می لارڈ‘ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے مدیحہ سے محبت ہے۔“ انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ اور ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ ان کی سماعت تک بھی پہنچی۔

حمید احمد نے جھری جھری لی۔ تو میں ہار گیا۔ وہ بڑبڑائے۔ اور میں ایک سچا اور HONEST آدمی ہوں۔ میں اپنا وعدہ بھی پورا کروں گا۔

انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ وہ تخت پر بیٹھے سوچتے رہے۔ تو یہ دن زندگی کا اہم ترین دن بن گیا ہے۔ آج ایک عہد ختم ہوا اور دوسرا دور شروع ہو رہا ہے۔ آج سے تدریس کا پیشہ میرے لیے نہیں رہا۔ اب کیا کرنا ہے‘ یہ بعد میں سوچیں گے۔ اور آج جا کر مدیحہ کے سامنے اعتراف بھی کرنا ہے....

وہ گھبرا گئے۔ روبرو؟ یہ تو بہت مشکل ہے۔ یہ کیسے ہوگا؟ اتنی بڑی بات.... اتنے برسوں کے بعد.... اور وہ بھی آمنے سامنے۔ اچانک انہیں خیال آیا کہ خط بھی تو لکھا جاسکتا ہے۔ وہ پرسکون ہوگئے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ خط لکھیں گے اور آج ہی پوسٹ کردیں گے.... رجسٹرڈ ڈاک سے۔

وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ ایسے بوجھ جلدی اتار دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔



ان کے سر اور داڑھی کے بال پوری طرح سفید تھے‘ رنگت سرخ و سپید تھی۔ آنکھیں ایسی چمک دار تھیں کہ آر پار دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ چہرے پر ایسا رعب تھا کہ نگاہ ٹھہرانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی عبا پہنے ہوئے تھے۔

مدیحہ ان کے سامنے نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ نظر اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔

”میں تیرے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری لایا ہوں بچی۔“ بزرگ نے کہا ”جن سجدوں پر تو شرمندہ ہوتی رہی ہے‘ انہیں قبول کرلیا گیا ہے۔ تیرے سجدوں کی سچائی کی راہ سے ہر رکاوٹ ہٹالی گئی ہے۔ تیری نمازیں مقبول ہوگئی ہیں۔ ہر کھوٹ دور کردیا گیا ہے۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ مدیحہ نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

”تو یہی چاہتی تھی نا بچی؟“

”جی ہاں۔ میں یہ بھی چاہتی تھی۔“

”تو کچھ اور بھی چاہتی تھی۔ وہ اب بھی چاہتی ہے؟“

”جی ہاں میرے بزرگ۔“ مدیحہ کی آواز لرزنے لگی۔

”میں ایک اور خوش خبری بھی لایا ہوں تیرے لیے۔“ بزرگ نے کہا ”آج جو دل چاہے مانگ لے اپنے رب سے۔ انشاءاللہ مل جائے گا۔“

بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا....

اذان کی آواز سے مدیحہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہاتھ اب بھی اسے اپنے سر پر رکھا محسوس ہو رہا تھا۔ دماغ میں‘ پورے وجود میں جیسے سکون سا پھیلتا جارہا تھا۔ پھر لمحوں میں اس ہاتھ کی موجودگی کا احساس معدوم ہوگیا۔ مگر وہ خواب اسے پوری طرح یاد تھا۔

اس نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہوگئی۔ چند لمحوں میں اس خواب کی سچائی اس پر روشن ہوگئی۔ پہلی بار نماز پڑھتے ہوئے ایسا ہوا کہ حمید احمد کا چہرہ اس کے تصور میں نہیں تھا۔ چہرہ کیا‘ اس کے دل میں ان کا خیال بھی نہیں تھا۔ اس نے اس سوچ کو بھی ذہن سے جھٹک دیا۔ اب وہ مکمل یکسوئی اور ارتکاز کے ساتھ اپنے رب کے حضور موجود تھی۔ اس کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔

نماز کے بعد اس نے تسبیح پڑھی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اسی لمحے خواب والے بزرگ کے الفاظ اس کی سماعت میں گونجے.... آج جو دل چاہے مانگ لے اپنے رب سے۔ انشاءاللہ مل جائے گا۔ اس پر رقت طاری ہوگئی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر سجدے میں گرگئی۔ اے اللہ.... آپ سے تو کچھ بھی مانگا جاسکتا ہے۔ آپ جو چاہیں دے دیں۔ میرے مہربان رب.... زندگی آپ کی عطا کردہ نعمتوں‘ آپ کی عنایات سے بہتر ہے۔ سب کچھ آپ نے عطا فرمایا ہے۔ مگر بندے کی ضرورتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ دونوں کی.... میری اور حمید صاحب کی دنیا اور آخرت کی بہتری کے ساتھ‘ سچی خوشیوں‘ محبت اور ہم آہنگی کے ساتھ....

اس نے وہی کچھ مانگا' جو وہ ہر نماز کے بعد مانگتی تھی۔ مگر آج دعا کے بعد اس سکون کا احساس ہوا' جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اس کے اندر یقین ابھرا کہ اس کی دعا قبول ہوگئی ہے۔

اس نے معمول کے مطابق نسیمہ کو جگایا اور خود بالکونی میں چلی گئی۔ وہاں کرسی پر بیٹھ کر اس نے باہر جانے پہچانے منظر کو دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ ایک سال پہلے جب وہ اس فلیٹ میں نئی نئی آئی تھی تو اسے یہ سب کچھ کتنا عجیب لگا تھا۔ مگر اب وہ مانوس ہوگئی تھی۔ وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے.... زخم محبت کے سوا۔

محبت! جب اس نے حمید احمد کو آخری بار اپنے ڈیفنس والے گھر سے رخصت کیا تھا۔ اس بات کو پانچ سال ہوگئے تھے۔ پانچ سال.... پانچ صدیوں جیسے! کتنا کچھ ہوگیا تھا اس عرصے میں۔ دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بس ایک چیز نہیں بدلی تھی.... حمید احمد کی محبت!

امتحان کا نتیجہ آنے کے بعد اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ بی اے آنرز میں اس کا خاص مضمون اسلامک اسٹڈیز تھا۔ پھر پہلا بڑا واقعہ پیش آیا۔ سمیعہ باجی اور نعیم بھائی کے درمیان علیحدگی ہوئی۔ گھر کے لوگ تصفیہ کرانے کی کوشش میں لگے رہے۔ لیکن بات بنی نہیں۔ سمیعہ باجی نے خلع لے لیا۔

مدیحہ کے لیے وہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ سمیعہ باجی کی نعیم بھائی سے محبت اور پھر طویل انتظار کے بعد شادی نے اس پر بڑا گہرا اور اَن مٹ نقش چھوڑا تھا۔ اس کی زندگی کا رخ ہی تبدیل کردیا تھا۔ اس کی بے غرض' بے طلب محبت انہی کی وجہ سے طلب سے آلودہ ہوئی تھی۔ اتنی محبت' اتنا انتظار' اتنا ایثار.... اور اس کے بعد ایک سال کے اندر علیحدگی! یہ سب کیا ہے؟ کیا محبت کا یہی انجام ہوتا ہے؟

اس نے یہی سوال باجی سے کیا۔ باجی افسردہ ہوگئیں "نہیں.... ضروری نہیں۔ بس اپنا اپنا نصیب ہے۔"

"مگر کیوں باجی؟ ایسا کیوں ہوا؟ اور کیا آپ کی محبت ختم ہوگئی؟ اور نعیم بھائی کی محبت؟"

"نہیں گڑیا۔ میری محبت بھی وہی ہے اور نعیم کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ ان کی محبت اور بڑھ گئی ہے۔"

"تو پھر؟"

"سب کچھ وہی ہے۔ بس فضا بدل گئی۔ اور محبت کو فضا کا بدلنا راس نہیں آتا۔"

"میں سمجھی نہیں باجی۔"

"شادی ہوئی تو میں بہت خوش تھی۔ لیکن شادی کے بعد دھیرے دھیرے پتا چلنے لگا کہ نعیم اب وہ نہیں رہے' جس کا میں نے آٹھ سال انتظار کیا تھا۔ اس میں ان کا اتنا قصور نہیں۔ غلطی میرے ڈیڈی اور ممی کی ہے۔ وہ ابتدا ہی میں انہیں قبول کرلیتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نعیم مجھ سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے پانے کے لیے بڑے جتن کیے۔ بے ایمانیاں کیں' کرپشن میں ملوث ہوئے' احسان کرنے والوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ صرف چار سال میں وہ یونہی لالو کھیت سے ڈیفنس سوسائٹی نہیں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے معمولی جاب سے اسٹارٹ کیا تھا اور اب ان کی اپنی کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ انہوں نے اپنی اچھائیاں ترک کیں اور برائیوں کو اپنایا۔ صرف چار سال میں وہ اس سب کچھ کے عادی ہوگئے۔ وہ نعیم نہیں رہے' جس سے میں محبت کرتی تھی۔ اور انہوں نے یہ سب کچھ میری خاطر کیا۔" باجی کا لہجہ تلخ ہوگیا "اور جب میں نے کہا کہ میری خاطر یہ سب کچھ چھوڑ بھی دو۔ پہلے جیسے ہوجاؤ۔ تو انہوں نے مجھے یوں دیکھا' جیسے میں پاگل ہوں۔ وہ یہ سب کچھ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بڑی مشکل سے انہوں نے یہ سب کچھ حاصل کیا ہے۔ اسے بلاوجہ کیوں گنوائیں۔ اور اس دنیا میں کامیابی کرپشن سے ہی ملتی ہے۔ خود بھی حرام کھاؤ اور دوسروں کو بھی حصہ دو۔ کیونکہ قاعدے قانون سے یہاں کچھ بھی نہیں ملتا۔ پلاٹ بھی نہیں ملتا۔ بلڈنگ تعمیر کرنے کی اجازت بھی نہیں ملتی۔ اور تعمیر کے بعد بلڈنگ پاس بھی نہیں ہوتی۔ اتنے آبجیکشن لگتے ہیں کہ بندہ جواب سوچتے سوچتے پریشان ہوجائے۔ اب تم ہی بتاؤ' میں کیا کرتی۔ میں وہ لڑکی ہوں' جس نے ایک شخص سے محبت کی' اس سے شادی کے خواب دیکھے۔ گھر والوں سے بغاوت کی۔ بیسیوں رشتے ٹھکرائے اور عمر نکل جانے کے خوف سے بے نیاز ہوکر اس شخص کا آٹھ برس تک انتظار کرتی رہی۔ اور جب وہ ملا تو وہ بھی ویسا ہی بن چکا تھا' جیسوں کے رشتے میں نے ٹھکرائے تھے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ کیسے زندگی گزارتی' جس کے پاس پرانی چیزوں میں صرف اپنا نام رہ گیا ہے۔ جس کی پوری شخصیت' تمام نظریات تبدیل ہوچکے ہیں۔ وہ تو اجنبی تھے میرے لیے۔ میں علیحدہ ہونے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔"

مدیحہ یہ سب جان کر بہت رنجیدہ ہوئی۔ تو کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ اس نے سوچا۔ لیکن نہیں۔ حمید احمد ایسے نہیں۔ وہ اپنے اصول نہیں چھوڑتے۔ اور اگر انہوں نے چھوڑ دیے تو کیا اس پر بھی یہی گزرے گی' جو سمیعہ باجی پر گزر رہی ہے؟

سمیعہ باجی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں "کیا بات ہے مدیحہ۔ لگتا ہے' تم بھی محبت کی چوٹ کھا بیٹھی ہو؟"

جواب میں مدیحہ نے انہیں پوری کہانی سنا دی۔ وہ اپنی بہترین سہیلی سے بھی یہ بات نہیں کہہ سکی تھی۔ کبھی کبھی اسے اپنا آپ بہت بوجھل لگنے لگتا تھا۔ سو اس نے چوٹ کھائی ہوئی سمیعہ باجی کو اپنا رازدار بنالیا۔

سمیعہ باجی نے اس کی روداد بڑی توجہ سے سنی۔ پھر بولی "بلاشبہ تمہارے حمید صاحب بڑے آدمی ہیں۔ لیکن اس معاملے میں وہ غلطی پر ہیں۔ اور کچھ انا سے بھی کام لے رہے ہیں۔"

"بڑے آدمی تو وہ ہیں۔" مدیحہ نے فخریہ لہجے میں کہا "لیکن آپ کی دوسری بات میں نہیں سمجھی۔"

"بھئی' جب تم ان کی شاگرد نہیں رہیں تو مسئلہ خود بخود ختم

ہوگیا۔ اب یہ انا ہی تو ہے کہ جو منہ سے نکل گیا' اٹل ہے۔ دوسرے وہ اپنے مضمون میں چاہے عالم ہوں لیکن عمومی طور پر ان میں علم کی کمی ہے۔ انہوں نے اس معاملے کو اسلامی نکتۂ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔"

"یہی میں نے بھی کہا تھا۔" مدیحہ بڑے جوش سے بولی "لیکن اپنی کم علمی کی وجہ سے میں انہیں قائل نہیں کر سکی۔"

"دیکھو.... اسلام میں رشتوں کے متعلق سب کچھ واضح ہے۔ قرآن پاک میں اللہ نے کچھ رشتوں کے بارے میں حکم دیا ہے کہ انہیں توڑا نہ جائے۔ بلکہ درگزر سے کام لے کر قائم رکھا جائے۔ وہ سب خون کے رشتے ہیں۔ ماں باپ' بہن بھائی۔ دادا دادی' نانا نانی' چچا پھوپی' خالہ ماموں۔ اور وہ سب سگے۔ اور اسلام میں واضح طور منہ بولے رشتوں کو' خود زبانی طور پر قائم کیے گئے رشتوں کو بالکل اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو بیٹی کہہ دے' بنالے یا سمجھنے لگے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے وہ ایک دوسرے کے لیے محرم بھی نہیں بن جائیں گے۔ بلکہ اسے اسلام میں اچھا بھی نہیں سمجھا گیا ہے۔ اور اسلام دین فطرت ہے۔ انسان کو اسلام سے زیادہ کسی نے بھی نہیں سمجھا۔ خود انسان نے بھی نہیں۔ چنانچہ جب یہ تاکید کی گئی کہ بیٹی اور باپ بھی بالکل تنہا نہ رہیں۔ کیونکہ ان کے درمیان تیسرا' شیطان ہوتا ہے' تو سب کچھ واضح کردیا گیا۔ ایسے میں استاد بے چارے کی کیا بساط ہے۔ مرد اور عورت کی باہمی کشش بہت بڑی حقیقت ہے۔ ایسے میں استاد شاگرد کی یا شاگرد استاد کی محبت میں گرفتار ہوجائے تو یہ غیر فطری نہیں۔ اور وہ محبت اگر سفلہ نہ ہو' نفسانی خواہشات کے ہاتھوں بے لگام نہ ہو تو معیوب بھی نہیں۔ اور شادی کو تو معیوب کہا ہی نہیں جاسکتا۔ نکاح تو برائی کو' برائی کے راستے کو مسدود کرتا ہے۔ اسے تو بس مستحسن ہی کہا جاسکتا ہے۔ کجا یہ کہ کوئی اس پر شرم کرے۔ تو یہ تو گمراہی ہے۔

تو تمہارے پروفیسر صاحب نے بلاوجہ ہی اسے مسئلہ بنالیا۔ اور یہ سوتیلے پن کا بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ اسلام نے کسی کو شوہر یا بیوی کی موت یا طلاق کے بعد دوسری شادی سے منع نہیں کیا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ دوسری شادی نہ کرنے کے مقابلے میں دوسری شادی میں زیادہ بہتری ہے۔"

"آپ نے تو میری آنکھیں کھول دیں باجی۔" مدیحہ نے کہا "کاش' میں یہ سب کچھ ان سے کہہ پائی ہوتی۔"

"تو اب کہہ دو۔"

"اب نہیں کہہ سکتی۔ میں وعدہ کرچکی ہوں کہ ان سے کبھی رابطہ نہیں رکھوں گی۔"

"احمقانہ وعدہ ہے یہ۔" سمیعہ باجی نے تیز لہجے میں کہا۔

"کچھ بھی ہو' میں اسے پورا کروں گی۔" مدیحہ بولی "اور انہوں نے بھی وعدہ کیا تھا مجھ سے۔" اس نے انہیں حمید احمد کے وعدے کے متعلق بتایا "مجھے ان کے اعتراف کا انتظار رہے گا۔"

"ایسی انا والے کبھی وعدہ پورا نہیں کرسکتے۔"

"نہیں باجی۔ جس دن انہیں احساس ہوگیا' وہ ہار مان لیں گے۔ میں جانتی ہوں انہیں۔" مدیحہ نے کہا تھا۔

اسلامک اسٹڈیز میں اسے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ سننے اور سمجھنے کے بعد اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ وہ اس مضمون کو بڑی محبت اور لگن سے پڑھ رہی تھی۔ وہ ہر چیز' ہر بات ہر عمل کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھتی تھی۔ اور جب وہ شرعی حکم سے ملکی قانون کو متصادم دیکھتی تھی تو اسے بہت افسوس ہوتا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اگر ملک میں اسلامی معاشرہ قائم ہوجائے اور شریعت نافذ ہوجائے تو لوگوں کو ہزاروں غیر ضروری' تکلیف دہ اور اذیت ناک مسائل سے نجات مل جائے۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ اسلام کے نام پر ووٹ لینے والے اقتدار میں آنے کے بعد خود شریعت سے نظریں چرانے لگتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ غیر شرعی قوانین کا دفاع بھی کرنے لگتے ہیں۔

تین سال بعد اس نے اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کا امتحان فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لے کر پاس کیا۔ اب اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک لیکچرار شپ کا اور دوسرے وکالت کا.... وفاقی شرعی عدالت کے لیے۔ اس سلسلے میں اس کی سمیعہ باجی سے بات بھی ہوئی "میں لیکچرار شپ کو ترجیح دوں گی۔" اس نے کہا۔

"لیکن شرعی عدالت میں اسکوپ زیادہ ہے۔ تم جج بھی بن سکتی ہو۔"

"یہ اس سے بڑا کام ہے کہ میں دوسروں کو پڑھاؤں۔ تلقین کروں کہ وہ اپنے طور پر اسلامی تعلیمات پر عمل کریں تاکہ معاشرے میں سدھار پیدا ہو۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔"

"لیکن باجی' اس سے پہلے میں ڈاکٹریٹ کرنا چاہتی ہوں۔"

اور اس نے ڈاکٹریٹ کے لیے تھیسس پر کام شروع کردیا۔ کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ زندگی میں سب سے بڑا طوفان آگیا۔ سپر ہائی وے پر ایک خوف ناک حادثے میں ممی اور پاپا دونوں جاں بحق ہوگئے۔ اور ابھی ان کی قبروں کی مٹی سوکھی بھی نہیں تھی کہ بہن بھائیوں کے درمیان دولت کی تقسیم پر جھگڑے شروع ہوگئے۔

وہ مدیحہ کے لیے بڑا خوف ناک اور روح فرسا تجربہ تھا۔ ماں باپ اپنی اولاد کے لیے ہی سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ ان کے لیے دولت چھوڑ کر جاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ نفاق کے سوا کچھ نہیں چھوڑ کر جاتے۔ ان کی اولاد کے درمیان بس نا اتفاقی' نفرت' عدم یقین اور اندیشے رہ جاتے ہیں۔

گھر کا پہلے سے جو رنگ تھا' اس میں وہ بس گزارہ ہی کر رہی تھی۔ لیکن ممی اور پاپا کے بعد اس کا وہاں رہنے کو جی ہی نہیں چاہا۔ اس کے اکاؤنٹ میں معقول رقم موجود تھی۔ اس نے اپنی گاڑی لی

اور نسیمہ کے ساتھ یونیورسٹی روڈ کے اس فلیٹ میں چلی آئی' جو اس کے نام تھا۔ وہ اپنے تھیسس میں لگ گئی۔ بعد میں وراثت کے کیس کا عدالت میں فیصلہ ہوا۔ جو ملنا تھا' اسے بھی مل گیا۔ لیکن وہ گھر کے نفرت بھرے ماحول سے بچی رہی۔

کاروبار' جائداد اور نقد رقم کی تقسیم کے بعد سب اپنی اپنی زندگی اپنے انداز میں گزارنے کے لیے آزاد ہو گئے۔ آپس میں ملنا جلنا بھی کم ہی رہ گیا۔ دولت کی خواہش نے رشتوں کو توڑ دیا تھا۔ مدیحہ بہت تنہا تھی۔ لیکن وہ خوش اور مطمئن تھی۔ اس کا تھیسس مکمل ہونے والا تھا۔ زندگی میں بس ایک کمی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اسے اس کی بھی کوئی بہت زیادہ پروا نہیں تھی۔ اس کے اختیار میں کچھ تھا ہی نہیں۔ تو وہ فکر کیوں کرتی۔

اور آج.... آج تو اسے لگ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہے۔ اس نے وہ نماز پڑھی' جس کی اسے برسوں سے آرزو تھی۔ اور اس نے وہ دعا کی تھی' جس نے اس کے دل کو سکون بخشا تھا۔ لگتا تھا' زندگی مکمل ہو گئی ہے۔

آہٹ سن کر وہ چونکی۔ اس نے پلٹ کر نسیمہ کو دیکھا۔ وہ اسے ناشتے کے لیے بلانے آئی تھی۔



اب کیا کیا جائے؟ یہ بہت مشکل سوال تھا۔ ساری زندگی انہوں نے بس ایک ہی کام کیا تھا اور اب وہ اس کے اہل نہیں رہے تھے۔ مگر کچھ تو کرنا ہے۔ متبادل تو ضروری ہے۔ روزگار کا معاملہ ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ انہیں کچھ کرنا ہی نہیں آتا تھا....

"ارے.... تم تیار نہیں ہوئے ابھی تک۔" بلقیس بیگم نے انہیں چونکا دیا۔

"نہیں اماں۔"

"آج چھٹی کرو گے؟" بلقیس بیگم نے حیرت سے کہا۔

"اب چھٹی ہی چھٹی ہے اماں۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔"

بلقیس بیگم سناٹے میں آگئیں "کیا مطلب؟"

حمید احمد نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور التجائیہ لہجے میں بولے "دیکھیں اماں' اس بار میں آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔ لیکن مجھے تین مہینے کی مہلت چاہیے۔ یہ میرے لیے ضروری ہے۔ آپ اس دوران مجھ سے کچھ نہیں پوچھیں گی۔ پھر میں خود آپ سے بات کروں گا۔"

"ناشتا لاؤں تمہارے لیے؟"

"صرف میرے لیے نہیں' اپنے لیے بھی۔" حمید احمد مسکرائے "اب ہم ناشتا ساتھ کیا کریں گے.... ہر روز۔"

بلقیس بیگم بھی مسکرا دیں۔

ناشتے کے دوران بھی حمید احمد اسی سوال پر سوچتے رہے۔ جو کچھ وہ کرتے رہے تھے' وہ انہیں بہت محبوب تھا۔ اس کے چھوٹنے کا صدمہ ایسا تھا کہ کئی دن تک وہ اس سے شل رہتے۔ لیکن انہیں تو ایسے میں بھی سوچنا تھا۔ اور یہ ایسا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ان کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ انہیں ایسا کچھ کرنا تھا کہ جس کے کرنے سے انہیں خوشی حاصل ہو۔ جیسی کالج میں پڑھا کر ہوتی تھی۔ اتنی خوشی تو کسی کام میں نہیں مل سکتی۔ تو اس سے کم سہی۔ لیکن خوشی ہو ضرور۔

بہت سوچنے پر بھی انہیں کچھ سجھائی نہیں دیا۔ انہوں نے سوچا' جلدی کیا ہے۔ پہلے یہ صدمہ جھیل لیں۔ پھر کچھ نہ کچھ سوجھ ہی جائے گا۔ اب ایک دن میں تو سب کچھ ہونے سے رہا۔ برسوں کا ساتھ چھوٹا ہے۔

وہ پوسٹ آفس گئے اور دونوں خط رجسٹری کر آئے.... اپنا استعفا بھی اور مدیحہ کا خط بھی۔ پھر وہ اماں سے بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ سارے موضوع ختم ہو گئے تو انہیں چپ لگ گئی۔ دل گھبرانے لگا۔ وہ اس طرح گھر کبھی بیٹھے ہی نہیں تھے۔ انہیں کالج یاد آنے لگا.... اپنی کلاسیں یاد آنے لگیں۔

وحید کے اسکول سے آنے کا وقت قریب آیا تو ان کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ وحید انہیں گھر میں دیکھے گا تو کتنا خوش ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اندیشے ستانے لگے۔ اگر وحید کو پتا چلا کہ اب وہ گھر میں رہا کریں گے تو اس کا دل اسکول سے اچاٹ نہ ہو جائے۔ اور وہ ان کے گھر میں رہنے کا عادی نہ ہو جائے۔ پھر وہ کچھ کریں گے اور ظاہر ہے کہ زیادہ دیر گھر سے دور رہیں گے تو وہ سمجھ نہیں کر پائے گا۔

وہ گھبرا کر گھر سے نکل آئے۔ لیکن جاتے کہاں۔ ایسی وقت گزاری کی انہیں کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ وقت کیسے گزارا جاتا ہے۔ وہ یونہی سڑکوں پر پھرتے رہے۔ تھک گئے تو ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ تنہائی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ایک فیملی روم کا رخ کیا تھا۔

تھکی ہوئی ٹانگوں کو پھیلا کر انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا تو پہلی بار انہیں مدیحہ کا خیال آیا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ انہوں نے اب تک اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں' جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ مدیحہ کا خیال آنے پر انہیں طمانیت کا احساس ہوا۔ اس کا سبب ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ پہلی بار وہ مرد بن کر سوچ رہے تھے۔ اور انہیں آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ پروفیسر نہیں تھے۔ لہٰذا کسی ضابطے کے پابند نہیں تھے۔ وہ کھل کر سانس لے سکتے تھے۔ وہ مدیحہ کے بارے میں آزادی سے سوچ سکتے تھے۔

ان کا دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔ رات وہ خواب دیکھ کر جاگے تھے اور انہوں نے اضطراری طور پر مدیحہ کی محبت کا اعتراف

کرلیا تھا۔ اب وہ سمجھے کہ اتنے عرصے سے وہ خوف زدہ تھے کہ ان سے انجانے میں بددیانتی سرزد ہو رہی ہے۔ شاید انہیں احساس تھا کہ انہیں مدیحہ سے محبت ہوگئی ہے۔ لیکن ان کا شعور مزاحمت کررہا ہے۔ انہیں اس کا ادراک نہیں ہونے دے رہا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ شعور کی مزاحمت فطری ہے۔ وہ ہتھیار ڈالتے تو انہیں اپنی عمر بھر کی کمائی، اپنے پروفیشن سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ لیکن ممکنہ بددیانتی کا احساس شاید انہیں اندر ہی اندر ڈستا رہا تھا۔ تبھی تو پہلا موقع آتے ہی انہوں نے اس محبت کا اعتراف کرلیا۔

لطف کی بات یہ تھی کہ انہوں نے خود سے اعتراف کیا۔ استعفا لکھا اور مدیحہ کو اعترافِ محبت کا خط لکھا۔ یہ سب کچھ کیا۔ مگر انہوں نے اس محبت کے بارے میں نہیں سوچا، جس کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کررہے تھے۔ مگر اس فیملی روم میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے اب انہوں نے اس محبت کے بارے میں سوچا۔ انہوں نے مدیحہ کو ایک عام لڑکی کی حیثیت میں، ایک عام مرد کی نظر سے دیکھا۔ ان کا وجود خوشی سے بھر گیا۔ سودا مہنگا نہیں۔ بلکہ سستا چھوٹا ہے۔ انہوں نے سوچا۔ مدیحہ ایسی لڑکی ہے، جس کے لیے دنیا بھی چھوڑی جاسکتی ہے۔ وہ ہر اعتبار سے خوب صورت لڑکی ہے۔ اس کا ذہن، اس کی روح، اس کا دل اس کے ظاہری حسن سے بڑھ کر حسین ہے۔ اگر وہ اپنی اس محبت کے ساتھ انہیں مل جائے تو زندگی خوب صورت ہوجائے گی۔

اچانک ان کے دل میں ایک خدشہ جاگا۔ وہ بڑے گھرانے کی لڑکی ہے.... بہت بڑے گھرانے کی۔ اور وہ خود اب کچھ بھی نہیں رہے۔ وہ اب ایک ایسے آدمی ہیں، جس کا کوئی مستقبل نہیں۔ جس کا حال تک درست نہیں۔ تو ایسے میں مدیحہ انہیں کیسے مل سکتی ہے۔ مگر پھر انہوں نے سوچا، یہ سب کچھ مدیحہ بھی جانتی ہے۔ لیکن وہ پورے اعتماد کے ساتھ ان کی طرف بڑھی تھی تو اس کے پیچھے کوئی یقین تو ہوگا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

مدیحہ نے انہیں اپنی محبت کی جو کیفیات بتائی تھیں، جن پر انہیں رشک آیا تھا، اب وہ خود پر طاری ہوتے دیکھ رہے تھے۔ چائے کی پیالی ختم کرتے کرتے انہیں جیسے نشہ ہوگیا۔ وہ سرشاری کی عجیب کیفیت تھی۔ وجود کے اندر گہرائی میں سکون ہی سکون تھا۔ لیکن ایک بے تابی تھی، جس نے اوپر کے پانیوں میں تلاطم پیدا کر رکھا تھا۔ بے تابی.... اس بات کی بے تابی کہ وہ مدیحہ کو دیکھیں، اس سے باتیں کریں۔ انہیں ایسی بے تابی کبھی کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ سوچتے اور حساب لگاتے رہے۔ انہوں نے مدیحہ کو جو رجسٹرڈ خط بھیجا ہے، وہ کل نہیں، شاید پرسوں اسے ملے گا۔ مدیحہ کا ردِعمل کیا ہوگا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ خط پڑھتے ہی دوڑی چلی آئے گی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے خط میں اسے پابندی سے آزاد کردیا تھا کہ وہ ان کے گھر نہیں آسکتی۔ وہ آئے گی۔ اور وہ کتنی خوش ہوگی۔

کتنی شکایتیں، کتنی باتیں کرے گی وہ ان سے۔ اور اب اس کے انداز میں کیسا کھلا والہانہ پن ہوگا۔ انہیں اس کا کلاس روم میں لیکچر کے دوران والہانہ نظروں سے دیکھنا یاد آیا۔ اور انہیں بہت اچھا لگا۔ صرف اس لیے کہ وہ پروفیسری کی قید سے آزاد ہوگئے تھے۔

وہ اس کے ساتھ کے خواب دیکھتے رہے۔ انہیں خیال آیا کہ اماں کتنی خوش ہوں گی۔ اماں کا یہ بہو والا ارمان بھی پورا ہوجائے گا۔ وہ یہی تو چاہتی تھیں۔ اور مدیحہ تو انہیں پسند بھی بہت ہے۔ وہ بہت خوش ہوں گی۔

پھر اچانک انہیں وحید کا خیال آیا۔ وہ پریشان ہوگئے۔ اس سب سے اہم مسئلے پر انہوں نے سوچا بھی نہیں۔ وحید اتنی بڑی تبدیلی کو قبول کرے گا بھی یا نہیں۔ اگر نہیں تو پھر سب کچھ ممکن ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوسکے گا۔ وحید کی خاطر ہی تو انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ تو اب کیسے کرسکتے ہیں۔

انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے وحید کو ٹٹولیں گے۔ وہ ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔

اس شام ہوم ورک مکمل کرانے کے بعد انہوں نے بات چھیڑی "یار بیٹے، تمہیں امی کی کمی تو محسوس ہوتی ہوگی؟" انہوں نے وحید سے پوچھا۔

وحید نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ ان کے درمیان اس موضوع پر بات ہو رہی تھی "بہت زیادہ ابو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"حالانکہ نہیں ہونی چاہیے۔ اماں تم سے اتنی محبت کرتی ہیں۔"

"وہ تو دادی ہیں۔ امی تو امی ہوتی ہے۔" وحید نے سادگی سے کہا۔

حمید احمد نے ہمت کرکے کہا "میں سوچتا ہوں کہ تمہارے لیے ایک امی لے ہی آؤں۔"

وحید تو اچھل ہی پڑا "سچ ابو۔ مزہ آجائے گا۔"

حمید احمد نے اسے بہت غور سے دیکھا "میں سمجھ رہا تھا کہ تمہیں یہ اچھا نہیں لگے گا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگے گا؟ میں تو شروع سے یہی چاہتا ہوں۔"

"تم نے کبھی بتایا نہیں۔"

"میرا خیال تھا، آپ کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔"

"اچھا.... یہ بتاؤ کہ تم کیسی امی چاہتے ہو۔"

"امی جیسی۔" وحید نے بے ساختہ کہا۔ پھر حمید احمد کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر وضاحت کی "جیسی میری امی تھیں۔ ان سے ملتی جلتی صورت ہو۔ اور اتنی ہی بڑی ہوں، جتنی میری امی تھیں۔ کیسا مزہ آئے گا۔ اب وہ مجھ سے تھوڑی ہی بڑی ہوں گی نا؟ پھر بھی میں بچوں کی طرح ان کی گود میں لیٹ جاؤں گا۔ وہ مجھے بچوں

کی طرح پیار کریں گی۔ کریں گی نا؟"
"ہاں، کیوں نہیں؟" حمید احمد کا دل بھر آیا۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وحید کے اندر محرومی کا یہ احساس اتنا شدید ہوگا۔ وہ اسے سوتیلی ماں سے بچانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اور وہ ماں کی آرزو کرتا رہا تھا۔ یہ سمجھے بغیر کہ ایک بار کھو جائے تو ماں کبھی نہیں ملتی۔ اپنا چودہ سالہ بیٹا انہیں اس وقت چار سال کا لگ رہا تھا۔
"آپ کب لائیں گے امی کو؟"
"دیکھو بیٹے، دعا کرو۔"
اب اہم سوال یہ تھا کہ کیا مدیحہ، وحید کو خوش کر سکے گی۔ اور یہ پریشان کن سوال تھا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ مدیحہ میں سلمہ کی شباہت تھی۔ وحید کے ذہن میں عمر کا جو تصور تھا، مدیحہ اس پر بھی پوری اترتی تھی۔ وہ وحید کی ماں تو نہیں، بڑی بہن جیسی بن سکتی تھی۔ اور انہیں یقین تھا کہ وہ اسے پیار بھی بہت دے گی۔
اس رات حمید احمد ٹھیک سے سوئے نہیں۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ خوش تھے۔ قدرت نے ان کی دونوں آرزوئیں پوری کردی تھیں۔ مدیحہ پر جو انہوں نے رشک کیا تھا، وہ رنگ لے آیا تھا۔ انہیں مدیحہ کی محبت تو پہلے ہی سے ملی ہوئی تھی۔ اب انہیں مدیحہ جیسی محبت بھی مل گئی تھی.... مدیحہ کے لیے۔
اگلے روز بھی وہ وحید کے اسکول سے واپس آنے سے ذرا پہلے تک گھر میں بیٹھے رہے۔ مگر ایک فرق تھا۔ گزشتہ روز وہ پریشان تھے کہ اب کیا کریں۔ لیکن اس روز انہیں اس بات کی فکر بھی نہیں تھی۔ یہ محبت کا کمال ہے۔ ہر فکر ماسوا کو مٹا دیتی ہے۔
اس روز بھی وہ اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے اور مدیحہ کے تصور سے کھیلتے رہے۔ وہ خوش تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ پہلی بار ان کی زندگی میں بہار آرہی ہے۔ اس روز ریسٹورنٹ میں بیٹھے بیٹھے انہیں ایک خیال آیا۔ انہوں نے سوچا، محکمۂ ڈاک والے کبھی کبھی غیر معمولی مستعدی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے، خط آج پہنچ جائے۔ بلکہ ممکن ہے، پہنچ گیا ہو۔ اور کچھ عجب نہیں کہ مدیحہ اس وقت ان کے گھر میں بیٹھی ہو۔
اس خیال نے انہیں بے تاب کردیا۔ وہ ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ گھر پہنچ کر انہیں مایوسی ہوئی کہ مدیحہ نہیں آئی ہے۔ لیکن آس نہیں ٹوٹی۔ کچھ یہ خیال بھی تھا کہ اتنی جلدی خط ملنے کا درحقیقت کوئی امکان نہیں ہے۔
اگلے روز بھی یہی کچھ ہوا۔ مگر وہ شام ان کے لیے بہت سخت تھی۔ وہ سراپا سماعت تھے.... گاڑی رکنے کی آواز، کسی دستک کے منتظر۔ دروازے پر دستک ہوتی تو وہ لپکتے۔ لیکن دروازہ کھول کر مایوس ہوتے۔ کبھی کوئی پڑوسن نظر آتی اور کبھی وحید کے کسی دوست کا چہرہ۔ مدیحہ بہرحال نہیں آئی۔
اگلے روز بارہ بجے کے قریب وہ گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس بار انہوں نے بڑے یقین سے دروازہ کھولا اور دروازہ کھولنے پر انہیں مایوسی نہیں ہوئی البتہ دل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔ دروازے پر پوسٹ مین کھڑا تھا۔ مدیحہ نہیں آئی.... کیوں؟ اس نے خط بھیجا ہے! زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔
پوسٹ مین نے ان کی طرف خط بڑھایا۔ اور ایک پرچا....
"اس پر سائن کردیں۔"
تو رجسٹری ہے۔ مگر اتنی جلدی! انہوں نے دستخط کیے اور خط لیا۔ اپنی تحریر.... وہ بھونچکے رہ گئے "یہ کیا....؟ خط واپس آگیا میرا؟"
"جی سر۔ وجہ لفافے پر لکھی ہے۔" پوسٹ مین نے کہا اور چلا گیا۔
انہوں نے دروازے پر کھڑے کھڑے لفافے پر ٹیڑھی میڑھی تحریر پڑھی "مکتوب الیہ اب اس پتے پر نہیں رہتا۔ نیا پتا معلوم نہیں۔" کچھ دیر تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر آیا تو انہیں لگا کہ آسمان ان کے سر پر آگرا ہے۔
اس کیفیت میں گھر میں جانا مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے وہیں سے آواز لگائی "اماں، میں جارہا ہوں خدا حافظ۔" پھر وہ گھر سے نکل آئے۔



تین دن گزر گئے۔ کیسے گزرے، یہ حمید احمد کو پتا ہی نہیں چلا۔ انہیں کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ وہ ہوش مندانہ انداز میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ ایک وحشت تھی، بے تابی تھی، اضطراب تھا۔ وہ کسی طرح اڑ کر مدیحہ تک پہنچ جائیں.... پوسٹ مین بن کر.... اور وہ خط اسے دے آئیں۔ اس کے علاوہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔
چوتھے دن انہوں نے جھرجھری لی، جیسے کسی طویل نیند سے جاگے ہوں۔ یہ وہ کیفیت تو نہیں جو میں نے مانگی تھی۔ وہ شکایتی لہجے میں بڑبڑائے۔ یہ کیا ہوگیا؟ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ انہوں نے سوچا کہ خود مدیحہ کے گھر جائیں، مکینوں سے پوچھیں کہ یہ لوگ کہاں ملیں گے۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ آدمی لاپتا ہو جائے۔ ڈھونڈا تو جا سکتا ہے لیکن نہیں..... وہ ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ ان کی حالت، ان کی کیفیت تو دیوانوں کی سی ہے۔
اچانک مدیحہ کی آواز ان کے کانوں میں گونجی، اقبال کا ایک شعر آپ کی نذر کرتی ہوں۔ حمید صاحب۔ یہ میرے دل سے دعا بن کر نکلا ہے۔ خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں۔
تو وہ دعا قبول ہوگئی۔ انہوں نے خود سے کہا۔ مدیحہ نے کیسے دیکھ لیا تھا....؟ یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ میں سینے میں سمندر

لیے بیٹھا ہوں۔ بس اس میں تلاطم نہیں تھا۔ موجیں تھیں۔ لیکن اضطراب سے محروم تھیں۔ اور اب طوفان آگیا تو موجیں اچھلنے' آسمان کو چھونے کی کوشش کرنے کی عادی ہوگئیں۔

انہوں نے وقت کی رہ گزر کو پلٹ کر دیکھا۔ وہ کیا تھے.... اور کیا ہوگئے۔ معلم.... عاشق۔ اب آئینہ دیکھیں تو اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بڑھی ہوئی شیو' نیند سے محروم جلتی' متورم آنکھیں' مسکا ہوا لباس۔ وہ تو تیاگی ہوگئے۔ ہاں سچ مچ۔ سب کچھ تو تیاگ دیا انہوں نے۔ ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ اور وہ بے کار بھی ہیں' بے روزگار! اور یہ سب کچھ جس کے لیے کیا' وہ انہیں نہیں ملا۔ شاید کفرانِ نعمت کی سزا ہے۔

استعفا واپس بھی تو لیا جاسکتا ہے۔ دنیا اندھیری دیکھ کر گھبرائے ہوئے ذہن نے سوال اٹھایا۔

چپ کم ظرف! انہوں نے اسے ڈپٹ دیا۔ یہ تجارت تھوڑا ہی ہے۔ محبت ہے۔ اہلیت کھو بیٹھے تو منصب چھوڑ دیا۔ یہ تو دیکھ کہ پہلے سے بڑا منصب مل گیا ہے۔

ہاں.... بہت بڑا منصب ہے۔ ذہن نے جل کر کہا۔ دوسروں کو علم بانٹتے تھے۔ اب چھپنچر ہو۔ لفنگوں کی طرح سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہو۔ یہ تو سوچو کہ اب کرنا کیا ہے۔ خود فاقے کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ کیا اماں اور بیٹے کو بھی بھوکا مارو گے۔ اور بیٹے کی تعلیم کا بھی سوچو۔ جوان ہوتے بیٹے کا باپ.... اور وہ بھی عاشقِ نامراد!

نامراد کیوں' میں تو بامراد ہوں؟ انہوں نے جواب دیا۔ لیکن تیری یہ بات برحق کہ کچھ کرنا ہوگا۔ مگر کیا کروں؟

دل یہی کہتا تھا کہ کچھ ایسا کر' جس میں خوشی ملے۔ مگر ایسا کیا ہے۔ خوشی تو محبت سے ہے۔ اور محبت.... میں نے کب کسی چیز سے محبت کی کہ مجھے خوشی ملے۔ کیا کروں؟

وہ سڑکوں پر چلتے رہتے۔ تھکتے تو ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتے۔ اب تو گھر واپس جانے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ دیر سے گھر جانے لگے تھے۔ اماں نجانے کیسے ضبط کیے بیٹھی تھیں۔ اب تک کچھ بھی نہیں پوچھا انہوں نے۔

ایک دن وہ چلتے چلتے ٹھٹکے۔ وہ ایک اسٹال تھا۔ اسٹال والے نے فٹ پاتھ پر ترپال بچھا کر کتابیں ترتیب سے لگائی ہوئی تھیں۔ ان کی نظر بچوں کی کہانی کی ایک کتاب پر جم گئی۔ کتاب کا ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ انہوں نے کتاب اٹھائی اور اسے کھول کر دیکھا۔ وہ چار رنگوں میں بہت خوب صورتی کے ساتھ چھاپی گئی کتاب تھی۔ ان کا دل کتاب کی محبت سے سرشار ہوگیا۔ وہ آٹھ نو سال کے لڑکے بن گئے۔ انہیں یاد تھا کہ وہ کہانیوں کی کتابوں کے لیے ترستے تھے۔ اس زمانے میں کتابیں اتنی اچھی نہیں چھپتی تھیں اور سستی بھی ہوتی تھیں۔ پھر بھی ان کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ کتاب خرید سکتے۔

اس لمحے بجلی کی طرح ایک خیال ان کے دماغ میں کوندا۔ انہیں اس پر سوچنا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے اور چائے منگوالی۔

وہ ریسٹورنٹ سے نکلے تو فیصلہ کرچکے تھے!



"اتنی بہت سی کتابیں؟" اماں نے کہا۔ کتابیں بلاشبہ ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔

"اتنی خوب صورت کتابیں!" وحید کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ان میں خواب ہی خواب تھے۔

"ہاں بیٹے۔ دن میں جتنی تم چاہو' لے سکتے ہو۔" حمید احمد بولے۔

"سچ ابو؟" وحید کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

حمید احمد کا دل دکھنے لگا۔ انہوں نے وحید کو کبھی کہانیاں نہیں پڑھنے دی تھیں۔ انہوں نے یہ خیال بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کتابوں سے محروم رہے ہیں۔ اس کی تلافی وہ وحید کے ذریعے کرسکتے ہیں۔ محرومی کا دکھ سمجھتے ہوئے بھی انہوں نے اسے محروم کردیا تھا "ہاں بیٹے' جتنی چاہو' لے لو۔" انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر ابو' آپ اتنی کتابوں کا کریں گے کیا؟"

"بچوں تک پہنچائیں گے۔"

اس شام ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد وحید بیٹھا کہانیوں کی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اور اس کی خوشی دیکھ کر حمید احمد کے دل میں بھی خوشی بوند بوند گر رہی تھی۔ انہوں نے درست فیصلہ کیا تھا۔ خوشی' خوشی بانٹنے سے ملتی ہے' یہ راز انہوں نے سمجھ لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔

اور وحید کو جیسے ہوکا ہوگیا تھا۔ اس کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ اس کے سونے کا وقت گزر چکا تھا اور وہ اب بھی ایک کہانی پڑھ رہا تھا "بیٹے.... تم یہ روز پڑھ سکتے ہو۔ سب آج ہی پڑھ ڈالو گے؟" انہوں نے اسے ٹوکا۔

"میں روز پڑھ سکتا ہوں ابو؟ پرامس؟"

حمید احمد نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "پکا پرامس۔ اب سو جاؤ۔"

اگلے روز حمید احمد نے اپنی تیاری شروع کی۔ وہ کپڑے کا ایک پورا تھان لائے تھے۔ اسے بچھا کر انہوں نے اس پر کتابوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کیا۔ کتابیں رکھنے کے بعد انہوں نے بڑی نزاکت سے اسے تہ کیا اور گٹھری کی طرح باندھا۔ اس طرح کہ کتابیں مڑیں بھی نہیں۔ وہ یہ کام اس مہارت سے کررہے تھے' جیسے برسوں سے کرتے آرہے ہوں۔

اماں انہیں بہت غور سے دیکھ رہی تھیں "تمہارا کیا ارادہ ہے بیٹے؟" انہوں نے پوچھا "یہ کندھے پر رکھ کر گلی گلی کتابیں بیچتے پھرو گے؟"

"جی ہاں اماں۔ اس میں کوئی برائی ہے؟"

"برائی تو نہیں۔ لیکن یہ کام تمہارے شایانِ شان بھی نہیں۔"

"ارے اماں.... شان تو بس اوپر والے کی ہے۔" حمید احمد نے کہا "اور اسی میں میرے لیے بہت بڑی خوشی ہے۔"

"یہ کام تم اور طرح سے بھی کر سکتے ہو بیٹے۔" اماں کے لہجے میں دکھ تھا۔

اب حمید احمد اماں کو کیسے سمجھاتے کہ یہ ان کے لیے کتنا اہم ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس دور میں کوئی یوں کتابیں بیچنے کے لیے نہیں نکلتا۔ لیکن ان کے بچپن میں تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ اب بھی ایسا ہی کریں گے۔ کچھ تو محرومی کا ازالہ ہوگا "اماں.... میں نے آپ سے ایک مہلت مانگی تھی نا۔ وہ مجھے دے دیں۔" انہوں نے التجائیہ لہجے میں کہا "پھر میں اور آپ بیٹھ کر بہت سی باتیں کریں گے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ مگر ابھی مجھے میری مرضی کرنے دیں۔ پہلی بار تو میں سچی خوشی کمانے نکل رہا ہوں اماں۔ مجھے دعا دیں۔"

مگر حمید احمد بازو پر گٹھری چڑھا کر گھر سے نکلے تو اماں رونے لگیں۔ کالج میں پڑھانے والا نازک مزاج آدمی، جس نے کبھی بوجھ نہیں اٹھایا، آج اس طرح گھر سے نکل رہا ہے!



حمید احمد کو پہلی بار پتا چلا کہ ان کا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ بچپن میں انہوں نے اس طرح کتابیں بیچنے والے کو دیکھا تھا۔ اور اس کا ہر انداز انہیں یاد تھا۔ وہ اسی کی طرح گٹھری بناتے، اس کی طرح اسے کندھے پر رکھ کر چلتے، بوقتِ ضرورت اس کے انداز میں گٹھری اتار کر کھولتے، کتابیں نکالتے اور دوبارہ اسی طرح بند کرتے۔ فرق اتنا تھا کہ وہ بوجھ اٹھانے کے عادی نہیں تھے۔ جلدی تھک جاتے تھے۔ ان کے کندھے دکھ جاتے تھے۔ وہ کبھی گٹھری کو دائیں کندھے پر لیتے، کبھی بائیں پر۔ اور پہلے ہی دن انہیں اپنے بچپن کے کتب فروش کی قوتِ برداشت پر رشک آنے لگا۔ بڑا تحمل تھا اس میں۔ کوئی ان سے گٹھری اترواتا، کتابوں کا جائزہ لیتا اور کتاب نہ لیتا تو ان کی دوبارہ گٹھری باندھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ گٹھری یا اس کے سر پر دے ماریں یا اس سے اپنا سر پھوڑ لیں۔ مگر کتاب بکنے پر جو خوشی ہوتی تھی، اس کا کوئی بدل ہی نہیں تھا۔ اور جو پہلی کتاب انہوں نے بیچی تھی، اسے تو وہ کبھی بھول ہی نہیں سکتے تھے۔

پہلے دن تو وہ دس قدم چل کر لڑکھڑا گئے تھے۔ تب انہوں نے پہلی بار خود کلامی کی تھی۔ بعد میں تو وہ اس کے عادی ہو گئے۔ اور پہلی بات جو انہوں نے خود سے کہی، وہ یہ تھی.... اب لدی ہیں نا گدھے پر کتابیں۔ چلتے رہو۔ اس وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ عشق کے راستے پر ان کا پہلا قدم ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ عشق اور انا میں بڑا بیر ہے۔ دونوں ایک ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ یہ سفر ان کے لیے اپنی انا کو کچلنے کا ہے۔

وہ چلتے رہے۔ ہر تھوڑی دور کے بعد وہ تھک کر بیٹھ جاتے اور ہانپنے لگتے۔ سانس یوں لگتا تھا کہ قابو میں ہی نہیں آئے گی۔ اور ہر بار دوبارہ گٹھری اٹھانے کے لیے انہیں پہلے سے زیادہ ہمت کرنی پڑتی۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا گٹھری اٹھانے کو۔ انہیں اندازہ ہوتا کہ یہ اتنا مشکل کام ہے تو وہ اسے شروع ہی ... نہ کرتے۔ لیکن اب شروع کر دیا تھا تو واپسی کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ دوپہر تک ان کی بوہنی بھی نہیں ہوئی۔ کوئی کتاب نہیں بکی۔ کوئی گاہک ہی نہیں ملا۔ کسی نے انہیں روکا بھی نہیں۔ گٹھری کھلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دوپہر کے وقت ایک عورت نے انہیں روکا تو وہ خوش ہو گئے۔ بالآخر....!

"اے چاچا.... کپڑا بیچ رہے ہو کیا؟" عورت نے پوچھا "چادریں بھی ہیں؟"

"نہیں آپا۔ کتابیں ہیں۔" حمید احمد نے بڑے تحمل سے کہا۔ ورنہ ان کا دل جل گیا تھا۔

"اے میں تمہیں آپا لگتی ہوں۔" عورت نے تپ کر کہا "اور سنو، ماتھے پر بورڈ ہی لگوا لو کہ تم کتابیں بیچ رہے ہو۔ ایسے کتابیں بیچتے تو کسی کو نہیں دیکھا۔"

حمید احمد کی بوہنی تو نہیں ہوئی۔ لیکن اس پھیری والی تجارت کے کئی رموز ان پر کھل گئے۔ پہلا یہ کہ گاہک کو مخاطب کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپا تو وہ عورت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے اس طرح کسی کو کتابیں بیچتے نہیں دیکھا تھا۔ تو وہ بعد کے دور کی ہی پیداوار ہوئی نا۔ دوسری بات سائن بورڈ کی تھی۔ وہ چلتی پھرتی دکان تھے۔ اپنی پیشانی پر بورڈ نہیں لگا سکتے تھے۔ مگر آواز تو لگا سکتے تھے۔ گاہک کو پتا تو چلے کہ یہ دکان کس چیز کی ہے۔

تو وہ صدا لگائیں؟ انہوں نے حیرت سے سوچا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ تو بہت دھیمی آواز میں بولنے والے ہیں۔ یہ ان سے نہیں ہو سکے گا۔

کیوں نہیں ہو سکے گا؟ دل نے انہیں بری طرح جھڑکا۔ خوشی کمانے نکلے ہو۔ خوشی یونہی تو نہیں ملے گی۔ چلو صدا لگاؤ۔

انہوں نے ذہن میں ایک صدا کو ترتیب دیا اور اس کی خوب ریہرسل کی۔ اس کے باوجود پہلی صدا لگاتے ہوئے ان کے انداز میں اعتماد نہیں تھا۔ اور جب انہوں نے صدا لگائی تو وہ خود انہوں نے بھی بمشکل ہی سنی۔ وہ شرمندہ ہو گئے۔ مگر وہ کوشش کرتے گئے اور گلا کھلتا گیا۔ یہاں تک کہ اپنی ایک صدا پر وہ جھوم اٹھے۔ یہ ہوئی نا بات۔

"کتابیں لے لو.... بچوں کی ننھی منی رنگین کتابیں۔ کتابیں لے لو!"

کتاب تو نہیں بکی۔ مگر انہیں بھوک ایسی لگی کہ برداشت کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔ ایسی بھوک انہیں کبھی نہیں لگی تھی۔ اتنا بوجھ

اٹھا کر کبھی اتنا پیدل بھی تو نہیں چلا تھا۔ انہوں نے بھنا کر سوچا۔
چنانچہ کھانا انہوں نے اپنی جیب سے کھایا اور ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد آدھے گھنٹے تک تو ان سے چلنے کا تصور بھی نہیں کیا گیا۔

پھر وہ دوبارہ چل پڑے۔ آواز لگاتے ہوئے مگر ابھی تک انہیں عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ آواز لگاتے اور اِدھر اُدھر دیکھتے۔ انہیں لگتا، تمام لوگ انہیں دیکھ رہے ہیں.... اور اشارے کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں.... دیکھو تو' پروفیسر صاحب پھیری والے بن کر کتابیں بیچ رہے ہیں۔ اس احساس کے باوجود وہ آواز لگاتے رہے۔ اب پیچھے تو نہیں ہٹا جا سکتا۔

"انکل.... انکل...." وہ کسی بچے کی آواز تھی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے وہ بچہ دوڑتا چلا آرہا تھا۔ اس کا چہرہ اور پیشانی بے حد روشن تھے۔ اس کے نیکر اور قمیص پر جا بجا بہت خوب صورت' رنگین اسٹکر لگے ہوئے تھے
"انکل.... آپ کے پاس رنگین کتابیں ہیں؟"

"ہاں بیٹے۔" حمید احمد نے بے حد اعتماد سے کہا "ابھی دکھاتا ہوں۔" پہلے گاہک نے انہیں اعتماد سے بھر دیا تھا۔ انہوں نے گٹھری اتار کر کھولی اور کتابیں دکھانا شروع کیں۔ کتابیں پھیلانے کے بعد انہوں نے بچے کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔
"یہ کتنے کی ہے انکل.... اور یہ....؟"
"یہ ایک روپے کی۔ یہ دو روپے کی اور یہ پانچ...."
بچہ کتابوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ساری کتابیں سمیٹ کر گھر لے جائے۔ حمید احمد نے سوچا' یہ لڑکا کم از کم دس کتابیں لے گا۔
مگر پھر ایک بہت بڑی کیمیاوی تبدیلی رونما ہوئی۔ بچے کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے جانے کے لیے پلٹا....
"کیا ہوا؟ کتاب نہیں لو گے؟" حمید احمد نے اسے پکارا۔
بچے نے پلٹ کر انہیں دیکھا "سوری انکل۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک آگئی۔

حمید احمد کے دل کو کچھ ہونے لگا "تو کیا ہوا۔ پیسے کل دے دینا۔"

"نہیں انکل۔ مجھے کتاب نہیں لینی۔"
"کیا تمہیں پیسے نہیں ملتے؟"
"بہت ملتے ہیں انکل۔ بہت.... لیکن میں خرچ کر دیتا ہوں۔"
بچے کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی "مجھے تو سب سے زیادہ پیسے ملتے ہیں۔"

"تمہارے ابو دیتے ہوں گے؟"
"نہیں۔" بچے نے نفی میں سر ہلایا۔ اب وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا "میرے ابو تو اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ مجھے امی پیسے دیتی ہیں۔"
حمید احمد نے بچے کا ہاتھ تھام لیا "یہاں بیٹھو بیٹے۔" اب وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے منظر بدل گیا۔ اب وہ ایبی سینیا لائن کا علاقہ تھا۔ اس بچے کی جگہ وہ خود تھے۔ اور بچے کی شرٹ اور نیکر پر لگے اسٹکرز کی جگہ بھدے بدنما پیوند نظر آرہے تھے۔ دنیا نے بہت ترقی کر لی ہے حمید احمد۔ انہوں نے دل میں سوچا۔ اب غربت اور یتیمی کے پیوند چھپانے کے لیے اسٹکرز فراہم کر دیے گئے ہیں "سنو.... تم کوئی سی ایک کتاب پسند کر لو۔"
"لیکن انکل' میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"
"تم ایک کتاب پسند تو کرو۔"
یہ کام بچے کے لیے بہت مشکل تھا۔ حمید احمد اسے محسوس کر سکتے تھے۔ یہ کام تو ان کے لیے بھی مشکل ہی ہوتا۔ بالآخر بچے نے ایک کتاب پسند کر لی۔
"تو میاں حمید احمد' یہ کتاب کل تک کے لیے تمہاری ہوئی۔ کل یہ واپس کر دینا تو میں تمہیں دوسری دے دوں گا۔" حمید احمد کا دل ایک سچی خوشی سے بھر گیا۔ انہوں نے کتاب کو ترسے ہوئے سات سالہ حمید احمد کو ۳۵ سال بعد ایک کتاب دے کر اس کی محرومی کا ازالہ کر دیا تھا۔
بچے کی نگاہوں کی شکر گزاری تو ان کی سمجھ میں آگئی۔ لیکن حیرت کا سبب وہ نہ سمجھ سکے۔ وہ بچے کے جملے نے انہیں سمجھا دیا۔
"انکل.... میرا نام حمید احمد نہیں' عقیل ہے۔"
"ایک ہی بات ہے بیٹے۔ نام سے کیا ہوتا۔" حمید احمد کی آنکھیں بھی جلنے لگیں۔
"انکل.... یہ خیرات تو نہیں ہے نا؟" بچے نے پوچھا۔
حمید احمد کا جی چاہا کہ وہ رو دیں "نہیں بیٹے۔ یہ ایک قرض تھا مجھ پر۔ بہت تاخیر سے اتارا ہے میں نے۔"
بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا "شکریہ انکل۔ اب میں جاؤں؟"
"جاؤ بیٹے' یاد رکھنا' کل دوسری کتاب۔"
وہ حمید احمد کی بوہنی تھی۔ وہ خوشی کمانے نکلے تھے اور انہوں نے پہلی خوشی کمالی تھی.... پیسے نہیں' خوشی۔
پھر انہوں نے پیسے بھی خوب کمائے۔ وہ بچوں میں گھر گئے تھے۔ بچے بھی خوش تھے اور وہ بھی۔ لیکن شام کو گھر پہنچنے کے بعد وہ ڈھے گئے۔ انہیں لگتا تھا کہ کندھے بری طرح سوج گئے ہیں۔ اس رات انہیں ایسی نیند آئی کہ پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔
دوسرا دن بہت سخت تھا۔ گٹھری لے کر نکلنے کا تو تصور ہی ناممکن تھا' ان کا جسم بستر سے اٹھنے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا۔ لیکن قدم اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنے کے وہ قائل نہیں تھے۔
اس روز گٹھری اٹھاتے ہوئے ان کی چیخ نکل گئی۔ اماں رونے

لگیں "کیوں اپنے اوپر ظلم کرتے ہو حمید احمد؟"
"یہ ظلم نہیں اماں۔ میں بہت سچی خوشیاں کما رہا ہوں۔ آپ کو بتاؤں گا تو آپ بھی خوش ہو جائیں گی۔"
دوسرے دن انہوں نے ایک بہت اہم رمز سمجھا۔ پہلے روز آواز لگانے کے بعد ان کی بکری شروع ہوئی تھی۔ دوسرے روز انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف آواز لگانے کا کمال نہیں تھا۔ اس وقت اسکولوں کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ اب آوازیں لگانے پر بھی کوئی نہیں آ رہا تھا۔ بڑوں کو بچوں کی کتابوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
ہاں، وہ بچہ عقیل موجود تھا۔ اس تک پہنچنے سے پہلے حمید احمد کئی بڑے کاروباری فیصلے کر چکے تھے۔ ابھی تک وہ صرف پیدل چلے تھے اور اپنے ہی علاقے میں رہے تھے۔ اب انہوں نے سوچا کہ وہ ہر روز ایک نئے علاقے میں جائیں گے۔ بس میں سفر کریں گے تو گٹھری اٹھانے کی مشقت بھی کم ہو گی۔ اور وہ ہاف ٹائم یا چھٹی کے وقت کسی اسکول کے گیٹ پر اپنی گٹھری پھیلا کر بیٹھیں گے۔ بچوں کی کتابیں بچوں ہی کے لیے تو ہیں نا۔ اور انہوں نے ایک فیصلہ عقیل کے لیے بھی کیا تھا!
انہوں نے عقیل سے پچھلی کتاب لے کر نئی کتاب دی "کل سے میں شام کو آیا کروں گا.... مغرب کے وقت۔ ٹھیک ہے؟"
"ٹھیک ہے۔"
"تم اسکول نہیں جاتے بیٹے؟" انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔
"نہیں انکل۔ امی کہتی ہیں، اگلے سال داخلہ دلائیں گی۔"
اس روز حمید احمد رکے رہے۔ بچہ اپنے گھر گیا تو انہوں نے اسے دیکھا اور مکان نمبر نوٹ کر لیا۔ اب وہ ہر مہینے اس بچے کی تعلیم کے لیے کچھ رقم منی آرڈر کریں گے۔ انہوں نے خوشی سے سوچا۔
آنے والے دنوں میں سب کچھ بہتر ہوتا گیا۔ جسم ٹانگیں اور کندھے مشقت کے بتدریج عادی ہوتے ہوتے مضبوط ہو گئے۔ آواز لگانے میں ان کی جھجک ختم ہو گئی۔ ان کا اسکولوں والا تجربہ بہت کامیاب رہا۔ ہر روز وہ ایک مختلف علاقہ کور کرتے۔ شام کو وہ اپنے علاقے میں پھرتے۔ عقیل سے پچھلی کتاب لے کر نئی کتاب دیتے اور گھر لوٹ آتے۔
انہیں یاد بھی نہیں تھا کہ کتنے دن ہو چکے ہیں۔ وہ اس معمول کے عادی ہو چکے تھے اور اس میں بہت خوش تھے۔ زندگی انہیں نعمتوں سے معمور لگنے لگی تھی۔ بہت اچھی بھوک لگتی تھی، بہت اچھی نیند آتی تھی۔ اور دونوں میں بے اندازہ لذت ملتی تھی۔
اسکولوں سے ہٹ کر غریبوں کی کچی بستیاں ان کا کاروباری میدان تھیں۔ ایک بار تو وہ ابھی سینیا لائن بھی چلے گئے۔ مگر انہیں مایوسی ہوئی۔ وہاں تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔

اس روز انہوں نے عائشہ باوانی اسکول کے سامنے اپنا گٹھری بازار لگایا۔ اسکول کی چھٹی کے بعد جب وہ فارغ ہوئے تو ان کے قدم بے اختیار کالا پل کی طرف اٹھ گئے۔ وہ ایک بے خودی کے عالم میں چل رہے تھے۔ پل پار کر کے جب وہ اس مقام پر پہنچے، جہاں برسات کے اس دن مدیحہ مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی تھی، تو وہ بری طرح ٹھٹکے۔ ان کے قدم رک گئے۔ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے خود سے پوچھا۔ جواب انہیں معلوم تھا۔
تھکن بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ انہوں نے گٹھری اتار کر رکھی اور سستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ سستانے کا تو شاید بہانہ تھا۔ اصل میں خود کو ٹٹولنا اور کریدنا مقصود تھا۔
اور تھوڑی سی دیر میں انہوں نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ خود کو اچھی طرح سمجھ لیا.... اپنے اندر چھپے ہوئے کو جان لیا۔ یہ کتابیں بیچنے کا فیصلہ کرنے کے بعد سے انہیں ایک بار بھی مدیحہ یا اس کی محبت یا خود اپنی محبت یاد نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ محبتیں نہ صرف موجود تھیں۔ بلکہ ان کے باطن کی نامعلوم گہرائیوں میں روبہ عمل تھیں۔ وہ کچھ کرتے رہے تھے، جو کچھ کر رہے تھے، اس کے ظاہری محرکات اور تھے۔ لیکن حقیقی محرک وہ محبتیں تھیں، جو ان سے چپکے چپکے یہ سب کچھ کرا رہی تھیں۔ انا بہت توانا ہو تو محبت دب کر رہتی ہے۔ اور محبت دب کر رہے تو بڑی قوت بن جاتی ہے۔ محبت سچی ہو تو جانتی ہے کہ انا اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کا سامان کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے دور کر کے راستہ صاف کر دیتی ہے۔
پروفیسر حمید احمد بہت انانیت پسند تھے۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ اپنی ایک شاگردہ سے محبت کریں۔ انہیں تو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ وہ اس کی محبت کو قبول کر لیں۔ یہ ان کے اور ان کے پیشے کے وقار اور مرتبے کے منافی تھا۔ اس کے لیے وہ آسمان سے اتری ہوئی محبت کو بھی ٹھکرا سکتے تھے۔ اور انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ محبت نے خود کو باطن کی گہرائیوں میں، سات پردوں کے پیچھے چھپا لیا۔ وہ دب گئی اور دب کر کام کرتی رہی۔ پھر ابھرنے کا موقع ملا تو وہ ابھری اور اس نے خود کو منوا لیا۔ مگر اب بھی وہ انا سے برتر نہیں تھی۔
پروفیسر حمید احمد نے استعفا دیا.... صرف انا کی خاطر۔ محبت نے ان کی انا کو ان کے اور ان کی انا کے ہی خلاف استعمال کیا تھا۔ وہ اپنا وعدہ کیسے پورا نہ کرتے۔ پورا نہ کرتے تو انا مجروح ہوتی۔ وہ ضرب کاری اسے ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دیتی۔
اور محبت کا تقاضا تھا کہ پروفیسر حمید احمد محبوب کو تلاش نہ کر سکیں تو کم از کم اس کے گھر جا کر کچھ تو معلوم کریں۔ کچھ تو جانیں۔ لیکن ایک باوقار سفید پوش پروفیسر ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ جو لوگ اب اس بنگلے میں رہتے ہیں، وہ کیا سوچیں گے۔ اس کے بارے میں کیا کیا گمان کریں گے۔ اور وہ ان سے کیا پوچھیں گے....

کیسے پوچھیں گے؟ نہیں، یہ تو ان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ انہوں نے استعفا دے دیا۔ لیکن ان کا مرتبہ، ان کی شان تو کم نہیں ہوئی۔ وہ یہ نہیں کرسکتے۔

سو محبت نے راہ نکالی۔ اس نے سچی خوشی کمانے کے نام پر انہیں پھیری والا... آواز لگا کر چیزیں بیچنے والا بنا دیا۔ ان سے بھاری گٹھری اٹھوا کر انہیں میلوں پیدل چلنے والا بنا دیا۔ مرتبہ، شان، وقار... کچھ بھی نہیں رہا۔ اب تو وہ یہ کرسکتے ہیں... اور انہیں کرنا ہے۔

"میں محبت ہوں پروفیسر صاحب... سچی محبت۔ آئندہ کبھی میری نفی نہ کرنا" محبت نے کہا۔ اور حمید احمد نے جان لیا کہ اپنی انا کو وہ شہری بستیوں، گلیوں میں، سڑکوں پر بچھا کر اس پر وزن اٹھائے چلتے رہے ہیں۔ انا کو اپنی اوقات معلوم ہو چکی ہے۔

انہوں نے گٹھری اٹھائی اور چل پڑے۔ لیکن انا کچلی جانے کے باوجود بھی زندہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس طرف جائے، جہاں کبھی وہ مدیحہ کو پڑھانے کے لیے جاتے تھے... بڑی لمبی سی کار میں۔ آج کتابوں کی گٹھری اٹھائے وہ پیدل وہاں کیسے جاسکتے ہیں۔ مگر محبت اب زیادہ طاقت ور تھی۔ قدم انہیں اسی طرف لے گئے۔ انہیں تو اس وقت پتا چلا، جب ان کی نظر اس بنگلے پر پڑی "بچوں کے لیے ننھی منی کہانیاں... رنگین کتابیں لے لو۔ بچوں کی کتابیں لے لو۔"

یہ کیا کرتے ہو؟ انا نے احتجاج کیا۔ ایک تو اس طرح یہاں چلے آئے اور پھر فخر سے آواز بھی لگا رہے ہو۔

کیوں نہ لگاؤں۔ یہ وہ کام ہے، جس نے مجھے سچی خوشی دی ہے۔ انہوں نے پھر آواز لگائی "بچوں کی رنگین کتابیں..."

اور اگر صدا سن کر وہ خود باہر نکل آئی تو؟ انا نے انہیں ڈرایا۔

اول تو وہ یہاں ہے نہیں۔ اور اگر ہو اور نکل بھی آئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو رد کیے جانے کے لیے بھی تیار ہوں۔

وہ بنگلے کی طرف چلے... آواز لگاتے ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ بیل دیں گے۔ انا نے پھر احتجاج کیا۔ لیکن انہوں نے اسے مسترد کردیا۔ انہیں انا کو اس طرح روندتے دیکھا تو عزتیں دینے والے کی رحمت جوش میں آگئی۔ گیٹ کے اندر موجود چھوٹا سا گیٹ کھلا اور ایک نو دس سال کے بچے نے جھانکا "انکل... آپ اندر آجایئے۔ مجھے کتابیں لینی ہیں۔"

وہ بنگلے میں داخل ہوئے۔ بچہ انہیں لان میں لے گیا۔ وہاں گارڈن چیئر پر ایک خاتون بیٹھی تھیں "ممی... کتابوں والے انکل آگئے۔" بچے نے اس سے کہا۔

"کتابیں دکھایئے ذرا۔" خاتون نے بے حد شستہ لہجے میں کہا۔

حمید احمد نے گٹھری اتار کر رکھی، کھولی اور کتابیں پھیلا دیں۔

پھر وہ گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ سامنے اسٹڈی کی کھڑکی نظر آرہی تھی، جہاں سے وہ اس لان کو دیکھتے رہے تھے۔ آج وہ یہاں ایک مختلف حیثیت میں بیٹھے تھے۔

"تم کتابیں پسند کرلو بیٹے۔" خاتون نے کہا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟"

خاتون نے چونک کر انہیں دیکھا "پوچھیے؟ کیا بات ہے؟"

"آپ لوگ یہاں نئے آئے ہیں؟"

"ایک سال ہوگیا۔" خاتون نے جواب دیا "لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں یہاں باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ یہاں پہلے حامد صاحب رہتے تھے۔"

"ہاں۔ کوئی سوا سال پہلے ان کا اور ان کی مسز کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے یہ بنگلا خرید لیا۔"

"لیکن انہوں نے یہ بیچا کیوں؟"

"جائداد پر خوب جھگڑے ہوئے بہن بھائیوں میں۔ پھر انہوں نے اسے بیچ کر کیش میں CONVERT کرلیا۔"

"ایک بیٹی مدیحہ بھی تھی ان کی۔ وہ مجھ سے کتابیں لیتی تھی۔"

"بچوں کی کتابیں؟" خاتون نے انہیں مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

"جی نہیں۔ وہ مجھے کتابوں کے نام لکھ دیتی تھیں۔ وہ میں لا دیتا تھا۔"

"اوہ۔ وہی ایک معقول لڑکی تھی پورے گھر میں۔ وہ جائداد کے قضیے میں کبھی نہیں الجھی۔ ایک وہی ہے، جس سے میں کبھی نہیں ملی۔ جھگڑے شروع ہوتے ہی اس نے یہ گھر چھوڑ دیا تھا۔"

"کہاں گئی تھیں، یہ نہیں معلوم آپ کو؟"

"پتا تو مجھے ان میں سے کسی ایک کا بھی نہیں معلوم۔ سنا ہے، مدیحہ کے سوا سب ABROAD چلے گئے۔" خاتون نے کہا۔ پھر بچے کی طرف مڑیں "کتابیں پسند کرلیں تم نے؟"

بچے نے کتابیں دکھائیں۔ حمید احمد نے قیمت بتائی اور خاتون نے ادائیگی کردی۔ حمید احمد نے گٹھری باندھ کر اٹھائی اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آئے۔ باہر آکر انہوں نے اسٹڈی کی کھڑکی کو الوداعی نظروں سے دیکھا۔ ان کا دل بھی بوجھل ہو رہا تھا۔

وہ گٹھری اٹھا کر چل دیے۔ ان کے دل و دماغ میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ چلو... یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ انہوں نے خود سے کہا۔ تلاش ختم ہوگئی۔ جانے والے نے کہیں کوئی نشان، کوئی سراغ نہیں چھوڑا کہ اس تک پہنچا جاسکے۔

انہیں اپنی مایوسی پر حیرت ہونے لگی۔ کیا اندر کہیں انہیں یہ یقین تھا کہ مدیحہ کا پتا مل جائے گا؟ وہ اسے پالیں گے؟ ہاں یہی بات ہے۔

"کفرانِ نعمت کرنے والے مغرور اور خود پسند انسان' تو نے یہ سوچا کیسے؟ان کے اندر سے کسی نے تند آواز میں کہا۔

یہ سب درست ہے۔ حمید احمد نے بے حد عاجزی سے سوچا۔ میں نے کفرانِ نعمت کیا.... لیکن بے خبری میں.... ایک اچھے جذبے کے تحت۔ اپنے اصول اور اپنے پیشے کی عزت کی خاطر۔ اور شاید میں مغرور بھی تھا اور خود پسند بھی۔ لیکن میں نے تلافی کی کوشش بھی تو کی۔ میں نے وہ سب کچھ تیاگ دیا' جس کی وجہ سے کفرانِ نعمت کی خطا سرزد ہوئی تھی مجھ سے۔ میں نے خود کو خاک میں ملا دیا۔ کتابوں کی اس گٹھری کا بوجھ تو کچھ بھی نہیں' میں اپنے اعتراف کا بوجھ اٹھائے شہر بھر میں پھرتا پھرا ہوں۔ خود کو کم سزا تو نہیں دی میں نے۔ اور کیا کروں؟

یہ تمام سزائیں کچھ بھی نہیں۔ اندر کی آواز نے کہا۔ تیری اصل سزا یہ ہے کہ جو محبت تجھے بن مانگے' بلا کسی شرط کے مل رہی تھی' اب اس سے محرومی کے ساتھ پوری عمر گزار دے۔ اب وہ تجھے کبھی نہیں ملے گی۔

میں نے ملنے کی آرزو بھی کب کی ہے۔ میں تو صرف اعتراف کا قرض اتارنا چاہتا ہوں۔

یہ موقع بھی تجھے کبھی نہیں ملے گا۔ مل گیا تو وہ بھی مل جائے گی تجھے!

اچانک حمید احمد نڈھال ہو گئے۔ وہ گٹھری اٹھانا اب ان کے بس میں نہیں تھا۔ انہوں نے گٹھری اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ وہ تھکن ایسی تھی' ایسا اضمحلال تھا کہ ان کا پورا جسم شل ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک ٹیکسی گزری تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا "کہاں جاؤ گے؟" ٹیکسی والے نے پوچھا۔ انہوں نے بتا دیا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اب وہ گھر کے سوا کہیں نہیں جا سکتے تھے۔

○☆○

"واہ.... آج تم جلدی گھر آگئے۔" اماں انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

اس وقت چار بجے تھے۔ تھکن ایسی تھی کہ حمید احمد بیڈ پر گر گئے اور گرتے ہی بے سدھ ہو گئے۔ وہ سو کر اٹھے تو چھ بجے تھے۔ وحید کرکٹ کھیلنے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ برآمدے میں تخت پر جا بیٹھے۔ اماں ان کے لیے چائے لے آئیں۔ ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں "آج تو میں تم سے بات کر سکتی ہوں حمید احمد؟" انہوں نے پوچھا۔

"ارے اماں.... آپ کو اجازت کی ضرورت ہے کیا۔" حمید احمد کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا "مجھے گناہ گار کر رہی ہیں۔"

"ضرورت تو نہیں ہے۔ پھر بھی پوچھ رہی ہوں۔ حالانکہ تمہاری مانگی ہوئی تین ماہ کی مہلت پوری ہو چکی ہے۔"

"اوہ۔" حمید احمد چونکے۔ انہیں یاد بھی نہیں تھا "تین مہینے ہو گئے۔ وقت کیسے گزر جاتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلا۔"

"مجھ سے پوچھو۔ ایک ایک دن گنتی رہی ہوں میں۔" اماں کے لہجے میں شکایت تھی "تمہیں دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی۔ اچھا.... اب تم بتاؤ گے یا مجھے پوچھنا پڑے گا؟"

"نہیں اماں۔ میں بتاؤں گا۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر انہیں ایک ایک بات بتا دی۔ شروع سے آخر تک۔

اماں افسردہ تھیں۔ انہوں نے آب دیدہ ہو کر کہا "غم نہ کرو بیٹے۔ اللہ بچھڑے ہوؤں کو ملانے والا ہے۔ میرا رواں رواں تمہارے لیے دعا کرتا ہے۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر اماں نے کہا "آگے کا کیا سوچا ہے تم نے؟"

حمید احمد نے منٹوں میں بہت کچھ سوچ اور سمجھ لیا۔ کچھ فیصلے تو انہوں نے پہلے ہی کر لیے تھے۔ اب تین مہینے کی خود ساختہ قید سے رہائی ملی تھی تو وہ جانتے تھے کہ انہیں زندگی کی بساط نئے سرے سے بچھانی ہے "اماں.... پوری زندگی میں نے کتاب سے محبت کی ہے۔" انہوں نے کہا "پہلے پڑھتا رہا۔ پھر پڑھانے لگا۔ اب پڑھانا چھوٹ گیا ہے تو کتاب بیچنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں میں۔"

"اسی طرح.... گُھری....." اماں نے گھبرا کر کہا۔

"میری پوری بات سن لیں اماں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کچھ کہیں۔ مجھے ہی کہنے دیں۔" حمید احمد نے ان کی بات کاٹ دی "یہاں چورنگی پر، سرسید گرلز کالج کے ساتھ کچھ اچھی موقع کی دکانیں ہیں۔ میں وہ خرید کر دکان چلانا چاہتا ہوں۔ اور اماں، میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنا مکان بیچ دیں، اپنی تمام جمع پونجی مجھے سونپ دیں تاکہ میں یہ سب کچھ کر سکوں۔"

اماں ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اتنا روئیں کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ حمید احمد گھبرا گئے "کیا ہوا اماں.... کیا بات ہے۔ برا لگا آپ کو؟"

اماں نے خود کو سنبھالا اور انہیں خود سے لپٹا لیا.... بھینچ لیا "مجھے برا لگے گا.... پاگل۔ ارے آج تو میں زندہ ہو گئی ہوں۔ حمید احمد.... تم نے بہت اچھا کیا کہ پروفیسری چھوڑ دی۔ میں بھی تم سے ڈرتی تھی۔ گھبراتی تھی۔ تمہارا رعب تھا مجھ پر۔ میں تم سے محبت بیٹوں کی سی کرتی تھی۔ لیکن عزت پروفیسروں کی سی۔ اور میں سمجھتی تھی کہ تمہیں مجھ سے محبت بالکل نہیں ہے۔ مگر بیٹے، آج تم نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم مجھے ماں سمجھتے.... مانتے ہو۔ یہ بات مجھے کہنی پڑتی تو اتنی خوشی نہیں ہوتی مجھے۔ ارے ماں سے کچھ مانگا تھوڑا ہی جاتا ہے اسے بس بتایا جاتا ہے کہ ہمیں یہ ضرورت ہے اور یہ چاہیے۔ تم نے مجھے خوش کر دیا حمید احمد۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ آج تم نے مجھے مان دے دیا۔"

وہ پھر رونے لگیں۔ لیکن اس بار وہ اکیلی نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ حمید احمد بھی تھے "اماں.... مجھے اظہار نہیں آتا۔ لیکن خدا کی قسم، میں نے آپ کو اپنی اماں کی طرح ہی سمجھا ہے۔ میں نے ان سے محبت نہیں کی..... موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن آپ سے میں نے محبت کی ہے اماں۔ سچ مچ محبت کی ہے۔" وہ ہچکیوں کے درمیان کہہ رہے تھے۔

"آج مجھے یقین آگیا بیٹے۔"

حمید احمد نے آنکھیں پونچھ دیں اور افق پر نظریں جما دیں، جیسے وہاں مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی کا ایک نیا عہد شروع ہو رہا ہے!



وحید کے لیے وہ ایک بہت خاص دن تھا۔ آج یونیورسٹی میں ایم اے اسلامک اسٹڈیز کے پہلے سمسٹر کا پہلا دن تھا۔ یہ اس کے نصابی تعلیم کے آخری دور کا نکتہ آغاز تھا۔ اسلامک اسٹڈیز کے لیے اس نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ اس نے ایم اے عربی میں ٹاپ کیا تھا۔

وہ ناشتا کر چکا تھا۔ دودھ کا گلاس سامنے رکھ کر اس نے "دی نیوز" میں جین ڈکسن کے کالم YOUR HOROSCOPE کا جائزہ لیا۔ یہ بات نہیں کہ اس کا ASTROLOGY پر یقین ہو۔ لیکن پچھلے چند برسوں سے وہ اس کی عادت بن چکا تھا۔ وہ روزانہ سے دیکھتا تھا۔ لیکن فوراً ہی بھول جاتا تھا۔

اس نے TAURUS کا احوال پڑھا۔ "آپ جس محبت کے خواب دیکھتے ہیں، آج شاید وہ آپ کو نظر آجائے۔ ممکن ہے، بعد میں کبھی آپ محسوس کریں کہ یہ وہ محبت نہیں ہے۔ بلکہ آپ کو بس محبت سے محبت ہو گئی تھی۔ اس لیے جلد بازی نہ کریں۔ یہ موٹے چھلکے والا اخروٹ ہے۔ اسے توڑنے میں احتیاط نہیں کریں گے تو اس کا مغز ضائع ہو جائے گا۔"

عجیب سی پیش گوئی ہے۔ وحید نے سوچا۔ خیر.... مجھے کیا۔ یہ تو ہے کہ محبت میری کمزوری ہے۔ لیکن ایسی نہیں کہ مجھے دل پھینک بنا دے۔ یونیورسٹی میں دو سال گزار چکا ہوں میں۔ مگر لڑکیوں سے میری جھجک آج بھی ویسی ہی ہے۔ کبھی محبت ہو ہی گئی تو اظہارِ محبت نجانے کیسے کروں گا۔

اسی وقت حمید احمد بھی ناشتے کی میز پر آ گئے۔ وحید نے انہیں سلام کیا "ارے.... تم تیار بیٹھے ہو!" حمید احمد نے سلام کا جواب دینے کے بعد حیرت سے کہا۔ پھر انہیں یاد آ گیا "اوہ.... آج سے تمہاری ایم اے اسلامک اسٹڈیز کی کلاسیں شروع ہو رہی ہیں؟"

"جی ابو۔ آج پہلا دن ہے۔" وحید نے جواب دیا۔

حمید احمد بیٹے کو بڑی محبت اور فخر سے دیکھ رہے تھے۔ ماشاء اللہ قد میں ان سے بھی اونچا نکلا تھا۔ ذہین بھی وہ بہت تھا۔ پڑھائی

کے میدان میں بھی وہ ان سے آگے جا رہا تھا۔ اس نے خود ہی اپنے لیے منزل کا تعین کیا اور اس تک پہنچنے کی پلاننگ بھی کی۔ ایم اے عربی وہ کرچکا تھا۔ اب اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کررہا تھا.... اور اس کے بعد ڈاکٹریٹ۔

حمید احمد اسے دیکھتے تو ہر دکھ، ہر پریشانی بھول جاتے۔ اسے دیکھتے تو اللہ کے لیے شکر ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا اور وہ اپنی مرحوم اماں کو یاد کرتے۔ اماں کو جتنا انہوں نے دیکھا تھا، دکھوں میں، غربت میں، پریشانیوں میں، مگر بس ایک ہی فکر کرتے دیکھا تھا۔ ان کی فکر.... اس لیے کہ وہ اپنے ابا کی نسل کو جاری رکھنے کا وسیلہ تھے۔ اور اب ان کا بھی یہی حال تھا۔ وہ وحید کو اس طرح دیکھتے، اس کی فکر ویسے ہی کرتے، جیسے اماں ان کے لیے کرتی تھیں۔ وہ ان کی نسل آگے بڑھانے کا وسیلہ تھا۔ وہ بہت اہم تھا ان کے لیے۔

وحید نے دودھ کا گلاس خالی کیا اور اٹھ کھڑا ہوا "ابو.... دادی اماں.... میں چلتا ہوں۔"

"وِش یو آل دی بیسٹ!" حمید احمد نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

وحید کے جانے کے بعد اماں نے حمید احمد کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں "بس اب اس کی شادی کی فکر کرو حمید احمد۔" انہوں نے کہا "اللہ میرا یہ بہو والا ارمان بھی پورا کردے۔ پھر میں سکون سے مرسکوں گی۔"

حمید احمد کے دل پر گھونسا سا لگا۔ تو اماں مدیحہ کے ملنے کے امکان سے دستبردار ہوگئیں۔ اپنے بہو کے ارمان کے لیے انہوں نے انہیں چھوڑ کر وحید سے آس لگالی۔ ٹھیک تو ہے "آپ مرنے کی بات نہ کیا کریں اماں۔"

اماں ان کے چہرے کی کیفیت دیکھ چکی تھیں۔ انہیں وہ بات منہ سے نکلتے ہی افسوس ہونے لگا تھا "اللہ میری اصل آرزو پوری کردے تو کیا بات ہے۔" انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "بہو تو بیٹے کی بیوی ہوتی ہے۔ پوتے کی بیوی میں وہ بات کہاں۔"

"مجھے تو بھول ہی جائیں اماں۔" حمید احمد کے لہجے میں تاسف تھا "ویسے بھی اب تو بڑھاپا آگیا ہے۔"

"بڑھاپا کیسا۔ ایک بات یاد رکھو حمید احمد۔ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔" اماں تیز لہجے میں بولیں۔ پھر انہوں نے تیزی سے گفتگو کا رخ بدلا "تمہاری دکان کیسی چل رہی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے اماں۔ اب تو وہ جگہ سونے کی قیمت کی ہے۔ اور دکان بھی بہت اچھی چل رہی ہے۔"

اماں نے پان کی تھالی لاکر ان کے سامنے رکھ دی "تم تیار نہیں ہوئے ابھی تک؟"

حمید احمد نے پان بنایا اور اٹھا کر منہ میں رکھ لیا "آج دیر سے جاؤں گا اماں۔ دکان شعیب کھولے گا۔ رات میں چابی اسے دے آیا تھا۔"

"یہ بھی اللہ کا بڑا کرم ہے تم پر۔ تمہیں قابلِ اعتماد ملازم مل گئے۔ لوگ ترستے ہیں اس نعمت کو۔"

"بے شک اماں۔ اللہ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ آٹھ سال پہلے انہوں نے وہ دکان خریدی تھی تو انہیں کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور دکان کے لیے تو مشہور ہے کہ پہلے سال چٹی، دوسرے سال ہٹی اور تیسرے سال کھٹی۔ کہتے ہیں کہ تین سال ثابت قدمی سے ڈٹے رہو، تب کہیں دکان چلتی ہے۔ اب حمید احمد سوچتے تھے کہ شاید ایسا ہوتا تو وہ ٹھہر ہی نہیں پاتے۔ انہوں نے ایسے احساسات کے ساتھ کاروبار شروع کیا تھا، جو آدمی کو کمزور کردیتے ہیں۔ انہیں احساس تھا کہ ان کی عمر ڈھل رہی ہے۔ وہ تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عدم تحفظ کا احساس بھی بہت طاقت ور تھا۔ پھر وہ تجارت کے اصولوں سے ناواقف تھے۔ ایسے میں ایک اجنبی میدان میں قسمت آزمائی....!

لیکن اللہ کی مہربانی سے ان کی دکان ابتدا ہی سے چل پڑی۔ چند مہینوں میں یہ حال ہوگیا کہ وہ اکیلے آدمی کے بس کا کام نہیں رہا۔ پھر خوش قسمتی سے انہیں اچھے اور ایماندار ملازم مل گئے۔ انہوں نے بھی ہمیشہ ان کو عزت دی، ان کی قدر کی اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا۔ اب وہ کفرانِ نعمت کرنے سے بہت ڈرتے تھے۔

ان آٹھ برسوں میں انہیں وہ معاشی استحکام ملا، جس کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اب تو صرف دکان ہی

لاکھوں کی تھی۔ اور ان کی ماہانہ آمدنی کا اوسط بھی لاکھ سے اوپر ہی تھا۔ مگر انہوں نے اپنا مکان اور رہن سہن نہیں بدلا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے مکان کو ڈھنگ سے بنوالیا۔ باقی ان کے طرز زندگی اور ان کے اخراجات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ یہ سوچ کر پس انداز کرتے رہے کہ کبھی وحید کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ سو اب ان کا بینک بیلنس لاکھوں میں تھا۔

اس اعتبار سے انہیں آسودہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ بے حد ناآسودہ تھے۔ اس ناآسودگی کا سبب یہ نہیں تھا کہ مدیحہ ان کی زندگی میں نہیں آئی۔ کیونکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے تو ایسا کوئی خواب دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے تو ایک وعدہ کیا تھا اور وقت آنے پر اسے پورا کیا تھا۔ اس طرف سے بھی انہیں طمانیت تھی۔ ناآسودگی کا سبب صرف اور صرف محبت تھی۔ اور ایک سبب یہ تھا کہ وہ محبت کو آسودگی اور طمانیت فراہم کرنے والی نعمت کی حیثیت سے جانتے تھے۔

محبت کے بارے میں جو کچھ وہ جانتے تھے' وہ صرف کتابی تھا یا پھر ان کے پاس مدیحہ کا حوالہ تھا۔ ان دونوں حوالوں نے محبت کی کچھ اور ہی تصویر کھینچی تھی۔ شعروادب کے حوالے سے محبت ایک ایسا نہایت طاقت ور جذبہ تھا' جو آدمی کی کایا پلٹ کردیتا تھا۔ وہ نزاکت فکر' سوچوں کی خوب صورتی اور حسن نظر کو فروغ دیتا تھا۔ وہ تخلیقی جوہر کو توانائی بخشتا تھا۔ وہ آدمی کو کہیں سے کہیں لے جاتا تھا۔ وہ انسان میں ایسے جذبے' ایسے خواص' ایسے اوصاف پیدا کرتا تھا کہ انسانیت بھی اس پر فخر کرنے لگے۔

اور مدیحہ کو دیکھ کر انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ آسودگی اور طمانیت کیا ہوتی ہے۔ اس کی کیفیات سن کر انہیں بلاوجہ رشک نہیں آیا تھا۔ انہوں نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ محبت نے ایک ٹین ایجر.... ایک عام سی لڑکی کو کیسی قابل فخر بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اور انہوں نے مدیحہ کو ہر مرحلے میں دیکھا تھا۔ سپردگی کی تو بات ہی اور ہے۔ اس کے تو اضطراب میں بھی ٹھنڈک اور سکون تھا۔ اس میں مٹھاس ہی مٹھاس تھی' کڑواہٹ نام کو بھی نہیں تھی۔ اس میں ضبط تھا' گہرائی تھی' ایثار کی خو تھی' خود نمائی کی نفی تھی۔ وہ بغیر احساس دلائے' بغیر سامنے آئے مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس میں بے غرضی تھی۔ خلوص تھا اور اس خلوص میں شدت تھی۔ اس میں پالینے کی' قابض ہوجانے کی ہوس نہیں تھی۔ تبھی تو انہوں نے محبت کی آرزو کی تھی!

لیکن انہیں محبت ہوئی تو پتا چلا کہ وہ ان کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔ انہیں محبت ہوئی تو وہ پستی میں چلے گئے.... ہر اعتبار سے۔ انہیں وہ پیشہ ترک کردینا پڑا' جس میں ان کی عزت اور توقیر تھی۔ وہ سرگرداں ہوئے۔ سڑکوں پر مارے مارے پھرے۔ وہ گویا مٹی میں مل گئے۔ اور انہیں ملا کچھ بھی نہیں۔ نہ بے خودی، نہ سرمستی' نہ خوشی نہ سکون۔ انہیں ملا تو جلانے' بے چین کرنے والا اضطراب۔ انہیں ملا تو احساس نارسائی۔

مگر نہیں.... محبت نے ایک چیز ان کو دی.... تصور۔ ورنہ وہ کبھی تصوراتی آدمی نہیں رہے تھے۔ وہ تو بے حد عملی تھے۔ وہ کبھی کسی چیز کو پانے کی آرزو نہیں کرتے تھے۔ دل میں آرزو پیدا ہوتی تو وہ اس پر سوچتے۔ تخمینہ لگاتے۔ فیصلہ کرتے کہ وہ ان کے لیے ممکن ہے یا نہیں۔ ممکن ہوتا تو وہ اس کے لیے نپی تلی کوشش شروع کردیتے۔ ان کے سامنے ایک ہدف ہوتا کہ وہ اتنے عرصے میں یہ چیز حاصل کرلیں گے اور اگر وہ ان کے خیال میں ممکن نہ ہوتا تو وہ اس کا خیال دل سے نکال دیتے۔ قصہ ختم۔ یہ ان کے مزاج میں نہیں تھا کہ وہ تصور میں اسے حاصل کریں اور اس پر خوش ہوں۔ یہ ان کے لیے منفی چیز تھی۔

مگر اس رات' جب وہ دن میں مدیحہ کے بنگلے پر گئے تھے اور انہیں پتا چلا کہ مدیحہ کا سراغ نہیں مل سکتا' وہ سونے کے لیے لیٹے تو ان کے تصور میں بڑا جیتا جاگتا منظر آگیا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ مدیحہ کے روبرو مجرموں کی طرح کھڑے ہیں۔ انہوں نے اپنا خط اسے دیا ہے "یہ امانت تم تک پہنچانے کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کہاں کہاں نہیں پھرا۔" وہ کہہ رہے ہیں۔

لیکن اس تصور میں بھی طمانیت' سکون' بے خودی' لذت.... کچھ بھی تو نہیں تھا ان کے لیے۔ مدیحہ نے خط پڑھا اور بڑی بے رخی سے انہیں دیکھا "سوری سر۔" اس کے لہجے میں بھی بے رخی تھی "میں بہت پہلے اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ آپ کا مؤقف درست ہے۔ استاد اور شاگرد ہونے کی حیثیت سے مجھے اور آپ کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی آپ کی محبت سے توبہ کرلی تھی۔ آپ بھی توبہ کرلیں۔ اور ویسے بھی اب تو میری شادی ہونے والی ہے۔"

تصور میں حمید احمد پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا "توبہ میں نہیں کرسکتا۔" انہوں نے عاجزانہ لہجے میں کہا "کیونکہ ترک محبت میرے بس میں نہیں۔ اور میں تم سے شادی کی درخواست کرنے نہیں آیا تھا۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا' وہ پورا کردیا ہے۔ یہ قرض تھا مجھ پر۔ میں صرف اعتراف کرنے آیا ہوں۔"

"آپ کس وعدے کی بات کررہے ہیں۔" مدیحہ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ پھر اس نے کہا "ارے.... وہ.... مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ چلیں' ٹھیک ہے۔ شکریہ۔"

تصور کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مگر وہ جاگتے رہے۔ انہیں نیند نہیں آئی۔ سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی' جو پانی پینے سے بجھنے والی نہیں تھی۔

اس خوب صورت داستان محبت کا آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے۔

مجھے احساس ہے کہ یہ ایک عجیب کہانی ہے۔ میں خود بھی اسے نہیں سمجھ پایا ہوں۔ میں اس امید پر اسے جوں کا توں لکھ رہا ہوں کہ ممکن ہے کوئی قاری جو انسانی فطرت کی پیچیدگیوں سے مجھ سے زیادہ واقف ہو، اسے سمجھ کر مجھے بھی سمجھا سکے۔

سب سے پہلے تو میں یہ واضح کردوں کہ یہ میری کہانی نہیں ہے اور نہ ہی اس کہانی کے کرداروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ یہ قصہ ایک شام مجھے میرے دوست نیڈ پریسٹن نے سنایا تھا۔ سنانے کی بھی وجہ یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اُسے یہ خوش فہمی تھی کہ میں اس مسئلے کو سمجھ کر اُسے کوئی مناسب مشورہ دوں گا۔

نیڈ کے بارے میں بھی مَیں آپ کو بتاتا چلوں۔ میرا یہ دوست وارم وُڈ جیل کا وزِٹر ہے۔ وہ ایسا سوشل ورکر ہے، جو اپنے کام سے عشق کرتا ہے۔ قیدیوں کی پریشانی کو وہ اپنی پریشانی تصور کرتا ہے۔ اُن کے مسائل حل کرنے کے لئے وہ اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

اس روز ہم نے کینفے رائل میں کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد

اُسی ظالم سمرسٹ ماھم کے ذخیرے میں سے پس انداز کی گئی یہ کہانی کچھ اِس طور شائع کی جارہی ہے کہ اس کی اشاعت پر ادارے کے مختلف احباب مختلف آرا رکھتے ہیں۔ جون ایلیا صاحب کا کہنا ہے کہ یہ اعلیٰ ترین کہانی ہے اور اعلیٰ ترین ذوق رکھنے والے ذہین افراد ہی اس کہانی سے حظ حاصل کرسکتے ہیں۔ محی الدین نواب صاحب فرماتے ہیں کہ دماغ کی چولیں ہلا دینے والی یہ تحریر اگر یکسوئی سے پڑھی گئی تو کسی پڑھنے والے کو مایوسی نہ ہوگی۔ اقلیم علیم صاحب کو یہ کہانی اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اسے دس بار پڑھا اور کہا: "اس کہانی پر کوئی گفتگو نہیں ہونی چاہیئے بس اس سے لُطف حاصل کیا جائے۔" غلام قادر نے کہا کہ میں تو ماھم کے نام پر سب کچھ پڑھ سکتا ہوں اور اس سے لُطف اُٹھا سکتا ہوں۔ ساجد امجد کہتے ہیں کہ اگر یہ سمرسٹ ماھم کی کہانی نہ بھی ہوتی تو میں اسے اعلیٰ درجے کی کہانی قرار دیتا لیکن ایک بات جو سب نے مشترکہ کہی وہ یہ کہ ہوسکتا ہے یہ سب پڑھنے والوں کی سمجھ میں شاید نہ آئے۔ ہم نے اس بات سے اختلاف کیا جس کا ثبوت ہے کہ کہانی کو شائع کیا جارہا ہے

گھٹن اور حبس کی یکسانیت سے اُکتائے ہوئے نوجوان نے تازہ ہوا سے اپنا رشتہ کیسے باندھا؟

علیم الحق حقی

استعارہ



ہے کہ مناسب وقت پر ہوگی۔ جب وہ خوش حال ہو جائے گا۔ میرا ہربرٹ بے وقوف نہیں۔۔۔۔ بہت سمجھدار ہے۔"

مسٹر سبزی خاموش ہو گئے۔ یہ انہوں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ بیڑائس کو بحث میں پلٹ کر جواب دینا ان کے لئے لاحاصل ہے۔

"میں شادی کے خلاف نہیں ہوں مگر شادی سے پہلے آدمی کو برے بھلے کی تمیز اور شعور ہونا چاہئے اور تیس پینتیس کی عمر سے پہلے یہ ممکن نہیں۔"

"وہ اپنے تحفے دیکھ کر بہت خوش ہوا ہے۔" مسٹر سبزی نے موضوع بدلا۔

"ہونا بھی چاہئے" مسز سبزی اب بھی اپ سیٹ تھیں۔

تحفے واقعتاً بہت اچھے تھے۔ مسٹر سبزی نے اسے تحفے میں رسٹ واچ دی تھی جس کی سوئیاں اندھیرے میں بھی چمکتی تھیں اور مسز سبزی نے اسے پتنگ کا تحفہ دیا تھا۔

اور وہ کسی بھی اعتبار سے اس کی زندگی کی پہلی پتنگ نہیں تھی۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ سات سال کا تھا۔ ان کے گھر کے قریب ہی ایک پبلک پارک تھا۔ اکثر ہفتے کی سہ پہر کو جب موسم خوشگوار ہوتا تو مسز سبزی اپنے شوہر اور بیٹے کو پارک لے جاتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہفتے بھر دفتر کے گھٹے ماحول میں محنت کرنے کے بعد سیوئیل کے لئے تازہ ہوا بہت ضروری ہے۔ پارک بہت بڑا تھا اور وہاں بہت زیادہ لوگ ہوتے تھے۔ مسز سبزی جو لئے دیے رہنے کی عادی تھیں حتی الامکان خود کو لوگوں سے بچائے رہتیں۔

"ممی۔۔۔ ممی۔۔۔ وہ پتنگ" دیکھیں ایک دن ننھے ہربرٹ نے کہا۔

اس روز خوش گوار ہوا چل رہی تھیں اور آسمان پر چھوٹی بڑی۔۔۔ ہر طرح کی پتنگیں ہوا میں تیرتی پھر رہی تھیں۔

"دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ کیسے اڑائی جاتی ہیں؟" مسٹر سبزی نے پوچھا۔

"جی ہاں ڈیڈ۔"

پارک کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے پتنگ اڑانے والے لڑکے لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ پتنگ ہاتھ میں لے کر ٹیلے پر دوڑ رہے تھے تاکہ ہوا ان کی پتنگوں کو اٹھا دے۔ کبھی ان کی پتنگیں اڑنے کے بجائے زمین پر گر جاتیں اور وہ اڑتیں تو اڑانے والے دھاگے سے ڈھیل دے کر انہیں اور ستا دیتے۔

ہربرٹ سحرزدہ سا انہیں دیکھتا رہا۔

"ممی۔۔۔۔ مجھے پتنگ مل سکتی ہے؟" بالآخر اس نے کہا۔ یہ بات اس نے بہت پہلے سیکھ لی تھی کہ کوئی چیز درکار ہو تو ممی سے مانگنا ہی بہتر ہے۔

"کس لئے ہربرٹ؟"

"اڑانے کے لئے۔"

"بیٹا۔۔۔۔ اس میں ہاتھ کٹ بھی سکتا ہے۔"

مسٹر اور مسز سبزی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چپکے سے مسکرائے۔ انہیں بیٹے کی اس فرمائش پر حیرت ہوئی تھی۔

"اگر تم اچھے لڑکے بنو گے اور میرے کہے بغیر ہر صبح باقاعدگی سے اپنے دانتوں کو صاف کرو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ سانتا کلاز کرسمس کے موقع پر تمہارے لئے پتنگ کا تحفہ نہ لے آئے۔" مسز سبزی نے کہا۔

کرسمس زیادہ دور نہیں تھا۔۔۔ اور پھر سانتا کلاز ننھے ہربرٹ کے لئے پہلی پتنگ لے آیا۔

ابتدا میں تو ہربرٹ کے لئے پتنگ سنبھالنا دشوار ہوا۔ مسٹر سبزی خود پتنگ لے کر ڈھلوان پر بھاگتے اور جب وہ بلند ہو جاتی تو ڈور اسے تھما دیتے۔ وہ بہت چھوٹی پتنگ تھی مگر جب ہربرٹ اسے فضا میں اڑتے، تیرتے اور غوطہ لگاتے دیکھتا اور اس کے ہاتھ کو پتنگ کے جھٹکے لگتے تو اس کے جسم میں جیسے برقی رو دوڑنے لگتی۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ ننھا ہربرٹ ہفتے کے دن کا۔۔۔۔ سہ پہر کا انتظار کرنے لگا۔ باپ کے دفتر سے آتے ہی وہ ماں سے پارک چلنے کی ضد کرنے لگتا۔

جلد ہی وہ پتنگ اڑانا سیکھ گیا۔ مسٹر اور مسز سبزی ٹیلے کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اسے پتنگ لے کر نیچے کی طرف بھاگتے دیکھتے تو ان کے سینے فخر سے بھر جاتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہربرٹ کو پتنگ بازی سے عشق ہو گیا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا ماں کی طرف سے ملنے والی پتنگیں بھی بڑی ہوتی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس فن میں طاق ہو گیا۔ ہوا کا رخ، ہوا کا مزاج وہ بہت اچھی طرح سمجھنے لگا۔ وہ پتنگ سے ایسے ایسے تماشے دکھاتا، جو بظاہر ممکن ہی نظر نہیں آتے تھے۔

پارک میں پتنگ اڑانے والوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ ان میں بچے ہی نہیں، عاقل و بالغ مرد بھی تھے۔ اور مشترکہ مشاغل سے زیادہ آسانی سے دنیا کی کوئی چیز انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب نہیں کرتی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف ہربرٹ اور مسٹر سبزی بلکہ مسز سبزی بھی وہاں موجود لوگوں سے گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ وہاں خود کو ماحول سے کٹا دیکھنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہاں سب اپنی اپنی پتنگوں کے بارے میں شیخیاں مارتے اور اپنی اپنی مہارت کے گن گاتے۔ موازنے ہوتے، مقابلے کی باتیں ہوتیں۔

ہربرٹ سولہ سال کا ہو گیا۔ اب وہ کبھی کسی پتنگ باز کو چیلنج کرتا۔ وہ اپنی پتنگ کو مخالف کی پتنگ کے ساتھ ہوا کے رخ پر اڑاتا۔ پھر وہ اپنی ڈور کو مخالف کی ڈور سے ملاتا اور ڈور کھینچتا۔ مخالف کی پتنگ کٹ جاتی۔

اس اثنا میں مسز سبزی کو بھی پتنگ اڑانے کا شوق ہو گیا

تھا۔ کبھی کبھی وہ بیٹے سے فرمائش کرتے کہ وہ انہیں بھی پتنگ اڑانے دے۔ دھاری دار پتلون پہنے پتنگ کو لے کر ڈھلوان کی طرف بھاگتے ہوئے وہ بہت عجیب سے لگتے۔ سر پر باؤلر ہیٹ بھی موجود ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے لپکتی مسز سبزی بھی اُن کے پیچھے ہوتیں۔ پتنگ اڑنے لگتی تو وہ ڈور شوہر کے ہاتھ سے لے لیتیں اور آہستہ آہستہ ڈھیل دیتے ہوئے، پتنگ اور اوپر...... اور اوپر جاتے دیکھتی رہتیں۔

یوں ہفتے کا دن...... خاص طور پر سہ پسران تینوں کے لئے خوشی کی علامت بن گیا۔ مسٹر سبزی اور ہربرٹ صبح ساتھ ہی گھر سے نکلتے تھے۔ وہ ایک ہی ٹرین میں سفر کرتے تھے۔ ہفتے کی صبح وہ نکلتے تو سب سے پہلے آسمان کو دیکھتے...... کہ موسم پتنگ بازی کے لئے سازگار ہے یا نہیں۔ انہیں وہ دن سب سے اچھے لگتے، جب تیز ہوا چل رہی ہوتی۔ ہوا کی تلون مزاجی میں انہیں اپنی مہارت دکھانے کا بھرپور موقع ملتا تھا۔ پورے ہفتے شام کو وہ پتنگ بازی کے متعلق باتیں کرتے گھر واپس آتے۔ چھوٹی پتنگوں کا تذکرہ وہ حقارت سے کرتے اور اپنی پتنگ سے بڑی پتنگوں کے متعلق باتیں کرتے وقت ان کے لہجے میں حسد ہوتا۔ دوسرے پتنگ بازوں کی کارکردگی کے متعلق بہت تند و تیز و تلخ گفتگو ہوتی، جیسے فٹ بال کے کھلاڑی یا باکسر اپنے حریفوں کے متعلق کرتے ہیں۔ دونوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ایک دن اتنی بڑی پتنگ اڑائیں گے کہ کسی نے نہیں اڑائی ہوگی اور وہ اتنی بلندی تک اڑے گی کہ کسی کا تصور بھی وہاں تک نہیں جا سکے گا۔

ڈور استعمال کرنا تو وہ پہلے ہی ترک کر چکے تھے کیونکہ ہربرٹ کو اس کی اکیسویں سالگرہ پر انہوں نے جو پتنگ دی تھی، وہ سات فٹ اونچی تھی۔ اب وہ ڈور کی جگہ پیانو کا تار استعمال کرتے تھے، جسے انہوں نے ایک بڑے ڈرم پر لپیٹ رکھا تھا لیکن اس سے ہربرٹ کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ کسی نے باکس کائٹ ایجاد کی ہے۔ اس آئیڈیے میں اس کے لئے زبردست اپیل تھی۔ اب وہ خود باکس کائٹ بنانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ڈرائنگ اسے اچھی خاصی آتی تھی سو اس پر سہ جہتی پتنگ کا ڈیزائن بنانے کی دُھن سوار ہوگئی۔

اس نے سہ جہتی پتنگ کا ایک چھوٹا ماڈل تیار کیا اور اس کی آزمائش کی لیکن تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ ہربرٹ ضدی لڑکا تھا۔ شکست تسلیم کرنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ اس نے ٹھان لیا کہ پتنگ بنانے میں اُس سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اسے اس غلطی کو دور کرنا ہے۔

پھر ایک تبدیلی آئی۔

شام کی چائے کے بعد ہربرٹ باہر جانے لگا۔ مسز سبزی کو یہ تبدیلی ایک آنکھ نہ بھائی۔ لیکن مسٹر سبزی نے معقولیت سے انہیں سمجھا دیا۔ انہوں نے کہا کہ لڑکا اب بائیس سال کا ہے اور گھر بیٹھے بیٹھے اس کا بور ہو جانا قدرتی امر ہے۔ اگر وہ چہل قدمی کے لئے یا فلم دیکھنے کی غرض سے جاتا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔

لیکن ہربرٹ کیوپڈ کے تیر کا نشانہ بن چکا تھا۔ ایک شام پارک میں بہت کامیاب وقت گزار کر آنے کے بعد وہ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اس نے اچانک کہا "ممی...... کل میں نے ایک لڑکی کو چائے پر مدعو کیا ہے۔ ٹھیک ہے ممی؟"

"کیا...... کیا تم نے کیا ہے؟" مسز سبزی یوں ہڑبڑائیں کہ گرامر بھی بھول گئیں۔

"آپ نے سن لیا ہے ممی۔"

"پوچھ سکتی ہوں کہ وہ لڑکی کون ہے اور تم اسے کیسے جانتے ہو؟" مسز سبزی نے تند لہجے میں پوچھا۔

"اس کا نام بیون ہے...... بیٹی بیون۔ ہفتے کی ایک شام، جب بارش ہو رہی تھی، وہ مجھے ایک سینما ہاؤس میں ملی۔ بس اتفاق تھا۔ وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کا بیگ گر گیا۔ میں نے اٹھا کر دے دیا۔ اس نے شکریہ ادا کیا میرا...... اور پھر ظاہر ہے، ہمارے درمیان بات چیت ہونے لگی۔"

"تو تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ تم اس فرسودہ پھندے کا شکار ہو گئے ہو؟ ہونہہ...... بیگ گر گیا اس کا......"

"آپ غلطی پر ہیں ممی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے...... بہت ہی اچھی۔ اور تعلیم یافتہ بھی ہے۔"

"یہ سب کچھ کب ہوا؟"

"کوئی تین ماہ پہلے کی بات ہے۔"

"اوہ...... تمہیں اس سے ملے تین ماہ ہو گئے.... اور اب تم کل اسے چائے پر بلا رہے ہو؟"

"بات یہ ہے.... کہ میں اس عرصے میں اُس سے ملتا رہا ہوں۔ پہلی ملاقات کے بعد میں نے اسے فلم کی دعوت دی تھی...... منگل کی شام۔ اس نے کہا کہ یہ یقینی نہیں ہے۔ ممکن ہے، وہ آسکے اور ممکن ہے وہ نہ آسکے۔ لیکن وہ آگئی بہرحال۔"

خوش خوراک

ایک خوش حال تاجر کو کسی معمولی جرم میں دو ہفتے کی قید یا ایک ہزار روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ تاجر نے قید بھگتنے کو ترجیح دی تو اُس کے دوست حیران رہ گئے۔ انہوں نے تاجر سے کہا۔ "ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیوں نہیں ادا کر دیتے؟ ایسی بھی کیا کنجوسی!" تاجر نے وضاحت کی۔ "کنجوسی کی بات نہیں، دراصل آج ہی ہمارے باورچی نے دو ہفتے کی چھٹی لی ہے.... گھر پر رہوں گا تو بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانا پڑے گا۔"

"وہ تو اسے آنا ہی تھا۔ تم مجھ سے پوچھ لیتے تو میں تمہیں بتا دیتی۔"

"اس کے بعد سے ہم ہفتہ میں دو بار ساتھ فلمیں دیکھتے رہے ہیں۔"

"تو اسی لئے تم کثرت سے گھر سے غائب رہتے تھے؟"

"جی ہاں، لیکن میری بات سنیں۔ میں اُسے آپ پر زبردستی نہیں تھوپنا چاہتا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ ممی کے سر میں درد ہے آج...... اور کسی ریسٹورنٹ میں لے جاؤں گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہاری ممی کو اس دعوت پر کوئی اعتراض نہیں" مسٹر سبزی جلدی سے بولے "بس بات اتنی سی ہے کہ تمہاری ممی اجنبیوں سے گھلنا ملنا پسند نہیں کرتیں۔ انہیں یہ کبھی اچھا نہیں لگا۔"

"میں خود کو اپنی حد تک رکھنے کی عادی ہوں" مسز سبزی نے اداسی سے کہا "وہ کرتی کیا ہے؟"

"شہر میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ ایک ہوم میں رہتی ہے، جسے گھر نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی ماں کا انتقال ہوچکا ہے۔ باپ نے دوسری شادی کرلی۔ اب ان کے تین بچے ہیں اور اس کی اپنی سوتیلی ماں سے نہیں بنتی۔ وہ کہتی ہے...... ہر وقت چخ چخ ہوتی رہتی تھی۔"

مسز سبزی نے چائے کی اس دعوت کے سلسلے میں زبردست اہتمام کیا۔ انہوں نے ڈرائنگ روم میں چھوٹی میز سیٹ کی۔ انہوں نے اس پر بڑا نفیس میز پوش نکال کر بچھایا۔ پھر کراکری کا بھی خاص اہتمام کیا۔ وہ برتن نکالے، جو کبھی استعمال نہیں کئے جاتے تھے۔ پھر کیک بنایا۔ میٹھی ٹکیاں تلیں۔ ڈبل روٹی کے بہت پتلے سلائس تیار کئے۔

"میں اس پر ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ہم کوئی گئے گزرے لوگ نہیں ہیں۔" انہوں نے اپنے شوہر کو بتایا۔

ہربرٹ مس بیون کو لانے کے لئے گیا ہوا تھا۔ مسٹر سبزی احتیاطاً دروازے پر جا کھڑے ہوئے کہ کہیں ہربرٹ اپنی دوست کو ڈائننگ روم میں نہ لے جائے، جہاں عام طور پر وہ لوگ کھانا کھاتے اور بیٹھتے تھے۔

ہربرٹ مس بیون کو لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس نے آراستہ میز کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔

"ممی...... یہ بیٹی ہے۔" اس نے مسز سبزی سے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے مس بیون" مسز سبزی نے تصحیح کی۔

"جی ہاں" مس بیون بولی "لیکن آپ مجھے بیٹی کہہ کر پکاریں۔"

"میرا خیال ہے کہ ابھی ہماری شناسائی اتنی طویل نہیں ہوئی کہ میں ایسا کروں" مسز سبزی نے باوقار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیٹھئے مس بیون۔"

عجیب بات یہ تھی...... بلکہ شاید ہرگز عجیب نہیں تھی کہ بیٹی بیون بالکل ویسی تھی، جیسی مسز سبزی اس عمر میں رہی ہوں گی۔ اس کے نقوش بھی ویسے ہی تیکھے تھے اور آنکھیں چھوٹی لیکن چمکدار۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک تھی۔ رخساروں پر ہلکا سا غازہ تھا اور سیاہ بال گھونگھریالے بنائے گئے تھے۔ مسز سبزی نے صرف ایک نظر میں یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ انہوں نے اس کے لباس کی قیمت کا تخمینہ بھی لگا لیا۔ مس بیون اونچی ایڑی کے قیمتی جوتے پہنے ہوئے تھی۔ سر پر جدید فیشن کا ہیٹ تھا۔ اس کی فراک بہت اونچی تھی، جس کی وجہ سے اس کی جلد کے ہم رنگ اسٹاکنگز کا بیشتر حصہ نظر آرہا تھا۔ میک اپ اور لباس کی وجہ سے مسز سبزی نے اسے فوراً ہی ناپسند کردیا لیکن انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا طرزِ عمل معزز خواتین کا سا ہی رکھیں گی۔ چنانچہ ابتدا میں تو معاملات ٹھیک چلتے رہے۔

مسز سبزی نے پیالیوں میں چائے انڈیلی اور ہربرٹ سے کہا کہ وہ اپنی دوست کو چائے پیش کرے۔

"سیموئیل ڈیئر، مس بیون سے پوچھو کہ یہ میٹھی ٹکیاں لیں گی یا ڈبل روٹی اور مکھن؟" انہوں نے شوہر سے کہا۔

"دونوں ہی لو ڈیئر۔" مسٹر سبزی نے بڑے پھوہڑپن سے دونوں پلیٹیں سب کے سامنے گھمائیں۔ "مجھے لوگوں کو کھاتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔" انہوں نے وضاحت کی۔

بیٹی نے ڈرتے ڈرتے ایک سلائس اور ایک میٹھی ٹکیہ طشتری پر رکھ لی۔ مسز سبزی نے بڑی تندہی سے موسم پر گفتگو شروع کردی۔ انہیں یہ دیکھ کر طمانیت ہو رہی تھی کہ بیٹی لمحہ بہ لمحہ نروس ہوتی جارہی ہے۔

پھر انہوں نے کیک کاٹا اور مہمان کی طرف ایک بہت بڑا ٹکڑا بڑھا دیا۔ بیٹی نے دانتوں سے ذرا سا کیک کاٹا اور طشتری میں رکھنے کی کوشش کی۔ ٹکڑا بڑا ہونے کی وجہ سے طشتری سے پھسل کر نیچے جاگرا۔

"اوہ...... آئی ایم سوری" بیٹی نے کہا اور جھک کر کیک اٹھا لیا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ایک اور پیس کاٹ دیتی ہوں تمہارے لئے۔" مسز سبزی نے کہا۔

"زحمت نہ کیجئے، میں یہی کھالوں گی۔ فرش بالکل صاف ہے۔"

"امید تو یہی ہے مجھے" مسز سبزی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری "لیکن میں تمہیں ایسا کیک کھلانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی، جو فرش پر گرچکا ہو۔ یہ پیس ادھر دو ہربرٹ۔ میں مس بیون کو اور پیس دیتی ہوں۔"

"مجھے کیک نہیں چاہئے مسز سبزی۔ واقعی... دل نہیں چاہ رہا میرا..."

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میرا کیک پسند نہیں آیا۔ میں نے خاص طور پر تمہارے لئے بنایا تھا۔" مسز سبزی نے دانتوں سے بڑا سا ٹکڑا کاٹ کر چبایا "مجھے تو ٹھیک ٹھاک لگ رہا ہے۔"

"یہ بات نہیں مسز سبزی۔ کیک تو بہت اچھا ہے، بس مجھے خواہش نہیں ہے اس وقت" مس بیون نے اور چائے لینے سے بھی انکار کردیا۔ اس نے پہلی پیالی ہی یوں خالی کی، جیسے اس سے پوچھا جا رہا ہو اُسے خوشی ہوئی ہو۔

مسز سبزی نے سوچا "لگتا ہے، یہ لوگ کھانا بھی کچن ہی میں کھاتے ہوں گے۔ ہربرٹ نے سگریٹ سلگا لیا۔

"ایک سگریٹ مجھے بھی دو ہرب" بیٹی نے کہا "بہت طلب ہو رہی ہے۔"

مسز سبزی کو سگریٹ پینے والی عورتیں بہت بری لگتی تھیں۔ تاہم انہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بس بھویں اچکا کر رہ گئیں۔ پھر انہیں خیال آیا کہ بیٹی نے ان کے بیٹے کا نام بگاڑا ہے۔ "مس بیون، ہم اسے ہربرٹ کے نام سے پکارنا پسند کرتے ہیں" وہ بولیں۔

مس بیون بے وقوف نہیں تھی۔ اُسے احساس ہو گیا تھا کہ مسز سبزی اسے اپ سیٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔ اس بار اسے بھی جوابی حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا "جب اس نے مجھے اپنا نام ہربرٹ بتایا تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کسی کو ہربرٹ کے نام سے پکارا بھی جا سکتا ہے۔ مجھے تو عجیب معلوم ہوتا ہے یہ نام......"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میرے بیٹے کا وہ نام پسند نہیں آیا جو اسے اس کے بپتسمے کے موقع پر دیا گیا تھا۔ مجھے تو یہ نام اچھا لگتا ہے۔ اب یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کس طبقے کے لوگوں میں اٹھ بیٹھ رہے ہیں۔"

ہربرٹ نے جلدی سے مداخلت کی "آفس میں لوگ مجھے برٹی کہتے ہیں ممی۔"

"تو میں اُن کے لئے بھی یہی کہوں گی کہ وہ عام لوگ ہیں...... جاہل۔"

اتنا کہہ کر مسز سبزی یوں خاموش ہو گئیں جیسے اب بولنے میں مزید توہین کا اندیشہ ہو۔ گفتگو کا بوجھ مسٹر سبزی اور ہربرٹ کے کندھوں پر آن پڑا۔ مسز سبزی کو اس بات سے اور طمانیت حاصل ہوئی کہ بیٹی کو توہین کا احساس ہوا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گئیں کہ لڑکی یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتی ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے جان چھڑائے۔ خود انہوں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اس سلسلے میں لڑکی کی کوئی مدد نہیں کریں گی۔

بالآخر ہربرٹ نے معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لئے "بیٹی ...... میرا خیال ہے اب چلا جائے" اس نے کہا "میں تمہیں گھر پہنچا آؤں گا۔"

"اتنی جلدی؟" مسز سبزی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔"

ان دونوں کے جانے کے بعد مسٹر سبزی نے کہا۔ "پیاری...... خوبصورت لڑکی ہے۔"

"خاک خوبصورت ہے" مسز سبزی نے بھنا کر کہا "میری بات لکھ لو۔ رنگ و روغن اتر جائے تو اندر کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ بہت عام سی لڑکی ہے۔ عام سی...... گندگی کی پوٹ۔"

ہربرٹ ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔

"دیکھیں مم.... آپ کو غریب لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ آپ نے مجھے بہت شرمندہ کرایا ہے۔"

"ہربرٹ...... تم اپنی ماں سے اس طرح بات کر رہے ہو۔" مسز سبزی کا لہجہ بھی شرربار تھا "تمہیں اس طرح کی عورت کو میرے گھر میں لانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ وہ عام سی لڑکی ہے...... گندگی کی پوٹ۔"

مسز سبزی جب بہت غصے میں ہوتی تھیں تو اُن کی گرامر تباہ ہو جاتی تھی مگر ہربرٹ نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا "وہ کہہ رہی تھی کہ زندگی میں اس کی کبھی اتنی توہین نہیں ہوئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے سمجھا بجھا کر منایا ہے۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ یہ کتنا مشکل کام تھا۔"

"اچھا اب میں صاف لفظوں میں کہہ رہی ہوں۔ آئندہ وہ میرے گھر میں کبھی قدم نہیں رکھے گی۔"

"یہ تو آپ کا خیال ہے۔ سن لیں کہ ہماری منگنی ہو گئی ہے۔ اب اس اطلاع کو دل میں اتاریں اور دھواں چھوڑتی رہیں۔"

مسز سبزی تو سانس لینا بھی بھول گئیں "نہیں .... یہ نہیں ہو سکتا۔" سنبھلنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"یہ ہو چکا ہے۔ میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا لیکن آج جب میں نے اُسے بے حد آزردہ دیکھا تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے اسے پروپوز کیا اور یقین کیجئے اُسے منانے اور قائل کرنے میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا۔"

"بے وقوف ...... احمق" مسز سبزی چلّائیں۔ اچھا خاصا سین ہو گیا۔ ماں بیٹے کے درمیان خوب تو تو میں میں ہوئی۔ سیموئیل نے مداخلت کی کوشش کی تو دونوں نے ہی بہت خراب لہجے میں اسے منہ بند رکھنے کو کہا۔

انجام کار ہربرٹ پاؤں پٹختا ہوا گھر سے باہر نکل گیا اور مسز سبزی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اگلے روز پچھلے روز کے واقعے کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ مسز سبزی کا رویّہ سرد اور نرم تھا۔ ہربرٹ بہت چپ چپ اور سوگوار تھا۔ شام کی چائے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ اگلے ہفتے اس نے اپنے والدین کو بتایا کہ شام کو اسے کچھ

مصروفیت ہے اس لئے وہ ان کے ساتھ پارک نہیں چل سکے گا۔

"ٹھیک ہے' تمہارے بغیر بھی ہمارا کام چل جائے گا" مسز سبزی نے کہا۔

ان کی ساحلی علاقے میں سالانہ تعطیلات کے دن قریب آرہے تھے۔ وہ لوگ ہمیشہ ہرن بے جاتے تھے۔ کیونکہ مسز سبزی کے خیال میں وہاں شرفا آتے تھے اور برسوں سے وہ ایک ہی جگہ قیام کررہے تھے۔

ایک شام ہربرٹ نے بے حد سرسری انداز میں کہا "ممّا' ان لوگوں کو خط لکھ دیجئے گا کہ اس بار وہ میرے لئے کمرا نہ رکھیں۔ میں اور بیٹی شادی کررہے ہیں۔ ہم ہنی مون کے لئے ساؤتھ اینڈ جارہے ہیں۔"

ایک لمحے کو کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

"بالکل اچانک فیصلہ کرلیا' کیوں ہربرٹ؟" مسٹر سبزی پریشان ہو گئے۔

"جی ہاں' دراصل بیٹی کے دفتر میں چھانٹی ہورہی ہے۔ ہم نے سوچا' فوراً ہی شادی کرلیں۔ بیٹی کی بے روزگاری کا جھگڑا ہی نہ رہے۔ ہم نے ڈینبی اسٹریٹ میں دو کمروں کا مکان لے لیا ہے۔ میرے سیونگ بینک اکاؤنٹ کی رقم فرنیچر کی خریداری میں کام آرہی ہے۔"

مسز سبزی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ پہلے تو اُن کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ پھر اُن کے رخساروں پر موٹے موٹے آنسو لڑھکنے لگے۔

"چھوڑیں نا ممی۔ اسے اتنا بڑا مسئلہ نہ بنائیں" ہربرٹ نے کہا "کبھی نہ کبھی شادی تو ہر کسی کی ہوتی ہے نا۔ اگر ڈیڈی نے آپ سے شادی نہ کی ہوتی تو میں اس دنیا میں آتا۔ پیدا ہوتا بھلا؟"

مسز سبزی نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے "تمہارے ڈیڈی نے مجھ سے شادی نہیں کی ..... میں نے ان سے شادی کی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ عزت دار اور سیدھی راہ پر چلنے والے آدمی ہیں۔ میں جانتی تھی کہ یہ اچھے شوہر اور اچھے باپ ثابت ہوں گے۔ اور ہم دونوں کو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس شادی پر پچھتاوا نہیں ہوا۔ کیوں سیموئیل' ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے بیٹرائس۔"

"میں ایک بات بتاؤں" آپ بیٹی کو قریب سے دیکھیں گی تو اسے پسند کئے بغیر نہیں رہیں گی۔ ممی' وہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ ملیں گی تو دیکھیں گی کہ آپ میں اور اُس میں بہت سی باتیں' بہت سی عادتیں مشترک ہیں۔ آپ اسے ایک موقع تو دیں ممی" ہربرٹ نے کہا۔

"میری زندگی میں تو وہ اس گھر کی چوکھٹ پار نہیں کرسکتی۔"

"یہ تو عجیب بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آپ معقولیت سے کام لیں تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہم پہلے کی طرح ہفتے کی سہ پہر پتنگ اڑانے جایا کریں گے۔ بس ابھی ذرا دشوار ہے یہ بات۔ اُس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ پتنگ اڑانا بھی کوئی شغل ہے۔ لیکن پھر اسے بھی لطف آنے لگے گا۔ اور نہیں تب بھی میں آجایا کروں گا اور ہم تینوں پارک چلا کریں گے۔ یہ معقولیت کہلائے گی۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ میں تمہیں بتادوں کہ اس عورت سے شادی کے بعد تم میری پتنگ نہیں اڑا سکو گے۔ سمجھ لو کہ میں نے وہ پتنگ تمہیں نہیں دی۔ وہ جس پیسے سے خریدی گئی ہے' وہ میں نے گھر کے خرچ میں سے بچا بچا کے جمع کئے تھے' سال بھر میں۔ وہ پتنگ میری ہے' سمجھے؟"

"ٹھیک ہے۔ آپ جانیں۔ بیٹی تو اسے بچوں کا کھیل قرار دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے پتنگ اڑاتے ہوئے شرم آنی چاہئے...... اس عمر میں۔"

وہ اٹھا اور اس بار بھی پاؤں پٹختا ہوا گھر سے نکل گیا۔ پندرہ دن بعد اُس نے بیٹی سے شادی کرلی۔ مسز سبزی نے شادی میں شرکت سے انکار کردیا۔ انہوں نے سیموئیل کو بھی شریک نہ ہونے دیا۔ وہ معمول کے مطابق چھٹیاں گزارنے گئے اور واپس بھی آگئے۔ زندگی معمولات کے مطابق گزرنے لگی۔ ہفتے کی سہ پہر وہ دونوں پارک جاتے اور اپنی بہت بڑی پتنگ اڑاتے۔ مسز سبزی نے کبھی بیٹے کا نام بھی نہیں لیا۔ وہ اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی لیکن مسٹر سبزی کی ٹرین میں بیٹے سے ملاقات ہوتی۔ جب بھی دونوں کو ایک ہی ڈبے میں سوار ہونے کا موقع ملتا' دونوں میں خوب ہی باتیں ہوتیں۔ ایک صبح مسٹر سبزی نے سر اٹھا کر آسمان دیکھا "آج تو پتنگ اڑانے کا موسم ہے۔" وہ بولے۔

"تو آپ اور ممی اب بھی پارک جاتے ہیں؟"

"تم کیا سمجھتے ہو۔ تمہاری ممی بھی اب مجھ سے کم نہیں رہی۔ اسکرٹ میں پنیں لگائے' پتنگ ہاتھ میں لئے اسے ڈھلان پر دوڑتے دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کے اندر بھی ایک پتنگ باز چھپا ہے اور یقین کرو' وہ مجھ سے بہتر دوڑتی ہے۔"

"مجھے ہنسنے پر مجبور نہ کریں ڈیڈی۔"

"ہربرٹ ..... تم نے اپنے لئے پتنگ کیوں نہیں خریدی اب تک۔ میں تو حیران ہوں۔ تمہیں تو بہت شوق تھا پتنگوں کا۔"

"اب بھی ہے۔ میں نے ایک بار اس سلسلے میں بات بھی کی۔ لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ عورتیں کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ بیٹی نے مجھے ڈانٹ دیا۔ بچے نہ بنو' اور نہ جانے کیا کیا...... ویسے بھی ڈیڈی میں بچوں والی پتنگ تو خریدنے سے رہا۔ مجھے تو بڑی پتنگ چاہئے۔ اور وہ مہنگی ہوتی ہے۔ ہم فرنیچر خرید رہے تھے تو بیٹی نے کہا' سستا روئے بار بار مہنگا روئے ایک بار۔ سو ہم نے قسطوں پر فرنیچر لیا۔ ہر ماہ اس کی قسط دینا ہوتی ہے۔ اس کے بعد اتنی رقم بچتی

ہے کہ بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک کے خرچ پر دو کا گزارہ بآسانی ہوجاتا ہے۔ لیکن ڈیڈی ...... میرا اب تک کا تجربہ اس سے مختلف ہے۔"

"تو بیٹی کام نہیں کررہی ہے؟"

"وہ کہتی ہے برسوں گدھے کی طرح محنت کرنے کے بعد اب تو ذرا آرام کرنے کا موقع ملا ہے اور ویسے بھی گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانا پکانا.... یہ بھی تو کسی کو کرنا ہے۔"

○———□———○

یہ ہربرٹ اور بیٹی کی شادی کے چھ ماہ بعد کی بات ہے۔ مسٹر اور مسز سبزی پارک میں تھے۔ وہ ہفتے کی سہ پہر تھی۔ اچانک مسز سبزی نے اپنے شوہر سے کہا "سیموئیل، جو میں دیکھ رہی ہوں، تمہیں بھی نظر آرہا ہے؟"

"اگر تمہارا اشارہ ہربرٹ کی طرف ہے تو میں نے اسے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ کہا اس لئے نہیں کہ میں تمہیں اَپ سیٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ظاہر نہ ہونے دو کہ تم نے اسے دیکھ لیا ہے" مسز سبزی نے ہدایت دی۔

ہربرٹ تماشائیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس نے ان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن یہ بات مسز سبزی کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی کہ ہربرٹ کی نظریں اس بڑی پتنگ کے ساتھ حرکت کررہی ہیں، جسے وہ بارہا اڑا چکا تھا۔

پھر خنکی بڑھ گئی۔ مسٹر اور مسز سبزی گھر واپس آگئے۔ مسز سبزی کا چہرہ چمک رہا تھا، آنکھوں میں شرارت تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں کیا وہ اگلے ہفتے آئے گا" مسٹر سبزی نے کہا۔

"اگر میں شرط لگانے کو برا نہ سمجھتی تو ایک پاؤنڈ کی شرط لگاتی کہ وہ ضرور آئے گا۔ میں تو کب سے اُس کی منتظر تھی۔" مسز سبزی نے کہا۔

"منتظر تھیں؟"

"میں ابتدا ہی سے جانتی تھی کہ وہ پارک اور پتنگوں سے دور نہیں رہ سکے گا" مسز سبزی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

ان کی بات درست ثابت ہوئی۔ نہ صرف اگلے ہفتے بلکہ اس کے بعد ہر اس ہفتے جب موسم پتنگ بازی کے لئے سازگار تھا، ہربرٹ پارک میں آیا۔ لیکن ان کے درمیان کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ وہاں کھڑا ہو کر انہیں دیکھتا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جاتا۔ چند ہفتے اسی انداز میں گزر گئے۔

پھر ایک روز مسٹر اور مسز سبزی نے ہربرٹ کو حیران کردیا۔

اس روز انہوں نے وہ پتنگ نہیں اڑائی، جس کا وہ عادی تھا۔ اُس روز ان کے پاس نئی باکس کائٹ تھی..... چھوٹی..... اُسی ماڈل کی جو اس نے خود ڈیزائن کی تھی..... سہ جہتی پتنگ!

فرقِ اصطلاح

جج نے ملزم سے پوچھا "تم اپنی بیوی کو چھوڑ کر کیوں بھاگ گئے تھے؟"

ملزم بولا "جناب والا! اگر آپ میری بیوی سے اتنے ہی واقف ہوتے جتنا میں ہوں تو آپ مجھے کبھی بھگوڑا نہ کہتے" اصل میں میں بھگوڑا نہیں، پناہ گزین ہوں۔"

اور ہربرٹ نے دیکھا کہ اس پتنگ نے پارک میں ہلچل مچادی تھی۔ دوسرے پتنگ باز بھی اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوگئے تھے۔ وہ ان کے گرد جمع ہوگئے اور مسز سبزی پُرجوش لہجے میں بولے جارہی تھیں۔

پہلی بار سیموئیل اس پتنگ کو لے کر دوڑا۔ پتنگ نہیں اڑی۔ وہ پھڑپھڑاتی ہوئی زمین پر آگری۔ ہربرٹ نے دانت پر دانت جما لئے۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ اس پتنگ کی ناکامی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ مسٹر سبزی پھر ٹیلے پر چڑھے۔ اس بار پتنگ فضا میں بلند ہوگئی، تماشائی تالیاں بجانے لگے۔ کچھ دیر بعد مسٹر سبزی نے پتنگ اتارلی اور اسے لے کر ٹیلے کی طرف چل دیے۔ مسز سبزی اپنے بیٹے کی طرف بڑھ گئیں۔

"تم نہیں اڑاؤ گے ہربرٹ؟" انہوں نے پوچھا۔

ہربرٹ کی سانسیں رک گئیں "ہاں مما..... جی تو چاہتا ہے۔"

"یہ چھوٹی ہے۔ بنانے والوں کا کہنا ہے کہ پہلے اس کے عادی ہوجائیں پھر بڑی پتنگ اڑائیں۔ بہرحال ہم نے بڑی پتنگ کا بھی آرڈر دے دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب وہ پتنگ ہماری سمجھ میں آجائے گی اور ہوا بھی مناسب ہوگی تو دو میل اوپر جاسکے گی۔"

مسٹر سبزی بھی ان کے پاس چلے آئے۔

"سیموئیل ...... ہربرٹ پتنگ اڑانا چاہتا ہے" مسز سبزی نے انہیں بتایا

مسٹر سبزی نے پتنگ ہربرٹ کو تھما دی۔ ہربرٹ کے ہونٹوں پر مسرت بھری مسکراہٹ تھرکی۔ اس نے اپنا ہیٹ ماں کو تھما دیا۔ پھر وہ پتنگ لے کر دوڑا۔ پتنگ بہت خوبصورتی سے اٹھی۔ اسے بلند ہوتے دیکھ کر ہربرٹ کا سینہ خوشی سے بھر گیا۔ اس چھوٹی سیاہ سہ جہتی پتنگ کو فضا میں خوبصورتی سے تیرتے دیکھنا بے حد خوش کن تھا لیکن ہربرٹ کے تصور میں تو وہ بڑی پتنگ لہرا رہی تھی، جس کا ممی ڈیڈی نے آرڈر دے دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ پتنگ ممی ڈیڈی کے بس کی تو ہرگز نہیں ہوگی۔ دو میل اوپر!

"ہمارے ساتھ گھر چلو نا ہربرٹ" مسز سبزی نے کہا "چائے پی کر چلے جانا۔ ہم تمہیں اس پتنگ کا ڈیزائن بھی دکھا دیں گے، جو

ہم بنوا رہے ہیں۔ ممکن ہے ہم کوئی اچھی تجویز دے سکو۔"

ہربرٹ ہچکچایا۔ اس نے بنی سے کہا تھا کہ وہ چہل قدمی کے لئے جارہا ہے تاکہ ٹانگیں ہی کھل جائیں۔ بنی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ ہر ہفتے پارک آتا ہے۔ سو اب وہ اس کی منتظر ہوگی لیکن ترغیب بے حد طاقت ور تھی۔ وہ مزاحمت نہ کرسکا۔

"کیوں نہیں مم" اس نے کہا۔

چائے کے بعد وہ ڈیزائن کا معائنہ کرنے بیٹھے۔ پتنگ بہت بڑی تھی اور اس میں بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں ایسی تھیں جن کے متعلق اس نے کبھی سنا بھی نہیں تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ بہت مہنگی پتنگ تھی۔

"آپ لوگ اسے اُڑا نہیں سکیں گے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"کوشش تو کرسکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے، آپ مجھے اپنی مدد کی اجازت نہیں دیں گے ... کم از کم شروع میں۔" ہربرٹ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"آئیڈیا برا نہیں۔" مسز سبزی نے کہا۔

ہربرٹ اپنے گھر پہنچا تو بہت دیر ہوچکی تھی... اس کے اندازے سے بہت زیادہ دیر! بنی کا موڈ بے حد خراب تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم ہرب؟ میں تو سمجھی، مر گئے ہو۔ کھانا رکھے رکھے ٹھنڈا ہوگیا۔" وہ غرائی۔

"راستے میں کچھ دوست مل گئے تھے۔ باتوں میں دیر ہوگئی۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔"

بنی نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ مگر مزید کچھ نہیں کہا۔

کھانے کے بعد ہربرٹ نے فلم دیکھنے کے لئے چلنے کی تجویز پیش کی لیکن بنی نے انکار کردیا "تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ میرا موڈ نہیں ہے۔"

○———□———○

اگلے ہفتے ہربرٹ پھر پارک گیا۔ ممی نے اسے پتنگ اڑانے کی اجازت دے دی۔ نئی ...... بڑی پتنگ تین ہفتے بعد آنے والی تھی۔

اچانک ممی نے کہا: "وہ بھی موجود ہے۔"

"کون بنی؟" ہربرٹ بری طرح چونکا۔

"ہاں...... تمہاری جاسوسی کررہی ہے۔"

ہربرٹ کو گھبراہٹ ہونے لگی لیکن ظاہری طور پر وہ بہادر بن گیا۔ "کرنے دیں جاسوسی۔ مجھے پروا نہیں۔"

لیکن وہ نروس تھا۔ اس نے چائے کی پیشکش قبول نہیں کی، وہ سیدھا گھر چلا گیا۔ وہاں بنی اس کی منتظر تھی۔

"تو یہ ہیں وہ دوست جو پچھلے ہفتے تمہیں راستے میں مل گئے تھے۔ جن سے باتوں میں تمہیں وقت کا پتا ہی نہیں چلا" بنی نے طنز کیا "مجھے عرصے سے شک تھا کہ یہ ہر ہفتے کی سہ پہر چہل قدمی کیسی۔ آج پتا چل ہی گیا۔ شرم نہیں آتی، اتنے بڑے ہو کر پتنگ اڑاتے ہو۔ میں تو اسے قابلِ نفرت ہی کہوں گی۔"

"جو جی چاہے کہو۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ تمہیں نہیں لگتا۔ تم اڑاتیں بھی نہیں پتنگ۔"

"میں تم سے صاف صاف کہہ رہی ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔ میں تمہیں خود کو بے وقوف بنانے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"میں بچپن سے اب تک ہر ہفتے پتنگ اڑاتا رہا ہوں ... اور جب تک میرا دل چاہے گا، اڑاتا رہوں گا۔"

"یہ سب اس بڈھی کتیا کا کیا دھرا ہے" بنی آپے سے باہر ہوگئی "وہ تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کررہی ہے۔ میں خوب جانتی ہوں اُسے۔ اگر تم مرد ہوتے تو زندگی بھر کبھی اُس سے بات نہ کرتے۔ دیکھ چکے ہو کہ اس نے کتنا خراب سلوک کیا تھا میرے ساتھ۔"

"زبان سنبھال کر بنی۔ ورنہ بتیسی گرا دوں گا تمہاری۔ وہ میری ماں ہے۔ میرا جب جی چاہے گا، اس سے ملوں گا۔"

یہ جھگڑا گھنٹوں چلتا رہا۔ دونوں ایک دوسرے پر گرجتے برستے رہے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو دونوں کے درمیان پہلے بھی ہوتے رہے تھے کیونکہ دونوں ہی ضدی تھے لیکن یہ پہلا سنگین جھگڑا تھا۔ اتوار کے روز دونوں نے ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کی۔ ہفتے کے باقی دنوں میں بھی یہی کیفیت رہی۔ باہر سے وہ پُرسکون تھے لیکن اندر اندر کھول رہے تھے۔

اگلے دو ہفتے ایسے آئے کہ موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ بنی دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ ہربرٹ کو اگر بارش سے مایوسی ہوئی تھی تو اُس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ جھگڑے کی یادیں دھندلا گئیں۔ وہ دو کمروں کے مکان میں رہتے تھے۔ ایک بیڈ پر سوتے تھے۔ ایسے میں اختلافات بھلانے ہی پڑتے ہیں۔ پھر بنی نے بھی اپنے مزاج کے خلاف اپنے ہرب کے لئے اپنا رویّہ نرم کرلیا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ ہرب نے اس کی زبان کی دھار دیکھ لی ہے اور سمجھ لیا ہے کہ وہ کسی سے زیر ہونے والی نہیں۔ چنانچہ اب وہ اپنا رویّہ درست کرلے گا۔ ویسے وہ اچھا شوہر ہے۔ کھلے دل کا مہربان آدمی ہے۔ کردار کے اعتبار سے بھی لاکھوں میں ایک ہے۔ یہ سبق کام آئے گا اور اب وہ قابو میں ہی رہے گا۔

لیکن دو ہفتے بعد موسم کے مزاج درست ہوگئے۔

جمعے کو باپ بیٹے ٹرین میں ملے "ایسا لگتا ہے، کل موسم پتنگ اڑانے کے لئے بہترین ہوگا" مسٹر سبزی نے کہا "اور ہاں نئی پتنگ بھی آگئی ہے۔"

"واقعی؟"

"تمہاری ممی نے کہلوایا ہے کہ تمہاری مدد ہمارے لئے خوشی کا باعث ہوگی لیکن میاں بیوی کے درمیان مداخلت کا کسی کو حق نہیں۔ اگر تم بنی سے خوف زدہ ہو ...... میرا مطلب ہے، اس کی زبان بہت دراز ہے نا ...... تو بہتر ہوگا کہ تم نہ آؤ۔ پارک میں

آنے والوں میں ایک لڑکا ہے' جسے ہماری نئی پتنگ نے پاگل کر رکھا ہے' وہ ہماری مدد کرے گا۔"

ہربرٹ کے سینے میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی "آپ کسی اجنبی کو ہماری پتنگ کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ فکر نہ کریں میں وہاں پہنچ جاؤں گا" ہربرٹ نے تیز لہجے میں کہا۔

"بہر حال ہربرٹ ...... تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔" مسٹر بزی نے کہا "اگر تم نہ بھی آئے تو ہم کوئی خیال نہیں کریں گے۔"

"میں ضرور آؤں گا۔"

اگلے روز وہ دفتر سے گھر پہنچا اور فوراً ہی کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ اسی وقت بٹی بیڈ روم میں چلی آئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کپڑے بدل رہا ہوں۔" ہربرٹ نے خوش دلی سے کہا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اپنا راز اپنی حد تک رکھنے کا اُسے خیال ہی نہیں آیا۔ "نئی پتنگ آگئی ہے۔ میں اسے اڑانے جا رہا ہوں۔"

"نہیں۔ تم ہرگز نہیں جاؤ گے۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔"

"بے وقوف نہ بنو بٹی۔ میں جا رہا ہوں۔ اور اگر تمہیں یہ بات پسند نہ آئے تو جو جی چاہے کرو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"میں تمہیں جانے ہی نہیں دوں گی۔"

اس نے دروازہ بند کیا اور اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اور اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔

وہ مختصر سی تھی اور ہربرٹ طویل القامت اور مضبوط۔ ہربرٹ نے اس کے دونوں کندھے تھام لئے کہ اسے راستے سے ہٹا دے مگر بٹی نے اسے لاتیں مارنا شروع کر دیں۔

"تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے جبڑے پر گھونسا رسید کر دوں؟" ہربرٹ نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"اگر جا رہے ہو تو یہاں کبھی قدم نہ رکھنا۔" بٹی چلائی۔

بٹی ہاتھ پاؤں چلاتی رہی۔ ہربرٹ نے اسے اٹھایا اور لے جا کر بیڈ پر پٹخ دیا پھر وہ گھر سے نکل آیا۔



چھوٹی باکس کائٹ نے اس کے وجود میں سنسنی دوڑا دی تھی لیکن بڑی باکس کائٹ کے معاملے میں اس کی حالت بیان سے باہر تھی۔ ہاں ...... اس پتنگ کو قابو میں رکھنا آسان نہیں تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے ہانپ گئے۔ دوسرے لوگ بھی ان کی مدد کر رہے تھے اس کے باوجود پتنگ اڑائی نہیں جا سکی۔

"کوئی بات نہیں۔" ہربرٹ نے کہا "جلد ہی ہم اس کے عادی ہو جائیں گے۔ آج ہوا بھی مناسب نہیں ہے۔" وہ ماں باپ کے ساتھ گھر چلا گیا۔ چائے کے دوران وہ بیتے دنوں کی طرح آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ہربرٹ دانستہ وہاں زیادہ دیر رکا۔ وہ بٹی کے ڈرامے سے حتی الامکان بچنا چاہ رہا تھا۔ لیکن جب مسز بزی کھانا پکانے کے لئے کچن میں چلی گئی تو اُسے بھی گھر جانے کے لئے اٹھنا ہی پڑا۔

وہ گھر پہنچا تو بٹی اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"تمہارا بیگ میں نے تیار کر دیا ہے۔" وہ بولی۔

"کیا..... میرا بیگ؟"

"تم جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں نے کہا تھا' جا رہے ہو تو یہاں واپس آنے کی ضرورت نہیں۔ اب تمہارا سارا سامان میں نے پیک کر دیا ہے۔ بیڈ روم میں رکھا ہے اٹھا لو۔"

ہربرٹ نے ایک لمحے کو اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ اپنی بات کہہ کر بظاہر پھر اخبار پڑھنے میں منہمک ہوگئی تھی۔ ہربرٹ کا جی چاہا کہ اس کی اچھی طرح ٹھکائی لگائے لیکن اس نے خود پر قابو پالیا۔ "ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ بیڈ روم میں گیا۔ اس کے کپڑے سوٹ کیس میں پیک کر دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کاغذ کا ایک پارسل تھا جس میں بٹی نے اس کی چھوٹی موٹی چیزیں یکجا کر دی تھیں۔ اس نے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے ہاتھ میں پارسل سنبھالا اور ڈرائنگ روم سے گزرتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اس نے بٹی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ سیدھا ماں کے گھر گیا اور گھنٹی بجائی۔ ماں نے دروازہ کھولا۔

"میں واپس آگیا ہوں ممی۔"

"اوہ ...... ٹھیک ہے۔ تمہارا کمرا تیار ہے۔ سامان رکھو اور نیچے آجاؤ' ہم بس کھانا کھانے کے لئے بیٹھنے ہی والے تھے۔"

ہربرٹ اوپر گیا۔ مسز بزی ڈائننگ روم میں چلی گئیں۔ "سنو ...... ہربرٹ واپس آگیا ہے" انہوں نے اپنے شوہر سے جلدی سے کہا "جلدی سے جاؤ اور بیئر لے آؤ۔"

کھانے کے دوران ہربرٹ نے انہیں بٹی سے اپنے تعلقات کے متعلق تفصیل سے بتایا۔

"چلو ہربرٹ۔ اچھا ہوا' آسانی سے جان چھوٹ گئی۔" مسز بزی نے سب کچھ سننے کے بعد کہا "میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ وہ عام سی لڑکی ہے..... گندگی کی پوٹ' جب کہ تمہیں اچھی تربیت دی گئی۔ مہذب طور طریقے سکھائے گئے۔"

ہربرٹ کو اپنے پرانے بستر میں سونا بہت اچھا لگا۔ گزری ہوئی خوش گوار زندگی یاد آگئی۔ صبح وہ ناشتے کے لئے آیا اور ناشتے کی میز پر اخبار پڑھتا رہا۔

"آج ہم چرچ نہیں جائیں گے" مسز بزی نے کہا "ہم آج ایک خوش گوار دن گزاریں گے ...... ہلکا پھلکا۔ ہربرٹ بہت پریشان ہے نا۔"

اس ہفتے پتنگ موضوع گفتگو بنی رہی لیکن بٹی کے متعلق بھی

وقتاً فوقتاً گفتگو ہوتی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ بٹی کا اگلا قدم کیا ہوگا۔
"وہ تمہیں واپس لے جانے کی کوشش کرے گی۔" مسز سبزی نے بیٹے سے کہا۔
"اس کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی دیوار سے اپنا سر پھوڑ لے۔" ہربرٹ نے کہا۔
"لیکن تمہیں اسے خرچا تو دینا ہوگا۔" مسٹر سبزی بولے۔
"کیوں...... یہ کیوں دینے لگا" مسز سبزی چلا اٹھیں "اس نے اسے پھنسا کر اِس سے شادی کی اور اب اسے اس کے ہی گھر سے نکال باہر کیا۔"
"بس وہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں اُس کا حق اسے دیتا رہوں گا" دن بہ دن ہربرٹ خود کو بہتر اور زیادہ پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اب تو اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ اس گھر سے کبھی کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ اُس کا حال اس پرندے کا سا تھا، جو بھٹک کر کہیں نکل گیا ہو اور اب اپنے آشیانے میں واپس آیا ہو۔ ماں پہلے کی طرح اس کے کپڑوں کا خیال رکھتی، اس کے موزوں کی مرمت کرتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ کھانا اسے اپنی مرضی... اپنی پسند کا ملتا، جو وہ ہمیشہ سے کھاتا آیا تھا۔ بٹی کو کھانا پکانا آتا ہی نہیں تھا۔ ڈبوں کا کھانا چلتا تھا۔ شروع میں تو اسے اچھا لگا۔ پکنک کا سا لطف آتا تھا۔ مگر پھر وہ بے زار ہو گیا۔ اس کی ماں نے ہمیشہ اسے تازہ کھانا کھلایا تھا۔ کچھ ہی دن بعد غذا کے ڈبے دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا تھا۔ اب پھر گھر کا کھانا میسر آگیا تھا۔ دوسری طرف وہ دو کمروں کے اس چھوٹے سے مکان میں خود کو گھٹا گھٹا محسوس کرتا۔ دو کمرے..... اور ان میں سے ایک کچن کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ اب اپنا پرانا گھر اسے بہت کھلا کھلا محسوس ہوتا۔
"میں نے زندگی میں اس سے بڑی غلطی نہیں کی، جو اپنا گھر چھوڑ کر گیا تھا ممی۔" اس نے ایک روز کہا۔
"میں جانتی ہوں ہربرٹ۔ لیکن اب تم واپس آگئے ہو اور کوئی وجہ نہیں کہ اب کبھی یہ گھر چھوڑو۔"
اسے جمعے کو تنخواہ ملتی تھی۔ اس شام وہ چائے پی رہے تھے کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔
"یہ وہی ہے۔" تینوں نے بیک آواز کہا۔
ہربرٹ کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ مسز سبزی نے ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالی "تم فکر نہ کرو۔" انہوں نے کہا "میں ملوں گی اُس سے۔"
انہوں نے جا کر دروازہ کھولا۔ چوکھٹ پر بٹی کھڑی تھی۔ اس نے اندر گھسنے کی کوشش کی مگر مسز سبزی نے اسے روک دیا۔
"مجھے ہربرٹ سے ملنا ہے۔"
"تم اُس سے نہیں مل سکتیں۔ وہ گھر میں نہیں ہے۔"
"میں جانتی ہوں، وہ گھر میں ہے۔ وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تھا اور اب تک باہر نہیں نکلا ہے۔"
"تو کان کھول کر سن لو۔ وہ تم سے نہیں ملنا چاہتا۔ اب زیادہ پریشان کرو گی تو پولیس کو فون کر دوں گی میں۔"
"مجھے ہفتے بھر کا خرچ چاہئے۔"
"یہی ایک چیز تو چاہتی ہو تم اُس سے۔" مسز سبزی نے اپنا پرس کھولا اور اس کی طرف پیسے بڑھائے۔ "یہ ہیں تمہارے ۳۵ شلنگ۔"
"۳۵ شلنگ؟ ۲۱ شلنگ تو صرف کرایہ ہے مکان کا۔"
"بس یہی کچھ مل سکتا ہے تمہیں۔ وہ یہاں رہ رہا ہے تو یہاں بھی تو خرچا دینا پڑتا ہے اُسے۔"
"اور فرنیچر کی قسط کا کیا ہوگا؟"
"جب اس کا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ اب یہ ۳۵ شلنگ لے رہی ہو یا رکھ لوں پرس میں۔" بٹی شکست خوردہ، افسردہ اور الجھن زدہ سی سر جھکائے قدم جمائے کھڑی رہی۔ مسز سبزی نے پیسے زبردستی اس کی مٹھی میں ٹھونس دیے اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ ڈائننگ روم میں واپس آگئیں۔ گھنٹی پھر بجی..... اور بجتی ہی چلی گئی لیکن انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بالآخر گھنٹی خاموش ہو گئی۔ شاید بٹی چلی گئی تھی۔
"میں نے دماغ درست کر دیا ہے اُس کا۔"
اگلے روز موسم بہت اچھا تھا۔ ہوا کا مزاج بھی مناسب ترین تھا۔ وہ پارک چلے گئے۔ دو تین بار کی ناکامی کے بعد ہربرٹ کا ہاتھ جم گیا۔ دیو قامت باکس کائٹ فضا میں بلند ہو گئی۔ بلند کیا ہوئی، تنتی ہی چلی گئی۔
"اوہ خدایا... یہ کم از کم ایک میل اوپر تو ہے۔" ہربرٹ نے سنسنی آمیز لہجے میں ماں سے کہا۔
ایسا تھرل اس نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔
کئی ہفتے گزر گئے۔ باپ کے مشورے پر ہربرٹ نے بیوی کو ایک خط لکھا۔ "اگر تم مجھے یا میرے گھر والوں کو تنگ نہیں کرو گی تو تمہیں ہر سنیچر کی صبح ۳۵ شلنگ کے پوسٹل آرڈر مل جایا کریں گے۔ اس کے علاوہ فرنیچر کی قسط بھی باقاعدگی سے ادا کر دی جائے گی۔"
مسز سبزی نے اس کی بڑی مخالفت کی لیکن زندگی میں پہلی بار مسٹر سبزی اپنے موقف پر ڈٹ گئے۔ اور ہربرٹ بھی ان سے متفق تھا۔

اس وقت تک ہربرٹ نئی باکس کائٹ پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ اُس سے طرح طرح کے کرتب دکھانے پر بھی قادر ہو چکا تھا۔ اب وہ دوسرے پتنگ بازوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ اس کے نزدیک بچے تھے۔ اس کی اپنی کوئی کلاس ہی نہیں تھی۔ ہفتے کی سہ پہر اس کے لئے سرشاری کے لمحات لاتی۔ پتنگ بلند ہوتی تو تماشائیوں کے نعرے، ان کی نگاہوں میں ستائش اور حسد کے ملے جلے تاثرات اسے فتح مندی کا احساس دلاتے۔
ایک شام وہ باپ کے ساتھ اسٹیشن سے واپس آرہا تھا کہ بٹی

نے اس کا راستہ روک لیا۔ "ہیلو ہربرٹ۔"

"ہیلو۔"

"مسٹر سبزی' میں اپنے شوہر سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی جو تم میرے ڈیڈی کے سامنے نہ کرسکو۔" ہربرٹ نے بے پروائی سے کہا۔

وہ ہچکچائی۔ مسٹر سبزی الگ پریشان تھے کہ رکیں یا آگے بڑھ جائیں۔ بالآخر بیٹی نے کہا "ہیلو یہی سہی۔ ہربرٹ' میں چاہتی ہوں کہ تم گھر واپس آجاؤ۔ جس رات میں نے تمہارا سامان پیک کیا' میں اپنے حواس میں نہیں تھی۔ مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔ میں تو بس تمہیں ڈرانا چاہتی تھی۔ مجھے اپنے کئے پر افسوس ہے۔ ایک پتنگ کے پیچھے جھگڑا کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔"

"میں واپس نہیں آؤں گا بیٹی۔ تم نہیں جانتیں' تم نے زندگی میں میری بھلائی کا ایک ہی کام کیا ہے.... مجھے گھر سے نکال کر....."

بیٹی کے آنسو رخساروں کو بھگونے لگے "لیکن ہربرٹ' میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" اس نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "بس تم واپس آجاؤ۔ بے شک بچوں کی طرح پتنگ اڑاتے رہو' میں کبھی اعتراض نہیں کروں گی۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اب میں دیکھ چکا ہوں کہ ازدواجی زندگی کیسا عذاب ہوتی ہے۔ میں اب زندگی بھر شادی کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔ آیئے ڈیڈی...." وہ دونوں تیز قدموں سے چل دیے۔ بیٹی نے ان کے پیچھے آنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

اگلے اتوار کو وہ چرچ گئے۔ کھانے کے بعد ہربرٹ پتنگ پر ایک نظر ڈالنے کوئلے کے شیڈ میں گیا' جہاں پتنگ رکھی جاتی تھی۔ ہربرٹ کو پتنگ سے ایسا عشق تھا کہ وہ دن میں ایک بار اسے ضرور دیکھتا تھا۔ ایک منٹ بعد وہ شیڈ سے بھاگتا ہوا آیا۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی۔

"اس نے پتنگ تباہ کر دی۔ توڑ پھوڑ دی... اس کلہاڑی سے۔"

مسٹر اور مسز سبزی کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ بھی کوئلے کے شیڈ کی طرف لپکے۔ ہربرٹ کی بات درست ثابت ہوئی۔ اتنی مہنگی پتنگ کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔ اسے کلہاڑی سے بڑی بے رحمی سے کاٹا گیا تھا۔ اب تو یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ وہ کبھی پتنگ رہی ہوگی۔ تار کی ریل کا حشر بھی خراب کر دیا گیا تھا۔

"اس نے ہمیں چرچ جاتے دیکھا ہوگا اور موقع سے فائدہ اٹھا کر کوئلے کے شیڈ میں گھس گئی ہوگی۔" ہربرٹ نے کہا۔

"لیکن وہ اندر کیسے گھسی ہوگی؟" مسٹر سبزی نے پوچھا۔

"میرے پاس شیڈ کی دو چابیاں تھیں۔ میں گھر واپس آیا تو اک چابی کم تھی۔ میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔"

"یہ ضروری نہیں کہ یہ بیٹی کی حرکت ہو۔ پارک میں بہت سے لوگ ہیں' جو اس پتنگ کی وجہ سے ہم سے حسد کرتے ہیں۔ وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ پتا چل جائے گا۔" ہربرٹ نے کہا۔ "میں جاکر اس سے پوچھوں گا۔ اگر پتنگ اس نے توڑی ہے تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔"

اس کا غصہ اتنا بھیانک تھا کہ مسز سبزی خوف زدہ ہوگئیں۔

"اور قتل کے جرم میں پھانسی چڑھ جاؤ گے؟" انہوں نے کہا "نہیں ہربرٹ' میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ اپنے ڈیڈی کو جانے دو۔ یہ واپس آجائیں تو فیصلہ کریں گے کہ اب کیا کیا جائے۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ ہربرٹ' مجھے جانے دو۔" مسٹر سبزی نے کہا۔ ہربرٹ کو قائل کرنے میں خاصی مشکل ہوئی۔ بہرحال جیسے تیسے وہ مان گیا۔ مسٹر سبزی بیٹی سے ملنے چلے گئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آئے۔

"ہاں' یہ اُسی کا کام ہے۔" انہوں نے بتایا "اس نے فوراً ہی اعتراف کرلیا۔ بلکہ اسے فخر ہے اپنے کارنامے پر۔ میں اس کے الفاظ دہرا نہیں سکتا۔ میں تو خود سناٹے میں آگیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ پتنگ اس کی رقیب ہے۔ پتنگوں سے اُسے نفرت ہے۔ اس نے کہا کہ ہربرٹ اُس سے زیادہ پتنگ سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے اس نے پتنگ کو تہس نہس کردیا اور اگر ضرورت پڑی تو وہ آئندہ بھی ایسا ہی کرے گی بلکہ کرتی رہے گی۔"

"خوش قسمت ہے کہ یہ بات اس نے مجھ سے نہیں کہی۔ ورنہ میں پھانسی کے پھندے کا خیال کئے بغیر اس کی گردن مروڑ دیتا۔ بہرحال' اب تو میں اسے زندگی بھر ایک شلنگ بھی نہیں دوں گا کبھی۔"

"وہ تم پر کیس کردے گی۔" مسٹر سبزی نے کہا۔

ایک صاحب کی کار کے نیچے آکر ایک کتا کچل گیا تو ان صاحب نے کار روک کر قریب کے بنگلے میں کھڑی ہوئی عورت سے پوچھا۔ "کس کا کتا تھا؟" عورت نے جواب دیا۔ "میرے شوہر کا.... اور وہ کہتے تھے کہ یہ دنیا کا بہترین کتا ہے۔" وہ صاحب بولے۔ "آپ کے شوہر کہاں ہیں؟ میرا خیال ہے انہیں اس سانحے کی خبر بھی تو سنانا چاہئے" عورت نے کہا "وہ بنگلے کے پیچھے باغیچے میں پودوں کو پانی دے رہے ہیں۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ انہیں یہ بری خبر اچانک سنائیں کیونکہ وہ دل کے مریض ہیں۔ بہتر ہوگا کہ پہلے آپ ان کے پیارے کتے کے مرنے کی اطلاع نہ دیں بلکہ یہ کہیں کہ میں بھاگ گئی ہوں۔"

کرنے دیں۔"

"اور ہربرٹ... اگلے ہفتے فرنیچر کی قسط بھی ادا ہونی ہے۔" مسز بزی نے یاد دلایا۔ "میں تمہاری جگہ ہوتی تو کبھی قسط ادا نہ کرتی۔"

"تو وہ فرنیچر اٹھا کر لے جائیں گے اور اب تک ہربرٹ نے جتنی رقم ادا کی ہے' وہ ضائع ہو جائے گی۔"

"تو کیا ہوا۔ سودا مہنگا نہیں۔ اس خبیث عورت سے تو پیچھا چھوٹے گا۔"

"مجھے پیسے کی کوئی پروا نہیں۔" ہربرٹ نے کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ جب وہ فرنیچر لے جا رہے ہوں گے تو اس پر کیا گزرے گی۔ اُس کا چہرہ اس وقت قابلِ دید ہوگا۔ اس کے لئے فرنیچر کی اور خاص طور پر پیانو کی بڑی اہمیت ہے۔ پیانو پر تو جان دیتی ہے وہ۔"

چنانچہ اگلے جمعے کو ہربرٹ نے بٹی کو خرچ کی رقم نہیں بھیجی۔ اور جب بٹی نے فرنیچر والوں کے ہاں سے آیا ہوا نوٹس اسے بھجوایا' جس میں کہا گیا تھا کہ اگر فلاں تاریخ تک قسط ادا نہ کی گئی تو وہ فرنیچر اٹھالیں گے... تو ہربرٹ نے جوابی خط کے ذریعے انہیں مطلع کیا کہ وہ بوجوہ مزید قسطیں ادا کرنے سے قاصر ہے۔ وہ اپنی سہولت کے مطابق جب چاہیں' فرنیچر اٹھوالیں۔

بٹی ایک روز اسٹیشن پر اُس کا انتظار کرتی رہی اور جب اس نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا تو وہ سڑک پر چیخ چیخ کر اُسے گالیاں دیتی ہوئی اس کے پیچھے چلتی رہی۔

ہر شام کو وہ گھر آتی اور مسلسل یوں گھنٹی بجاتی کہ وہ پاگل ہو جاتے۔ ان کے کان بجنے لگتے۔ ہربرٹ کو جھپٹ کر دروازہ کھولنے اور بٹی کی مرمّت کرنے سے باز رکھنے کی کوششوں میں مسٹر اور مسز بزی نڈھال ہو جاتے۔ ایک بار تو بٹی نے پتھر پھینک کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا شیشہ بھی توڑ دیا۔ اس نے گالیوں اور کوسنوں سے بھرے ہوئے پوسٹ کارڈ ہربرٹ کے دفتر کے پتے پر پوسٹ کئے۔ بالآخر وہ عدالت چلی گئی اور مجسٹریٹ سے شکایت کی کہ اُس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے اور خرچا بھی نہیں دے رہا ہے۔

ہربرٹ کو عدالت سے سمن موصول ہو گیا۔

دونوں نے مجسٹریٹ کو اپنی اپنی کہانی سنائی۔ مجسٹریٹ کو بات عجیب لگی لیکن اُس نے اپنے تاثرات اور انداز سے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے دونوں کے درمیان صلح کرانے کی بھرپور کوشش کی لیکن ہربرٹ کسی قیمت پر بیوی کے پاس واپس جانے کو تیار نہیں تھا۔ بالآخر مجسٹریٹ نے ہربرٹ کو حکم دیا کہ وہ بٹی کو پچیس شلنگ فی ہفتہ ادا کرے۔

"میں اسے ایک شلنگ بھی نہیں دوں گا۔" ہربرٹ نے کہا۔

"تو پھر جیل بھی جاؤ گے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "اگلا کیس لاؤ۔"

لیکن ہربرٹ نے جو کہا تھا' اس پر عمل بھی کیا۔ بٹی کی شکایت پر مجسٹریٹ کے سامنے دوبارہ پیشی ہوئی۔ مجسٹریٹ نے پوچھا کہ حکم کی تعمیل نہ کرنے کی کیا وجہ ہے۔

"اس نے میری پتنگ توڑی ہے۔" ہربرٹ نے کہا۔ "میں نے کہہ دیا تھا کہ میں اسے ایک شلنگ بھی ادا نہیں کروں گا اور واقعی... کبھی ادا نہیں کروں گا۔ آپ مجھے جیل بھیجنا چاہیں تو شوق سے بھیجیں۔"

اس بار مجسٹریٹ کا رویّہ سخت تھا۔ "نوجوان... تم بہت بے وقوف آدمی ہو۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں پچھلے واجبات سمیت ادائیگی کے لئے ایک ہفتے کی مہلت دے رہا ہوں اور اب کے تمہاری شکایت آئی تو میں تمہیں اس وقت تک جیل میں رکھوں گا جب تک تمہارا دماغ ٹھکانے نہ آجائے۔"

ہربرٹ نے ادائیگی نہیں کی۔ یوں میرا دوست نیڈ پریسٹن جیل میں اُس سے ملا... اور اس کی کہانی مجھے سنائی۔



"کہو... کچھ سمجھ میں آیا؟" نیڈ نے کہانی سنانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ "دیکھو... بٹی بُری لڑکی نہیں ہے۔ میں اس سے کئی بار ملا ہوں۔ ہربرٹ کی پتنگ سے شدید ترین نفرت کے علاوہ اس میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔ اور ہربرٹ بھی کسی اعتبار سے بے وقوف نہیں ہے بلکہ اس کی ذہانت اوسط سے بالا تر ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پتنگ بازی میں ایسی کون سی بات ہے' جس نے اُس جیسے ذہین آدمی کو پاگل پن کی حد تک پہنچا دیا ہے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ "ایک تو میں پتنگوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ ہوا میں اڑتی ہوئی آزاد پتنگ اس کے لئے آزادی کی علامت ہے' جو کڑی تربیت کی وجہ سے اُسے کبھی نہیں ملی۔ شاید پتنگ کے ذریعے اسے اپنی قوتِ ارادی... اپنی طاقت کے اظہار کا موقع ملتا ہوگا۔ شاید وہ اس کے لئے لگے بندھے معمولات سے' بوجھل زندگی سے فرار کا ذریعہ ہو۔ کچھ بھی ہو' میرے نزدیک یہ بیویوں کے لئے ایک سبق ہے۔ شوہر قابو میں ہو تو اور زیادہ محتاط ہو جانا چاہئے۔ ہربات ماننے والے شوہر کے لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب کسی بچگانہ بات کے لئے ہربات منوانے کی عادی بیوی کے سامنے یوں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے گا کہ ازدواجی زندگی ہی منقطع ہو کر رہ جائے۔ بہرحال نیڈ' یہ مسئلہ تو تم کسی ماہرِ نفسیات کے سامنے رکھو..."

اب آپ نے یہ کہانی پڑھ لی۔ اگر آپ انسانی نفسیات سمجھتے ہیں اور اس معاملے کو سمجھ سکتے ہیں تو مجھے بھی سمجھا دیں۔

THE KITE
WILLIAM SOMMERSET MAUGHAM



اعتراف

سلیم الحق حقی

آج کا ایک اہم مسئلہ آدمی کی شناخت بھی ہے جو روز بروز مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کسی شخص کا ظاہر دیکھ کر اس کے بارے میں جو رائے قائم کرتے ہیں، اکثر کسوٹی پر پرکھنے کے بعد وہ درست ثابت نہیں ہوتی لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے باوجود ہم ظاہر پر ہی بھروسہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں

ایک شخص کا احوال، جو اعتراف کی رات قبرستان میں موجود تھا

میں نے اسے دیوانہ وار چاہا تھا.... دیوانگی کی آخری حد تک۔

آدمی محبت کیوں کرتا ہے؟ کیوں کرتا ہے وہ محبت؟ اور محبت کیا ہے؟ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی محبت کرتا ہے تو اسے دنیا میں ایک ہستی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ذہن میں ایک ہی خیال جاگزیں رہتا ہے۔ دل میں ہمیشہ ایک ہی خواہش سرکشیدہ رہتی ہے۔ ہونٹوں پر ایک ہی نام کی پکار اُبھرتی ہے اور وہ ایک نام تسلسل کے ساتھ لبوں کو چھوتا ہے۔ پہاڑ کے سنگی سینے میں نمو پانے والے چشمے کے پانی کی طرح روح کی انتہائی گہرائیوں سے وہ نام ہونٹوں تک آتا ہے اور ہونٹ اسے بار بار دُہراتے ہیں، ہر جگہ، ہر طرف، سرگوشی میں، جیسے وہ نام نہیں، کوئی دعا ہو۔

میں آپ کو اپنی بلکہ ساری دنیا کی کہانی سنا رہا ہوں، کیونکہ محبت

کی تو ایک ہی کہانی ہے۔ ہر خطے میں اس کا ایک ہی روپ ہے۔ میں اس سے ملا، میں نے اسے چاہا، میں زندہ رہا تو اس کی محبت اور اس کی نرمی اور مہربانی کے زور پر۔ بس اس کے لمس کے سہارے، اس کی باہنوں میں، اس کے لفظوں میں یوں کھو گیا کہ مجھے دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہا۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ دن ہے یا رات۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں زندہ ہوں یا مردہ۔ میں تو اس بوڑھی دھرتی پر اس کی محبت کے سحر میں گم تھا۔ یہ بے خودی، یہ از خود رفتگی صرف محبت ہی میں ممکن ہے اور یہی محبت کی کہانی ہے۔ اس زمین پر، اس آسمان کے نیچے، خواہ مقام کوئی بھی ہو۔

اور پھر وہ مر گئی۔ کیسے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ اب تو میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ ایک شام وہ گھر واپس آئی تو بری طرح بھیگی ہوئی تھی کیونکہ اس روز موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ اگلے روز اسے کھانسی ہو گئی۔ وہ تقریباً ایک ہفتہ کھانستی رہی اور بستر سے لگ گئی۔ پھر کیا ہوا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ ڈاکٹر آئے، انہوں نے نسخے لکھے، دوائیں تجویز کیں اور چلے گئے۔ دوائیں لائی گئیں اور کچھ عورتوں نے، جو اس کی تیمارداری کر رہی تھیں، اسے وہ دوائیں پلائیں۔ اس کے ہاتھ گرم تھے۔ اس کی پیشانی جل رہی تھی، اس کی آنکھوں میں بخار کی وجہ سے شعلگی تھی اور گہری اداسی تھی۔ میں نے اس سے باتیں کیں، اس نے جواب دیئے، لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟ میں ہر بات بھول گیا ہوں، ہر بات ... ہر بات ... وہ مر گئی اور مجھے اس کی وہ مدھم، دبی دبی آخری آہ خوب یاد ہے۔ پھر نرس نے کہا "آہ!" اور میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔

اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔ پادری نے مجھ سے پوچھا "تمہاری صرف دوست تھی وہ؟" اور مجھے ایسا لگا کہ وہ اس کی توہین کر رہا ہے۔ اب جبکہ وہ مر چکی تھی، تو کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں تھا۔ میں نے پادری کو نکال دیا۔ پھر ایک اور پادری آیا۔ وہ نرم دل اور مہربان تھا۔ اس نے اس کے متعلق باتیں کیں تو میں خوب رویا، دل کھول کر رویا۔ تدفین کے موقع پر مجھ سے مشورہ لیا گیا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ لوگوں نے مجھ سے کیا کہا۔ البتہ مجھے اس کا تابوت یاد ہے۔ ہتھوڑے کی اس وقت کی آواز یاد ہے، جب وہ اسے تابوت میں رکھ کر کیلیں ٹھونک رہے تھے۔ میرے خدا! اوہ میرے خدا!

وہ دفن کر دی گئی، دفن، اس اندھیری قبر میں وہ گل بدن، سیم تن، اس قبر میں اتار دی گئی۔ کچھ لوگ تعزیت کے لیے آئے۔ ان میں اس کی سہیلیاں بھی تھیں۔ میں ان سے بچ کر نکل آیا۔ میں بھاگا، میں بھاگتا رہا۔ رات، بہت رات گئے میں گھر واپس آیا اور اگلے روز سفر پر روانہ ہو گیا۔



کل میں پیرس واپس آیا۔ میری اپنے کمرے، ہمارے کمرے، ہمارے بستر، ہمارے فرنیچر، ہر اس چیز پر جو انسان کے مرنے کے بعد اس کی علامت کے طور پر رہ جاتی ہے، نظر پڑی تو میرا دکھ شدید تر ہو گیا۔ درد کی شدت سے میرے وجود میں اپنے نکیلے دانت گاڑ دیئے۔ اذیت اتنی شدید تھی کہ میرا جی چاہا کھڑکی کھولوں اور نیچے کود جاؤں، مر جاؤں۔ میں ان چیزوں کے، ان دیواروں کے درمیان نہیں رہ سکتا تھا، جنہوں نے اسے پناہ دی تھی۔ جن کے روزنوں میں اس کے وجود کے ہزاروں ذرّے تھے، اس کی جلد کی شہابی رنگت تھی اور اس کی سانسوں کی مہک تھی۔ میں نے اپنا ہیٹ اٹھایا اور وہاں سے فرار ہونے کے لیے لپکا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر مجھے ہال میں آویزاں وہ قدِ آدم آئینہ نظر آیا۔ وہ آئینہ اسی نے لگوایا تھا تاکہ کہیں جانے سے پہلے اپنا، اپنے میک اپ اور اپنے لباس کا جائزہ لے سکے کہ کہیں کوئی خامی تو نہیں ہے۔

میں اس آئینے کے سامنے ٹھٹک گیا، جس میں اس نے بارہا اپنے سراپا کو دیکھا تھا، اتنی کثرت سے کہ مجھے گمان ہوا، ممکن ہے آئینے میں اب بھی اس کا عکس موجود ہو۔ میں آئینے پر نظریں جمائے کھڑا، بلکہ جان سے لرزتا رہا۔ آئینہ گہرا، سپاٹ اور خالی نظر آیا۔ اس آئینے نے بھی اسے ان گنت بار اپنی آغوش میں بھرا تھا۔ اس کے وجود کو اپنے اندر سمیٹا تھا۔ اس نے بھی اسے ہر ہر زاویے سے دیکھا تھا، میری محبت کرنے والی نگاہوں کی طرح۔ اس لمحے مجھے اس آئینے سے بے اندازہ محبت محسوس ہوئی۔ میں نے آئینے کو چھوا۔ وہ بالکل سرد تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ آئینے سوگوار بھی ہوتے ہیں، ہجر میں سلگتی آنکھوں کی طرح جلتے بھی ہیں اور اجاڑ اور خوفناک بھی ہوتے ہیں۔ خوش صرف وہی لوگ رہتے ہیں، جو بھول جائیں کہ آئینے نے ماضی میں، اپنی آغوش میں کیا کچھ سمیٹا تھا۔ جو ماضی کو بھول جاتے ہوں۔ مجھے تو اس آئینے میں جگنوؤں کی طرح اڑتے ہوئے لمس، اور تتلیوں کی طرح تھرکتی ہوئی دھنک رنگ محبت نظر آ رہی تھی۔ وہ جام جہاں نما نہیں، جام عشق نما تھا۔ آہ، اس آئینے نے مجھے کیسا دکھی کر دیا تھا۔

میں باہر نکل آیا، بغیر باہر نکلنے کی خواہش کے اور مجھے پتا ہی نہ چلا کہ میں کس طرف چل دیا ہوں۔ مجھے علم نہیں ہوا کہ میں قبرستان کی طرف جا رہا ہوں۔ اس خاموش بستی کی طرف، جہاں وہ جا بسی ہے۔

میں اس کی سادہ قبر پر پہنچا۔ قبر پر سفید ماربل کی صلیب نصب تھی اور اس پر لکھا تھا:

اس نے محبت کی، وہ چاہی گئی اور مر گئی۔

وہ اس گہری قبر میں دفن تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا پھول بدن مرجھا رہا ہو گا۔ ترشی ہوئی مورت پر فرسودگی کا عذاب اتر رہا ہو گا گہرے دکھ نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میں نے اپنی پیشانی زمین پر رگڑ دی

اور دیر تک، بہت دیر تک اسی حال میں رہا۔ پھر میں نے اندھیرا ہوتے دیکھا۔ شہرِ خموشاں پر اندھیرا ابھی چپ چاپ دبے پاؤں اتر رہا تھا کہ سکوتِ آشنا بستی کے باسیوں کا سکون درہم برہم نہ ہو۔

اچانک ایک عجیب اور دیوانگی پر مبنی خواہش نے مجھے جکڑ لیا۔ ایسی خواہشیں مایوس عشاق کے گداز سینوں ہی میں نمو پا سکتی ہیں۔ میں نے سوچا، چاہا کہ وہ رات میں قبرستان ہی میں گزار دوں اور رو کر اس کی قبر بھگو دوں، لیکن خدشہ یہ تھا کہ مجھے دیکھ لیا جائے گا اور میں زبردستی وہاں سے نکال دیا جاؤں گا۔ اس صورتِ حال سے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرنا تھی۔ میں نے چالاکی سے کام لیا۔ وہاں سے اٹھا اور شہرِ خموشاں کی کوچہ نوردی شروع کر دی۔ میں چلتا رہا، چلتا گیا۔

یہ شہر اس شہر کے مقابلے میں کتنا چھوٹا ہے، جس میں ہم زندہ لوگ رہتے ہیں، لیکن اس کی آبادی ہمارے شہر کے مقابلے میں کتنی زیادہ ہے۔ ہمیں بڑے بڑے مکانات اور کشادہ سڑکیں درکار ہوتی ہیں۔ ہماری تین نسلیں ایک ساتھ جیتی ہیں۔ ایک ساتھ سورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتی ہیں۔ ان سبھوں کو پانی پینے کے لیے میٹھے چشموں کی اور شراب کے لیے انگور کی بیلوں کی اور کھانے کے لیے زمین سے غلّے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تمام مردہ نسلیں جو انسانیت کے زینے کی حیثیت رکھتی ہیں، انھیں کچھ بھی تو درکار نہیں ہوتا۔ زمین انھیں واپس لے لیتی ہے اور انھیں گھُپ اندھیرے میں رہنا ہوتا ہے۔

میں قبرستان کے افتادہ ترین حصّے تک آ گیا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ قبرستان کا قدیم ترین حصّہ ہے۔ یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جو بہت پہلے...... مدتوں پہلے یہاں آباد ہوئے تھے۔ جن کے جسموں کا گوشت اب مٹی میں گھل مل گیا ہوگا۔ قبروں پر کھڑی صلیبیں فرسودگی کی زد پر تھیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ آنے والے دنوں میں اس جگہ نئے آنے والوں کو آباد کیا جائے گا۔ وہ جگہ خود رو جنگلی گلاب کی جھاڑیوں اور شمشاد کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ وہ ایک اداس مگر خوبصورت باغیچہ تھا، جس کی نمو انسانی گوشت کی مرہونِ منت تھی۔

میں وہاں تنہا تھا...... بالکل تنہا۔ میں ایک درخت کے نیچے گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اب مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اس درخت کے تنے سے یوں لپٹا ہوا تھا، جیسے کوئی ڈوبتا آدمی پتوار کو تھامتا ہے۔

اندھیرا دبیز تر ہوا تو میں وہاں سے اٹھ گیا اور دبے قدموں چلنے لگا کہ کہیں صدیوں کی نیند میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی نیند میرے قدموں کی چاپ سے نہ اُچٹ جائے۔ میں تا دیر بھٹکتا پھرا، مگر اس کی قبر مجھے نہیں ملی۔ میں ہاتھ پھیلائے، ٹٹول ٹٹول کر مقبروں سے ٹکراتا بڑھتا رہا۔ لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ شہرِ خموشاں زیادہ بڑا شہر ہے۔ یہاں کسی کا پتا نہیں ملتا اور

کوئی پتا بتانے والا بھی نہیں ہوتا۔ میں کسی اندھے کی طرح راستہ ٹٹول رہا تھا، ٹھوکریں کھا رہا تھا، انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں اور کئی بار مقبروں سے میرا سر ٹکرا چکا تھا۔ میں انگلیوں سے ٹٹول کر مکینوں کے نام پڑھ رہا تھا۔ عجیب رات تھی وہ، بے حد عجیب رات۔ ایسا لگتا تھا کہ اب میں اس کا مہمان نہیں ہو پاؤں گا۔ اس کا نیا گھر مل ہی نہیں رہا تھا۔

وہ تاریک رات تھی۔ چاند بھی نہیں نکلا تھا۔ اب میں قبروں کے درمیان تنگ کچے راستے پر چلتے ہوئے خوف زدہ تھا۔ قبریں ہی قبریں، ہر طرف قبریں۔ وہاں قبروں کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ میرے دائیں، میرے بائیں، میرے سامنے، میرے پیچھے، میرے اطراف میں قبروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں تھک گیا۔ مزید ایک قدم چلنا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ میرے گھٹنے لرزنے لگے۔ چنانچہ میں ایک قبر پر بیٹھ گیا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں، لیکن پھر میں نے دھڑکنوں کے سوا بھی کوئی آواز سنی۔ کیا؟ وہ کوئی بے نام سی آواز تھی، بے مفہوم آواز۔ میں سوچنے لگا کہ یہ آواز کہیں میرے دکھ سے بوجھل سینے کی بے آواز آہ تو نہیں، میرے آزار زدہ ذہن کا کرشمہ تو نہیں یا یہ انسانی اسرار چھپانے والی زمین کے سینے سے ابھرنے والی آواز ہے؟ میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن جہاں میں بیٹھا تھا، وہاں سے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ دہشت کے مارے میں ساکت ہو گیا۔ خوف نے مجھے ٹھٹھرا دیا۔ میں چیخ سکتا تھا، اس لمحے میں مر سکتا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں مرمر کی جس سِل پر بیٹھا ہوں، وہ حرکت کر رہی ہے۔ ہاں، واقعی وہ سِل متحرک ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اٹھ رہی ہے۔ میں بری طرح اُچھلا اور برابر والی قبر کی طرف لپکا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

میں نے دیکھا اور واضح طور پر دیکھا کہ جس سِل پر میں بیٹھا تھا، وہ اٹھ رہی ہے۔ پھر ایک مردہ قبر میں سے نکلا۔ وہ ایک بے لباس ڈھانچا تھا۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی پیٹھ کی ہڈیوں سے سِل کو اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ رات بہت تاریک تھی، لیکن میں نے یہ سب کچھ بہت واضح طور پر دیکھا۔ میں نے مرمر کی صلیب پر کندہ عبارت پڑھی۔ لکھا تھا:

یہاں جیکوگس اولیونٹ دفن ہے جس نے ۵۱ سال زندگی گزاری۔ وہ اپنے گھر والوں سے محبت اور ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ مہربان، شریف اور معزز تھا اور اس نے خدا کی مرضی اور مہربانی سے وفات پائی۔

ڈھانچے نے بھی وہ عبارت بغور پڑھی۔ پھر اس نے راستے میں پڑا ہوا ایک نکیلا پتھر اٹھایا اور آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے ایک ایک حرف کھرچ کر مٹانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صلیب صاف ہو گئی۔ وہ چند لمحے اپنی کھوکھلی خالی آنکھوں سے اس جگہ کو تکتا رہا جہاں وہ حرف موجود رہے تھے۔

پھر اس نے اپنی استخوانی چھنگلیا کی نوک سے روشن حروف میں یہ عبارت لکھی، جیسے بچے فاسفورس کی تیلی سے دیوار پر نقش تصویر بناتے ہیں:

یہاں جیکوئس اولیونٹ عذاب بھگت رہا ہے جو ۵۱ سال کی عمر میں مرا۔ اس نے اپنے نامہربان رویے سے اپنے باپ کو قبل از وقت مرنے پر مجبور کیا کیونکہ وہ جلد از جلد باپ کی دولت اور املاک حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایذائیں پہنچائیں، بچوں کو دکھ دیے، پڑوسیوں کو دھوکے دیے، جس شخص کو بھی لوٹ سکتا تھا، لوٹا اور اسے بدبختی کے عالم میں موت آئی۔

یہ لکھنے کے بعد ڈھانچا بے حس و حرکت کھڑا اپنی کارگزاری کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا تو پتا چلا کہ ساری قبریں کھل گئی ہیں اور ان میں سے مُردے باہر نکل آئے ہیں۔ پھر وہ سب اپنی اپنی صلیبوں پر لکھی ہوئی عبارتیں مٹانے اور ان کی جگہ حقیقتیں لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ عبارتیں جو اُن کے لواحقین نے، ان کے محبت کرنے والوں نے صلیبوں پر کندہ کرائی تھیں، سچی نہیں تھیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ وہ سب پڑوسیوں کو ستانے والے، شیطان صفت، بد دیانت، منافق، جھوٹے، حاسد، ٹھگ اور مجرم تھے۔ پرانی عبارتوں کے تحت ان میں اچھے باپ تھے، وفادار بیویاں، محبت کرنے والے بیٹے، باعصمت بیٹیاں اور دیانت دار کاروباری تھے، لیکن اب وہ سب اپنی اپنی خوف ناک اور مکروہ سچائیاں لکھ رہے تھے۔ دنیا کی کوئی برائی، کوئی گناہ ایسا نہیں تھا، جو انھوں نے نہ کیا ہو، لیکن ان کے قریبی لوگ تک ان سچائیوں سے بے خبر تھے یا انھوں نے خود کو بے خبر ظاہر کیا تھا۔ اس روز پہلی بار مجھے علم ہوا کہ درگزر کا اتنا مرتبہ کیوں ہے اور درگزر کتنا مشکل کام ہے۔

میں نے سوچا، اس نے بھی اپنی صلیب پر یقیناً کچھ نہ کچھ لکھا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں ان مُردوں کے درمیان بھاگتے ہوئے اس کی قبر تلاش کرنے لگا۔ اب مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ اس بار مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے مل جائے گی اور میں نے اسے پہلی ہی نظر میں، بغیر اس کا چہرہ دیکھے پہچان لیا۔ اس کا چہرہ کفن کی چادر میں لپٹا ہوا تھا اور سفید ماربل کی جس صلیب پر کچھ پہلے میں نے یہ عبارت پڑھی تھی۔

اس نے محبت کی، وہ چاہی گئی اور مر گئی۔

وہاں اب یہ عبارت لکھی تھی:

ایک دن موسلا دھار بارش میں یہ عورت اپنے محبوب سے بے وفائی کے لیے نکلی تھی۔ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اسے نمونیا ہوا اور مر گئی۔

مجھے بعد میں پتا چلا کہ لوگوں نے اگلی صبح مجھے اس کی قبر پر بے ہوش پڑے پایا تھا۔

WAS IT DREAM
Guy De Maupassant.

سسپنس کے سلور جوبلی نمبر کے لیے ایک سلور جوبلی کا ماجرا اپنے اسی معاشرے کی کہانی۔ اس ماہ کا توشۂ خاص

اُس رات کا افسانہ جو اپنے اندر پچیس برس کے عذاب سمیٹے ہوئے تھی
محبتیں لکھنے والے قلم کی نفرت بھری تحریر

علیم الحق حقی

شبِ احتساب

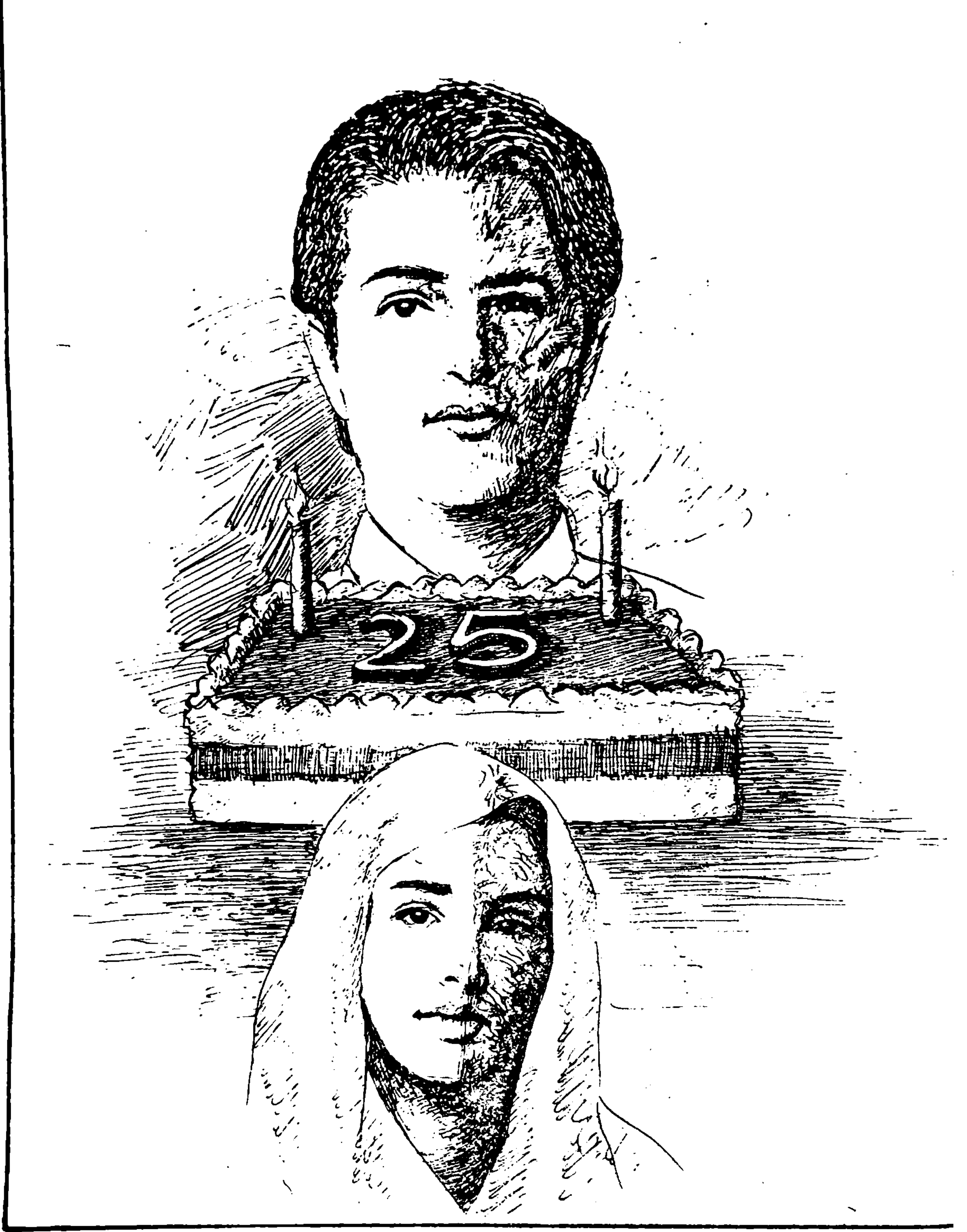
ہم ہوں گے آپ اپنے ہی دل کا عذاب جب
چہرے سے خواہشوں کے اٹھے گا نقاب جب
کیا کیا نہ خوف آئے ہیں خود اپنے آپ سے
ہم نے کیا ہے اپنا کبھی احتساب جب

ہمارے ہاں ہر وقت احتساب کا شور مچا رہتا ہے۔ یہی فرمائشیں چلتی رہتی ہیں۔ جنہیں احتساب کا اختیار مِل جائے، وہ احتساب کے نام پر انتقام لیتے ہیں اور جن کا احتساب کیا جا رہا ہو، وہ دوسروں کے احتساب کا عزم ظاہر کرتے رہتے ہیں اور جب موقع مِل جائے تو احتساب اُنہیں یاد بھی نہیں رہتا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں احتسابِ ذات... خود احتسابی کی رسم ہی نہیں۔ یہاں تو لوگ آئینہ بھی کم ہی دیکھتے ہیں۔ سارا زور اپنے ہر فعل، ہر عمل کو درست ثابت کرنے پر رہتا ہے۔ جس نے اپنا کبھی احتساب نہیں کیا، اپنا قبلہ درست نہ کیا، وہ کسی اور کا احتساب نہیں کر سکتا۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ گناہ گار کو پہلا پتھر وہ مارے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ یعنی پہلے انسان اپنا احتساب کرے۔ ہم ایسا نہیں کرتے اور ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ ہم اپنا احتساب نہیں کریں گے تو وقت کرے گا اور جتنی تاخیر سے کرے گا، احتساب اُتنا ہی سخت ہوگا۔

بنگلے کے لان پر رنگ و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ زرق برق ملبوسات، دمکتے چہرے، لبوں پر مچلتے تبسم اور خوشبو کی لپٹیں اڑاتے آنچلوں نے لان کو جلوہ گاہ بنا دیا تھا۔ ہر طرف جیسے خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مرد اور عورتیں چھوٹے چھوٹے گروپ کی شکل میں اِدھر اُدھر موجود تھے۔ کہیں کھنکھناتے قہقہے تھے تو کہیں دل آویز تبسم۔ کہیں سرگوشیاں تھیں تو کہیں بلند آہنگ گفتگو۔ ہر شخص اپنے پسندیدہ انداز میں اس محفل سے حظ اٹھا رہا تھا۔

عثمان حفیظ لان کے اس حصے میں کھڑا تھا، جو گیٹ سے قریب تر تھا۔ وہ وہاں مہمانوں کو خوش آمدید کہتا رہا تھا۔ کچھ دیر شہناز بھی اس کے ساتھ کھڑی رہی تھی پھر کسی کو لان میں بچھی ہوئی میزوں کی طرف لے جانے کے بعد واپس نہیں آئی تھی۔ مہمانوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ خوش اخلاق، ہنس مکھ اور زندہ دل ہونے کی وجہ سے لوگوں میں بے حد مقبول تھی۔

عثمان نے بیوی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ آخر کار وہ اسے نظر آگئی۔ اس وقت وہ اشرف علی کے ساتھ کھڑی تھی اور کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ ایک لمحے کو عثمان کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ شہناز کی یہ ہنسی ہمیشہ اس پر جادو کر دیتی تھی۔ ہنسنے کا اس کا خاص انداز تھا۔ سر پیچھے کی طرف ہو جاتا اور چہرہ آسمان کی سمت۔ اور چہرے پر اور آنکھوں میں روشنی سی پھوٹ پڑتی۔ پھر اس ہنسی کا صوتی تاثر! وہ بے حد مترنم اور بے ساختہ ہنسی



ی۔ سننے والے کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ دل میں، دماغ میں، وجود میں
ںہ سے چھلکتی خواہشیں سر اٹھانے لگتی تھیں۔ اس کا اپنا بھی یہی
ال تھا۔ برسوں پہلے شہناز کی یہ ہنسی سن کر اسے صرف اور صرف
لوت کی خواہش ہوتی تھی۔ بس وہ ہو اور شہناز ہو۔ اور جب تک
،نہ ہو جاتا وہ بے چین رہتا۔

مگر یہ سب کچھ اب قصۂ پارینہ تھا۔ اب وہی ہنسی سن کر صرف
یک لمحے کو وجود خواہشوں کی گٹھری بنتا تھا اس کے بعد ایسی کراہت
ور بے زاری طاری ہوتی کہ خمار کی کیفیت بھی اس کے سامنے ہیچ
ہوکر رہ جاتی۔

اب بھی یہی ہوا۔ ایک لمحے کے بعد اسے اپنا آپ برا لگنے
لگا۔ یہ عجیب بات تھی۔ شہناز اسے بری نہیں لگتی تھی۔ لیکن خود
سے نفرت ہونے لگتی تھی۔ ایسے میں وہ شہناز کو بہت غور سے
دیکھتا۔ اس کی نگاہوں میں اشتیاق نہیں ہوتا تھا۔ ایک جوہری کی
سی حرص و ہوس ہوتی تھی، جس کے سامنے کوئی بے حد نایاب اور
حسین ہیرا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس کی نگاہوں میں بوالہوسی ہوتی۔
چہرہ تمتما اٹھتا۔ آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگتی۔

اس وقت بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ کسی نے اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا "کیا بات ہے یار؟
بھابی کو کھا جاؤ گے کیا؟ بہت بے صبرے ہو۔"

وہ بری طرح چونکا۔ اس نے سر گھما کر انسان کو دیکھا "ایسی

کوئی بات نہیں بھائی۔" اس نے کھسیا کر کہا۔ احسان اس کا سب سے اچھا دوست تھا۔

"میرا خیال ہے' سب مہمان آچکے ہیں۔" احسان نے سنجیدگی سے کہا "یا ابھی کسی کا انتظار ہے تمہیں؟"

"مجھے؟ نہیں تو۔"

"تو پھر نمٹادو یہ معاملہ۔ اناؤنسمنٹ کردوں؟"

عثمان نے اثبات میں سر ہلایا۔ احسان اسٹیج کی طرف چل دیا۔ عثمان نے اپنے خاص ملازم شبیر کو اشارے سے بلایا "کیک اسٹیج پر پہنچادو۔" یہ کہہ کر وہ خود بھی اسٹیج کی طرف چل دیا۔

اسی وقت اسٹیج سے احسان نے اناؤنسمنٹ شروع کردیا۔

"خواتین و حضرات' پلیز متوجہ ہوں۔"

قہقہے تھم گئے۔ سرگوشیاں معدوم ہوگئیں۔ خاموشی چھا گئی۔ سب کی نظریں اسٹیج کی طرف اٹھ گئیں۔

"آپ سب جانتے ہیں کہ آج میرے عزیز دوست عثمان کی شادی کی سالگرہ ہے۔" احسان مائیک ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا۔ "اب چند لمحوں میں سالگرہ کا کیک کاٹا جائے گا۔ میں عثمان حفیظ اور بیگم عثمان سے استدعا کرتا ہوں کہ اسٹیج پر تشریف لے آئیں اور آپ تمام خواتین و حضرات بھی تمام تر رونق سمیت اسٹیج سے قریب تر ہوجائیں۔ شکریہ۔"

اس دوران کیک لاکر میز پر رکھا جاچکا تھا۔ بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ گئے۔ سب لوگ اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سٹیج کے گرد دائرہ سا بن گیا۔ شہناز اور عثمان اسٹیج پر پہنچ گئے۔ کیک باکس سے نکالا گیا تو دیکھنے والوں کی سانسیں رکنے لگیں "واہ' کتنا خوب صورت کیک ہے۔" کسی نے کہا۔

"لیکن یہ دو مکان کیوں بنوائے ہیں کیک میں؟" ایک اور نے......

واقعی۔ کیک دو کاٹیجز پر مشتمل تھا جو آمنے سامنے تھے۔ ان میں ایک پگڈنڈی تھی جو درمیان سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہاں گہری کھائی تھی جو دونوں کاٹیجز کا ایک دوسرے سے رابطہ ختم کررہی تھی۔

"بہت خوب صورت آئیڈیا ہے بھئی... بہت فنکارانہ خیال ہے" کسی نے داد دی۔

کیک اتنا خوب صورت تھا کہ اصل اور اہم بات لوگوں کو دیر سے نظر آئی۔ سب سے پہلے مسز شاہ نے اسے دیکھا "او... وہاٹ اے سرپرائز!" انہوں نے بے حد سُریلے پن سے چیخنے کی کوشش کی۔ پھر وہ شہناز کی طرف مڑیں "پچیس سال ہوگئے تمہاری شادی کو یہ سلور جوبلی ہے۔ بھئی بڑی چھپی رستم نکلیں تم۔ یہ تو بتایا ہی نہیں تھا تم نے۔"

چند لمحوں میں یہ بات ہر زبان پر تھی۔ سب ایک دوسرے سے یہی کہہ رہے تھے "یہ تو بہت خاص موقع ہے بھئی۔ یہ ان کی شادی کی پچیسویں سالگرہ ہے۔"

○☆○

اسٹیج پر کھڑی ہوئی مسز شمیم نے برابر کھڑی ہوئی بیگم رضوی سے سرگوشی میں کہا "میرا خیال ہے' اس جوڑے نے ہمارا ایک بڑا مسئلہ حل کردیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔" بیگم رضوی نے جوابی سرگوشی کی۔

"ارے وہی مسئلہ.... اس سال کے مثالی جوڑے والا۔" مسز شمیم ذرا جھنجلا گئیں۔

بیگم رضوی تقریباً اچھل پڑیں "واقعی... شادی کی پچیسویں سالگرہ۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"تم ایسا کرو کہ باقی ممبرز سے بھی رائے لے لو اور آکر مجھے بتادو۔ میں کیک کٹنے کے بعد تقریر کرتے ہوئے اناؤنس کردوں گی۔"

بیگم رضوی سر ہلاتے ہوئے اسٹیج سے اتریں۔ وہ باقی ممبرز کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی رہیں۔ آخرکار انہیں صبیحہ بیگم نظر آگئیں۔ وہ ان کی طرف بڑھ گئیں۔ مسز شمیم اپنی جگہ کھڑی مسکراتی رہیں۔ وہ مطمئن تھیں کہ ان کا ایک بڑا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔

مسز شمیم نے برسوں پہلے چند خواتین کے ساتھ مل کر انجمنِ شادی شدہ خواتین کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں' اس میں خواتین کو فرصت ہی فرصت ہوتی ہے' جو آخرکار بے زاری کا روپ دھار لیتی ہے۔ انجمنِ شادی شدہ خواتین اس مسئلے کا بہترین حل ثابت ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ممبر شپ بہت تیزی سے آگے بڑھی۔ انجمن کی سرگرمیاں بے حد متنوع تھیں' جو پورے سال جاری رہتی تھیں۔ کبھی اس کے زیرِ اہتمام کوئی پکنک ہوتی تو کبھی میلۂ جشنِ بہاراں۔ کبھی کسی فنکار کے ساتھ شام منائی جاتی تو کبھی معذوروں کی امداد کے لئے کوئی پروگرام کرلیا جاتا۔ لیکن انجمن کا خاص اور مقبول پروگرام یہ تھا کہ ہر سال ایک جوڑے کو سال کے مثالی جوڑے کا ایوارڈ دیا جاتا تھا۔ اس تقریب کو سماجی حلقوں میں خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

مسز شمیم انجمنِ شادی شدہ خواتین کی چیئرپرسن تھیں۔ یہ مثالی جوڑے والا سلسلہ انہوں نے شروع تو کردیا تھا مگر اب وہ انجمن... کے لئے بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ ہر سال ایک مثالی جوڑے کا انتخاب جبکہ مثالی جوڑے کا محض تصور موجود تھا۔ عملی زندگی میں مثالی جوڑا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اسکینڈلوں سے بھرے اس معاشرے میں کسی کا دامن صاف نہیں تھا۔ سبھی ایک جیسی ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ فرق یہ تھا کہ کچھ لوگ ظاہرداری اور بھرم کا خیال رکھتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی ازدواجی زندگی بے سکون ہے اور ایسے لوگ بھی تھے جو پردہ نہیں رکھتے تھے۔ کہہ بھی دیتے تھے کہ وہ جیسے تیسے ازدواجی زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے ہیں۔

تو یہ ہر سال مثالی جوڑے کا ایوارڈ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔
مسز شمیم جانتی تھیں کہ ہر سال جس جوڑے کو انعام دیا جاتا ہے وہ بظاہر تو بہت خوش ہوتا ہے۔ اپنے ایوارڈ پر فخر کرتا ہے لیکن درحقیقت ایوارڈ ان کی روح کے لئے تازیانہ ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر وہ بے چارے بلبلاتے ہیں۔ مسز شمیم انجمن کی عہدے دار خواتین کی ازدواجی زندگی سے خوب واقف تھیں۔ دور کیوں جائیں ان کی اپنی ازدواجی زندگی بھی کچھ خوش گوار نہیں تھی۔

ایسے میں شادی کی یہ ۲۵ویں سالگرہ مسز شمیم اور انجمن کے لئے نعمت ہی تھی۔ وہ احسان کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ انہیں تقریر کا موقع فراہم کر سکتا تھا۔

○☆○

کیک پر دو اور پانچ کے ہندسوں والی موم بتیاں ۲۵ کی شکل میں لگادی گئیں۔ احسان نے دیا سلائی جلاکر موم بتیوں کو روشن کردیا۔

"آؤ عثمان..... آئیں بھابی۔" اس نے کہا۔

عثمان اور شہناز کیک کے قریب ہوگئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر کیک پر لگی موم بتیوں پر جھک گئے۔ اگلے ہی لمحے موم بتیاں بجھ گئیں۔ عثمان نے کیک کاٹنے کے لئے چھری اٹھائی۔ شہناز نے اس کے چھری والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ عثمان نے کیک کو اس جگہ سے کاٹا' جہاں دونوں کا ٹیجز کا درمیانی راستہ تھا۔ اس نے کیک کے دو ٹکڑے کاٹے اور ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ سے شہناز کو کھلایا۔ شہناز نے دوسرا ٹکڑا اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں ڈال دیا۔

مبارکباد کا شور مچ گیا۔ خوش و خرم مہمان مبارکباد دے رہے تھے۔

اسی وقت بیگم رضوی آئیں اور انہوں نے مسز شمیم سے سرگوشی میں کہا "سب ممبر متفق ہیں کہ یہی اس سال کا مثالی جوڑا ہے۔"

سرگوشی بہت دھیمی تھی لیکن عثمان حفیظ نے اسے واضح طور پر سن لیا۔ ایک لمحے کو اس کا چہرہ ست گیا لیکن فوراً ہی اس نے چہرے پر ایک چمکیلی مسکراہٹ کا نقاب ڈال دیا۔ اس نے سر گھما کر بیوی کو دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی جسے وہ کوئی مفہوم نہ پہنا سکا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

احسان اس کے پاس آگیا "بہت مبارک ہو دوست۔" وہ بولا۔ "میں تمہاری حالت جانتا ہوں۔ اس وقت تمہارے بس میں ہو تو اس تقریب کو فوراً ختم کرو اور مہمانوں کو رخصت کرکے....." وہ کہتے کہتے رکا۔ اس کی نگاہوں میں شوخی چمکی "... بھابی کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گزارو۔ ہے نا یہی بات؟"

"اس سے زیادہ درستی کے ساتھ شاید ہی زندگی میں کبھی کسی نے مجھے سمجھا ہوگا۔" عثمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسی لئے میں تم سے اجازت لینے آیا ہوں۔ تقریب کچھ اور طویل ہوجائے گی لیکن یہ ضروری ہے۔ انجمنِ شادی شدہ خواتین کی چیئرپرسن مسز شمیم تمہارے مہمانوں سے مختصر سا خطاب کرنا چاہتی ہیں۔" احسان نے مختصر پر خاص طور پر زور دیا "اجازت ہے؟ اعلان کردوں۔"

"اجازت ہے۔" عثمان نے شاہانہ انداز میں کہا۔

"شکریہ عالی جاہ۔" احسان مزاحیہ لہجے میں بولا اور مائیک کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد اس کی آواز لان میں گونج رہی تھی۔ "خواتین و حضرات! ازراہِ کرم توجہ فرمائیں۔" توجہ حاصل کرنے کے بعد اس نے مائیک میں کہا "یہاں انجمنِ شادی شدہ خواتین کی چیئرپرسن مسز شمیم موجود ہیں جن سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ وہ ہم سب کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھرنے کا اہتمام کرتی رہتی ہیں۔ مسز شمیم آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتی ہیں اور ایک اہم اعلان بھی انہیں کرنا ہے۔ توجہ فرمائیں..... لیڈیز اینڈ جنٹلمین' مسز شمیم۔"

مسز شمیم بڑے باوقار انداز میں آئیں اور مائیک تھام لیا۔ "دوستو' میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی....."

عثمان اسٹیج سے اتر آیا۔ لوگوں کی مبارکباد وصول کرتا وہ لان کے ایک نیم تاریک گوشے کی طرف چل دیا۔ درحقیقت اسے اس وقت تنہائی کی شدید ضرورت تھی۔ تنہائی! اور ایسی محفل میں تنہائی؟ محفل بھی وہ جس کا ہیرو وہ خود تھا۔ ایسے میں وہ گھر کے اندر بھی نہیں جاسکتا تھا کہ یہ آدابِ میزبانی کے خلاف تھا۔ یہ بداخلاقی ہوتی۔

اس نے ایک کرسی گھسیٹی اور اس گوشے میں جا بیٹھا۔ وہاں سے گزرتی ہوئی دو خواتین نے حیرت سے اسے دیکھا "عثمان صاحب خیریت ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا "یہاں اس طرح کیوں آبیٹھے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں بیگم خورشید۔ کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے اور تھکن بھی ہوگئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

وہ دونوں آگے بڑھ گئیں۔ چند قدم آگے جاکر ایک نے دوسری سے کہا "شراب کی طلب ہو رہی ہوگی بے چارے کو۔"

"پہلو گرم کرنے کی بھی فکر ہوگی۔ اب آج تو یہ ممکن نہیں ہے نا۔" دوسری بولی۔

یہ جملے کرسی پر بیٹھے ہوئے عثمان نے بھی سن لئے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی سماعت کو برا بھلا کہنے لگا' جو وہ باتیں بھی سمیٹ لیتی تھی' جو اس کے لئے نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں بلاوجہ اذیت اٹھانی پڑتی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے بیگم رضوی کی وہ سرگوشی سن لی تھی' جو مسز شمیم کے لئے تھی۔

اس نے سر اٹھا کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ مسز شمیم بڑے جوش و خروش سے بول رہی تھیں لیکن اس تک بس ان کی آواز پہنچ رہی تھی' لفظ نہیں۔ کیا طرفہ تماشا ہے' یہ میری سماعت۔ وہ بڑبڑایا۔ تقریر سنائی نہیں دے رہی..... اور وہ سرگوشی اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

یہ حقیقت تھی۔ بیگم رضوی کی وہ سرگوشی اس کے کانوں میں مسلسل گونج رہی تھی..... سب ممبر متفق ہیں کہ یہی اس سال

مثالی جوڑا ہے۔

اس کے چہرے پر اذیت کا سایہ سا لہرا گیا۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ یہ کام بھی آج ہی کے دن ہونا تھا۔ آج کے دن! یہ دن تو کسی اور ہی کام کے لئے مخصوص ہے۔ یہ تو نجات کا دن ہے۔ اذیت سے، منافقت سے، گھٹن سے نجات کا دن.... ایسے میں یہ ایوارڈ کی پرچی کیوں چلی آرہی ہے میری طرف۔

میں اور شہناز.... شہناز اور میں۔ مثالی جوڑا! ہنہہ۔ اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ہاں.... شاید برسوں پہلے کبھی، ابتدا میں۔ بالکل ابتدا میں۔ شاید ہم مثالی جوڑا تھے۔ اس وقت جب میری محبت شفاف، بے داغ تھی۔ پرستش کی حد کو پہنچی ہوئی محبت۔ مگر اب۔ اب تو وہ کوئی بھولا بسرا خواب بھی نہیں رہی۔ اس کی جگہ تو نفرت نے لے لی۔ اور نفرت بھی وہ جو ظاہر نہیں کی جا سکی۔ کچلی ہوئی، مسخ شدہ، قابلِ نفرت نفرت!

اور وہ دن! شہناز کتنی خوب صورت تھی۔ اسے دیکھ کر سانسیں رکنے لگتی تھیں۔ خیر۔ خوب صورت تو وہ اب بھی بہت ہے۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ وہ اس کی تردید کرنا چاہتا تھا مگر اس کی فطرت کی معقولیت نے اسے روک دیا۔

اس نے سر اٹھا کر پھر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ اس بار اس کی نظریں شہناز کو تلاش کر رہی تھیں۔ لان کے جگمگاتے قلب میں وہ مسز شاہ کے ساتھ کھڑی باتیں کرتی نظر آئی۔ اس نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ شہناز پہلے کی طرح نہیں، پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہے اب۔ اس کی معقولیت نے اعتراف کیا۔ وہ اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھتا، ۲۵ سال پہلے کی شہناز سے اس کا موازنہ کرتا رہا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس عورت کی عمر ۵۰ سال ہے۔ وہ ۳۰، ۳۵ سے زیادہ ہرگز نہیں لگتی تھی۔ کیا انسانوں کی طرح وقت کو بھی دھوکا دیا جا سکتا ہے؟

۲۵ سال پہلے کی شہناز بلاشبہ حسین تھی۔ وہ معصوم اور کم عمر بھی تھی۔ کم عمری کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے پھر اس میں محبت بھی شامل ہو جائے تو سونے پر سہاگا والی بات ہوتی ہے۔ محبت تو نظروں میں حسین رنگ بھر دیتی ہے۔ عثمان جانتا تھا کہ اس وقت وہ شہناز سے محبت کرتا تھا۔ جبکہ اب اسے شہناز سے نفرت تھی۔ لیکن وہ یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ شہناز اب زیادہ حسین ہو گئی ہے۔ پہلے وہ کلی تھی تو اب حسن کے گلستاں کا بے مثال پھول بن گئی تھی۔ پہلے وہ ہلال تھی تو اب ماہِ تمام۔ اب تو اس کی شادابی اکسانے والی تھی۔

لیکن عثمان دل کا کیا کرتا، جس میں ۲۷ سال پہلے شہناز چپکے سے اتر گئی تھی۔ اب تو وہ بس یہی سوچ سکتا تھا کہ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ اسی دن تو اس کی زندگی کے جام میں زہر کا پہلا قطرہ گرا تھا۔ اب تو جام لبریز ہو چکا تھا۔

وہ یادوں کی ڈور تھام کر پیچھے، بہت پیچھے چلا گیا۔

○☆○

شہناز سے تو اس کا رشتہ ہی دکھ کا تھا۔ اس کی پہلی دید کے ساتھ اس کی زندگی کا سب سے بڑا غم پیوست تھا۔ بعض غم ایسے ہوتے ہیں، جنہیں آدمی کبھی نہیں بھولتا۔ وہ غم بھی ایسا ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود شہناز کی پہلی دید کو کبھی نہ بھول سکا۔ اس دید کا ناتا ایسے دکھ سے تھا جو ناقابلِ فراموش تھا۔

اس روز عثمان کی کائنات لٹی تھی!

امی کا انتقال ہوا تو وہ بارہ سال کا تھا۔ اسے یاد تھا، وہ بہت رویا تھا۔ لیکن امی کی موت کے دن نہیں۔ ہاں، اس کے بعد وہ مسلسل روتا رہا تھا۔ جب بھی وہ کوئی ایسا کام کرتا، جو اس سے پہلے امی اس کے لئے کرتی تھیں، وہ رو پڑتا تھا۔ ایسے ہر موقع پر اسے شدت سے محرومی کا احساس ہوتا تھا۔ رات کے وقت دودھ پینا تو اس نے چھوڑ ہی دیا تھا۔ کون خود جا کر گلاس میں اپنے لئے دودھ لائے اور پھر امی کو یاد کر کے روتا رہے۔

پھر ایک رات وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا کہ ابو نے دھیرے سے اسے پکارا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ دودھ کا گلاس ہاتھ میں لئے اس کے بیڈ کے پاس کھڑے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا "جی ابو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ دودھ پی لو بیٹے۔" ابو نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ زخم جیسے پھر سے ہرا ہو گیا۔ ابو نے دودھ کا گلاس بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ بچوں کی طرح بلکتا رہا اور ابو اسے تھپکتے چمکارتے رہے۔ جانے یوں کتنی دیر گزری۔ پھر برسات تھمی تو ابو نے اپنے ہاتھ سے اسے دودھ پلایا "میں بہت کم ظرف ہوں بیٹے۔" انہوں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا "اپنے غم میں الجھ کر تمہارے غم کو بھول گیا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ تمہارا غم میرے غم سے کتنا بڑا ہے۔ مجھ سے تو میری شریکِ سفر چھنی ہے لیکن تم تو اپنی جنت سے محروم ہو گئے ہو۔"

اس نے پھر ابو کے سینے میں منہ چھپا لیا اور سسکنے لگا۔

"نہ روؤ میرے بیٹے۔" ابو نے اسے تھپکتے ہوئے کہا "تم روؤ گے تو وہاں تمہاری ماں تڑپے گی۔ اسے بہت تکلیف ہوگی بیٹے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ اس سلسلے میں وہ پہلی تسلی، پہلی نصیحت تھی جس نے اس کے دل کو چھو لیا تھا۔

"میں تمہیں تمہاری ماں تو واپس نہیں دلا سکتا عثمان۔" ابو نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "لیکن اپنے عمل سے یہ کوشش ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہیں اس کی محرومی کا احساس نہ ہو۔ اب میں تمہارا باپ ہی نہیں، تمہاری ماں بھی ہوں۔"

اور واقعی ابو نے ماں بن کر دکھایا۔ وہ ہر رات اس کے لئے دودھ کا گلاس لے کر آتے۔ بیڈ پر اس کے ساتھ لیٹ کر اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتے اور جب تک وہ سو نہ جاتا، وہ کمرے سے نہ جاتے۔ کبھی تو اسے ایسا لگتا کہ ابو نہ تو سوتے ہیں اور نہ ہی اس کے کمرے سے جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ اس کی آنکھ کھلی اور اس

نے ابو کو خود پر جھکے یا اپنے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے پایا۔ شاید وہ بار بار اس کے کمرے میں آتے تھے۔ شاید وہ سکون سے سو نہیں پاتے تھے۔

عثمان جانتا تھا کہ اس کا باپ دنیا کا سب سے اچھا باپ ہے۔ یہ بات صرف وہ نہیں سمجھتا تھا' تمام لوگ یہی کہتے تھے کہ رئیس صاحب نے بیٹے کے لئے زندگی تج دی ہے۔ بیوی مری تو ان کی عمر ایسی تھی کہ انہیں شادی کر لینا چاہئے تھی۔ پھر وہ صاحبِ حیثیت تھے۔ انہیں تو کنواری لڑکی کا رشتہ بھی مل سکتا تھا۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو سوتیلی ماں کی مصیبت سے بچانا چاہتے تھے۔ سو انہوں نے خود کو مار لیا۔

رئیس صاحب کی صحت بیوی کی موت کے بعد تیزی سے گرتی چلی گئی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے چہرے سے 'گرتے ہوئے بالوں سے' آنکھوں کے نیچے پڑنے والے سیاہ حلقوں سے ہوتا تھا۔ لیکن محنت وہ پہلے سے زیادہ کر رہے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ انہیں بیوی کا غم بہت آہستگی اور تسلسل سے چاٹ رہا ہے۔ لیکن عثمان جانتا تھا کہ بات کیا ہے۔

عثمان کی عمر اتنی نہیں تھی لیکن وہ بہت زیادہ سمجھ دار تھا۔ کم عمری میں ماں یا باپ سے محروم ہو جانے والے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ زندگی اور دکھ کا فلسفہ اور آگہی ان پر روشن ہو جاتے ہیں۔ عثمان پر بھی بہت کچھ کھل گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ غم انسان کو کبھی نہیں مارتا۔ مار ہی نہیں سکتا۔ غم میں اتنی طاقت' اتنی سکت نہیں ہوتی۔ انسان ہمیشہ غم سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوتا ہے۔ اللہ کسی کو غم دینا چاہے تو اس سے پہلے اسے ظرف عطا فرماتا ہے۔ انسان کو کسی آزمائش سے گزارنا ہو تو پہلے وقت کے ہاتھوں اس انسان کی تربیت کراتا ہے۔ اس لئے کہ وہ نہایت رحم والا' بے حد مہربان ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ اس کے باپ نے جو ہمیشہ سے اپنی ذمے داریوں کا احساس کرنے والا تھا اب باپ کی ذمے داری کے ساتھ ماں کی ذمے داری بھی اپنے اوپر لاد لی تھی۔ یہ ایک کوہِ گراں تھا جس کے نیچے وہ دبتا جا رہا تھا۔ آدمی دن بھر باپ بن کر بیٹے کے مستقبل کی خاطر محنت کرے اور رات بھر ماں بن کر اس کی باطنی ضروریات اور آسائشات کی فکر میں جاگے تو صحت تو تباہ ہونی ہی ہے۔

ماں کی موت کو چار سال ہوئے ہوں گے کہ ایک دن عثمان نے رئیس صاحب سے اس سلسلے میں بات کر ہی لی "ابو' آپ اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟" ایک رات اس نے ان سے کہا۔

"رکھتا تو ہوں بیٹے۔"

"کہاں رکھتے ہیں۔ اپنا حال تو دیکھئے....."

"میں بالکل ٹھیک ہوں عثمان اور کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں۔"

"بات تو ہے ابو۔ آپ رات کو سوتے بھی نہیں۔ اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔"

"یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ میں سوتا نہیں ہوں۔"

"میں خود دیکھ رہا ہوں۔ رات میں جب بھی آنکھ کھلے تو آپ میرے پاس موجود ہوتے ہیں۔"

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں جب تمہارے کمرے میں آؤں' تمہاری آنکھ کھل جاتی ہے۔" ابو نے کھسیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

عثمان کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کی خاطر اس کی بات مان کر رات کو اس کے کمرے میں آنا چھوڑ دیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی بات مان لیں گے لیکن ایک خیال کے تحت وہ کہتے کہتے رک گیا۔ یہ مطالبہ اس بات کی ضمانت نہیں تھا کہ اس کے بعد وہ سو سکیں گے۔ اگر وہ اپنے کمرے میں جاگتے رہے تو یہ اور برا ہوگا۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ ان کا دکھ اس کے دکھ سے بڑا ہے۔ ان کی محرومی زیادہ خوف ناک ہے۔ انہیں دل جوئی کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ امی اس کی امی تھیں لیکن ابو کی تو وہ شریکِ سفر تھیں' واحد محرم راز تھیں۔ اب وہ کسی کو اپنا دکھ نہیں سنا سکتے۔ کوئی نہیں' جس سے وہ دل کی بات کہیں۔ وہ تو اپنا ہر دکھ انہیں سنا دیتا ہے۔ اس کی دل جوئی تو وہ بھرپور طریقے سے کرتے ہیں لیکن ان کے سینے پر رکھا پہاڑ تو کسی کو نظر نہیں آتا۔ اسے بھی نہیں.....

بہت سوچ کر اس نے ایک بات کہی "ابو' میری ایک بات مانیں گے؟"

"کہو بیٹے۔"

"آپ یہاں میرے پاس سویا کریں۔ مجھے اکیلے سونا اچھا نہیں لگتا ہے۔"

"اتنے بڑے ہو کر....."

"ابو' آپ کے لئے تو میں بچہ ہی ہوں۔" اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"چلو یہی سہی۔ لیکن بہت عجیب لگے گا۔"

یوں سولہ سالہ عثمان نے اپنے طور پر باپ کو جذباتی تحفظ فراہم کیا۔ اس کا فائدہ ہوا۔ ابو رات کو بے چین ہو کر جاگتے تو وہ بھی بیدار ہو جاتا۔ وہ ان کے سر میں تیل لگاتا۔ ان کے پاؤں دباتا۔ ان سے باتیں کرتا۔ ابو شرمندہ ہوتے کہ انہوں نے اس کی بھی نیند خراب کی۔ یوں ان کے اندر بے خوابی کے خلاف مزاحمت پیدا ہوئی اور وہ سکون سے سونے لگے۔

پھر یہ ہوا کہ وہ ابو سے لپٹ کر سونے لگا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ماں سے محرومی کی وجہ سے چھوٹا سا بچہ بن گیا تھا بلکہ اس لئے کہ ابو اسے چھوٹا سا بچہ لگتے تھے۔ اس کے خیال میں انہیں اس کی ضرورت تھی کہ کوئی ان سے لپٹ کر سوئے۔

وہ تعلیم حاصل کرتا رہا اور ابو کا کاروبار پھیلتا رہا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ابو کے ساتھ بڑی خوبی اور کامیابی سے کاروباری معاملات سنبھالنے لگا۔ اسے اپنے باپ پر فخر تھا۔ دنیا میں کسی کا ایسا باپ نہیں تھا۔

پھر ابو اس سے شادی کی ضد کرنے لگے "یار میں اب گھر میں بہو لانا چاہتا ہوں۔ مجھے خدمت کی ضرورت ہے اور کھیلنے کے لئے ایک پوتا بھی چاہئے۔"

"ابھی نہیں ابو۔" وہ کہتا۔ وہ چاہتا تھا کہ کاروباری امور کو پوری طرح سمجھ کر ان پر حاوی ہو جائے۔ پھر اس چکر میں پڑے۔ وہ اس بری طرح کام میں الجھا ہوا تھا کہ اس کے پاس فرصت ہی نہیں تھی۔

لیکن ابو کا اصرار جاری رہا "آخر تم بچ کیوں رہے ہو شادی سے؟" ایک دن انہوں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"ایسی بات نہیں ابو۔" اس نے کہا اور اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔

"لیکن یہ ہو گا کب تک۔ کسی وقت کا تعین تو کرو۔"

عثمان تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "انشاء اللہ تیس سال کی عمر میں....."

ابو کی نگاہوں سے اداسی جھلکنے لگی "کہیں دیر نہ ہو جائے بیٹے۔"

"ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ ابھی آپ بہت جئیں گے انشاء اللہ۔"

ابو اداسی سے مسکراتے رہے۔ انہوں نے کہا کچھ نہیں۔

یہ تھے اس کے باپ رئیس احمد۔ ایسا باپ' جو ماں بھی ہو' پوری کائنات ہوتا ہے۔ اسی لئے تو ان کے انتقال پر اسے لگا کہ اس کی پوری کائنات لٹ گئی ہے۔ اسے احساس ہوا کہ ماں کا غم تو اس نے اٹھایا ہی نہیں تھا۔ وہ تو پورے کا پورا ابو نے بانٹ لیا تھا۔ اب دونوں غم اس پر ایک ساتھ آئے تھے۔

موت کا دکھ اپنی جگہ۔ لیکن موت پچھتاوے بھی لاتی ہے۔ ہر موت کے ساتھ پچھتاوے لگے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک دکھ تو یہ تھا کہ ابو اس سے ہی نہیں' کسی سے بھی کچھ کہے بغیر چپ چاپ چلے گئے۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے اپنی سیکریٹری کو بلانے کے لئے بزر دیا۔ وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دل پر ہاتھ رکھے جھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ سیکریٹری کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھے گئے۔ گھبرائی ہوئی سیکریٹری نے ڈاکٹر کو بلوایا لیکن پنچھی پنجرہ چھوڑ کر اڑ چکا تھا۔

عثمان حفیظ کے لئے وہ زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ اس روز وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سب کچھ سن رہا تھا لیکن سنائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ عجیب کیفیت تھی اس کی۔ وہ جیسے کسی خلا میں معلق تھا۔ ایک پچھتاوا تھا کہ اپنا زہریلا ڈنک اس کے وجود میں چبھوئے جا رہا تھا۔ ابو کو بہو لانے کا' اپنے پوتے کو گود میں کھلانے کا کتنا ارمان تھا۔ وہ ان کی یہ آرزو بہ آسانی پوری کر سکتا تھا لیکن اس نے مجرمانہ غفلت برتی تھی اور ابو اپنا ارمان دل میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اف...! کیسا دکھ تھا یہ' کیسا پچھتاوا تھا۔ ان لمحوں میں اس نے سوچا کہ اب بھی شادی نہیں کرے گا۔ اب شادی کیوں۔۔۔ اور کس کے لئے۔ اپنے لئے؟ ہرگز نہیں۔ یہی تو وہ سزا ہے جو اسے ملنی چاہئے۔ وہ اب زندگی بھر تنہا رہے گا۔

گھر میں لوگوں کا ہجوم تھا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابو اور امی دونوں ہی کے قریبی رشتے دار اس دنیا میں نہیں تھے۔ دور پرے کے رشتے دار تھے جن سے ابو اور امی بھی کم ہی ملتے تھے۔ وہ سب کے سب وہ لوگ تھے جن سے انہیں تکلیفیں پہنچی تھیں لیکن اس وقت وہ سب جمع تھے اور اس کی دل جوئی میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے مگر عثمان تو اس وقت اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھا۔

تدفین کا مرحلہ قیامت کا تھا لیکن وہ قیامت ہی اسے ہوش میں لے آئی۔ ابو کو لحد میں اتارا جا رہا تھا۔ وہ رخصت ہو رہے تھے۔ تمام تر ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اب اس چہرے کو وہ کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ اب اس جسم سے وہ کبھی نہیں لپٹ سکے گا۔ اب یہ ہاتھ کبھی اسے پیار سے نہیں چھوئیں گے۔ کبھی اس کا سر نہیں سہلائیں گے۔ اسی لمحے گھپ اندھیرے میں کرن سی چمکی۔ اس کے وجود میں طمانیت ابھری اور ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ۔ دیکھنے والے دہل گئے کہ شاید وہ پاگل پن کی حدود میں داخل ہو رہا ہے لیکن اس کی طمانیت بجی تھی۔ اس نے سوچا' جسد خاکی تو مٹی کے سپرد کر دیا گیا لیکن ابو میرے دل میں' میری یادوں میں زندہ ہیں اور رہیں گے۔

تدفین کے بعد وہ گھر واپس آیا تو سنبھل چکا تھا۔ نام نہاد رشتے داروں کے سوا سب لوگ رخصت ہوتے گئے۔ سب سے آخر میں نجم صاحب رخصت ہوئے۔ وہ اس کے ابو کے سب سے اچھے دوست تھے۔ انہوں نے رخصت ہوتے وقت بڑی شفقت سے اسے لپٹایا اور بولے "بیٹے کسی بھی وقت' کسی بھی سلسلے میں میری ضرورت پڑے تو بلا جھجک مجھے رنگ کر دینا۔ رئیس کا بیٹا میرے لئے میری اولاد سے کم نہیں۔"

"شکریہ انکل۔"

نجم صاحب نے سرگوشی میں کہا "یہ تمہارے رشتے دار وہ ہیں جن سے تمہارے ماں باپ کبھی خوش نہیں رہے۔ تم انہیں ہینڈل کر سکو گے؟"

"جی انکل۔ آپ فکر نہ کریں۔"

ہوا بھی یہی۔ عثمان نے اپنے ان رشتے داروں کو بڑی کامیابی سے ہینڈل کیا۔ تیسرے روز فاتحہ کے بعد اس نے انہیں رخصت کر دیا۔ کسی حد تک بدمزگی بھی ہوئی کیونکہ ان میں کچھ ایسے تھے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر زندگی بھر اس کا غم بانٹنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کچھ اس کا گھر بسانا چاہتے تھے اور ان کے خیال میں اس کے لئے مناسب ترین شریک حیات ان کی دختر نیک اختر تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو' ان میں سے کوئی بھی اسے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے ان پر واضح کر دیا کہ اسے تنہائی کی ضرورت ہے۔

زندگی فوری طور پر پوری طرح تو معمول پر نہیں آئی لیکن گاڑی بہرحال چلنے لگی۔ اس نے خود کو کاروباری معاملات میں الجھا لیا کہ غم سے فرار کی یہی سب سے اچھی صورت تھی۔ دن بھر وہ خود کو خوب تھکاتا۔ رات کو نیند نہ ہونے کے باوجود وہ تھکن ہی اسے تھپک تھپک کر سلا دیتی۔ پھر بھی بہت دیر تک اسے کروٹیں بدلنا پڑتیں۔

وہ ابو کے انتقال کے بعد ساتویں رات تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے اس کے ساتھ عجیب واقعہ ہوا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک حسین لڑکی کا دل نشیں چہرا ایسے ابھرا جیسے دھوئیں نے کوئی شکل اختیار کرلی ہو۔ مگر وہ چہرہ نظروں کے سامنے سے ہٹنے والا نہیں تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کے اندر کی کیفیت بدل گئی ہے۔ دل کی دھڑکنوں میں خوش گواریت سی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی سرشاری اور انبساط کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

وہ کھلی آنکھوں سے اس چہرے کو تکتا رہا۔ وہ مبہوت ہوگیا تھا۔ اس کا ذہن یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو کب اور کہاں دیکھا ہے۔ یادداشت اس کی تردید کررہی تھی کہ اس نے اسے دیکھا ہے۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس نے کبھی کسی لڑکی کو اتنے غور سے نہیں دیکھا۔ پہلے کبھی اس کے تصور میں کوئی چہرہ نہیں آیا۔ بلاشبہ اس نے زندگی میں سیکڑوں لڑکیوں کو دیکھا تھا لیکن اسے ان میں سے کسی کی صورت یاد نہیں تھی۔

مگر یہ چہرہ بھی فرضی تو نہیں۔ ذہن نے دلیل دی۔

پھر اس کے تصور میں اس چہرے کا گرد و پیش دھیرے دھیرے واضح ہونے لگا۔ لڑکی کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ارد گرد کئی عورتوں کے سوگوار چہرے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ ابو کے انتقال کے موقع پر اسے نظر آئی ہوگی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بات اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ لڑکی تعزیت کے لئے آنے والی کسی فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ صدمے اور دکھ سے نڈھال تھا۔ وہ اس کے شعور تک نہ پہنچ سکی لیکن لاشعور نے اس کے عکس کو محفوظ کرلیا اور اب چپکے سے ریلیز کردیا ہے۔

بے بسی یہ تھی کہ وہ یہ یاد نہیں کرسکتا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ اسے خود پر غصہ بھی آرہا تھا کہ کس حال میں وہ کیسا بکھیڑا لے بیٹھا۔ زندگی کے سب سے بڑے غم کے دوران اس نے خوشی تلاش کی اور جس طرح سے وہ چہرہ اس پر حاوی آرہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ قبروں پر گلاب کے پھول نہیں کھلتے۔ اس رات وہ سو نہیں سکا۔ وجہ دکھ نہیں تھا، محبت کی کسک تھی۔ اس محبت سے بھاگنے والے کو پہلی نظر کی محبت ہوگئی تھی۔

اسے خوف تھا کہ اس لڑکی کا تعلق اس کے کسی مطلبی رشتے دار سے ہی نکلے گا۔ ابو کی موت کے تین دن تک وہی لوگ چھائے رہے تھے۔ بہرکیف اسے تو اس لڑکی کو تلاش کرنا تھا۔ وہ ایک ایک کرکے اپنے ہر رشتے دار کے گھر گیا۔ بظاہر وہ ابو کے دکھ میں ساتھ دینے پر ان کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا۔ وہ سب اس کے سامنے بچھ بچھ گئے لیکن گوہرِ مقصود اسے نہ مل سکا۔ متلاشی نگاہوں کو مایوسی کے سوا کچھ میسر نہیں آیا۔

وہ مایوس ہونے لگا۔ کیا وہ چہرہ محض اس کا تصور ہے۔ تخیلاتی ہے؟ ایسا ہے تب بھی اسے ڈھونڈ نکالنا ضروری ہے۔

ایک دن نجم صاحب دفتر آئے اور اس سے ملے۔ اس عرصے میں انہوں نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ کاروباری معاملات میں انہوں نے اسے بہت قیمتی مشورے دیے تھے۔ بہت کام کی نصیحتیں کی تھیں۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے اندر جو کمی رہ گئی تھی، انہوں نے پوری کردی ہے۔ اب وہ اپنا کاروبار خود سنبھال سکتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ان کے خلوص اور محبت کا قائل ہوگیا تھا۔

اس روز نجم الحسن نے اس سے کہا "عثمان میاں، تم ہمارے ہاں کبھی نہیں آئے۔ تمہاری چچی ہمیشہ تمہیں پوچھتی ہیں۔ مجھ سے لڑتی ہیں کہ اسے ساتھ کیوں نہیں لاتے۔"

"بس انکل، مصروفیت ہی ایسی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں۔ تم نے اپنے اطراف مصروفیت کا انبار لگالیا ہے۔ جانتا ہوں کہ تم کس چیز سے لڑ رہے ہو لیکن میاں، جنگ میں اپنے حلیفوں کو نظرانداز نہیں کیا جاتا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں انکل......"

"بس آج تم میرے ساتھ گھر چلوگے۔" نجم الحسن نے حتمی لہجے میں کہا "میں چھ بجے تمہیں لینے آؤں گا۔ اس وقت تک کام نمٹالینا۔"

عثمان کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن ایسے خلوص اور محبت سے منہ بھی نہیں موڑا جاسکتا۔ وہ جانتا تھا کہ نجم صاحب کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ کاروباری طور پر وہ اس سے کہیں زیادہ مستحکم تھے۔ اس نے ہامی بھرلی۔

چھ بجے نجم صاحب اسے لینے آگئے۔

ڈیفنس سوسائٹی میں نجم صاحب کا خاصا خوب صورت بنگلا تھا۔ ان کی بیگم عثمان سے بڑے تپاک اور محبت سے ملیں۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "بیٹے آتے رہا کرو یہاں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ ہاں، یہ بات میں رسماً نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"شکریہ آنٹی۔"

انہوں نے اسے اپنے دونوں بیٹوں سے ملوایا۔ سعود اور محمود کی عمریں اٹھارہ اور بیس کے لگ بھگ ہوں گی۔ دونوں بہت خوش اخلاق اور ملنسار لگے۔ ان کے انداز میں عثمان کے لئے محبت اور احترام تھا۔ دونوں ہی ابھی تعلیم حاصل کررہے تھے۔

ان کے درمیان کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں پھر نجم صاحب نے کہا "بھئی لان پر چلو۔ چائے وہیں پئیں گے۔"

وہ لان پر آگئے۔ وہاں کرسیاں بچھی تھیں۔ عثمان کو لان بہت پسند آیا۔ اس کی ترتیب میں نفاست اور سلیقہ تھا۔ پودوں میں کوئی

ایک پتا' کوئی ایک تنکا فاضل نہیں تھی۔ گھاس ہموار تھی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ہر لمحے اس کی نگہداشت کی جاتی ہے۔

"آپ کا مالی یقیناً بہت اچھا اور محنتی ہے اور درختوں اور پودوں سے محبت بھی کرتا ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہاری سب باتیں درست ہیں بس ایک بات غلط ہے۔ وہ مالی نہیں' مالن ہے۔" نجم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "ابھی تمہیں اس سے ملوائیں گے۔ لو وہ آگئی۔"

عثمان نے اشارے کی سمت دیکھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ وہ لڑکی چائے کی ٹرالی دھکیلتی اسی طرف آرہی تھی۔ اس کے سر پر آنچل تھا۔ چہرہ بھی اوٹ میں تھا۔ بہرحال لباس سے اور اپنے پُراعتماد انداز سے وہ مالن نہیں لگ رہی تھی۔

وہ ٹرالی لے کر آئی تو اس کے چہرے کی سائیڈ عثمان کی نظروں کے سامنے تھی۔ پھر وہ سلیقے سے پیالیاں سب کے سامنے میز پر رکھنے لگی۔

"یہ ہماری مالن بھی ہے' باورچن بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری چہیتی بیٹی ہے..... شہناز۔" نجم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پاپا....." اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

لیکن عثمان کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ تو بس ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جارہا تھا۔ جس چہرے کو تلاش کرتے کرتے وہ مایوس ہوچکا تھا' وہ خلافِ توقع اس کے روبرو تھا۔ اس کا دل اس کے نام کی گردان کیے جارہا تھا... شہناز' شہناز' شہناز.....

اسی لمحے شہناز نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی والہانہ نظروں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کا سایہ سا لہرا گیا۔ اسے اس کا یوں دیکھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

لیکن عثمان اس وقت ہر چیز سے بے نیاز تھا!

○☆○

مسز شمیم کی تقریر جاری تھی۔ شہناز کے ساتھ اس وقت مسز مسعود کھڑی تھیں۔ وہ بھی مسلسل بول رہی تھیں۔ شہناز یہ ظاہر کررہی تھی کہ وہ پوری توجہ سے ان کی بات سن رہی ہے۔ وہ کبھی اثبات میں سرہلاتی' کبھی نفی میں اور کبھی پُرزور لہجے میں جی ہاں' یہی بات ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہہ دیتی۔ درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

بیگم رضوی کی وہ سرگوشی اس نے بھی سن لی تھی۔

یہ سن کر اسے شاک لگا تھا کہ اسے اور عثمان کو اس سال کا مثالی جوڑا قرار دیا جارہا ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد مسز شمیم اس کا باقاعدہ اعلان کردیں گی۔ فوری طور پر تو اس بات کا تاثر اس پر پوری طرح مرتب نہیں ہوسکا تھا مگر اب جیسے وہ قطرہ قطرہ دریا بن رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر تمسخر امنڈ رہا تھا۔

۲۵ سال پر پھیلی ہوئی منافقت بھری ازدواجی زندگی اور مثالی جوڑے کا ایوارڈ!

مثالی جوڑا... ہنہ! اس نے نفرت اور حقارت سے سوچا۔ یہ لوگ سمجھتے کیا ہیں۔ یہ ایوارڈ ہے ہی احمقانہ۔ دنیا میں مثالی جوڑے کا وجود ہے کہیں؟ اور یہ ہر سال ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ کبھی اپنی ازدواجی زندگی کے آئینے میں دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔

وہ جانتی تھی کہ اس تقریب میں موجود ہر شخص کیسی ازدواجی زندگی گزار رہا ہے۔ سب کے ہاں تلخیاں' بے وفائیاں اور منافقتیں تھیں۔ معاشرے سے ڈرنے والوں میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اپنا اصلی روپ دکھا سکتے۔ کسی اور کو کیا کہتی۔ اس کا اپنا بھی یہی حال تھا۔ پچھلے بیس سال سے عثمان مے نوشی اور عیاشی میں مبتلا تھا۔ تقریباً اتنے ہی عرصے سے ان دونوں کے درمیان محبت کا سلسلہ منقطع ہوچکا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ سلسلہ دو طرفہ نہیں' یک طرفہ تھا۔ بہرحال تھا تو سہی۔ لیکن منافقت کے بیس سال! بیس سال بہت ہوتے ہیں۔ اتنے عرصے میں تو عادتِ بد فطرتِ ثانیہ کا روپ دھار لیتی ہے۔ اتنے عرصے میں تو جھوٹ سچ اور سچ جھوٹ بن جاتا ہے۔

شہناز کو تقریباً ستائیس سال پہلے کا وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اس کی زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ اس روز عثمان پہلی بار اس کے گھر آیا تھا۔ اگر عثمان سے اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو آج وہ دن اسے یاد بھی نہ ہوتا لیکن اب تو وہ اس دن کو کبھی بھول ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ یادوں میں کھوگئی!

○☆○

اس نے چائے کی پیالی عثمان کے سامنے رکھتے ہوئے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سا ضدی پن تھا اور انداز بے حد والہانہ تھا۔ شہناز کو بہت برا لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر ناگواری کا سایہ سا لہرا گیا۔ کیسا شخص ہے یہ؟ اس نے سوچا۔ اسے لڑکیوں کو دیکھنے کا سلیقہ بھی نہیں۔

"چینی کتنی ڈالوں؟" اندر کی ناگواری اس کے لہجے میں بھی در آئی۔

وہ بری طرح چونکا اور گڑبڑا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔"

"جتنی جی چاہے' ڈال دیں۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

شہناز جل کر رہ گئی۔ اس نے بڑے اہتمام سے آدھا چمچہ چینی اس کی چائے میں ڈالی اور دیر تک ہلاتی رہی' جیسے صرف ہلانے سے چائے میٹھی ہوجائے گی۔

لیکن عثمان نے وہ چائے بڑی رغبت سے پی۔ اس روز وہ رات کے کھانے تک رکا رہا۔ ممی اور پاپا اس کے سامنے بچھے جارہے تھے۔ وہ تمام وقت کڑھتی رہی اور کوشش کرتی رہی کہ اس کے سامنے ہی نہ آئے۔ مگر یہ کہاں ممکن تھا۔

شہناز نے جب بھی نظریں اٹھائیں، اسے اپنی ہی طرف نگہ راں پایا۔ اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس شخص کی موجودگی میں تنہائی اور سکون ممکن ہی نہیں۔ اس کی جھنجلاہٹ حد سے گزری تو اس نے سر اٹھایا اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اس پر عثمان چند لمحوں میں ہی گڑبڑا گیا اور نظریں نیچی کر لیں۔

تاہم شہناز اسے دیکھتی رہی۔ اب وہ اسے غور سے اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اندر کی سختی نرمی میں تبدیل ہونے لگی۔ جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی، تھا ہی کچھ ایسا۔ اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ بے حد خوب رو جوان ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش سے مزاج کی نرمی ہویدا تھی۔ اس کا انداز مہذبانہ تھا۔ آواز اور لہجے میں عجیب سی مٹھاس، نرمی اور دل نشینی تھی۔ غرض ہر زاویے سے وہ کوئی ہیرو ہی لگتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی نگاہوں میں اس کے لئے وارفتگی تو تھی لیکن وہ ہوس اور گرسنگی نہیں تھی جس سے اس کا زیادہ تر واسطہ پڑتا تھا۔ مختصر یہ کہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی اس کی محبت میں گرفتار ہو سکتی تھی بلکہ جانے کتنی تو اب تک ہو چکی ہوں گی۔ اسے دیکھتے ہوئے شہناز نے سوچا۔

لیکن شہناز ایسی لڑکیوں میں شامل نہیں تھی... ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

پہلی بات تو یہ کہ اس کا مرد کا تصور بے حد مختلف تھا۔ اس کے نزدیک سخت ہونا ایک خالص مردانہ وصف تھا۔ نرمی کو وہ نسوانی خوبیوں میں شمار کرتی تھی۔ مرد صنفِ قوی ہے سو اسے قوی نظر آنا چاہئے۔ اس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔ وہ کسی بحران میں کوئی کمزوری نہ دکھائے بلکہ مردانہ وار اس کا سامنا کرے۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ مرد ہی کیا جو عورت کو رلانا بھی نہ جانتا ہو۔ بلکہ عورت کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہے۔ ایسا مرد عورت کو تحفظ کا وہ احساس کیسے دے سکتا ہے جو عورت کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسے وہ مرد مرد لگتے تھے جو جارحانہ رویّے کے حامل ہوتے، زوس ہو جانے والے مرد اسے مرد ہی نہیں لگتے تھے۔

اس نے پہلی بار عثمان حفیظ کو اس دن دیکھا تھا جب اس کے ابو کا انتقال ہوا تھا۔ وہ امی کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی۔ اس روز وہ بہت غور سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ اس کی ظاہری شخصیت کے بارے میں اس روز بھی اس نے اسی انداز میں سوچا تھا۔ وہ اسے چاہے جانے کے قابل لگا تھا۔ بہت ڈیشنگ پرسنالٹی تھی اس کی۔ اگر شہناز کی زندگی میں پہلے ہی مشکور نہ آ گیا ہوتا تو شاید وہ اس دن اسے دل دے بیٹھتی۔

لیکن اس روز بھی اس کی شخصیت کا دکھ کے سامنے سرنگوں ہونے والا پہلو اسے اچھا نہیں لگا۔ عثمان نے اس روز اسے بس ایک نظر دیکھا تھا۔ اور وہ بھی شہناز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دکھ سے نڈھال اس خوب رو جوان کو نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے، نہ سنائی دے رہا ہے۔ اس کے لئے تو یہی بڑا کمال تھا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر نہیں رویا.... عورتوں کی طرح بین کر کے نہیں رویا۔ حالانکہ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنے اندر وہ بین بھی کر رہا ہے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو بھی رہا ہے۔ شہناز کو اس کا یہ عورت پن ذرا اچھا نہیں لگا۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا۔ اس کی عمر ۲۵ سے زیادہ ہی ہو گی اور اتنی عمر میں تو آدمی کو موت کی حقیقت سے آگہی ہو ہی جاتی ہے۔ جبکہ وہ تو اس سے پہلے ماں سے محروم ہو چکا تھا۔ موت اور اس کا دکھ اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ پھر ایسی کم ظرفی کیوں؟

شہناز نے ایک لمحے کو بھی یہ نہ سوچا کہ دکھ کی آگہی دکھ کو کم نہیں کرتی۔ ایک موت دیکھ لینے سے دوسری موت کا صدمہ نہیں گھٹتا۔ دکھ کو اس طرح جھیلنا کہ اندر آنسوؤں کا بپھرا ہوا سمندر ہو اور آنکھیں نم نہ ہوں، کمزوری نہیں، مضبوطی ہے۔ نسوانیت نہیں، مردانگی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکی کہ ماں کے کھونے کے بعد باپ کو کھونا دہرا دکھ ہوتا ہے۔ ہر نئی موت اپنے ساتھ ہر پچھلی موت کا دکھ بھی لاتی ہے۔ اس معاملے میں تجربہ کسی کام نہیں آتا لیکن شہناز یہ بات نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے اب تک کسی کو کھویا ہی نہیں تھا۔

شہناز اب بھی عثمان کو دیکھے جا رہی تھی۔ شاید ان نسوانی کمزوریوں کے باوجود وہ اس خوب صورت شخص کی محبت میں گرفتار ہو جاتی لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ پہلے ہی کسی کی اسیر ہو چکی تھی۔ مشکور علی کی!

مشکور اس کے لئے آئیڈیل مرد تھا۔ وہ ہر اعتبار سے اس کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ وہ اس سے کالج میں ملی تھی اور فوراً ہی متاثر ہو گئی تھی۔ اس میں وجاہت سے زیادہ جو مردانہ پن تھا وہ اس کے لئے باعثِ کشش تھا۔ وہ ایک سرکاری افسر کا بیٹا تھا۔ ذہین، پُرجوش اور اولوالعزم تھا۔ لیکن پڑھائی کی طرف اس کی پوری توجہ نہیں تھی۔ اس کے برعکس اسپورٹس میں وہ زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔

کالج میں مشکور شہناز سے دو سال سینئر تھا۔ بی اے میں اس نے سیکنڈ ڈویژن لی اور پھر پڑھائی چھوڑ کر ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر لی۔ شہناز اس کے کالج چھوڑنے کے بعد بھی اس سے ملتی رہی۔ وہ اکثر اس کی ملازمت کے سلسلے میں اسے چھیڑتی۔ درحقیقت یہ مشکور کا کمزور ترین پہلو تھا۔ شہناز جانتی تھی کہ اس ملازمت میں مشکور کا کوئی روشن مستقبل نہیں ہے۔ خود اسے تو اتنی پروا نہیں تھی۔ لیکن جانتی تھی کہ جب بھی شادی کا مسئلہ کھڑا ہو گا، پاپا اس کمزوری کی بنیاد پر اس رشتے پر ہچکچائیں گے۔

"ارے... یہ تو میں صرف تجربہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کر رہا ہوں۔" مشکور ہمیشہ خوش دلی سے کہتا "میری اڑان کا تو تمہیں پتا ہی نہیں ہے۔ دیکھنا، میں بہت کچھ کروں گا۔ یہ دنیا تمہیں میرے قدموں میں پڑی نظر آئے گی۔ مجھے تو کائنات کو تسخیر

کرتا ہے۔"

اور شہناز فخر سے اسے دیکھتی رہتی۔

تو مشکور جیسے مرد کے ہوتے ہوئے شہناز عثمان کو بھلا کیسے خاطر میں لاتی۔ اسے تو اس کی والہانہ نگاہیں بہت بری لگتیں۔ اسے الجھن ہوتی تھی۔ اس نے جان لیا کہ اگر ان نگاہوں سے واسطہ پڑتا رہا تو وہ اس سے چڑنے لگے گی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ کاتبِ تقدیر نے اسے اس کا مقدر کردیا ہے.....

○☆○

"ازدواجی زندگی بے حد اہم چیز ہے...." مسز شمیم کہہ رہی تھیں۔

عثمان حفیظ نے سر جھٹکا۔ بے شک۔ وہ بڑبڑایا۔ اس سے کم از کم میں انکار نہیں کرسکتا۔

اداسی اس کے وجود میں سرایت کررہی تھی۔ دل بہت بوجھل ہوگیا تھا۔ ایک پہاڑ سا بوجھ پچیس سال تک اٹھا کر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان تازہ دم رہے۔ ماندگی اور اداسی نہ کمائے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیتے دنوں کی فلم سی چلنے لگی۔ مسز شمیم کی آواز معدوم ہوتی گئی۔

وہ سرشاری اور بے خودی کے عجیب عالم میں تھا۔ کام کے دباؤ میں بھی شہناز کا چہرا اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا۔ فرصت کے لمحوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ان میں تو وہ شہناز سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہورہا تھا کہ محبت کیسا طاقت ور اور دل آویز جذبہ ہے۔ اس میں تو ہر سانس لذت آمیز ہوتی ہے۔

ہر شام اس کا جی چاہتا کہ دفتر سے اٹھے تو اپنے گھر کے بجائے نجم صاحب کے گھر چلا جائے۔ وہاں سب کچھ بھول کر شہناز کو تکتا رہے لیکن وہ خود سے لڑتا اور اپنے گھر چلا جاتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے گھر جانے کے ارادے سے نکلتا اور پھر خود کو ڈیفنس جانے والی سڑک پر ڈرائیو کرتے پاتا۔ یہ کیا مصیبت ہے' کیا میرے ارادے بھی محبت کے تابع ہوجائیں گے؟ وہ جھنجلا کر سوچتا اور گاڑی کا رخ موڑتا۔

نجم صاحب کے گھر جانے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ پچھلی بار اسے رخصت کرتے وقت فہمیدہ آنٹی نے اس سے آتے رہنے کو اس کثرت سے کہا تھا کہ اسے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اصرار رسمی نہیں ہے بلکہ خلوص پر مبنی ہے۔ اسے علم تھا کہ وہ جائے گا تو اسے بہت گرم جوشی سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ پھر بھی وہ وہاں جانے سے بچ رہا تھا۔ اس لئے کہ اسے یقین تھا کہ ایک بار اس نے خود کو اس معاملے میں ڈھیل دے دی تو پھر وہ ہر روز وہاں جانے لگے گا۔ وہ خود کو کبھی نہیں روک سکے گا۔ اور قدر کھودیتا ہے ہر روز کا آنا جانا۔

دو ہفتے اس نے جیسے تیسے گزارے مگر اب اس کی بے تابی بڑھ گئی تھی۔ وہ شہناز کی صورت دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ اس کا ضبط جواب دے رہا تھا لیکن ایک اور دفاعی حصار سامنے آگیا تھا۔ آنٹی نے اسے کہا تھا کہ وہ آتا رہے لیکن وہ دو ہفتے گزرنے کے باوجود وہاں نہیں گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے ان کے اصرار کی' خلوص کی توہین کی ہے۔ وہ لوگ یقیناً ناراض ہوں گے اس لئے نجم صاحب نے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا۔ اب وہ ان کے گھر جائے تو کس منہ سے جائے۔

تین دن اور گزرے تو اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ بن بلائے ان کے گھر نہیں جاسکے گا۔ اب وہ یہ دعا ہی کرسکتا تھا کہ وہ خود اسے بلائیں۔

اور اس کی دعا قبول ہوگئی۔

اس روز فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "عثمان حفیظ اسپیکنگ۔"

"ہم سے ناراض ہو عثمان؟" دوسری طرف سے کسی نسوانی آواز نے پوچھا۔

"جی... میں آپ کو پہچانا نہیں۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری فہمیدہ آنٹی بول رہی ہوں۔"

اس کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ جیسے سینے سے نکل آئے گا۔

"سوری آنٹی.... رئیلی سوری کہ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔"

"کوئی بات نہیں۔ فون پر پہلی بار میری آواز سنی ہے نا۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اتنے دن ہوگئے۔ تم ہمارے گھر نہیں آئے۔ ہم سے ناراض ہو گیا؟"

"ارے نہیں آنٹی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"تو پھر؟ ہم شاید اپنے خلوص کا پوری طرح تمہیں یقین نہیں دلا سکے۔ میں نے تو اتنی بار کہا تھا کہ میں تم سے رسماً نہیں کہہ رہی ہوں۔ تمہارا آنا ہمیں اچھا لگے گا۔ وہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔"

"میں جانتا ہوں آنٹی لیکن کیا کروں' مصروفیت ہی اتنی ہے۔"

"میں جانتی ہوں اسی لئے تو کہتی ہوں کہ روز آجایا کرو۔ آدمی دکھ سے لڑتا ہے تو مصروفیت ہی کو ہتھیار بناتا ہے۔ پھر اکیلے گھر جانے کا تصور بھی دفتر سے نہیں اٹھنے دیتا ہوگا۔"

عثمان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ کیسی گہرائی میں محسوس کرکے کیسی سچی بات کہی ہے انہوں نے۔ کوئی کسی غیر کو اس طرح محسوس کرسکتا ہے۔

"پھر یہاں بھی سب تمہارے گرویدہ ہوگئے ہیں۔" آنٹی کہہ رہی تھیں "میرے دونوں بیٹے روز تمہیں یاد کرتے ہیں۔ بس آج شام آجاؤ۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے۔"

"ٹھیک ہے آنٹی۔"

ریسیور رکھنے کے بعد وہ یوں ہانپتا رہا' جیسے میلوں دوڑا ہو۔ آنٹی نے کہا تھا' سب گرویدہ ہوگئے ہیں تو کیا شہناز بھی.....؟

اس شام وہ سینے میں رقصاں دل لئے نجم صاحب کے گھر چلا گیا۔ واقعی وہ اس کے منتظر تھے۔ دونوں لڑکے اس سے یوں ملے' جیسے وہ کوئی ان کا برسوں کا بچھڑا بھائی ہو۔ ان کا بس چلتا تو وہ اپنے

سوا کسی اور سے اسے بات بھی نہ کرنے دیتے۔ ان کے پاس موضوعات کی بھی کمی نہیں تھی۔ کرکٹ' ٹینس' سیاست' تعلیم۔

"انکل نظر نہیں آرہے؟" عثمان نے آنٹی سے پوچھا۔

"وہ تو اچانک ایک کاروباری دورے پر نکل گئے تھے ورنہ تمہیں فون کرنے میں اتنے دن نہ لگتے۔" آنٹی نے کہا "وہ تو میں نے بڑی مشکل سے تمہارا نمبر تلاش کیا۔ کئی دن سے کوشش کررہی تھی۔"

اس روز عثمان کو احساس ہوا کہ بھائیوں کے برعکس شہناز بہت کم سخن ہے۔ پھر پہلی بار اس نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جانے پر اس کا ردِعمل بھی دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے حد واضح ناگواری تھی۔ عثمان کے نزدیک وہ ردِعمل فطری تھا۔ یوں دیکھے جانا کسی کو بھی اچھا نہیں لگ سکتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اس وارفتگی سے لڑنا ہوگا۔ اسے یوں دیکھنے سے گریز کرنا ہوگا۔

اس دن کے بعد عثمان کی جھجک نکل گئی۔ وہ باقاعدگی سے نجم صاحب کے گھر جانے لگا۔ ایک دن چھوڑ کر جانے کا معمول بن گیا تھا۔ کبھی دو دن کا وقفہ ہوجاتا تو اسے فون پر آنٹی کی ڈانٹ سننا پڑتی۔ شہناز کے سوا سب سے بے تکلفی ہوگئی تھی۔ اب وہ اس گھر کے فرد کی طرح تھا۔

سب کچھ ہوگیا لیکن وہ شہناز سے بے تکلف نہیں ہوا۔ شہناز نے بھی کبھی رسمی باتوں کے سوا اس سے بات نہیں کی۔ اپنی گستاخ نگاہوں کے معاملے میں عثمان بہت محتاط ہوگیا تھا۔ پھر بھی کبھی نگاہ اٹھ ہی جاتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ شہناز اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ ان نظروں کا مکمل مفہوم تو کبھی نہیں سمجھ سکا' اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ تولنے والی نظریں تھیں جیسے وہ اسے سمجھنے' اس کی اصل پیمائش کرنے کی کوشش کررہی ہو۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس کے دیکھنے پر بھی شہناز نے کبھی نظریں نہیں جھکائیں۔ الٹا وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی' جیسے اسے چیلنج کررہی ہو۔ اس کے بعد اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔

عثمان نے کبھی اس چیلنج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ محبت میں چیلنج قبول کرنے کا قائل ہی نہیں تھا۔ وہ تو محبت کا طالب علم تھا۔ مبتدی' جس پر محبت کے اسرار ایک ایک کرکے کھل رہے... اور اسے حیران کررہے تھے۔ جب محبت سے ناآشنا کوئی شخص پہلی بار کسی کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو ایک خاص عرصے تک اپنے آپ میں گم ہوجاتا ہے۔ وہ محبت کے حوالے سے خود کو جاننے کی اور اپنے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ دوسروں کو' باہر کی دنیا کو بلکہ اپنے محبوب تک کو سمجھنے کی فرصت اس کے پاس نہیں ہوتی۔ اپنے اندر گم ہونے اور اس کیفیت کے عرصے کی طوالت کا انحصار اس کی محبت کی شدت' گہرائی اور سچائی پر ہوتا ہے۔ محبت جتنی شدید گہری اور سچی ہوگی' یہ عرصہ اتنا ہی طویل ہوگا۔

عثمان بھی اس عرصے سے گزر رہا تھا۔ اس نے شہناز کے اس چیلنج کو دیکھا لیکن سمجھا نہیں بلکہ اس نے اسے سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس نے تو بس اتنا دیکھا کہ شہناز اسے ٹٹولنے' تولنے والی نظروں سے دیکھتی ہے۔ جب تک کوئی دلچسپی نہ ہو' کوئی کسی کو ایسے نہیں دیکھتا۔ یہ بات اس کے لئے بہت تھی کہ شہناز اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ مطمئن ہوگیا کہ اس کا جذبۂ محبت یک طرفہ نہیں ہے۔ اس کے لئے تو بس وہ نظر حوصلہ افزا تھی۔

پھر وہ اس عرصے سے گزر گیا جس میں اس کے اندر کی خوب صورتی اور وسعت نے اسے اسیر کرلیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خوب صورتی محبت کی عطا کی ہوئی ہے۔ وہ حیرت سے سوچتا' کیا محبت ایسا حسین' ایسا طاقت ور اور ایسا بے کراں جذبہ ہے کہ آدمی کی دنیا ہی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ پیتل کو سونا بنادیتا ہے۔ اپنی تبدیلیاں اسے خود بھی بہت اچھی لگی تھیں۔

اس عرصے سے گزرا تو باہر کی دنیا سے اس کا تعلق جڑا۔ اس نے دنیا کو اور دوسرے لوگوں کو دیکھنا شروع کیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر موجود جھیل جیسی پُرسکون اور خوب صورت محبت اپنا اظہار' اپنا اثبات چاہتی ہے۔ اور وہ خود بھی اسے چھپا کر رکھنا نہیں چاہتا۔ یوں اس کے لئے ایک مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ وہ یہ سب کچھ کسے بتائے؟ ایک طرف وہ اس محبت کو بیان کرنا چاہتا تھا تو دوسری طرف اس کے اندر اس کے خلاف مزاحمت بھی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ محبت کو اور اس کی خوب صورتی کو وہ ٹھیک طور پر بیان نہیں کرسکے گا۔ بیان کے نتیجے میں محبت ہلکی اور گھٹیا ہوجائے گی۔ یہ اسے گوارا نہیں تھا۔

دل میں کوئی اچھی بات بھی بہت دن تک رہے تو بوجھ بن جاتی ہے۔ شیئر کرنا' وہ دکھ ہو یا سکھ' اچھی بات ہو یا خراب' انسان کی فطرت ہے۔ وہ خاموش اور اَن کہی محبت عثمان کے لئے بوجھ بن گئی۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ محبت بھی بڑھ رہی تھی اور بوجھ بھی۔ ایک وقت آیا کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے دل کا بوجھ کسی کے سامنے ہلکا نہیں کیا تو کسی دن وہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

قدرتی طور پر اسے دل کا بوجھ شہناز کے سامنے ہلکا کرنا چاہئے تھا لیکن وہ اس کے سامنے اپنی محبت کو ہلکا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خواہش کے باوجود اس کے سامنے اس کی زبان نہیں کھلی۔ اس کے علاوہ ایک اور رکاوٹ بھی تھی۔ وہ صرف شہناز نہیں تھی' نجم انکل اور فہمیدہ آنٹی کی بیٹی بھی تھی۔ سعود اور محمود کی بہن بھی تھی۔ ان سب لوگوں نے اسے اعتماد اور محبت سے نوازا تھا۔ اسے اپنے گھر کے فرد کا درجہ دیا تھا۔ ایسے میں اسے زیب نہیں دیتا تھا کہ براہِ راست شہناز سے اپنے دل کی بات کہے۔ یہ تو گھٹیا پن ہوتا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوتی کہ وہ انکل نجم سے یا آنٹی سے شہناز کو مانگ لیتا۔

جب یہ بوجھ ناقابلِ برداشت ہونے لگا تو اس نے اپنے بچپن کے دوست احسان سے سب کچھ کہہ دیا۔ احسان نے بہت توجہ سے اس کی بات سنی مگر زیرِ لب مسکراتا رہا۔ عثمان اس مسکراہٹ سے چڑ گیا "یہ گدھے کی طرح اپنے ہونٹ کیوں پھیلائے جا رہے ہو؟"

"گدھا میں نہیں، تم ہو۔ مجھے کیوں سنا رہے ہو یہ کتھا۔" احسان نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "بھائی۔ میرا نام شہناز نہیں ہے۔ نہ میں تمہارے اس اظہارِ محبت کا اہل ہوں، نہ ہی مستحق ہوں۔ میں تمہیں جواب میں وہ محبت بھی نہیں دے سکتا جو تمہیں ملنی چاہئے۔"

"ہر وقت مسخرا پن نہ کیا کرو۔" عثمان نے اسے ڈپٹا "میں شہناز سے یہ گفتگو نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

جواب میں عثمان نے اپنی وجوہات بیان کر دیں۔

احسان ہنسنے لگا "تمہاری بات میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔ بھائی، تم اس سے کوئی گناہ کی بات تو نہیں کر رہے ہو کہ احساسِ جرم کا شکار ہو۔ یہ کوئی ناجائز کام تو نہیں۔"

"بس مجھے لگتا ہے کہ میں انکل اور آنٹی کے اعتماد کو مجروح کروں گا اس طرح۔"

"اپنی اوندھی منطق خود ہی جانو اور خود ہی بھگتو۔ میرے خیال میں تو شہناز سے بات کرنے میں کوئی برائی نہیں۔"

عثمان کے ذہن نے احسان کی بات درست تو تسلیم نہیں کی۔ پھر بھی ایک ترغیب سی اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ اس کا فیصلہ اب بھی یہی تھا کہ اسے شہناز سے ایسی کوئی بات نہیں کرنی۔ لیکن جب وہ شہناز کے قریب ہوتا تو ترغیب اسے کچھ کرنے، کچھ کہنے پر اکساتی۔

شہناز اب بھی اسے اسی طرح دیکھتی تھی۔ وہ نظریں اٹھاتا تو وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی۔ اس کی نگاہوں میں تمسخر اور چیلنج ہوتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر عثمان کے ہونٹ اس سے کچھ کہنے کے لئے مچلے۔ ہونٹ ہلے لیکن آواز نہیں نکلی۔

شہناز اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی "مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ؟" اس کے لہجے میں التجا سی تھی۔ اسے کچھ کہنے پر اکساتی ہوئی، بڑھاوا دیتی ہوئی التجا۔

ترغیب نے عثمان کے دل میں اس بے رحمی سے پنجے چبھوئے کہ وہ تلملا گیا۔ آخرکار فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا تھا۔

○☆○

"یہ وہ ستون ہے، جس کے بل پر معاشرے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔۔۔" مسز عظیم ازدواجی زندگی کے متعلق کہہ رہی تھیں۔

"بھئی شہناز، یہی بات یہ ہے کہ تم بہت خوش نصیب ہو۔" بیگم سلیمان نے شہناز سے کہا "کیسی بھرپور اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری ہے تم نے۔۔۔"

"یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ؟" شہناز نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"بھئی تمہارا چہرہ، تمہارا جسم، تمہاری تازگی اور شادابی گواہی دیتی ہے۔ شادی کو پچیس سال ہو گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ نصف صدی پرانی تو ہو تم لیکن دیکھنے میں ۳۰، ۳۲ سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔ زیادہ سے زیادہ دو تین سال کی چھٹائی بڑائی ہو گی مجھ میں اور تم میں۔۔۔"

چھٹائی بڑائی! شہناز نے دل میں بھنا کر سوچا۔ مطلب یہ کہ مجھ سے دو تین سال چھوٹی ہی ہوں گی بڑی بی۔۔۔

"اور مجھے دیکھو۔ اپنی عمر سے کتنی بڑی لگتی ہوں۔ کاش ازدواجی زندگی کے معاملے میں، میں بھی تمہاری طرح خوش نصیب ہوتی۔"

"کاش، ایسا ہی ہوتا۔" شہناز نے جل کے کہا لیکن لہجہ ہمدردانہ رکھا۔ اندر ہی اندر وہ بڑی حقارت سے لفظ خوش نصیب کی گردان کر رہی تھی۔

یادوں کی ٹوٹی ہوئی فلم پھر سے جڑ گئی۔

عثمان حفیظ بڑے تواتر سے ان کے گھر آنے لگا تھا۔ اس کے انداز میں اب بلا کی خود اعتمادی تھی جیسے وہ اس گھر کا ہی فرد ہو۔ محمود اور سعود اس کے گرویدہ تھے۔ ممی اور پاپا تو اس پر جان چھڑکتے تھے۔

دوسری طرف عثمان کا رویہ بھی اب پہلے سے مختلف ہو گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح پاگلوں کے سے انداز میں ٹکٹکی باندھ کر اسے نہیں دیکھتا تھا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی یہ حرکت اسے بجا طور پر ناگوار گزری ہے۔ یہاں اسے پھر اس کی یہ کمزوری بری لگی۔ مردوں کو یوں ناگواری کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ مرد تو وہ ہے جو ڈٹا رہے۔ کسی عورت کی آرزو کرے تو اسے حاصل کئے بغیر چین سے نہ بیٹھے۔ اس نے سوچا۔ یہ شخص ہے ہی کمزور۔ اس کی شخصیت میں بودا پن ہے۔

شہناز دودھ پیتی بچی نہیں تھی۔ پھر مشکور کی محبت نے بھی اس کی سمجھ داری میں اضافہ کیا تھا۔ مردوں کی نظروں کے معاملے میں عورتوں کو ویسے بھی فطری شعور ہوتا ہے۔ معصوم بچیاں تک مردوں کی نظروں کو پہچان لیتی ہیں۔ شہناز نے بھی عثمان کی والہانہ نظریں، اس کی وارفتگی دیکھی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ یہی نہیں، اسے اس کی محبت کی شدت کا بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ جس شخص کو کسی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس بات کا خیال بھی نہ رہے کہ اسے اس عالم میں جو بھی دیکھے گا اس کے راز کو جان جائے گا، وہ اپنے آپ میں ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر شہناز نے ممی اور پاپا کی عثمان سے محبت بھی دیکھی تھی۔ وہ جس طرح سے اس پر جان چھڑکتے تھے، وہ خطرناک تھا۔ جوان بیٹی کے ماں باپ اگر کسی جوان آدمی پر والہ و شیدا ہوں تو اس کا صرف ایک سبب ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ اس جوان کو اپنا بیٹا بنانا چاہتے ہیں۔ اپنی بیٹی کا مستقبل اس سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں، داماد کی محبت بیٹے سے زیادہ ہوتی ہے اور اس کے داماد بننے سے

پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی کسی لڑکی کے والدین کے دلوں میں کسی خاص شخص کو داماد بنانے کی خواہش جاگتی ہے وہ اسے اولاد کی طرح چاہنے لگتے ہیں۔

شہناز کو احساس ہو گیا کہ یہ معاملہ خطرناک ہے۔ عثمان حفیظ خود بھی خطرناک آدمی تھا۔ اس کی خطرناکی اس کی اہلیتوں میں پنہاں تھی۔ اسے معقولیت کے ساتھ مسترد کرنا مشکل ہی نہیں، تقریباً ناممکن تھا۔ معاشی اعتبار سے وہ مستحکم تھا۔ محنتی بھی تھا اور کاروباری شعور بھی رکھتا تھا۔ صورت شکل اور شخصیت کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک تھا۔ خوش گفتار بھی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کردار کے اعتبار سے بھی وہ بے داغ ہے۔ ایسے آدمی کو کوئی کیسے مسترد کر سکتا ہے۔

شہناز ذہین تھی۔ اس دشواری کو خوب سمجھتی تھی۔ اگر مشکور اسے پہلے نہ مل گیا ہوتا تو وہ خود بھی ہچکچائے بغیر عثمان کو قبول کر لیتی لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا وہ صورتِ حال کو اور زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ بات اگر رشتے کی حد تک پہنچ جاتی تو معاملہ مشکل ہو جاتا۔ اور بات وہاں تک پہنچنا ہی تھی۔ عثمان کم ہمت اور بزدل تھا۔ وہ چاہتا تھا لیکن اس کے روبرو اظہارِ محبت کی اسے جرأت نہیں ہوتی تھی مگر وہ اس کے پاپا اور ممی سے تو کسی بھی وقت بات کر سکتا تھا۔ عافیت اس میں تھی کہ اس سے پہلے ہی معاملے کو نمٹا دیا جائے۔

شہناز کو عثمان پر غصہ آنے لگا۔ اگر وہ صحیح معنوں میں مرد ہوتا تو اس سے اظہارِ محبت کیے بغیر نہ رہتا اور اظہارِ محبت کرتا تو شہناز کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ وہ بڑی صفائی سے اسے بتا دیتی کہ یہ ممکن نہیں۔ یہ خیال اسے دل سے نکالنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ ممی یا پاپا سے رشتے کی بات نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ ایسا تھا ہی نہیں۔ چنانچہ شہناز ہی کو کچھ کرنا تھا۔

بہت غور و فکر کے بعد شہناز نے ایک لائحہ عمل ترتیب دے لیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عثمان کو اکسائے گی۔ ایک تبدیلی تو عثمان میں آئی تھی۔ وہ اب اسے مسلسل وارفتگی سے نہیں تکتا تھا۔ ایسا ہوتا تو شہناز کو اسے جھاڑنے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ اب شہناز نے خود ہی کام سنبھال لیا۔ وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی اور اندر ہی اندر حکمیہ لہجے میں کہتی رہتی۔ مجھے دیکھو۔ ادھر دیکھو..... میری طرف دیکھو۔

نظروں کی چبھن کا تو اسے تجربہ تھا۔ کوئی ٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو دیکھے جانے والے کو احساس ہو کر رہتا ہے بلکہ فوراً ہوتا ہے۔ عثمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ احساس ہو جانے پر وہ نظریں اٹھا کر دیکھتا تو شہناز کو گھورتے پاتا۔ اس شہ پر وہ بھی اسے دیکھنا شروع کرتا تو وہ نظریں جھکانے کے بجائے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگتی۔ بغیر لفظوں کے وہ اپنے وجود کی پوری شدت سے کہنا شروع کرتی۔ ہمت ہے تو مجھ سے بات کرو۔ مجھ سے اظہارِ محبت کرو۔ کہو مجھ سے، کیا کہنا چاہتے ہو لیکن عثمان نے اس کا چیلنج بھی قبول نہیں کیا۔ چند لمحوں میں ہی وہ نظریں جھکا لیتا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے، شہناز مایوس ہوتی گئی۔

ایک دن عثمان نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو خلافِ معمول اس کے ہونٹوں میں لرزش نظر آئی۔ شہناز کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ شاید اس کی مشکل آسان ہونے والی تھی۔ وہ متوقع نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ عثمان کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز کوئی نہیں تھی۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا یہ لمحے بھی یونہی گزر جائیں گے؟ اسے کچھ کرنا چاہئے "مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے بے ساختہ کہا۔ اس کے لہجے میں اپیل تھی۔ التجا تھی۔

عثمان چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بہت دھیرے سے بولا۔

"نہیں، کچھ بھی نہیں۔ میں کیا کہوں گا۔"

اس روز شہناز بالکل ہی مایوس ہو گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ یہ معاملہ اس انداز میں سامنے آئے گا، جس سے وہ بچنا چاہ رہی ہے۔ تو اب اسے کچھ اور کرنا ہو گا اور بہت تیزی سے کرنا ہو گا۔ بلی کے تھیلے سے باہر آنے سے پہلے!

اگلے روز وہ مشکور سے ملی تو اس سلسلے میں اس سے بات کی۔ "میں چاہتی ہوں کہ عثمان کی بات آنے سے پہلے ہمارا معاملہ چل نکلے۔"

"تو میں اس سلسلے میں کیا کروں؟" مشکور نے پوچھا "اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجوں؟"

"نہیں، ابھی نہیں۔ پہلے میں اپنی ممی سے بات کر لوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری امی کو انکار کی توہین کا سامنا کرنا پڑے۔"

"تو کیا انکار بھی ہو سکتا ہے؟" مشکور کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ تم اپنی جاب تو دیکھو۔"

"کیا برائی ہے میری جاب میں؟ اور میں یہاں رکنے والا بھی نہیں۔ مجھے بہت آگے جانا ہے۔ تم دیکھ لینا......"

"یہ تو میں پچھلے چار سال سے سن رہی ہوں۔ میں اپنے پاپا کو خوب جانتی ہوں۔ تمہاری یہ جاب ہمارا کام مشکل کر دے گی۔"

"تو کیا میری شخصیت، میری ذہانت کی کوئی حیثیت نہیں۔" مشکور آپے سے باہر ہونے لگا۔

"یہ بات نہیں...."

"یہی بات ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے کوئی پروا بھی نہیں۔ بات نہیں بنتی تو نہ بنے۔"

شہناز اسے فخر اور محبت سے دیکھتی رہی۔ اس کی یہی مردانہ کوالٹی تو اسے بھائی تھی۔ اسے منانے، رام کرنے میں خاصی دیر لگی۔

شہناز نے اس سلسلے میں اپنی ممی سے بات کی۔ ممی نے پاپا کو بتایا تو پاپا پریشان ہو گئے "یہ کیسی خبر لے آئیں فہمیدہ۔" انہوں نے کہا۔

"کیوں... کیا بات ہے؟ آپ پریشان کیوں ہو گئے؟"

"آپ یہ بتائیں کہ عثمان کیسا لڑکا ہے؟" پاپا نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

"عثمان تو مثالی لڑکا ہے۔ سچ پوچھیں' مجھے تو بہت ہی پسند ہے لیکن اس وقت اس کا تذکرہ کہاں سے نکال لیا آپ نے؟" ممی کے لہجے میں حیرت تھی۔

دروازے کی اوٹ میں کھڑی ان کی گفتگو سنتی ہوئی شہناز نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس نے جان لیا کہ اب ممی کا ووٹ بھی اس کا نہیں رہے گا۔

"میں تم سے بات کرنے ہی والا تھا۔ عثمان نے مجھ سے شہناز کے لئے بات کی ہے۔"

فہمیدہ بیگم کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی "کمال ہے۔ میں نے کبھی اسے شہناز میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔"

"شرافت یہی ہوتی ہے۔" نجم الحسن بولے "بات جس انداز میں ہونی چاہئے' اس نے اسی انداز میں کی ہے لیکن یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا۔ تم کہتی ہو کہ شہناز......"

"آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں شہناز سے بات کروں گی۔"

ممی نے شہناز سے بات کی۔ شہناز اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ عثمان تو اسے بالکل اچھا نہیں لگتا اور وہ مشکور کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی۔

فہمیدہ بیگم نے نجم الحسن کو بتایا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ مشکور سے مل لینا چاہئے۔ دیکھا تو جائے کہ لڑکا کیسا ہے مگر ان کا فیصلہ تھا کہ پہلے مرحلے میں وہ صرف مشکور سے ملیں گے۔ شہناز کے لئے یہ بات بھی توقع سے بڑھ کر تھی۔

○☆○

مسز شمیم کی تقریر جاری تھی لیکن عثمان حفیظ اپنے ماضی میں کھویا ہوا تھا۔

نجم صاحب سے بات کرنے کے بعد وہ بے حد ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اس نے شہناز سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن بات جس انداز میں جہاں پہنچنی چاہئے تھی' وہاں پہنچا دی تھی۔ نجم صاحب نے اس کی بات خاموشی سے سنی تھی لیکن کہا کچھ بھی نہیں تھا۔ عثمان بھی اپنی بات کہنے کے بعد وہاں سے چلا آیا تھا۔

اگلے روز نجم صاحب نے شام کے وقت اسے فون کیا "بیٹے' تم مائنڈ نہ کرنا کہ کل میں نے تمہیں جواب نہیں دیا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں انکل۔"

"میرا جواب تو تم جانتے ہو؟"

عثمان کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں "جانتا ہوں لیکن احتیاطاً اسے اپنی خوش گمانی پر محمول کر رہا ہوں۔"

"یہ خوش گمانی نہیں۔ اگر فیصلہ صرف میرا ہوتا تو میں کل ہی تمہیں جواب دے دیتا لیکن یہ معاملہ براہِ راست شہناز کی زندگی کا ہے۔ پھر مجھے تمہاری آنٹی سے بھی مشورہ کرنا ہے۔ پہلے موقع دیکھ کر میں ان سے بات کروں گا پھر وہ شہناز سے بات کر لیں گی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں انکل۔"

"بیٹے' کچھ دن لگیں گے۔"

"میں انتظار کروں گا انکل۔"

"اور یہ بات کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم گھر آنا چھوڑ دو۔ تم پہلے کی طرح ہمارے ہاں آتے رہو گے۔ مجھے یقین ہے کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہی ہو گا۔"

"شکریہ انکل۔" ریسیور رکھنے کے بعد عثمان نے آنکھیں موند لیں۔ اس کی آنکھوں میں سپنے اتر آئے تھے۔

○☆○

معاملات شہناز کی توقع سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے آگے بڑھے تھے۔

اس روز عثمان نہیں آیا تھا۔ شہناز کے لئے یہ بات باعثِ تشویش تھی کہ وہ اب بھی معمول کے مطابق گھر آ رہا تھا اور اس کے انداز میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ جس مزاج اور طبیعت کا آدمی تھا' شہناز کو توقع تھی کہ وہ اب ان کے گھر نہیں آئے گا۔ شرمیلے لوگوں کا ردِ عمل تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

پھر ایک اور بات تھی۔ شہناز نے اپنی مرضی دو ٹوک لفظوں میں بتا دی تھی اور پاپا نے اسے مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پہلے وہ صرف مشکور سے ملیں گے۔ اس صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ انہوں نے عثمان کی حوصلہ افزائی کی ہو مگر عثمان پھر بھی معمول کے مطابق آ رہا تھا۔ عام طور پر وہ ایک دن چھوڑ کر آتا تھا۔ وہ سلسلہ اب بھی اسی طرح چل رہا تھا۔

شہناز بہت پریشان تھی۔ اسے لگتا تھا کہ پاپا نے یا پھر ممی نے عثمان کو یقیناً کوئی یقین دہانی کرائی ہے اسی لئے اس کا طرزِ عمل بالکل نارمل ہے۔ اور اگر کوئی یقین دہانی کرائی گئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مشکور کے سلسلے میں پہلے ہی سے کوئی منفی فیصلہ کر لیا گیا ہے۔

اس روز عثمان نہیں آیا تھا۔ کھانے کی میز پر صرف گھر کے لوگ تھے۔ محمود اور سعود تو کھانا کھا کر جلد ہی اٹھ گئے۔ پھر پاپا بھی اٹھ گئے۔ اپنے کمرے کی طرف جانے سے پہلے انہوں نے اس سے کہا "نازو بیٹی' ابھی تمہیں کوئی کام ہے؟"

"جی پاپا۔ برتن سمیٹنے ہیں۔"

"کام نمٹا کر اوپر میرے کمرے میں آ جانا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

شہناز کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں "جی پاپا۔"

بیس منٹ بعد وہ پاپا کے کمرے کے دروازے پر پہنچی تو آوازوں سے اندازہ ہوا کہ ممی پہلے ہی سے وہاں موجود ہیں "میری پوزیشن بے حد نازک ہے فہمیدہ بیگم۔" پاپا کہہ رہے تھے "چھان بین کرنا میرا فرض ہے۔ دشواری یہ ہے کہ نازو مجھے غیر جانب دار تسلیم نہیں کرے گی۔"

"آپ اس کے باپ ہیں۔ یہی نہیں' آپ اس سے محبت بھی

بات کرتے ہیں۔" ممی نے کہا "وہ جانتی ہے کہ آپ اس کا برا نہیں چاہیں گے بلکہ اس کے لئے بہتر سے بہتر کی خواہش کریں گے۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ آپ کی غیر جانب داری پر شک کرنے کی حماقت کرے گی۔"

"تم نہیں جانتیں فہمیدہ بیگم۔ جوان خون میں جب جذباتیت کا ابال آئے تو وہ کچھ نہیں سوچتا سمجھتا۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ سمجھ بعد میں آتی ہے جب دیر ہو چکی ہوتی ہے۔"

"مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اسے سچ جھوٹ اور برا بھلا بتائیں بھی نہیں۔ وہ ہماری ذمے داری ہے۔"

شہناز کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس گفتگو سے اس کے اندیشوں کی تائید ہو رہی تھی۔ کوئی فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

پاپا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھو بیٹی، ہم تمہارے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے۔"

"جی پاپا۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بیٹی، پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ مجھے اپنا بہی خواہ سمجھتی ہو یا نہیں؟"

شہناز جانتی تھی کہ کیا بات سامنے آنے والی ہے۔ اس نے کہا "پاپا میرا ایمان ہے کہ آپ میرے بھلے کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے۔"

"تو تمہیں اعتماد ہے کہ میں تمہارے متعلق جو بھی فیصلہ کروں گا وہ درست ہو گا۔"

"یہ دو مختلف باتیں ہیں پاپا۔ فیصلے کا درست ہونا یا آپ کے نکتہ نظر سے فیصلہ میرے حق میں بہتر ہونا۔" شہناز نے بے حد رسان سے کہا۔

"گویا تمہیں اس سلسلے میں مجھ پر اعتماد نہیں؟" پاپا کے لہجے میں اداسی تھی۔

"یہ بات نہیں پاپا۔ آپ دنیاوی نکتہ نظر سے میرے لئے بہتر سوچ سکتے ہیں۔" اس نے اعتماد سے کہا "لیکن آپ یہ تو نہیں سمجھ سکتے کہ باطنی طور پر میری پسند ناپسند، میری ترجیحات اور میری ضرورتیں کیا ہیں۔ اس معاملے میں آپ کا فیصلہ ضروری نہیں کہ درست ہو اس لئے کہ آپ میں نہیں ہیں۔ آپ شہناز نہیں ہیں۔"

پاپا کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی "بہرکیف۔ تم کچھ بھی سمجھو۔ مجھے تو اپنا فرض انجام دینا ہے۔ میں اس لڑکے مشکور سے مل چکا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ مجھے وہ اچھا نہیں لگا۔ وہ کسی اعتبار سے بھی تمہارے لائق نہیں۔"

"مجھے بھی یہ سن کر افسوس ہوا پاپا۔ لیکن کیا کروں، وہ میری پسند ہے اور پسند کا اختلاف کوئی بڑا اور اہم مسئلہ نہیں ہوتا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے پاپا کہ کوئی زیور خریدتے وقت میری پسند آپ کی پسند کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ زیور میرے لئے خریدا جا رہا ہو۔"

پاپا نے بڑی بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس کا انداز، اس کے الفاظ یقیناً ان کے لئے شاک کا باعث بنے تھے پھر انہوں نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی مگر زیور کی حد تک۔ زیور اور شوہر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ زیور جب جی چاہے، بدلا جاسکتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں شوہر اتنی آسانی سے نہیں بدلا جاسکتا۔"

شہناز ایک لمحے کو گنگ ہو گئی۔ پاپا نے اس کی بات پکڑ کر بے حد منطقی دلیل دی تھی لیکن بہرحال وہ بھی انہی کی بیٹی تھی "پاپا، میں نے آج تک جو بھی چیز پسند کی وہ میرے دل سے کبھی نہیں اتری۔ میں بہت سوچ سمجھ کر کچھ پسند کرتی ہوں۔" وہ کہتے کہتے رکی "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو مشکور کس بنا پر ناپسند ہوا۔ اس میں کیا خامیاں نظر آئیں آپ کو۔"

"اس بات کی کیا اہمیت ہے جبکہ تم کو میری ناپسندیدگی کی کوئی پرواہ ہی نہیں۔"

"خیر، مشکور کو ناپسند کرنے والے کے لئے اس کی وجوہات بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں۔" شہناز نے بے حد اعتماد سے کہا۔ "آپ نے بڑی صفائی سے دامن بچا لیا لیکن میں جانتی ہوں مشکور کو ناپسند کرنے کی وجہ مشکور کا کوئی عیب یا برائی نہیں۔ آپ کی ایک پسند ہے۔ عثمان حفیظ!"

"دیکھا تم نے۔ میں نے کہا تھا نا۔" پاپا نے ممی سے کہا پھر وہ اس کی طرف مڑے "تازو، تم نے زیادتی کی۔ مجھے بدنیت تک ٹھہرا دیا لیکن میں تم پر غصہ نہیں کروں گا۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ اس توہین کو پی جاؤں گا البتہ میں تمہیں اس کی خامیاں ضرور بتاؤں گا۔ تمہیں سمجھاؤں گا کہ وہ مجھے کیوں پسند نہیں آیا مگر میں اس سے پہلے تم سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ تمہیں وہ کن خوبیوں کی بنا پر پسند ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ شہناز کے لئے پاپا کا ردعمل بالکل غیر متوقع تھا۔ چند لمحے تو اس کے ذہن نے کام ہی نہیں کیا۔ اس کے بعد اس نے مشکور کی خوبیاں یاد کرنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے "وہ وجیہہ ہے۔ اس کی شخصیت پُرکشش ہے۔ اسے اپنے اوپر بلا کا اعتماد ہے۔ وہ مضبوط آدمی ہے، پُرعزم اور محنتی۔ وہ ایسا ہے جیسا کسی مرد کو ہونا چاہئے۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کھوکھلی باتیں کر رہی ہے۔ وہ خود ہی قائل نہیں ہے تو پاپا کو کیا قائل کرے گی "بس پاپا، سب سے بڑی بات یہ کہ وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اب تم خود سوچو کہ تم نے کتنی خوبیاں بیان کیں اس کی۔" پاپا نے تمسخرانہ لہجے میں کہا "وہ وجیہہ ہے۔ یہ کوئی خوبی نہیں، اس کی شخصیت پُرکشش ہے یہ صرف تمہارے دل کی بات ہے۔ میں

دعوے سے کہتا ہوں کہ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اسے پسند نہیں کرتے۔ اسے اپنے اوپر بلا کا اعتماد ہے۔ یہ بھی کوئی خوبی نہیں۔ خود اعتمادی معقول حد تک ہو تو خوبی ہے' ضرورت سے زیادہ ہو تو یا تو وہ محض بے وقوف کہلاتا ہے یا پھر منافق ہوتا ہے۔ وہ مضبوط تو ہی ہے۔ یہ محض تمہارا حسنِ ظن ہے۔ وہ پُرعزم اور محنتی ہے یہ بھی غلط ہے۔ اب یہ تم بیٹھ کر سوچو کہ کیا کسی مرد کو ایسا ہونا چاہئے؟"

شہناز چڑ گئی "آپ صرف اسے رد کرنا چاہتے ہیں۔ عثمان کی خاطر۔"

"عثمان کو بیچ میں مت لاؤ شہناز۔" ممی نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم بیچ میں مت بولو فہمیدہ بیگم۔ یہ اتنا اہم معاملہ ہے۔ ہمیں نازو کی ہر بات سننا ہوگی۔" پاپا نے ممی کو ٹوک دیا اور اس کی طرف مڑے "دیکھو بیٹی' میں تین دن پہلے اس سے ملا اور میں نے پہلی ہی نظر میں اسے ناپسند کیا۔ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ اپنی طویل کاروباری زندگی میں ہزاروں انسانوں سے واسطہ پڑا ہے۔ ہزاروں انسانوں کو برتا ہے میں نے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا پہلا تاثر کبھی غلط نہیں ہوتا لیکن..."

"آپ اسے صرف اس لئے مسترد کر رہے ہیں کہ وہ مالی اعتبار سے آپ کا ہم پلہ نہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ وہ مجھے آسائشات فراہم نہیں کر سکے گا لیکن پاپا مجھے آسائشات کی کوئی طلب بھی نہیں۔"

"تم نے خواہ مخواہ میری بات کاٹی۔" پاپا نے متاسفانہ لہجے میں کہا "اور تم بدگمانی بھی بہت کرتی ہو۔ پوچھو اپنی ممی سے کہ مجھ سے ان کی شادی ہوئی تو میرے پاس کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ میرا تو ایمان ہے کہ دولت بیوی اور بچوں کے نصیب سے ملتی ہے۔ میں تو اپنے داماد کو صرف اچھا انسان دیکھنا چاہتا ہوں۔ دولت کی مجھے ضرورت نہیں۔ دولت میرے پاس بہت ہے۔"

"شہناز' ہم نے وہ وقت بھی گزارا ہے کہ تمہارے لئے ایک وقت کے دودھ کا بندوبست کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا" ممی نے کہا۔ "پھر محمود کی پیدائش کے بعد ایک دم دن پھر گئے ہمارے۔"

"میں تمہیں کچھ بتا رہا تھا نازو۔ بات وہیں سے شروع کرتا ہوں" پاپا نے کہا "مجھے اپنی مردم شناسی پر بھی اعتماد ہے اور اپنی غیر جانب داری اور سچائی پر بھی۔ مشکور کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ وہ کوئی اچھا انسان نہیں۔ جیسا ظاہر کرتا ہے درحقیقت ویسا نہیں۔ مجھے یقین تھا اس پر لیکن میں نے یقین نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ انسان کتنا پیچیدہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے میں نے خود پر اعتماد نہیں کیا۔ میں عثمان کو پسند کرتا ہوں' بہت زیادہ۔ وہ بیٹوں کی طرح عزیز ہے مجھے۔ میں نے سوچا' ممکن ہے میں اسی کی خاطر لاشعوری طور پر مشکور میں عیب نکال کر اسے مسترد کر رہا ہوں۔ اس لئے میں نے اس کے متعلق چھان بین کرائی اور یقین کرو' مشکور میرے خدشات سے بڑھ کر برا ثابت ہوا۔ اس کے دوست تک متفق ہیں کہ وہ مطلبی اور خودغرض ہے۔ اس کے باس کا کہنا ہے کہ وہ ہڈ حرام ہے اور محنت کرنا نہیں جانتا۔ صرف اپنے باپ کی وجہ سے اسے ملازمت ملی ہوئی ہے۔ وہ ریٹائر ہو گئے تو اسے کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ اور سنو' وہ جھوٹا ہے۔ اس کے والد کوئی گزیٹڈ آفیسر نہیں' محض ہیڈ کلرک ہیں۔ ان کی اتنی اہمیت صرف اس لئے ہے کہ وہ ایسی جگہ کام کرتے ہیں جہاں کاروباری لوگوں کو ان سے کام پڑتے رہتے ہیں۔ خود مشکور میں کوئی ایسی خوبی اور اہلیت نہیں جس کی وجہ سے وہ اچھے مستقبل کی آس لگائے۔ اس پر ستم یہ کہ موصوف کو جوئے اور شراب کے علاوہ ایک ایسی لت بھی ہے جس کا میں تمہارے سامنے تذکرہ نہیں کر سکتا۔ ان لتوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔ بس باتیں کرنے کا فن اسے خوب آتا ہے جس کی وجہ سے وہ تم جیسی لڑکیوں کو بھی لبھا لیتا ہے اور لوگوں سے قرض لینے میں بھی کامیاب رہتا ہے۔ یہ ہے تمہارا مشکور احمد۔ اب تم اپنے ذہن میں قائم اس کی خوبیوں کا موازنہ ان مصدقہ برائیوں سے کر کے خود ہی فیصلہ کر لو۔ جو کچھ میں نے کہا ہے' وہ سب کا سب تصدیق شدہ ہے۔"

"میں ایسی کسی بات پر یقین نہیں کر سکتی۔" شہناز نے کہا۔ "میں اسے کالج کے زمانے سے جانتی ہوں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔"

"یہ بھی میں نے تمہاری ممی کو بتا دیا تھا۔" پاپا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ بتاؤ' تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں بتا چکی ہوں۔"

"دیکھو بیٹا' میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں شادی کے معاملے میں زبردستی کا قائل بھی نہیں۔ ویسے بھی یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف ہے لیکن تمہیں دیدہ و دانستہ تباہی کی طرف کیسے دھکیل سکتا ہوں۔ پلیز میری بات مان جاؤ۔ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے' لفظ بہ لفظ سچ ہے۔"

"سوری پاپا۔ میرا فیصلہ اب بھی وہی ہے۔"

اچانک پاپا کے چہرے پر سختی کا تاثر ابھرا "مجھے افسوس ہے کہ تم نے معقولیت کا ثبوت نہیں دیا۔ میں تمہاری ضد کے مقابلے میں ضد کر کے تمہیں کوئی غلط قدم اٹھانے کا موقع نہیں دوں گا کہ یوں میری جگ ہنسائی ہوگی۔ میں تمہاری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دوں گا۔ میں باپ کی طرح تمہیں اس گھر سے وداع کروں گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مشکور سے شادی کے بعد تمہارا مجھ سے' اپنی ممی اور بھائیوں سے.... اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ ہم تمہیں رخصت پوری عزت اور شان سے کریں گے لیکن ہمیشہ کے لئے۔"

ایک لمحے کو شہناز ٹھرا کر رہ گئی۔ پھر وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ پاپا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"نہیں شہناز۔" وہ نازو بیٹی کے بجائے اسے شہناز کہہ کر مخاطب کر رہے تھے "ابھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ چاہے تمہیں ضرورت نہ ہو' پھر بھی میں تمہیں تین دن کی مہلت دوں گا۔ میرا

مشورہ ہے کہ تم خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ نہ سوچنا چاہو تب بھی اپنا فیصلہ تین دن بعد سنانا۔ اور وہ بھی اپنی ممی کو۔ یہ یاد رکھنا کہ میرا فیصلہ بھی اٹل ہے۔ بس اب تم جاؤ۔ میری دعا ہے کہ خدا تمہیں عقل کی روشنی عطا فرمائے۔"

شہناز کمرے سے نکلی تو دل گرفتہ ضرور تھی لیکن وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کے لئے بھی آمادہ نہیں تھی۔ مشکور کی محبت سے پیچھے ہٹنے کی اب گنجائش نہیں تھی۔

وہ سمجھی تھی کہ اب گھر کے ماحول میں کشیدگی رچ جائے گی۔ لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اگلے روز شام کے وقت عثمان آگیا۔ پاپا بھی موجود تھے۔ چائے لان پر ہی پی گئی۔ خوب قہقہے لگے۔ سبھی خوش مزاجی کے موڈ میں تھے۔ عثمان بھی چہک رہا تھا۔ البتہ اسے یوں نظرانداز کررہا تھا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔

اگلے تین دن ممی اسے سمجھانے کی مسلسل کوشش کرتی رہیں۔ آخر جھنجلا گئیں "جہنم میں جاؤ۔" انہوں نے غصے سے کہا۔ "مقدر سے بھلا کوئی لڑ سکتا ہے۔"

تیسرے دن ممی نے اس سے آخری بار پوچھا کہ اس کا فیصلہ کیا ہے "میری پسند اور میرے فیصلے آسانی سے نہیں بدلتے ممی۔ میں شادی مشکور ہی سے کروں گی۔" اس نے جواب دیا۔ ممی اس کا فیصلہ پاپا کو سنانے چلی گئیں۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آئیں تو ان کی آنکھوں میں نمی تھی "شہناز، مشکور کو بتادو کہ اس کے گھر والے جب چاہیں، رشتے کے لئے آسکتے ہیں۔" انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

شہناز نے مشکور کو فون کرکے اگلے روز کی ملاقات طے کرلی۔

اگلے روز وہ مقررہ وقت پر دلکشا ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ مشکور بیس منٹ کی تاخیر سے آیا۔ اور جب وہ آیا تو وہ اسے دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ اس کا ہاتھ Sling میں تھا۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور وہ بے حد کمزور لگ رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو اس کے کندھے کے قریب بازو پر پٹی بندھی نظر آئی۔

وہ بے قرار ہوکر اٹھ کھڑی ہوئی "کیا بات ہے مشکور؟ یہ کیا ہوا؟" اس کے لہجے میں وحشت تھی۔

مشکور نے مسکرانے کی کوشش کی "کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ بیٹھ جاؤ سکون سے۔ مجھے تماشا مت بناؤ۔"

وہ دونوں بیٹھ گئے "تم بتاتے کیوں نہیں مجھے۔"

"بتادوں گا۔ ذرا سانس تو لینے دو۔ کافی منگواؤ میرے لئے۔ کریم کے ساتھ۔"

شہناز نے ویٹر کو بلا کر آرڈر نوٹ کرایا اور پریشانی سے مشکور کو دیکھتی رہی جس نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موندلی تھیں۔ شہناز نے اسے چھیڑا نہیں۔ جانتی تھی کہ ایسے میں مداخلت اسے بالکل پسند نہیں۔

ویٹر کافی لے آیا تھا۔ شہناز نے کافی بنائی اور پیالی اس کے سامنے کھسکادی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شہناز کو ان میں ویرانی سی نظر آئی۔

"اب تو بتادو کہ کیا ہوا ہے۔" شہناز نے التجا کی۔

"کچھ نہیں۔ معمولی سی بات ہے۔ کسی نے گولی چلائی تھی مجھ پر۔" مشکور نے بے پروائی سے کہا۔

"گولی؟" شہناز کی آنکھیں پھیل گئیں "کب کی بات ہے؟"

"دو دن ہوگئے۔ پرسوں صبح کی بات ہے یہ۔"

"زخم کہاں۔۔۔"

"بائیں بازو میں۔ گولی گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ ہڈی محفوظ ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔ خطرے کی تو کوئی بات نہیں؟"

"خطرہ تو فی الحال ٹل گیا۔" وہ ہنسنے لگا "نشانہ خطا ہوگیا اناڑی کا۔ گولی دل سے خاصی دور لگی... پورے سوا دو انچ دور۔ اسی لئے یہاں بیٹھا نظر آرہا ہوں۔"

شہناز نے محبوبیت سے اسے دیکھا۔ اب ایسے جری مرد سے کوئی پیار نہ کرے تو کیا کرے "کچھ اندازہ ہے کہ حملہ آور کون تھا؟" اس نے پوچھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" کندھے جھٹکنے کی کوشش میں اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی اور چہرے پر جیسے زردی کھنڈ گئی۔ "آج کل ہر چیز کرائے پر مل جاتی ہے۔ ریوالور بھی اور حملہ آور بھی۔" اس نے اپنی بات پوری کی۔

"کیا مطلب؟"

"ہر بات کا مطلب نہیں پوچھتے بے بی۔ مردوں کی باتیں مردوں کے لئے ہی رہنے دو۔" مشکور نے تمسخرانہ انداز میں کہا "تم اپنی سناؤ۔"

شہناز خوش ہوگئی "میں تو خوش خبری لے کر آئی ہوں۔" اس نے چہکتے ہوئے کہا "اب تم اپنے گھر والوں کو کل ہی بھیج دو ہمارے ہاں۔ میں نے پاپا سے بات کرلی ہے۔"

مشکور نے کافی کی پیالی اٹھائی اور آخری گھونٹ لے کر خالی پیالی میز پر رکھ دی "سوری بے بی۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ تو اب ممکن نہیں۔"

شہناز بھونچکی رہ گئی "کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میرے گھر والے تمہارے ہاں رشتہ مانگنے نہیں آسکتے۔ نہ ہی میں تم سے شادی کرسکتا ہوں۔"

"کیوں آخر؟"

"وجہ میں تمہیں نہیں بتاسکتا۔"

"یہ میرا حق ہے۔ وجہ تو تمہیں بتانا ہوگی۔" شہناز نے تند لہجے میں کہا۔ فوراً ہی اس کا لہجہ نرم ہوگیا "ورنہ کہہ دو کہ تم مذاق کررہے ہو۔"

"میں مذاق نہیں کررہا ہوں اور تمہیں وجہ بھی نہیں بتاسکتا۔ اس لئے کہ جانتا ہوں، عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں اور تمہارے منہ سے کبھی یہ بات نکل گئی تو میں اس خطرے سے دوچار ہوجاؤں

گا جس سے بچنے کے لئے تم سے دست بردار ہو رہا ہوں۔ میں اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

شہناز کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اتنی مشکل سے تو یہ بات بنی تھی۔ اس شادی کے لئے اس نے کیا کیا کچھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اب مشکور ہی انکاری ہو رہا تھا۔ اور اسے وجہ بھی نہیں معلوم ہو گی۔ نہیں ... وجہ جاننا تو بہت ضروری ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ مشکور کے انکار کی وجہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا تعلق ضرور ہے "پلیز مشکور، مجھے سب کچھ بتادو۔" وہ گڑگڑائی "میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ساری زندگی راز رکھوں گی اسے۔"

مشکور سوچ میں پڑ گیا "یہ تمہارے لئے غیر ضروری بوجھ ہو گا۔ میں تمہیں کرب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔"

"یقین کرو۔ اتنا ظرف رکھتی ہوں میں۔"

"تو میری قسم کھاؤ کہ یہ راز ہمیشہ راز رہے گا۔ تمہاری زبان کھلی تو مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔"

"میں تمہاری قسم کھاتی ہوں کہ تمہارا یہ راز کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا۔"

"سوچ لو۔ ضبط کرنا بہت دشوار ہو گا۔"

"سوچنے کی تو اب بات ہی نہیں۔ تمہاری قسم کھا چکی ہوں میں۔"

"قاتلانہ حملے سے پہلے مجھے فون پر دھمکی دی گئی تھی کہ میں تمہارا خیال دل سے نکال دوں۔" مشکور نے کہا "میں نے اسے اہمیت نہیں دی۔ ایک گھنٹے بعد مجھ پر گولی چلا دی گئی۔"

شہناز نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا "اور تم موت سے ڈر گئے۔ موت کے خوف سے تم مجھے چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔"

"بکواس مت کرو ورنہ تھپڑ مار بیٹھوں گا میں....."

"تم بات ہی ایسی کر رہے ہو۔"

"پوری بات سنو میری اور زبان بند رکھو تھوڑی دیر۔" مشکور نے سخت لہجے میں کہا "اگلے روز پھر فون موصول ہوا۔ اس بار دھمکی کی نوعیت بدل گئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میری تین بہنیں ہیں۔ وہ اغوا بھی ہو سکتی ہیں اور ان کی بے عزتی بھی کچھ مشکل نہیں۔ پھر میرے ماں باپ کی باری آئے گی اور آخر میں میرا نمبر آئے گا۔ اس پر میں نے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں، یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ فون کرنے والے نے بے نیازی سے کہا کہ میں نے بات نہیں مانی تو یہ بھی دکھا دیا جائے گا۔" اس نے چند لمحے توقف کیا "اب بتاؤ میں کیا کر سکتا تھا۔ سوائے اس کی بات ماننے کے۔ گولی چلا کے وہ معاملے کی سنگینی کا ثبوت دے چکا تھا۔"

شہناز کو چپ سی لگ گئی۔ یہ سب کچھ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ کچھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

"اس نے یہ تنبیہہ بھی کی تھی کہ میں تمہیں کچھ بھی نہ بتاؤں ورنہ ہر دھمکی پر عمل کیا جائے گا۔ مجھ سے کہا گیا کہ بس تمہارا خیال دل سے نکال دوں۔" وہ کہتے کہتے رکا "میں مرد آدمی ہوں موت سے نہیں ڈرتا لیکن بہنوں کا معاملہ تو نہیں سہہ سکتا۔ اسی لئے تمہیں نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ تمہیں یہ بات معلوم ہو گئی ہے تو....." وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

شہناز کو اس پر ترس آنے لگا۔ ایسا مضبوط اور جواں مرد کیسا خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا خون بھی کھولنے لگا۔

"تم بتا رہی تھیں کہ تمہارے پاپا راضی ہو گئے۔ یہ کب کی بات ہے؟" مشکور نے پوچھا۔

"چار دن پہلے میں نے پاپا کو بتادیا تھا کہ میں تمہارے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔" شہناز نے بتایا "انہوں نے مجھے تین دن کی مہلت دی تھی کہ میں خوب سوچ سمجھ کر حتمی فیصلہ کرلوں۔ کل میں نے انہیں بتادیا۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہارے گھر والوں کو رشتہ طلب کرنے کے لئے بلا سکتی ہوں۔"

"اس یقین کے ساتھ کہ میرے گھر سے رشتہ مانگنے کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔" مشکور نے زہریلے لہجے میں کہا۔

شہناز کو اس کی بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اس کی تیوریاں چڑھ گئیں "کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ قاتلانہ حملہ میرے پاپا نے کرایا ہے اور وہی تمہیں دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

"میں کچھ بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ تو دو جمع دو چار والی بات ہے۔ میرے ہتھیار ڈالنے کے بعد ہی انہوں نے ہامی بھری ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ پاپا نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس شادی کے خلاف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ باقاعدہ مجھے رخصت کریں گے لیکن ہمیشہ کے لئے۔ تم سے شادی کے بعد میرا اس گھر سے، ان سے، ممی اور بھائیوں سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اگر یہ سب کچھ ان کا کیا دھرا ہوتا تو انہیں یہ دھمکی دینے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے ان پر شک تھا بھی نہیں۔" مشکور نے کہا "لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کس کی حرکت ہے۔"

"میں بھی سمجھ رہی ہوں۔" شہناز نے کہا "یہ عثمان کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا لیکن مشکور، تم اس کا دماغ تو بہ آسانی درست کر سکتے ہو۔"

"میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے بے بی۔ میری بہنیں میرے پاؤں کی بیڑیاں بن گئی ہیں۔"

"تو پھر؟"

"تم مجھے بھول جاؤ اور خدا کے لئے اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح وہ میرا اور تمہارا تعلق ختم کر سکے گا۔"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔"

گھر آکر شہناز سوچتی اور الجھتی رہی۔ بساط کیسے الٹ گئی تھی۔ جس خواب کی تعبیر کے لئے وہ ممی اور پاپا کے سامنے ڈٹ کر کھڑی

ہوئی تھی، جس کے لئے وہ سب کچھ چھوڑنے پر آمادہ ہوگئی تھی وہ بس خواب ہی رہ گیا تھا۔ تعبیر اب اسے کبھی نہیں مل سکتی تھی۔ اسے عثمان سے ایسی نفرت محسوس ہورہی تھی کہ اس کا بس چلتا تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ لیتی۔

وہ سوچتی اور اسے غصہ آنے لگتا۔ پاپا نے مشکور کو خود غرض اور مطلبی کہا تھا اور مشکور نے اپنی بہنوں کی خاطر کیسا ایثار کیا تھا۔ اپنی محبت سے، اپنے ہر خواب سے دستبردار ہوگیا تھا اور جس عثمان پر وہ جان چھڑک رہے تھے وہ خود غرض ثابت ہوا تھا۔ اسے اپنانے کے لئے، اس کی محبت حاصل کرنے کے لئے وہ کیسے ہتھکنڈے استعمال کررہا تھا۔ اور پاپا کہتے ہیں کہ وہ مردم شناس ہیں۔ انسانوں کو پہچانتے ہیں۔ ہزاروں انسانوں کو برتا ہے انہوں نے۔

"کب آرہے ہیں وہ لوگ؟" ممی نے اسے چونکادیا۔

"وہ لوگ نہیں آئیں گے۔" شہناز نے جواب دیا۔ وہ اپنا لائحہ عمل ترتیب دے چکی تھی "پاپا نے ٹھیک کہا تھا۔ مشکور اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس نے شادی سے انکار کردیا۔"

ممی سے اپنی خوشی نہیں چھپائی گئی "اوہ... تو اس لئے اداس بیٹھی ہو۔ کوئی بات نہیں۔ رشتوں کی کوئی کمی تو نہیں تمہارے لئے۔"

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے ممی۔ میں عثمان سے شادی کروں گی۔"

"لیکن تم اسے پسند نہیں کرتیں۔"

"وہ ناپسندیدگی تو اس لئے تھی کہ میں مشکور کو پسند کرتی تھی۔" شہناز نے کہا "اور ویسے بھی میں آپ کو اور پاپا کو خوش کرنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی تھی۔"

ممی خوش ہوگئیں۔ وہ جانتی تھی کہ ان کی وساطت سے یہ بات پاپا تک پہنچے گی تو وہ بھی بہت خوش ہوں گے۔

اس رات وہ دیر تک جاگتی رہی۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ کسی محبت سے دستبردار ہونا بے حد مشکل کام ہے۔ کتنی بار اس کے جی میں آئی کہ سب کچھ چھوڑ کر مشکور کے پاس چلی جائے۔ اس سے کہے کہ ہم سب کچھ چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔ اپنی دنیا کہیں اور بسائیں لیکن وہ جانتی تھی کہ اب یہ ممکن نہیں۔ بہنوں کا مسئلہ اپنی جگہ ہے، وہ نہ بھی ہوتا تب بھی مشکور نے جو کہہ دیا تھا وہ اس سے کبھی نہ ہٹتا۔ جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔

اسے مشکور کا اٹھایا ہوا سوال یاد آیا۔ کیا اس طرح وہ ان کے تعلق کو ختم کرسکے گا؟ کبھی نہیں۔ وہ بڑبڑائی۔ اس سوال کا جواب سوچتے سوچتے وہ سوگئی۔ اس رات اس نے جتنے خواب دیکھے وہ محبت اور انتقام کے ملے جلے خواب تھے۔



عثمان بہت خوش تھا۔ اس کے خوابوں کو تعبیر مل گئی تھی!

اس روز رات کے کھانے کے بعد نجم صاحب اسے اپنی اسٹڈی میں لے گئے۔ آنٹی کافی وہیں لے آئیں "بیٹھ جاؤ فہمیدہ بیگم۔ تمہاری موجودگی بھی ضروری ہے۔" نجم صاحب نے کہا۔

آنٹی مسکراتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

عثمان کا چہرہ تمتمانے لگا۔ انکل اور آنٹی بہت خوش نظر آرہے تھے۔ اسے لگتا تھا کوئی اہم بات ہونے والی ہے۔

"ویسے تو تم میرے لئے اولاد کی طرح ہو۔" نجم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن ہم نے تمہیں باقاعدہ اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں۔" عثمان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"یہ گھر کی بات ہے لیکن بہتر ہوگا کہ تم اپنے چند رشتے داروں کو ہمارے ہاں بھیج دو تاکہ تاریخ وغیرہ طے کرلی جائے۔"

"میرے رشتے داروں سے تو آپ خوب واقف ہیں انکل۔" عثمان نے آہستہ سے کہا "وہ تو یہی چاہیں گے کہ یہ رشتہ ختم ہوجائے۔ اس میں ان کا اپنا مفاد ہے۔"

نجم صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔ "کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔"

"تو یہ کون سا بڑا مسئلہ ہے۔" فہمیدہ آنٹی بولیں "آپ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہ گھر کی بات ہے۔ عثمان میرے لئے بھی بیٹوں کی طرح ہے۔"

"مطلب؟" نجم صاحب نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ شہناز کے باپ ہیں اور میں عثمان کی ماں۔ یوں ہم خود طے کرلیں گے۔"

نجم صاحب کی آنکھیں چمکنے لگیں "ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" وہ عثمان کی طرف مڑے "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ تو آپ کا احسان ہے مجھ پر۔" عثمان نے ممنونیت سے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔"

"ٹھیک ہے انکل۔ اب میں چلتا ہوں۔"

اگلے روز عثمان نے اپنی فرم کے منیجر ساجد صاحب سے بات کی۔ وہ سب سے پرانے آدمی تھے اور ابو سے بہت قریب رہے تھے۔

"آپ بے فکر رہیں عثمان میاں۔" انہوں نے کہا "تمام انتظامات ہوجائیں گے۔ آپ صرف تاریخ بتادیجئے گا۔ میں اور دفتر کے سب لوگ ہر طرح سے حاضر ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم سب مرحوم صاحب سے اور آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔"

عثمان جانتا تھا۔ اس کا عملی مظاہرہ وہ ابو کے انتقال کے موقع پر دیکھ چکا تھا۔ اس نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ ابو نے ساری زندگی اصل کمائی کیا کی ہے۔

تین دن بعد نجم صاحب نے فون کیا "تم آئے نہیں۔ تین دن سے تمہارا انتظار ہورہا ہے۔" انہوں نے چھوٹتے ہی شکایت کی۔

"بس انکل، اب تو مشکل ہے۔ اچھا نہیں لگتا۔"

"ہم جانتے تھے کہ یہی ہوگا۔" نجم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس لئے تمہاری امی نے اصرار کیا کہ تاریخ دور کی نہ رکھی جائے۔ انہوں نے اس مسئلے پر شہناز کے ابو سے خوب لڑائی کی۔"

عثمان اس دلچسپ گفتگو پر مسکراتا رہا "تو پھر کیا طے پایا؟"

"آج ۱۵ دسمبر ہے نا۔ بس تمہارے پاس ۱۶ دن کی مہلت ہے۔ یکم جنوری کو شادی طے پا گئی ہے۔ باقی تفصیل تمہاری امی خود گھر آکر تمہیں بتائیں گی۔ اب میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔"

"شکریہ انکل۔"

"اور کوئی مسئلہ ہو، کوئی کام ہو جس میں دشواری ہو تو مجھے فون کر دینا۔ ٹھیک ہے بیٹے؟"

"جی انکل۔"

اگلے روز سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ عثمان کے اصرار پر ساجد صاحب کی بیوی اور بچے اس کے گھر آگئے۔ عثمان کو یقین نہیں آرہا تھا کہ گھر میں اتنی رونق بھی ہو سکتی ہے۔ شادی چیز ہی ایسی ہے۔ گھر کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔

دن تیزی سے اڑتے رہے۔ سالِ رواں ختم ہوا اور نیا سال آپہنچا۔ سالِ نو کا پہلا دن.... شادی کا دن، خوابوں کی تعبیر کا دن!

سب مہمان رخصت ہو گئے۔ ساجد صاحب اور ان کے گھر والوں کو اس نے اصرار کر کے چند روز کے لئے روک لیا تھا۔ رات گئے وہ حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اس کی دھڑکنیں تیز رفتاری کے نئے ریکارڈ قائم کر رہی تھیں۔ وہ اس کی سہاگ رات تھی۔ ارمانوں بھری سہاگ رات!

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ آراستہ چھت بے حد حسین لگ رہی تھی..... کچے گلابوں کی سیج نے پورے کمرے کو مہکا دیا تھا۔

مگر کمرے میں کوئی کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مسہری کی طرف بڑھا اور سیج کی لڑیاں ہٹا کر دیکھا۔ اس کی دلہن سیج پر موجود نہیں تھی۔ ارے.... یہ کہاں گئی۔ چند لمحے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ ملحقہ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور شہناز اندر آئی۔

وہ حیرت سے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسے زبردست شاک لگا تھا۔

شہناز سفید کاٹن کے عام سے لباس میں تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے پاک تھا۔ بھیگے ہوئے بالوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نہا کر آئی ہے۔ اس کا دھلا دھلایا چہرہ بے حد تروتازہ لگ رہا تھا۔ صرف مانگ میں کہیں کہیں چمکی افشاں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے دلہن بنی ہوگی۔

عثمان گنگ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس لباس میں بھی وہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی لیکن اس کا شاک اپنی جگہ تھا۔ وہ دولہا تھا، جو اپنی بجی سنوری دلہن کو دیکھنے کا شوق لئے کمرے میں آیا تھا۔ اس کی شیروانی کی جیب میں منہ دکھائی کا تحفہ موجود تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ تو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا۔

"کیا بات ہے؟ آپ رک کیوں گئے؟" شہناز کی آواز نے جیسے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"یہ.... یہ.... یہ سب کیا ہے؟" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

شہناز نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا "کیا؟ آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہاری طرف۔" عثمان کے لہجے میں شکایت تھی۔

"کیوں.... مجھے کیا ہو گیا؟" شہناز نے معصومیت سے کہا۔

"یہ تم نے اپنا کیا حلیہ بنا لیا؟" اس کے لہجے کی شکایت اور گہری ہو گئی۔

"اچھی نہیں لگ رہی ہوں کیا؟" شہناز نے بڑے ناز سے پوچھا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔ تم تو ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔" عثمان نے بے حد نرم لہجے میں کہا مگر پھر اس کے لہجے میں شکایت در آئی "لیکن یہ ہماری سہاگ رات ہے۔ تم میرے لئے دلہن بنی تھیں۔ میرے لئے بجی سنوری تھیں اور اب....."

"اوہ تو یہ بات ہے۔" شہناز نے اٹھلاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی "سوری عثمان، دراصل مجھے گرمی بہت لگ رہی تھی۔ ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔"

اس موسم میں گرمی! نئے سال کے پہلے دن گرمی! عثمان کو کچھ ہونے لگا۔ وہ خود بھی اپنی کیفیت نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اسے غصہ بھی تھا، جھنجلاہٹ بھی تھی اور افسوس بھی ہو رہا تھا۔ شاید اسے یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ جو کچھ ہو گیا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ جو کچھ کھو گیا ہے اب اسے کبھی نہیں مل سکتا۔ یہ لمحے تو کبھی پلٹ کر نہیں آئیں گے "تم تھوڑی دیر انتظار کر سکتی تھیں پھر گرمی کیسی۔ مجھے تو اس شیروانی میں بھی گرمی نہیں لگ رہی ہے۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"شادی کا جوڑا بہت بھاری ہوتا ہے۔ پھر اتنا زیادہ میک اپ۔ میں اس کی عادی نہیں ہوں۔" شہناز نے کہا۔ عثمان کہنا چاہتا تھا کہ عادی تو کوئی لڑکی بھی نہیں ہوتی لیکن اس سے کہا نہیں گیا۔ درحقیقت وہ ابھی تک شاک سے نہیں نکلا تھا۔

"اور مجھے گرمی ویسے بھی بہت زیادہ لگتی ہے۔"

عثمان تھکے تھکے قدموں سے مسہری کی طرف بڑھا اور بیٹھ گیا۔

"اب تم نہا چکی ہو۔ پھر سے دلہن بن جاؤ۔ صرف چند منٹ کے لئے سہی۔ میری خاطر.... پلیز۔" اس نے التجا کی۔

"وہ میک اپ تو میں قیامت تک نہیں کر سکتی۔ مجھے میک اپ کرنا آتا ہی نہیں۔ کبھی کیا ہی نہیں میں نے۔" شہناز نے عذر پیش کیا "اور سنئے۔ میں روایت شکن لڑکی ہوں۔ میرے خیال میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہاں، آپ کی خاطر شادی کی پہلی سالگرہ پر میں یہ اہتمام کروں گی۔ سہاگ کا جوڑا بھی پہنوں گی مگر آج نہیں۔"

عثمان کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے تمام سپنے بکھر گئے ہیں۔ خوشیوں میں جیسے کوئی کرب گھل مل گیا ہے۔ اس کے ذہن میں تو سہاگ رات کا کچھ اور ہی تصور تھا۔ وہ مسہری پر بیٹھے گا جہاں وہ پہلے ہی سے سمٹی سکڑی سی بیٹھی ہوگی۔ وہ اس کا گھونگھٹ اٹھائے گا اور اس کا جمال اس کی سانسیں روک دے گا۔ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہے گا... دیر تک۔ وہ کھنکارے گی تو وہ چونکے گا۔ پھر وہ اسے منہ دکھائی کا تحفہ دے گا اور پھر......

شہناز بے تکلفی سے مسہری پر بیٹھ گئی اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی۔

یہاں نہ وہ دلہنوں والا حجاب تھا نہ سہاگ رات کا وہ افسانوی حسن۔ وہ کسی سنگین مگر حسین حقیقت کی طرح اس کے روبرو تھی۔

"اچھا اب میری منہ دکھائی نکالیں۔" شہناز نے بے تکلفی سے کہا۔

وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم روایت شکن ہو کر ایسا روایتی مطالبہ کر رہی ہو لیکن وہ تلخی نہیں بڑھانا چاہتا تھا پھر بھی اس نے کہا "جس طرح منہ دکھایا جاتا ہے اس طرح تو تم نے دکھایا ہی نہیں۔ منہ دکھائی کیا دوں تمہیں؟"

"کیوں بھئی؟ منہ تو دیکھا ہی ہے آپ نے۔" وہ اٹھلائی۔

"یہ منہ تو بہت پہلے دیکھا تھا۔ اسی وقت لے لیتیں منہ دکھائی۔" عثمان کو احساس ہوا کہ اس نے بہت سخت بات کہہ دی ہے۔ صورتِ حال کچھ بھی ہو لیکن وہ بہرحال شہناز کو روح کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ وہ اسے کیسے تکلیف پہنچا سکتا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "یہ تو خیر مذاق تھا۔ یہ لو اپنی منہ دکھائی۔" اس نے شیروانی کی جیب سے رسٹ واچ کا کیس نکالا۔ اس میں سے گھڑی نکالنے کے بعد اس نے شہناز کی کلائی تھامی اور اس پر گھڑی باندھ دی۔

"منہ دکھائی میں یہ عام سی گھڑی۔" شہناز نے بے ساختہ کہا۔

عثمان کے چہرے کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوگئی "یہ عام سی گھڑی نہیں ہے۔ یہ تمہیں پتا چل جائے گا۔" شہناز کی کلائی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگالیا "شہناز' آئی لو یو۔" اس کی آواز بدلنے لگی۔ لہجے میں محبت ہی محبت تھی "میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کا بیان ممکن نہیں۔ بتایا ہی نہیں جاسکتا۔ بس یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

"میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ یہ میرے لئے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری ہے۔" شہناز نے کہا۔

"ادھر آؤ۔" اس نے شہناز کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "میں تمہیں ایک اور چیز دکھانا چاہتا ہوں۔"

وہ اسے مسہری کے پیچھے بائیں جانب والے گوشے کی طرف لے گیا۔ وہاں چھت سے فرش تک ایک مخملی پردہ لہرا رہا تھا "اس ڈوری کو کھینچ کر پردہ کھولو۔" اس نے کہا۔

شہناز نے ڈوری کھینچی۔ پردہ دونوں طرف سمٹنے لگا۔ پردہ ہٹا تو ایک اور حریری پردہ سامنے آیا۔ عثمان شہناز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ حریری پردے کے پیچھے کارنس پر رکھی چیز دیکھ کر شہنا مبہوت ہو کر رہ گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی سانسیں رک ہیں "کیسا ہے؟" عثمان نے پوچھا۔

"بہت حسین۔" شہناز نے جواب دیا۔ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھے جارہی تھی۔ وہ بلور کا بے حد حسین تاج محل تھا۔ اس نے حریری پردہ بھی ہٹادیا۔

"یہ میری محبت کی علامت ہے۔" عثمان نے کہا "میں بادشاہ ہوتا تو سچ مچ تاج محل تعمیر کراتا تمہارے لئے۔"

شہناز نے سر اٹھا کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

"اس کی اصل خوب صورتی اب دیکھنا۔" عثمان نے کہا اور سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بٹن دبائے اور کمرے میں اندھیرا پھیل گیا "کیا کر رہے ہیں؟" اندھیرے میں شہناز کا احتجاج ابھرا۔

عثمان نے ایک سوئچ دبایا اور بلور کا تاج محل روشن ہوگیا۔ تاج محل کے اس ماڈل کے اندر بہت چھوٹے چھوٹے قمقمے تھے لیکن روشنی بہت زیادہ نہیں تھی "اسے اس کمرے کا نائٹ بلب سمجھ لو۔ کیسا لگا تمہیں؟"

"اچھا ہے۔" اس بار شہناز کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

عثمان نے دونوں ہاتھ شہناز کے کندھوں پر رکھے تو اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ وہ اسے مسہری کی طرف لے چلا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے وجود کے اندھیرے میں سمٹ کر بیٹھا سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کیا انسان برف کی مورت بھی ہوتا ہے؟ وہ سوچ رہا تھا۔ گداز' حرارت اور جنبش سے محروم؟ وہ اپنے وجود کی تمام حرارت گنوا کر بھی برف کی مورت میں حرارت کی رمق تک منتقل نہیں کر سکا تھا۔

کیا سہاگ رات ایسی ہوتی ہے؟ اس نے سوچا۔ اسے احساسِ جرم ستانے لگا۔ وہ تو بہت خود غرض' بہت کم ظرف ثابت ہوا تھا۔ سوائے شرمندگی کے اس نے کیا کمایا تھا۔ محبت کوئی یک طرفہ جذبہ تو نہیں ہوتا۔

اس کے لئے سونا بھی دشوار ہوگیا۔ اس نے پہلو کی طرف دیکھا۔ شہناز بے سدھ سو رہی تھی۔



شہناز بہت آہستگی سے عالمِ خواب سے عالمِ ہوش میں آئی۔ اس سفر میں ایک احساس اس کا ہم سفر تھا۔ اور جب اس نے عا ہوش میں قدم رکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ محض احساس نہیں تھ

بلکہ آواز تھی جو بیداری کے عالم میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ کوئی بے حد رومانوی سرگوشی میں دہرائے جارہا تھا ''آئی لو یو' آئی لو یو' آئی لو یو......''

شہناز نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ سجی ہوئی چھت دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ سہاگ رات کے بعد جاگی ہے۔ وہ رومانوی سرگوشی اب بھی اس کی سماعت میں گدگدی کررہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ عثمان کی آواز ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ اس کے ہونٹ ساکت تھے۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔

اس کا ذہن جو ابھی تک پوری طرح نہیں جاگا تھا' خوف زدہ ہوگیا۔ یہ آواز کیسی ہے۔ کہاں سے آرہی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھے جارہی تھی۔ آواز اس کے بہت قریب سے۔ اس کے اندر سے آتی محسوس ہورہی تھی۔

اچانک اسے اپنی کلائی کے مرتعش ہونے کا احساس ہوا۔ اس کلائی پر منہ دکھائی والی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے اس ہاتھ کو اوپر...... اپنے چہرے کے قریب لائی۔ آواز زیادہ بلند ہوگئی۔ زیادہ صاف سنائی دینے لگی۔ اس نے گھڑی کو کان سے لگایا اور جان لیا کہ آواز گھڑی میں سے آرہی ہے۔ اس نے بوکھلا کر گھڑی کو ٹٹولا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی کئی چابیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے تمام چابیوں کو دبا کر دیکھ لیا۔ آواز بند نہیں ہوئی۔ وہ جھنجلا گئی۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ گھڑی نے جیسے اس کی آواز سن لی۔ اظہارِ محبت کا وہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔

اس نے برابر میں سوئے ہوئے عثمان کو دیکھا۔ اس وقت وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے اس پر پیار آنے لگا مگر فوراً ہی ردِّ عمل کے طور پر خود پر غصہ آیا۔ اس سے اسے انکار نہیں تھا کہ وہ بہت پُرکشش آدمی ہے۔ یہ بات اس نے بہت پہلے تسلیم کرلی تھی کہ اگر مشکور درمیان میں نہ ہوتا تو وہ عثمان سے محبت کئے بغیر نہ رہتی۔

وہ اسے غور سے دیکھتی رہی اور اس کے اندر متضاد جذبوں کی جنگ ہوتی رہی۔ اگر اس کی شادی عام حالات میں ہوئی ہوتی تو وہ اس کی ظاہری شخصیت کی کشش سے نہیں بچ سکتی تھی لیکن شادی سے پہلے ہی اس کا اصل روپ اس کے سامنے آچکا تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے اپنی خواہش کے لئے راستہ صاف کیا تھا۔ شہناز کے نزدیک بے رحمی میں کوئی برائی نہیں تھی۔ مرد کو اپنے اہم معاملات میں بے رحم ہونا چاہئے۔ سختی اور سخت گیری مرد پر سجتی ہے لیکن عثمان نے مشکور کو راستے سے ہٹانے کے لئے جو کچھ کیا تھا وہ مردانگی کے خلاف تھا۔ وہ ایسی چھپی ہوئی' بزدلی میں لپٹی ہوئی سفاکی تھی جو صرف عورتوں میں ہوتی ہے۔

تو اب اس سے محبت کو دل چاہے یا اس پر پیار آئے' وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

وہ اٹھی۔ وارڈ روب سے اپنے لئے ایک سادہ سا لباس نکالا اور باتھ روم چلی گئی۔

باتھ ٹب کے نیم گرم پانی میں دراز ہوکر بھی وہ عثمان ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیسے تضادات ہیں اس شخص میں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اس کے پاس غضب کا Imagination ہے۔ ذوق بھی ہے۔ یہ کسی کی بھی محبت جیت سکتا ہے۔ اسے محبت بھی ہوئی تو ایسی لڑکی سے' جو پہلے ہی کسی اور کی محبت میں گرفتار تھی۔ اصولاً اسے دل جیتنے کی' اپنے حریف کو محبت کے میدان میں شکست دینے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اس میں اس کی صلاحیت بھی ہے۔ تمام ہتھیار موجود ہیں اس کے پاس۔ لیکن اس نے کیا کیا...... گھٹیا پن کا مظاہرہ۔ اپنی دولت اور کرائے کی طاقت پر گھمنڈ! اس شخص کو محبت جیتنی بھی نہیں آتی۔ وہ اپنے Imagination' اپنے ذوق سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔

لیکن شادی کی رات وہ مختلف آدمی تھا۔ اس کا وہ جگمگاتا تاج محل دیکھ کر چند لمحوں کے لئے وہ بے خود ہوگئی تھی۔ اس نے خود کو پگھلتا محسوس کیا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس کی باہنوں میں' اس کے سینے پر بکھر جائے لیکن فوراً ہی اسے اس کی اصلیت یاد آگئی۔ وہ سحر فوراً ٹوٹ گیا۔

اور اب یہ گھڑی! یہ رومانوی سرگوشی۔ آئی لو یو۔ یہ اظہارِ محبت۔ اور اظہارِ محبت کرنے والے کی ایسی قربت کہ وہ ہر وقت کلائی سے لپٹا رہے۔ کون ہے جو ایسی محبت کی ناقدری کرسکتا ہے۔ اس سے منہ موڑ سکتا ہے۔ صرف وہی جو خوب صورت ظاہر کے پردے میں چھپے بھیانک اور گھناؤنے باطن کو دیکھ چکا ہو۔

شہناز کے ذہن میں اس لمحے ایک بے حد مشکل سوال نے سر اٹھایا۔ اگر عثمان نے یہ تحفے شادی سے پہلے دیے ہوتے تو کیا ہوتا؟ کیا وہ مشکور کی محبت سے چمٹی رہتی؟ یا عثمان کے اس منفرد اظہارِ محبت کے سامنے سر جھکا دیتی؟

سوال بے حد مشکل تھا مگر اس کے ذہن میں جو جواب ابھر رہا تھا۔ وہ کمزور کردینے والا تھا۔ اب ایسی باتوں کا کیا فائدہ؟ ایسا ہوا تو نہیں نا۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ وقت اب پلٹ تو نہیں سکتا اس لئے یہ سوال مہمل ہے۔ اس کا جواب غیر ضروری ہے۔

نہیں عثمان حفیظ۔ وہ بڑبڑائی۔ میں تم سے محبت نہیں کرسکتی۔ تم بزدل اور کم ظرف ہو۔ تم مرد ہو لیکن مردانگی سے محروم۔ جو کچھ تم نے کیا' اس کی سزا تمہیں دنیا کا کوئی مرد نہیں دے سکتا۔ ہاں عورت دے سکتی ہے اور دے گی۔ میں نے تم سے شادی ہی اس لئے کی ہے۔ میں تمہاری زندگی کو جہنم بنادوں گی۔ میں تمہیں بتاؤں گی کہ تم میں کتنا ہی عورت پن ہو' تم سفاکی میں عورت کی ہمسری نہیں کرسکتے۔ تم کتنی ہی...... کیسی ہی محبت کرلو مجھ سے' تم مجھے جیت نہیں سکتے عثمان حفیظ۔

وہ باتھ روم سے باہر آئی تو وہ بیدار ہوچکا تھا۔

○☆○

ایک ماہ میں عثمان کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی ازدواجی زندگی شرمندگی کی تحریر بن گئی ہے۔

وہ پریشان رہنے لگا۔ شادی تو خوشی کا نام ہے۔ مسرت لاتی ہے۔ اور ازدواجی زندگی میں ایک آدمی کے خوش اور مطمئن ہونے سے کام نہیں چلتا۔ کچھ خوشیاں تو مشروط ہی اس سے ہوتی ہیں کہ دونوں فریق مطمئن ہوں۔ لیکن وہ پوری کوشش کے باوجود خوشی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔

شہناز اس کے لئے ایک ناقابلِ تسخیر برفانی چوٹی بن گئی تھی۔ وہ ایک ایسا کوہ پیما تھا' جو پیہم کوشش کے باوجود اسے سر نہیں کر پا رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ اونچے پہاڑوں کو سر کرنے کی مہمات ناکام کیسے ہوتی ہیں اور ان کی کامیابی کی کیا وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ پہاڑ تسخیر ہونے پر آمادہ ہو۔ پہاڑوں کا رویّہ معاندانہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ مہم کو ادھورا چھوڑنا پڑتا ہے اور اگر کوہ پیما ضد کریں تو جان سے ہاتھ بھی دھو بیٹھتے ہیں۔ دوسری چیز موسم ہے۔ مہم کی کامیابی کے لئے موسم کا سازگار ہونا اشد ضروری ہے۔ ناسازگار موسم میں بھی پہاڑی چوٹیاں سر نہیں ہوتیں۔ اسے یاد آیا کہ دشوار ترین پہاڑی چوٹیاں وہی ہوتی ہیں جہاں موسم سارا سال ہی خراب رہتا ہے۔ جہاں موسم کا مزاج کبھی نہیں ملتا۔ موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ سازگار موسم چند منٹ بھی رہ سکتا ہے اور چند گھنٹے بھی اور پل کے پل میں سب کچھ بدل کر رہ جاتا ہے۔

وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن پوری طرح نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ یونہی تو نہیں چل سکتا۔ اسے احساس ہو گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس سلسلے میں شہناز سے بات کرنا پڑے گی۔ چنانچہ اس رات اس نے شہناز سے یہ موضوع چھیڑ دیا "تم خوش نہیں ہو شہناز۔"

"نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔" شہناز نے جواب دیا۔

"مجھے تو تم خوش اور مطمئن نہیں لگتیں۔"

"یہ تو پھر آپ ہی جانتے ہوں گے۔" شہناز کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "میں آپ کی ذمے داری ہوں۔"

عثمان کا احساسِ جرم اور بڑھ گیا "وہ تو میں سمجھ رہا ہوں لیکن اس مسئلے کو حل بھی تو کرنا ہو گا۔ کوئی حل تو ہو گا اس کا۔"

"ہونا تو چاہئے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تم میری مدد کر سکتی ہو۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم مجھ سے تعاون نہیں کرتیں۔ تم میرے ساتھ شامل نہیں ہوتیں۔"

"میں اس سے انکار نہیں کروں گی لیکن اس میں میرا قصور نہیں۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایسے دو افراد کا تصور کریں جو ٹیبل ٹینس کھیل رہے ہیں اور ان میں سے ایک ایسا ہے جو کھیلنا نہیں چاہ رہا ہے مگر دوسرے کی خاطر ہاتھ میں ریکٹ لئے کھڑا ہے

اشتہار

اقوامِ متحدہ کی عمارت کے نزدیک واقع ایک باربر شاپ کے دروازے پر ایک اشتہار چسپاں تھا۔ جلی حروف میں لکھا تھا!

"ایک باربر کی ضرورت ہے۔ عالمی حالات وواقعات اور سیاست پر عمدگی سے گفتگو کر سکتا ہو۔ ذہین اور خوش اطوار ہو۔ بال بھی کاٹنا جانتا ہو تو ترجیح دی جائے گی۔"

ایسی صورت میں کیا ہو گا۔"

عثمان کی سمجھ میں بات پوری طرح آگئی "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس صورت میں کھیل نہیں ہونا چاہئے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں نے تمہارے اندر کبھی آمادگی محسوس نہیں کی۔ تم ہمیشہ مجھے برف کی مورت کے روپ میں ملیں۔"

"یہ محض اتفاق ہے۔" شہناز نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ویسے میں ہر تعاون کے لئے تیار ہوں اور تعاون کرتی بھی رہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آپ کو کبھی روکا نہیں۔"

عثمان چند لمحے سوچتا رہا "حالانکہ تعاون یہ ہوتا کہ تم مجھے روک دیتیں۔ ناآسودگی کمانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ آسودگی تو خود مجھے بھی نہیں ملتی۔"

"میں ہمیشہ یہ سوچتی ہوں کہ اس میں آپ کی دل آزاری ہو گی۔"

"اس انداز میں مت سوچو۔ تم مجھے روک سکتی ہو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ اور دوسری طرف تم مطالبہ کرنے کا حق بھی رکھتی ہو۔" عثمان نے کہا "اور ہاں ایک اور تعاون بھی تم مجھ سے کر سکتی ہو۔"

"آپ بتائیں۔"

"وہ یہ کہ جب تمہارے ہاں آمادگی ہو تو تم مجھے بتا دو۔"

شہناز نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا "یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ یہ تو بے شرمی ہو گی۔"

"پلیز... میری خاطر۔" عثمان نے التجا کی "اور پھر منہ سے کہنا ضروری تو نہیں' اظہار کے اور بھی طریقے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

عثمان اس گفتگو کے بعد مطمئن ہو گیا لیکن وہ طمانیت بھی عارضی ہی ثابت ہوئی۔ اب وہ بس یہی کہہ سکتا تھا کہ شاید ان دونوں کے ستارے نہیں مل رہے ہیں۔ منفی انداز میں وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ جب وہ بے حد تھکا ہوا ہوتا یا طبیعت خراب ہوتی یا وہ ڈپریشن سے دوچار ہوتا تو شہناز آمادگی ظاہر کرتی۔ نتیجہ اب پہلے سے بھی خراب نکلتا تھا۔

ایک دن شہناز نے کہہ ہی دیا "آپ بہت بدل گئے ہیں۔ آپ

کو اب مجھ میں کشش محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کا دل بھر گیا ہے مجھ سے۔"

عثان بے بسی سے اسے دیکھتا رہا "یہ مت کہو۔ میری محبت کم نہیں ہوئی' بڑھی ہے۔ کیا وہ گھڑی اب تمہیں یہ بات یاد نہیں دلاتی۔"

"وہ تو بے بس' بے جان ہے۔ طوطے کی طرح رٹا رٹایا سبق دہراتی رہتی ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ وہ میرے دل کی آواز ہے' جسے مناسب اور موثر لفظ نہیں ملتے۔"

اب وہ صحیح معنوں میں پریشان تھا۔ اور اس کا کوئی حل اسے نظر نہیں آرہا تھا۔

○☆○

انتقام جیسا کوئی طاقت ور جذبہ فطرت سے ساز باز کرتا ہے تو عورت کی نسوانی سوجھ بوجھ بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات شہناز نے سہاگ رات کو ہی ثابت کردی تھی۔ وہ ایک کثیر المقاصد اور کثیر النتائج جنگ لڑرہی تھی۔ پہلے ہی مرحلے میں اس نے عثان کو احساسِ محرومی' احساسِ جرم اور شرمندگی سے دوچار کردیا تھا۔ ان میں احساسِ محرومی سب سے خطرناک اور مضر تھا۔ آدمی سب کچھ پالے لیکن اسے کچھ بھی نہ ملے تو اس کی اذیت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اور یہ اذیت سب سے زیادہ دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے سوچنے سمجھنے اور فیصلے کرنے کی قوت بری طرح متاثر ہوتی ہے احساسِ محرومی مسلسل رہے تو پھر یہ قوتیں ختم ہوتی چلی جاتی ہیں شہناز جانتی تھی کہ عثان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

ان کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو بھی ہوئی تھی۔ اور یہ طے پایا تھا کہ وہ خود بھی ضرورت کا اظہار کرسکتی ہے۔ یوں اسے ایک اور ہتھیار میسر آگیا تھا۔ جس دن وہ اسے تھکا ہوا اور ڈپریس نظر آتا' وہ جاتی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی۔ کبھی وہ اس کا ہاتھ تھام لیتی اور اسے پگھلا دینے والی نگاہوں سے تکنے لگتی۔ وہ راغب نہ ہونے کے باوجود اس کی خواہش کا احترام کرتا۔ اس خواہش کا احترام جو سچی نہیں' محض اوپری ہوتی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اچھا نہیں نکل سکتا تھا۔

وہ یہ سوچ کر مسکرادی۔ اسے اپنی ہی دی ہوئی مثال یاد آگئی۔ اس نے اس میں ترمیم کر ڈالی۔ اب یوں ہوتا تھا کہ دو ایسے کھلاڑی ٹیبل ٹینس کھیل رہے ہوتے تھے جو کھیلنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک نہیں' دونوں کھلاڑی۔ صورتِ حال پہلے سے خراب ہوگئی تھی۔

پھر یہ سوچ کر اسے غصہ آنے لگتا کہ عثان کیسا مرد ہے۔ اس کے رد کرنے پر اپنی خواہش سے دست بردار ہوجاتا ہے۔ اور اس کی خواہش کا ہر حال میں احترام کرتا ہے۔ مرد ایسے تو نہیں ہوتے۔ وہ تو اپنی مرضی کرتے ہیں۔ وہ تو منہ زور گھوڑی کو بھی رام کرلیتے ہیں اور وہ بھی محض طاقت کے بل پر۔ مرد ایسے تو نہیں ہوتے۔

خود شہناز پر بھی کبھی کبھی دورے پڑتے۔ کبھی کبھی یوں ہوتا کہ اس کا دل عثان کے قرب کے لئے مچلنے لگتا۔ اسے اس پر ٹوٹ کر پیار آتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ ایسے میں وہ خود کو باندھ کر رکھتی۔ یاد کرتی کہ وہ اس کے اور مشکور کے ساتھ کیا کرچکا ہے۔ ایسے میں وہ خود پر اس کی نفرت اور شدت سے طاری کرنے کی کوشش کرتی۔

ایک رات عثان نے اس سے قریب ہونے کی کوشش کی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ عثان کا چہرہ طلب کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں خوب صورت سی وحشت کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ خواہش کی آگ میں تپ رہے تھے۔

اس روز عجیب بات ہوئی۔ عثان نے اسے چھوا تو اس کے وجود میں جیسے جھماکے سے ہونے لگے۔ پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ایک جانی پہچانی خواہش نے اس کے پورے وجود کو جیسے جکڑلیا۔ بس دماغ نجانے کیسے اس گرفت سے آزاد رہ گیا تھا اور دماغ بھی وہ جس نے اس ہنگامی صورتِ حال میں بہت تیزی سے کام کرنا شروع کردیا تھا اور اس دماغ نے اسے بچالیا۔

اسے احساس ہوا کہ اس لمس نے اس کے وجود کو دہکا دیا ہے۔ اس کے جسم کا ٹمپریچر بڑھ رہا تھا۔ سانسیں بوجھل اور بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ جانتی تھی کہ ابھی عثان کو اس کا ہاتھ سرد لگ رہا ہوگا۔ اس کے جسم کی حرارت ابھی عثان کے جسم کی حرارت سے کم تھی لیکن بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ اس طرح چند منٹ اور گزر گئے تو عثان کو اس کے ہاتھ کی گرمی کا پتا چل جائے گا اور اس کے لئے پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔

اس نے تیزی سے لیکن نرمی سے دوسرے ہاتھ سے عثان کا ہاتھ تھام کر اسے ہٹادیا "سوری..... آج میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔"

عثان اسے بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔ آنکھیں خون کبوتر کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس بار وہ ضبط نہیں کرسکے گا۔ اس پر جھپٹے گا اور اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔

وہ سحرزدہ سی اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ اس کے اندر ہونے والی کشمکش کو خوب سمجھ رہی تھی۔ اس کا اپنا حال بھی عجب تھا۔ اس نے خود کو سختی سے نہ باندھا ہوتا تو وہ اس سے لپٹ گئی ہوتی۔ وہ اس آگ میں جل رہی تھی جو اتفاق سے اور بے خبری میں لگی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے گا اور وہ جانتی تھی کہ ایسا ہوا تو وہ مزاحمت نہیں کرے گی بلکہ خود بھی اس کا ساتھ دینے لگے گی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھے جارہے تھے۔

شہناز کے جسم کی پکار ہر لمحہ بلند آہنگ ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر خواہش چیخ رہی ہو۔ اس کے جسم کا رواں رواں عثمان سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اسے اپنا لے۔ اسے یقین تھا کہ یہ التجا اس کی آنکھوں میں بھی چلا رہی ہوگی۔ اس کا دماغ جسم کے خلاف، خواہش کے خلاف مزاحمت کر رہا تھا، اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی مزاحمت لمحہ بہ لمحہ کمزور ہو رہی تھی۔ یہ بہت خطرناک بات تھی۔ اگر اس نے اس کی نگاہوں کی التجا سمجھ لی تو...

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بظاہر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہے لیکن درحقیقت وہ نہیں دیکھ رہا ہے۔ ہاں... وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خالی پن تھا، جس سے پتا چلتا تھا کہ اس کی نگاہوں کے سامنے صرف خلا ہی خلا ہیں۔

ہوا بھی یہی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے والا اس کی نگاہوں کی التجا نہ دیکھ سکا۔ ایک جھٹکے سے اس نے رخ بدلا اور اس کی طرف پیٹھ کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کا جسم بری طرح لرز رہا ہے۔

اسی لمحے شہناز کے دماغ کی مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ ساتھ ہی اس کا اپنا جسم بھی لرزنے لگا۔ اس لمحے اسے عثمان پر ترس آنے لگا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنے حوالے سے بھی سمجھ سکتی تھی کہ وہ کس عذاب سے گزر رہا ہے مگر پھر اس کا وجود اس کی نفرت سے بھر گیا۔ تم مرد نہیں ہو۔ مجھے تم سے نفرت ہے... نفرت ہے۔ تم مرد نہیں ہو۔ اس کا پورا وجود بے آواز چلا رہا تھا۔ یہی دو جملے دہرائے جا رہا تھا۔

وہ بھی لیٹ گئی لیکن نفرت کے اس طوفان میں بھی اس کے اندر ایک آس کا دیا جل رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ کسی بھی لمحے وہ پلٹے گا اور... وہ نفرت کا بوجھ اٹھائے آس کے اس جھولے میں پینگیں لیتی رہی۔ خواہش کی آگ ایسے بھڑکی تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

دیر ہو گئی... بہت دیر ہو گئی۔ جیسے صدیاں گزر گئیں۔ خواہش کا وہ بوجھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ وہ دل میں آس لیے متوقع نظروں سے اس کی پیٹھ تکتی رہی۔ عثمان کے جسم کی لرزش معدوم ہو چکی تھی۔ اور کچھ دیر گزری تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔

"عثمان... عث...مان..." اس نے جذبات سے چھلکتی آواز میں اسے پکارا۔ اپنی آواز وہ خود بھی نہ پہچان سکی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کئی بار پکارا پھر اسے ہلایا۔ اب وہ چت لیٹا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ جھنجلا گئی کہ وہ بے خبر سو رہا ہے۔ آگ لگانے والوں کو یوں سونا زیب نہیں دیتا۔

اب وہ رک نہیں سکتی تھی۔ وہ فطرت کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا گئی تھی۔ اس نے عثمان کو جھنجوڑ ڈالا۔ خاصی دیر بعد اس نے نندا سی آنکھیں کھولیں "کیا بات ہے؟" وہ اب بھی نیند میں تھا۔

شہناز کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کہے۔ کیا شکست کا اعتراف کر لے؟ "تم سو کیوں رہے ہو؟ مجھ سے باتیں کرو نا" اس نے بھاری... اجنبی آواز میں کہا۔

"سو جاؤ۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں" عثمان نے کہا اور جواب مکمل ہونے سے پہلے پھر سو گیا۔

اس بار شہناز کو بے بسی اور مایوسی نے پوری طرح جکڑ لیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ اپنے عمل کی لپیٹ میں خود آگئی ہے۔ اب تک وہ خود تکلیف اٹھائے بغیر عثمان کے لیے جس کرب کا سامان کرتی رہی تھی، اندازہ ہو رہا تھا کہ اب اسے بھی وہ کرب برداشت کرنا پڑے گا بلکہ اس پہلے ہی موقع پر تو اس کا کرب عثمان کے کرب سے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

کرب پر مستزاد اس کی تشویش تھی۔ جسم کے تقاضے ایک بار شروع ہو جائیں تو ان کا کہیں اختتام نہیں ہوتا۔ اسے اس کا توڑ کرنا تھا ورنہ اس کا انتقام اب اس کے ہی خلاف کام کرنے والا تھا اور یہ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس رات وہ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سو سکی۔ فجر کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ نو بجے دستی گھڑی کے آئی لو یو نے اسے جگا دیا۔

"شٹ اپ یو فول" وہ غرائی۔ "چپ ہو جاؤ، بند کرو یہ منحوس آواز" اس نے گھڑی اتار کر بے دردی سے ایک طرف پھینک دی۔ پھر اس نے بستر پر نظر ڈالی عثمان موجود نہیں تھا۔ وہ شاید باتھ روم میں تھا۔

○☆○

اس خبر نے عثمان حفیظ کی سب کلفتیں دور کر دیں، سب اذیتیں دھو ڈالیں کہ وہ باپ بننے والا ہے۔

سب کچھ جیسے جادو کے زور سے بدل گیا لیکن نہیں... بدلا کچھ بھی نہیں تھا۔ بس بے اثر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہی شہناز کے رویوں کی دھوپ چھاؤں تھی، جس میں چھاؤں بہت کم اور دھوپ بہت زیادہ تھی۔ التفات بے حد موہوم اور سرد مہری بے حد واضح تھی۔ وہ اس کے مزاج کے موسموں میں چیخ رہا تھا اور جی رہا تھا۔ لیکن اس کی محبت تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، اس نے قبول کر لیا تھا۔

وہ عرصہ عثمان کے لیے بے حد الجھا دینے والا تھا۔ کبھی کبھی یونہی اسے محسوس ہوتا کہ شہناز اس سے نفرت کرتی ہے لیکن یہ محض ایک احساس تھا، جسے کسی ثبوت، کسی دلیل کا سہارا میسر نہیں تھا۔ شہناز کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اس نے کبھی اس سے بدتمیزی سے بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی کبھی انداز سے ایسا کچھ ظاہر کیا تھا پھر بھی کبھی کچھ لمحے ایسے آئے، جن میں عثمان کو واضح طور پر احساس ہوتا کہ وہ اس سے نفرت کر رہی ہے۔

شان کبھی اس پر غور کرتا تو اسے اپنی کوتاہی کا احساس ہونے لگتا۔ کوتاہی کے علاوہ یہ احساس الگ ہوتا کہ شہناز کو پانے کے باوجود بھی وہ بدقسمت ہے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی کی سب سے بڑی خوش بختی شہناز کا حصول تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے باوجود بدقسمتی نے اس کا دامن تھام لیا تھا۔

ازدواجی زندگی کا جو سب سے حسین اور نازک پہلو ہوتا ہے' وہ ابھی تک ادھورا تھا۔ وہ ایسا پیاسا تھا جو صاف شفاف اور شیریں پانی کے دریا کنارے بھی پیاسا کھڑا تھا۔ وہ پانی پیتا.... اتنا پیتا کہ مزید پینے کی گنجائش نہ رہتی لیکن پیاس اپنی جگہ رہتی۔ حلق میں پڑے ہوئے کانٹے اپنی جگہ سرکشیدہ رہتے اور کرب صرف یہی نہیں تھا کہ اس کی پیاس نہیں بجھی' اسے تو دریا کی پیاس کا غم بھی کھائے جارہا تھا۔ پشیمانی کرب پر مستزاد تھی۔

وہ اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا تو اس کی سمجھ میں صرف ایک بات آتی۔ اس کے اور شہناز کے ستارے ہی نہیں ملتے تھے۔ اسے شہناز سے محبت تھی.... بے پایاں محبت' اتنی محبت کہ لفظوں سے' عمل سے اس کا اظہار کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ صرف اسے حقیر کیا جاسکتا تھا۔ بلور کا وہ تاج محل' اظہارِ محبت کرنے والی وہ گھڑی.... یہ اس کے اظہارِ محبت کی کوششیں تھیں۔ اور اب وہ سوچتا تو وہ خود اسے بھی گھٹیا پن لگتا۔ جو کچھ تھا' وہ اسے ظاہر کرنے سے قاصر تھیں۔ بس وہ ایک گھٹیا' بھڑکیلا سا اظہار تھا۔

وہ خود بھی سوچتا تو وہ اسے محبت جتانے کی گھٹیا کوشش لگتی۔

مگر وہ عرصۂ جہالت کی بات تھی.... عرصۂ جہالت کی سوچ تھی۔ شادی سے پہلے وہ ہمیشہ سوچتا رہا تھا کہ شہناز کو کیسے بتائے گا۔ کیسے بتائے گا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ تب اسے یہ دو آئیڈیے سوجھے تھے۔ اس وقت اس کا خیال تھا کہ بات بن جائے گی.... محبوب تک اپنی پوری شدت کے ساتھ نہ سہی' بہرحال پہنچ جائے گی لیکن شادی کی اگلی صبح اسے ان کے حقیر ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اس نے بے بسی سے سوچا کہ دنیا میں کسی بھی زبان میں وہ جملہ کہہ دیا جائے.... میں تم سے محبت کرتا ہوں.... آئی لو یو.... جو انسان روزِ ازل سے اپنے محبوب سے کہتا آرہا ہے اور اس کے باوجود روزِ ازل سے تشنہ ہے تو اس لیے کہ یہ محض ایک بیان ہے' جس میں محبت کی شدت سموئی نہیں جاسکتی۔ اور لہجہ بھی کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لہجے کی رسائی بہت دور تک' بہت اوپر تک ہے لیکن مقامِ محبت تک پہنچنے سے بہت پہلے.... بہت پہلے لہجے کے پر جل جاتے ہوں گے۔

سو وہ محبت میں سرشار مؤثر اظہارِ محبت کی آرزو میں جلتا رہا۔ پھر شادی کے بعد اس کی سمجھ میں بہت کچھ آگیا۔ سمجھانے والا کوئی اور نہیں' اس کی اپنی شدت تھی۔ اب وہ اس کی دسترس میں تھی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر حق دیا تھا تو اس کا کیا کیا جی چاہتا تھا۔ وہ سوچتا کہ کسی طرح شہناز کو مائع میں تبدیل کردے۔ مہکتا' خوش رنگ' آتشی سیال بنائے اور گھونٹ گھونٹ پی جائے۔ وہ سوچتا کہ وہ اس کے لیے آسمان سے اتاری جانے والی بے بدل غذا ہے۔ وہ اسے کھالے.... یہ سب کچھ اس کی شدت اس سے کہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ شادی اللہ تعالیٰ کے بیش بہا تحائف میں سے ایک ہے۔ شادی اظہارِ محبت کے لیے وہ پیرایہ عطا کرتی ہے' جو دنیا کی کسی زبان میں ممکن نہیں۔

یوں اسے مؤثر ترین پیرایۂ اظہار میسر آگیا۔ وہ اس کی قربت میں ہوتا تو اس کے جسم کا رواں رواں' اس کی ہر سانس' دل کی ہر دھڑکن.... غرض کہ اس کا پورا وجود شہناز سے اظہارِ محبت کررہا ہوتا لیکن وہ طمانیت جو اظہار سے مشروط ہوتی ہے' اب بھی اسے میسر نہیں تھی بلکہ شرمندگی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

اب وہ اس پر غور کرتا رہا۔ اس کے سامنے ایک جہانِ معنی کھل گیا۔ اس کی سمجھ میں اور بہت کچھ آنے لگا۔ کیمیاوی عمل میں ہر جگہ مخصوص حالات میں عناصر کی یکجائی کی شرط ہوتی ہے۔ اور محبت بھی کیمیاوی عمل ہے۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن مل جائیں تو پانی بنتا ہے لیکن فضا میں ہائیڈروجن اور آکسیجن ساتھ رہتے ہیں اور پانی نہیں بنتا۔ پانی تو جب بنے گا جب ہائیڈروجن اور آکسیجن مخصوص کیمیاوی حالات میں یکجا ہوں۔

کمی بس یہیں تھی۔ وہ اور شہناز یکجا تھے لیکن مخصوص حالات اور عوامل کی شرط پوری نہیں ہورہی تھی اس لیے اسپارک نہیں ہوتا تھا۔ کمی عمل انگیز کی تھی بلکہ عمل انگیز کی بھی نہیں' عمل انگیز جذبہ تو موجود ہوتا تھا کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔ لیکن عمل انگیز کی موجودگی میں دونوں عناصر یکجا نہیں ہوپاتے تھے۔

اس نے اس سلسلے میں کوشش شروع کردی لیکن بات پھر بھی نہیں بنی۔ وہ اپنی طرف سے ہر قربانی دیتا رہا۔ شہناز کا اشارہ ملتا تو وہ تیار ہوجاتا لیکن وہ محسوس کرتا کہ اس وقت اس کے اندر کوئی کیمیاوی تحرک نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن وہ بے حد رومینٹک موڈ میں تھا۔ اس نے پیش قدمی کی تو شہناز نے اسے روک دیا۔ اس روز اس کے اندر جو وحشت ابھری' اس نے اسے خوف زدہ کردیا۔ وہ نہیں رکنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت منہ زور پہاڑی دریا کے مانند تھا' جو راستے میں پڑی بھاری بھرکم چٹانوں کو ٹھوکریں مارکر' جھاگ اڑاتا آگے ہی آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا' یہ کون ہوتی ہے مجھے میرے حق سے روکنے والی۔ میں نہیں رکوں گا' میں اسے روند ڈالوں گا.... توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔

لیکن عین وقت پر محبت نے مداخلت کرڈالی۔ محبت میں روندا نہیں جاتا.... محبوب کو توڑا پھوڑا نہیں جاتا۔ وہ ہٹ گیا لیکن وہ ضبط کا بہت دشوار مرحلہ تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ دانت ہونٹوں میں گڑے تھے۔ وجود میں عمارتوں کو خس و خاشاک کی طرح

اڑا لے جانے والی آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ طوفان کی سی خاموشی سے پلٹ گیا۔

اس روز ڈپریشن کی حد ہو گئی تھی۔ وہ کبھی حیوانی جذبوں کا آدمی نہیں رہا تھا۔ اس کے مزاج میں لطافت بہت تھی مگر اس روز جو کچھ ہوا' اس نے ثابت کر دیا کہ اس میں حیوانیت بھی چھپی ہے۔ البتہ یہ ہے کہ وہ اس سے بے خبر رہا۔ کیا آدمی یوں خود سے بے خبر بھی رہتا ہے۔ یہ بات ڈرا دینے والی نہیں تھی۔

وہ بہت شرمیلا آدمی تھا۔ اس کی فطرت میں حجاب تھا۔ وہ کسی سے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کر سکا تھا۔ دوستوں کی شادیوں کے موقعوں پر اکثر باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس نے کبھی ان میں دلچسپی نہیں لی تھی لیکن اب وہ وقت آگیا تھا کہ باہر سے مدد لینا اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا ورنہ وہ عمر بھر یہ ڈپریشن پالتا رہتا۔ تباہ ہو کر رہ جاتا۔

دوستوں میں ایک احسان ہی ایسا تھا' جس سے وہ بات کر سکتا تھا۔ وہ بچپن کا بے تکلف دوست تھا لیکن اس سے پہلے عثمان کے نزدیک بے تکلفی کا کبھی یہ مفہوم نہیں رہا تھا کہ نجی نوعیت کی انتہائی ذاتی باتیں بھی کی جا سکتی ہیں مگر اب معاملہ ایسا تھا کہ رہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

سو اس نے احسان کو سب کچھ کہہ سنایا۔ احسان نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی' پھر بولا "یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں..."

"غیر معمولی بات نہیں؟" عثمان نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔ "نہ ہوتی تو میں کبھی تم سے اس سلسلے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔"

"میں جانتا ہوں لیکن تم نے میری پوری بات سنی ہی نہیں" احسان نے کہا "یہ واقعی غیر معمولی بات نہیں.... ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ غیر معمولی بات ہے اتنے تواتر اور تسلسل سے اس کا ہونا۔ اور اس کا کوئی سبب بھی ہوگا۔"

"وہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ لگتا ہے' پاگل ہو جاؤں گا۔"

احسان کچھ دیر سوچتا رہا "کوئی نفسیاتی گرہ ہی ہو سکتی ہے" اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "تم بھابی کا بہت احترام کرتے ہو نا؟"

"محبت کا احترام تو تم سمجھ سکتے ہو۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔"

"اور تمہارے ذہن میں پاکیزگی کا بے حد واضح تصور ہے۔"

"وہ تو ہے۔"

"بات سمجھ میں آگئی۔ تمہارے اندر مزاحمت موجود ہے۔ قربت میں تمہیں یہ خیال رہتا ہے کہ تم اس تعلق کی پاکیزگی کو تباہ کر رہے ہو" احسان نے کہا۔

اب عثمان سوچتا رہا پھر اس نے کہا "ممکن ہے' یہ بات ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس کے بعد اچانک میں اتنا پُرجوش کیوں ہو جاتا ہوں" اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں' یہ بات نہیں ہو سکتی۔ یہ رشتہ' یہ تعلق خود سب سے بڑی پاکیزگی ہے۔ اگر میرے ذہن میں یہ خیال ہوتا تو میں کبھی اس کے قریب جاتا ہی نہیں۔"

"قریب جانے کی خواہش تو فطری ہے" احسان نے اس کا اعتراض رد کر دیا "اور تم کہتے ہو کہ بھابی بھی پیش قدمی کرتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بالکل نارمل ہیں۔ ان کا ارادہ وقتی ہوتا ہے' مستقل نہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں وہ قصوروار نہیں۔"

"اتفاق ہے کہ جب میں ایگزاسٹ ہوں' تھکا ہوا اور پژمردہ ہوں یا کسی وجہ سے ڈپریس ہوں تو اسے قربت کی سوجھتی ہے؟" عثمان نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے یہ موضوع چھیڑا ہی کیوں؟

"اور وہ بھی یہی بات سوچتی ہوں گی؟"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ تمہیں بھی ایسے ہی وقت میں قربت کی سوجھتی ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے" عثمان نے جوش سے کہا "وہ یہ بات کئی بار کہہ بھی چکی ہے۔"

"بس تو تمہیں خود کو ٹٹولنا چاہیے" احسان نے ناصحانہ لہجے میں کہا "آسودگی درحقیقت اندر کی چیز ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی اندر سے ناآسودہ ہو.... اندر کوئی رکاوٹ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بس اندر کی اس رکاوٹ کو تلاش کر کے دور کر لو۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"لیکن میرے اندر کوئی رکاوٹ نہیں" عثمان نے بے بسی سے کہا "میں جس شدت کے ساتھ اس کی طلب کرتا ہوں' تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"آدمی کو اپنے لاشعور کی خبر ہو تو اسے لاشعور کہا ہی کیوں جائے" احسان نے فلسفیانہ لہجے میں کہا "پھر تو وہ شعور ہو گیا نا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے لاشعور سے آگہی حاصل کرو۔"

عثمان نے اس مشورے پر بڑے خلوص سے عمل کیا۔ اس نے خود کو ٹٹولا.... بلکہ کھنگال ڈالا لیکن کوئی رکاوٹ نہیں ملی۔ اس نے جھنجلا کر سوچا کہ یہ رکاوٹ دوسرے فریق کے ہاں بھی تو ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے' شہناز کے لاشعور میں کوئی نفسیاتی گرہ ہو۔ اس نے سوچا ضرور لیکن شہناز سے یہ ثقیل گفتگو کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔

پھر وہ پورا معاملہ پس منظر میں چلا گیا۔ اہمیت صرف اس بات کی رہ گئی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ وہ بہت بڑی خبر تھی اس کے لیے۔ شہناز کے لیے اس کی محبت سوگنا بڑھ گئی۔ تشنگی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ اظہار کی حاجت بھی ختم ہو گئی اور کیا چاہیے؟ اظہار تو اس نے کر دیا تھا.... اور اسے جواب بھی مل گیا تھا۔

اسے صرف ایک ہی فکر رہ گئی۔ شہناز کی اور اپنے بچے کی

بہتری کی فکر۔ وہ ڈاکٹر سے ملا اور اس کی ہدایات ذہن نشین کرلیں پھر وہ ان پر عمل کرنے میں لگ گیا۔ شہناز کوئی کام کرتی تو وہ اسے روکتا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی تو وہ چیخ اٹھتا۔ وہ اس کی غذا کا خیال رکھتا۔ اس کے لیے پریشان ہوتا جیسے وہ شوہر نہیں' اس کی ماں ہو۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ رسم کے مطابق پہلی زچگی کے لیے لڑکیاں میکے جاتی ہیں۔ فہمیدہ بیگم شہناز کو لینے کے لیے آئیں تو وہ متوحش ہوگیا "آنٹی..... آپ یقین کریں' میں شہناز کا اتنا خیال رکھتا ہوں۔ آپ پوچھ لیں....."

فہمیدہ بیگم ہنسنے لگیں "وہ تو میں جانتی ہوں بیٹے۔ لیکن یہ رسم ہے ہمارے ہاں کی۔ یہ تمہاری امانت تمہاری اجازت سے لے کر جارہی ہوں میں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آنٹی لیکن....."

"لیکن ویکن کی اس میں گنجائش نہیں" فہمیدہ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی "اچھا ہے' یوں تمہیں سزا بھی مل جائے گی۔"

"سزا؟ کس بات کی سزا؟" اس نے آنٹی کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔

"شادی کے بعد تم ہمارے گھر کا رستہ ہی بھول گئے۔ یہ یاد ہی نہیں رہا تمہیں کہ تمہارا ایک گھر اور بھی ہے۔"

عثمان شرمندہ ہوگیا۔ اسے احساس ہوا کہ واقعی اس سے یہ کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔ اسے حیرت ہونے لگی۔ اتنے عرصے میں شہناز نے کبھی ایک بار بھی اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ اسے گھر لے کر چلے۔ اتنے عرصے میں وہ صرف چار پانچ بار گھر گئے تھے۔

اس کے ساتھ ہی اسے ایک خوش آئند خیال آیا۔ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ہر لڑکی میکے جانے کی ضد کرتی ہے۔ وہی لڑکیاں میکے جانے کا نام نہیں لیتیں' جن کا سسرال میں دل لگ جائے۔ بلکہ جو اپنے شوہر سے اس درجہ محبت کرتی ہوں کہ ان کا ایک پل کے لیے بھی نظروں سے اوجھل ہونا انہیں گوارا نہ ہو۔

یہ دلیل محبت اتنی خوش کن تھی کہ اسے جدائی کا ملال بھی نہیں ہوا۔ فہمیدہ آنٹی کو اسے ساتھ لے جانے سے تو وہ ویسے بھی نہیں روک سکتا تھا۔

"اب تو تم ہر روز ہمارے گھر آؤ گے نا؟" رخصت ہوتے ہوئے فہمیدہ آنٹی نے اس سے پوچھا۔

"آنٹی..... یقین کریں میں شرمندہ ہوں۔ اب تلافی کردوں گا۔" اس نے جواب دیا۔

○☆○

یہ انکشاف کہ وہ ماں بننے والی ہے' شہناز کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ وہ اور عثمان کے بچے کو اپنی کوکھ میں پالے۔ عثمان' جس سے اسے شدید نفرت تھی۔ جس کی زندگی کو اس نے بڑی کامیابی سے نشانِ اذیت بنادیا تھا۔ وہ اس سے یوں ہار جائے گی۔

بدقسمتی یہ ہوئی کہ اسے اس بات کا اندازہ کافی دیر سے ہوا۔

لیڈی ڈاکٹر سے اس نے بات کی تو وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"مسز عثمان' یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں اتنی جلدی ماں نہیں بننا چاہتی۔"

"لیکن یہ آپ کا پہلا بچہ ہے" ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ابھی میں زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی سے یہ ذمے داری اٹھانا مجھے پسند نہیں۔"

"آپ جیسے بڑے لوگ تو دس بچوں کے باوجود بھی زندگی انجوائے کرسکتے ہیں۔ آپ تو اپنی ذمے داری معقول تنخواہ پر کسی کو بھی سونپ سکتی ہیں۔"

ڈاکٹر کے لہجے میں اسے خفیف سا طنز محسوس ہوا لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی "کچھ بھی ہو' مجھے یہ قبول نہیں' کچھ کرو ڈاکٹر۔"

"سوری مسز عثمان۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ بات بہت آگے جاچکی ہے۔"

"ہو کیسے نہیں سکتا...؟"

"آپ ڈاکٹر ہوتیں تو سمجھ سکتی تھیں' یہ آپ کا پہلا موقع ہے۔ آپ کی صحت اور جسمانی کیفیت میرے سامنے ہے۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ یہ کام تو ہوجائے گا لیکن آپ کی زندگی کی ضمانت میں نہیں دے سکتی۔ پچاس فی صد سے زیادہ امکان یہ ہے کہ آپ نہیں بچ سکیں گی۔"

شہناز کا چہرہ فق ہوگیا۔ زندگی سے اسے بے اندازہ محبت تھی۔ یہ رسک وہ لے ہی نہیں سکتی تھی مگر یہ تصور ہی اس کے لیے روح فرسا تھا کہ وہ عثمان کے بچے کو جنم دے گی۔ بہرکیف اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تن بہ تقدیر ہوگئی لیکن عثمان سے اس کی نفرت بہت بڑھ گئی۔

ایک اچھی تبدیلی بھی ہوئی۔ عثمان کے جسمانی تقاضوں سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ وہ جس بچے کے تصور سے ناخوش تھی' عثمان اسی کے تصور میں سرشار تھا۔ لگتا تھا' اسے اب اس کی کوئی پروا نہیں رہی ہے۔ چند روز تو وہ خوش رہی پھر اسے احساس ہوا کہ اس تبدیلی کے نتیجے میں اذیت کا وہ کھیل ہی موقوف ہوگیا ہے' جس کی خاطر اس نے عثمان سے شادی گوارا کی تھی۔ چنانچہ اس نے خود تقاضے شروع کردیے۔

مگر کچھ ہی دن بعد وہ اس کھیل سے دستبردار ہوگئی۔ اس کے مطلوبہ نتائج نکل ہی نہیں رہے تھے۔ بچے کی خوشی میں عثمان راضی بہ رضا ہوگیا تھا۔ وہ یوں سراپا تسلیم ہوا تھا کہ اسے کچھ بھی برا نہیں لگتا تھا۔

شہناز کا ڈپریشن بڑھتا گیا۔ تمام وقت اس کے اندر ایک ہی جملہ تڑپتا مچلتا رہتا تھا..... آئی ہیٹ یو۔ اس کی شدت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ پھر اس کا ہدف بھی ایک نہیں رہا تھا' دو ہوگئے

تھے۔ وہ پیٹ میں پلنے والے بچے سے بھی یہی کہتی رہتی تھی.... آئی ہیٹ یو۔ مجھے نفرت ہے تم سے۔

لیکن پھر وہ بچے کی احسان مند ہو گئی۔ اس کی وجہ سے تو امی اسے لینے کے لیے آئی تھیں۔ اسے قید سے رہائی مل رہی تھی۔ اب جبکہ اس کے مقاصد پورے نہیں ہو رہے تھے تو عثمان کے ساتھ رہنا اسے قید سخت معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کا.... نہیں' عثمان کا بچہ اسے رہائی دلا رہا تھا۔

وہ امی کے ہاں چلی گئی۔ عثمان ہر شام اس سے ملنے آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتا۔ وہ بے دلی سے قبول کر لیتی۔ عثمان ہمیشہ رات کا کھانا کھا کر واپس جاتا تھا۔ ممی اور پاپا کے اصرار کے باوجود اس نے رات کو رکنا بھی گوارا نہیں کیا' یہ بھی اچھا ہی تھا ورنہ وہ اس کے کمرے میں ہی سوتا۔ ممی نے اس کے لیے وہی کمرا ٹھیک کروا دیا تھا' جس میں وہ پہلے رہا کرتی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اب اس میں ڈبل بیڈ ڈلوا دیا گیا تھا۔

وہ خوش تھی کہ چلو منافقت سے کچھ عرصے کے لیے نجات مل گئی لیکن عجیب بات تھی۔ سوتے وقت وہ بیڈ کے عقب کی طرف بائیں جانب نگاہ ضرور کرتی اور کئی بار کرتی۔ اس کا دل عجیب طرح دھڑکتا۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرتی لیکن بات کئی دن بعد اس کی سمجھ میں آئی۔ شاید اس لیے کہ وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی اور غیر ارادی طور پر اٹھنے والی نظروں پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

اسے امی کے ہاں رہتے بیس دن سے زیادہ ہو چکے تھے کہ اس کی سمجھ میں آیا کہ رات کو سوتے وقت اور صبح اٹھتے وقت وہ کیا دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی نظریں کس چیز کی جستجو کرتی ہیں۔ وہ اس تاج محل کو مس کر رہی تھی' جو اس کی خواب گاہ کی زینت تھا۔ اس احساس نے اس کے ذہن میں کئی سوال اٹھائے.... نازک سوال۔ وہ اس چیز کو کیوں مس کر رہی ہے' جسے عثمان نے اپنی محبت کی علامت قرار دیا تھا؟ اس کے ذہن نے فوراً جواب دیا.... اس لیے کہ اس کے نزدیک وہ عثمان کی حماقت کی علامت ہے۔ وہ اسے یاد دلاتا ہے کہ عثمان کتنا احمق ہے۔ وہ اسے یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ وہ کس ارادے سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی ہے۔ شاید وہ اسے اس لیے بھی مس کرتی ہے کہ اب کیونکہ وہ عثمان کے ساتھ نہیں رہ رہی ہے تو وہ کہیں یہ بات بھول نہ جائے۔

کیا وہ گھر کو بھی مس کر رہی ہے.... اپنے گھر کو؟ یہ سوال بھی چونکا دینے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ذہن کوئی جواب دیتا' اس کے اندر بے ساختہ جواب ابھرا.... اور اثبات میں ابھرا۔ ذہن نے فوراً صورت حال کی نزاکت کو بھانپ کر اس کی توجیہہ کی۔ یہی کہ وہ یاد رکھنا چاہتی ہے کہ اسے عثمان سے کس قدر نفرت ہے۔

لیکن ذہن کی مداخلت سے پہلے ہی ایک شک سر اٹھا چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی' کہیں اسے عثمان سے محبت تو نہیں ہوتی جا رہی ہے۔ اس سوال پر اس کا اپنا ردعمل بے حد شدید تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جو کچھ اس نے اس کے اور مشکور کے ساتھ کیا ہے' اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اس سے تو اس کا نفرت کا رشتہ ہے۔

پھر بھی وہ اس معاملے میں جذباتی تردید نہیں چاہتی تھی۔ اس نے معقولیت کے ساتھ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عثمان بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اس کی محبت کے معاملے میں بے اصولی سے قطع نظر اپنے ہر عمل سے وہ اچھا انسان ثابت ہوتا تھا۔ وہ نرم خو' نرم مزاج' نرم گفتار اور محبت کرنے والا تھا۔ بس اس میں مردانگی کی کمی تھی۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اگر اس کے دل میں عثمان کی نفرت نے پہلے ہی پنجے نہ گاڑ دیے ہوتے تو وہ اس کا دل جیت لیتا۔ وہ اس سے محبت پر مجبور ہو جاتی لیکن اب یہ ممکن نہیں' قیامت تک نہیں۔

کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ تم سچ بول رہی ہو؟ اس کے اندر سے کسی نے پوچھا۔

ہاں.... سو فی صد یقین ہے۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ اس نفرت کی ہی خاطر میں اسے مس کرتی ہوں۔ میں اس گھر کو مس کرتی ہوں کیونکہ وہیں میں اس سے اس کی کمینگی کا انتقام لے سکتی ہوں۔ میں اس تاج محل کو یاد کرتی ہوں کیونکہ وہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ وہ کس طرح میرے بس میں ہے.... میری مٹھی میں ہے۔

تقریباً ایک ماہ بعد وہ سو کر اٹھی تو متوحش تھی۔ اس نے اپنی کلائی ٹٹولی۔ وہ گھڑی کہاں گئی.... عثمان کی آواز میں آئی لو یو کہنے والی۔ اسے یاد آیا کہ وہ تو بہت دن پہلے اس نے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی تھی۔ مجھے وہ گھڑی چاہیے۔ میں یاد رکھنا چاہتی ہوں کہ میرا اسیر رہا نہیں ہوا ہے۔ سزا پوری ہوئے بغیر وہ رہا نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس کی اسیری کا مکمل یقین چاہیے۔

اس رات گھر جانے سے پہلے عثمان نے معمول کے مطابق اس سے پوچھا "کچھ منگوانا تو نہیں ہے؟"

"میری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رسٹ واچ رکھی ہے۔ وہ لیتے آیئے گا" اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اس سوال کے جواب میں کوئی فرمائش کی تھی۔

"کون سی رسٹ واچ؟"

"وہی منہ دکھائی والی۔"

عثمان بے حد خوش نظر آنے لگا۔ سوچ رہا ہوگا کہ وہ اس کی محبت کو مس کر رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔

○☆○

وہ بہت خوب صورت لمحہ تھا' جب عثمان نے اپنے پہلے نومولود کو گود میں لے کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور اسے اس میں اپنی جھلک نظر آئی۔ وہ سانس لیتے اس ننھے منے معجزے کو سحر زدہ سا دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ابو زندہ ہوتے تو کیسے خوش

ہوتے۔ یہ ان کی کتنی بڑی آرزو تھی۔ اس نے پوری نہیں ہونے دی۔
"کیا نام رکھو گے اس کا؟" نجم الحسن نے اس سے پوچھا۔
"نعمان" اس نے بے ساختہ کہا "پیار سے اسے نومی کہیں گے ہم۔"
"بہت خوب صورت نام ہے" اللہ مبارک کرے۔"
وہ سب خوش تھے۔ نجم انکل، فہمیدہ آنٹی، محمود، مسعود اور وہ خود۔ خوشیاں دونوں گھروں پر ٹوٹ کر برس رہی تھیں لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ شہناز خوش نہیں ہے۔ اس نے شہناز سے یہ بات پوچھ ہی لی "میں اتنی جلدی یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی" وہ بولی "ابھی تو ہمارے محبت کرنے کے دن تھے۔"
عثمان سرشار ہو گیا۔ کتنی محبت کرتی ہے وہ اس سے "یہ تو محبت بڑھائے گا" اس نے فخر سے نعمان کو دیکھتے ہوئے کہا "یہ کوئی محبت کم تو نہیں کرے گا۔"
"اور پھر مجھے بیٹی کی خواہش تھی" شہناز نے رکھائی سے کہا۔
"یہ تو اللہ کی نعمت ہے۔ جو اس نے دیا، بہت اچھا دیا۔"
لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس شدید ہوتا گیا کہ شہناز کو بیٹے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کچھ یہ بھی تھا کہ بچوں کے معاملے میں وہ پھوہڑ تھی۔ اس نے کبھی کسی بچے کو گود میں نہیں لیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بچے کتنے نازک ہوتے ہیں۔ اس کی گرفت سخت ہوتی۔ بچہ رونے لگتا۔ وہ اس کا کوئی کام نرمی سے نہیں کر سکتی تھی۔
ایک بات عثمان کو بہت ناپسند ہوئی۔ شہناز نے کبھی نعمان کو دودھ نہیں پلایا۔ اس نے ٹوکا تو وہ بولی "میں کمزور بہت ہوں۔ ڈاکٹر نے منع کیا تھا اسی لیے ابتدا ہی میں فیڈر سے دودھ دیا گیا۔ بعد میں مشکل ہوتی۔"
عثمان نے کچھ کہا تو نہیں لیکن اسے افسوس بے حد ہوا۔ ایسا بچہ جو مقدر میں دنیا کی ہر نعمت لے کر آیا تھا، ایک قدرتی نعمت سے محروم کر دیا گیا۔ کتنی بڑی محرومی ہے یہ؟
پھر ایک دن شہناز نے اس سے کہا "نعمان کے لیے آیا کا بندوبست کرلیں۔"
"وہ کیوں؟" عثمان نے بھویں اچکائیں۔
"کیوں کی کیا بات ہے؟" شہناز نے تنک کر کہا "سب گھروں میں یہی ہوتا ہے۔ میں اس کی اس طرح نگہداشت نہیں کر سکتی، جیسے ہونی چاہیے۔"
"تمہاری یہ بات غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ زیادہ تر گھروں میں یہ نہیں ہوتا۔"
"میں ان لوگوں کی بات نہیں کر رہی، جو آیا افورڈ نہیں کر سکتے۔"
"میں افورڈ کر سکتا ہوں لیکن اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ ماں باپ کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ وہ بچے خود اعتمادی سے کبھی محروم نہیں ہوتے، جنہیں ماں باپ کا بھرپور لمس اور ان کی محبت ملی ہو۔ جن کے چھوٹے چھوٹے کام ماں باپ کرتے رہے ہوں۔"
شہناز خاموش ہو گئی۔ اس نے اصرار نہیں کیا لیکن چند روز میں ہی عثمان کو احساس ہو گیا کہ یہ کام اسے کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے ایک بے حد خوب صورت آیا رکھ لی۔
بچہ بڑا ہونے لگا۔ شہناز اس سے بالکل ہی بے تعلق ہو گئی تھی۔ عثمان نے اسے اپنی ذمے داری بنا لیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے تمام کام اس نے آیا سے سیکھ لیے۔ اب وہ اس کی نیپی بھی بدل سکتا تھا، اس کے لیے دودھ بھی بنا سکتا تھا۔ وہ دفتر سے جلدی گھر آنے لگا۔ شام کو وہ گھنٹوں اس سے کھیلتا، اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ اسے باہر ٹہلانے کے لئے نکل جاتا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بچہ بہت ذہین ہے۔ وہ وقت تک پہچانتا تھا۔ کسی روز اسے دیر ہوتی تو وہ دیکھتا کہ نومی دروازے پر نگاہیں لگائے بیٹھا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ خوشی سے قلقاریاں مارتا۔
"آیا آپ نے کس لیے رکھی ہے آخر؟" ایک روز شہناز نے غصے سے کہا "یہ رات کو اسے کیوں نہیں سلاتی اپنے پاس؟"
"اس نے کب انکار کیا ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا" عثمان نے جواب دیا "یہ ہمارے ساتھ ہی سوئے گا، تمہیں اس میں اعتراض کیا ہے؟"
"یہ بے بی کاٹ کس لیے ہے؟ اور آیا کس لیے ہے؟"
"اور یہ ماں باپ کس لیے ہیں۔ تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں اس میں اعتراض کیا ہے؟" عثمان نے نرم لہجے میں کہا۔
"رات کو کئی بار اٹھتا ہے۔"
"تو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں تو کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے سارے کام تو میں کرتا ہوں۔"
"روتا بھی بہت ہے۔ میری نیند خراب ہوتی ہے۔"
"کوئی بات نہیں۔ میں اسے لے کر دوسرے کمرے میں سو جایا کروں گا" عثمان نے بڑے تحمل سے کہا۔
"میں اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ الگ رہنے والے بچوں کا ڈر نکل جاتا ہے" شہناز نے پینترا بدلا۔
"میرا نظریہ مختلف ہے۔ جن بچوں کے پاس ماں باپ کے جسموں کی گرمی ہو، اوّل تو وہ ڈرتے نہیں اور ڈریں تو ماں باپ سے لپٹ کر خوف سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔"
"جو جی چاہے کریں لیکن میری نیند خراب نہ کریں۔"
پھر ان کی شادی کی پہلی سالگرہ آ گئی۔ وہ دفتر گیا تو شہناز سو رہی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت خوب صورت تحفہ لے کر گھر آیا تو اس کا دل خوش ہو گیا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ شہناز کو اپنا سہاگ رات کا وعدہ یاد ہوگا۔ وہ وعدہ تو وہ خود بھی بھول چکا تھا۔
شہناز دلہن بنی ہوئی تھی۔ اس نے سہاگ کا وہی جوڑا اور

وہی زیورات پہن رکھے تھے، جو سہاگ رات میں اس کی آمد سے پہلے اس نے اتار پھینکے تھے۔

عثمان کی شکر گزاری کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس رات تین ماہ کا نعمان اپنی آپا کے پاس سویا۔

○☆○

شہناز کو اپنی کوکھ میں پلنے والے اس وجود سے ویسے ہی نفرت تھی کہ وہ زبردستی اس پر تھوپ دیا گیا تھا، ستم بالائے ستم یہ کہ وہ لڑکا تھا اور ہو بہو عثمان کی تصویر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اسے کب تک اور کیسے برداشت کرے گی۔

وہ نعمان کو دیکھتی تو اس کا خون کھول اٹھتا۔ اسے احساس ہوتا کہ اس کے جسم سے زبردستی خون، ہڈیاں اور گوشت چھین کر اس بچے کو تخلیق کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ مکمل نہیں رہی ہے۔ وہ کم ہو گئی ہے۔۔۔ گھٹ گئی ہے "یاد رکھنا عثمان حفیظ" وہ بڑبڑاتی "تم آئندہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکو گے۔ یہ میرا تم سے بھی وعدہ ہے اور خود سے بھی۔"

ننھا نعمان باپ کی شفقت اور محبت اور آپا کی نگہداشت کے سائے میں دن گزارتا اور بڑھتا رہا پھر اس نے مما کہنا سیکھ لیا۔ لیکن مما نے اسے گود میں لینا نہیں سیکھا۔ چھوٹا سا بچہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ نفرت کیا ہوتی ہے مگر مما کی بے نیازی اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔

شہناز کے لیے وہ بچہ گویا ہو کر بھی نہیں تھا۔ اسے اس کی پروا ہی نہیں ہوتی تھی لیکن خون کے رشتوں کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے۔ کبھی اسے نعمان پر بے ساختہ پیار آتا۔ وہ اسے گود میں اٹھا لیتی اور اس کے چہرے کو بوسوں سے بھگو دیتی۔ اس وقت جیسے اس کے چہرے کے نقوش اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتے تھے۔ ایسے میں وہ حیران ہوتی کہ ماتا جیسے طاقت ور ترین جذبے کو اس نے کیسے قابو میں کر لیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کہا جاسکتا ہے، نفرت محبت کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور جذبہ ہے لیکن کیا نفرت اتنا طاقت ور جذبہ ہے کہ ماتا جیسے عظیم جذبے پر حاوی ہو جائے؟ یہ خیال اکثر اسے الجھن میں مبتلا کر دیتا اور اس کے ساتھ ہی نعمان کے چہرے کے نقوش اس کے سامنے اجاگر ہونے لگتے۔ اس کے چہرے میں اسے عثمان کا عکس دکھائی دیتا اور وہ اسے پٹخ دیتی۔ ننھا بچہ معصومیت میں لپٹی حیرت سے اسے تکتا رہتا۔

اس نے کتابوں میں پڑھا تھا اور نچلے اور متوسط طبقے کے گھروں میں دیکھا بھی تھا کہ لڑکیاں ان شوہروں کے ساتھ پوری عمر گزار دیتی ہیں، جن سے انہیں شدید نفرت ہوتی ہے۔۔۔ جو بجا طور پر نفرت کے لائق بھی ہوتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ رہتی ہیں اور بچے پیدا کرتی رہتی ہیں۔ وہ ان سے نفرت کرتی ہیں لیکن ان کے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اس لیے کہ وہ ان کے بھی ہوتے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کے پاس باپ کا ناپسندیدہ حوالہ تو ہوتا ہے جو کبھی کبھار نفرت بھرے انداز میں استعمال ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر ماتا نفرت پر حاوی آجاتی ہے۔ عورت کہتی ہے کہ وہ انسان کے بچے نہیں، سنپولیے پال رہی ہے۔ پھر بھی وہ انہیں پالتی رہتی ہے۔ یہ طاقت ہوتی ہے ماتا میں۔

"ہاں۔۔۔ یہ بات طے ہے۔" اس کے اندر سے ایک آواز ابھری "پگھلی ہوئی محبت نفرت سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ وہ ماتا پر بھی غالب آسکتی ہے۔"

محبت! پگھلی ہوئی محبت! شہناز استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ محبت ہوئی ہوتی تو اسے پگھلنا بھی پڑتا۔ یہاں تو محبت کبھی تھی ہی نہیں۔ اور نفرت ازلی ہے۔

اس کے اندر کوئی اس سے زیادہ زور سے، اس سے زیادہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ اس نے اس آواز کو نظرانداز کر دیا۔ دیوانوں سے بھلا کوئی لڑ سکتا ہے؟

○☆○

ثوبیہ کی پیدائش نعمان کے سوا دو سال بعد ہوئی۔ عثمان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ کمال یہ ہوا کہ اس بار شہناز بھی خوش تھی۔ نعمان کو تو اس نے ابھی تک قبول نہیں کیا تھا اور عثمان جانتا تھا کہ اب کبھی ایسا نہیں ہو سکے گا مگر ثوبیہ خوش نصیب تھی کہ اسے ماں کا دودھ بھی میسر آیا اور ماں بھی ملی۔

اس عرصے میں ننھا نعمان باپ کو ماں کا درجہ بھی دے چکا تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والا بچہ تھا۔ اس سلوک کے باوجود بھی وہ ماں سے محبت کرتا تھا۔ کبھی وہ چند لمحوں کے لیے اس پر مہربان ہو جاتی تو وہ ماں پر واری صدقے ہونے لگتا۔ اپنے سارے کھلونے لا کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیتا لیکن اس کے لیے باپ کی تو حیثیت ہی کچھ اور تھی۔ وہ اس کا سب کچھ تھا۔ اس کی پوری کائنات ہی باپ کا وجود تھا۔ عثمان گھر میں موجود ہوتا تو وہ اپنا کوئی کام آپا کو نہ کرنے دیتا۔

"پوٹی پاپا سے دھلواؤں گا۔"

"پاپا۔۔۔ مجھے دودھ لا کر دیں۔"

"کھانا پاپا کے ہاتھ سے کھاؤں گا۔"

"پاپا کے ساتھ کھیلوں گا۔"

اور عثمان کبھی اس کے کسی کام سے انکار بھی نہیں کرتا تھا۔ جب فرصت ہوتی، وہ خود اسے نہلاتا۔ نعمان کے لیے وہ لمحے بے حد مسرت خیز ہوتے، جب وہ اور پاپا باتھ روم میں شاور کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ نہاتے۔ عثمان اس کے جسم کی مالش کرتا۔ سر میں تیل لگاتا، پھر دونوں لان پر دوڑیں لگاتے۔

کبھی کبھی شہناز عثمان سے کہتی "آپ لاڈ پیار میں اسے بگاڑ رہے ہیں۔"

"لاڈ پیار!" عثمان حیرت سے کہتا "میں تو بس خانہ پری کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ خانہ جو تم نے خالی چھوڑ دیا ہے۔"

"چھوٹی باتوں کو بڑا بنانے میں تو آپ کو کمال حاصل ہے۔"

اور عثمان اسے عجیب نظروں سے دیکھتا رہ جاتا۔ شہناز کی محبت اس کے دل میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے پہلے ایک بیٹے اور بیٹی کا تحفہ دے کر اسے نہال کردیا تھا۔ ان کے ازدواجی تعلق کا اب بھی وہی حال تھا لیکن اب عثمان کو کوئی پروا نہیں تھی۔ بچے اس کے لیے وسیلۂ اظہار بن گئے تھے۔ ازدواجی زندگی کی خلوتیں معطل ہوگئی تھیں۔ کبھی کبھی اسے بڑی شدت سے کمی محسوس ہوتی لیکن وہ صبر کرلیتا۔ ہمارے ستارے شاید بچوں ہی کی حد تک ملتے تھے' وہ سوچتا....

اس بار اس نے تجویز پیش کی کہ ثوبیہ کو آیا کے پاس سلایا جائے۔ شہناز بھڑک گئی۔ دلیلیں الٹ گئی تھیں۔ جو دلیلیں شہناز نے نعمان کے معاملے میں دی تھیں' وہ اب عثمان دے رہا تھا۔ اور شہناز وہی جوابی دلیلیں دے رہی تھی' جو کبھی عثمان نے دی تھیں۔

"بس تو ہم سب ساتھ سویا کریں گے" عثمان نے کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بیڈ بہت چھوٹا ہے" شہناز نے اعتراض کیا۔

"بیڈ کی فکر مت کرو۔ میں بہت بڑا بیڈ بنوالوں گا۔"

شہناز کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ اذیت کا کھیل پھر سے شروع کرنا چاہتا تھا۔ قربت ہوگی تو شعلہ بھڑکے گا۔ شعلہ بھڑکے گا تو آگ لگے گی۔ اور آگ کو بھڑک کر جل بجھنے کا موقع نہیں ملے گا تو جسم سلگتا رہے گا' نہ جلے گا نہ بجھے گا۔

عثمان نے بہت بڑا بیڈ بنوالیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کیسے سویا جائے۔ عثمان چاہتا تھا کہ وہ دونوں کناروں پر سوئیں اور بچے درمیان میں۔ شہناز کو اعتراض تھا کہ نعمان سوتے میں لاتیں بہت چلاتا ہے۔ ثوبیہ کے لیے خطرناک ہوگا۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ ثوبیہ ماں اور باپ کے درمیان سوئے گی اور نعمان باپ کے برابر کنارے پر۔

کھیل پھر سے شروع ہوگیا۔ وہی خواہش' گریز اور اذیت کا کھیل۔ لیکن اس بار اذیت پہلے جیسی پُراثر نہیں تھی۔

ننھا نعمان بہن سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کے قریب رہتا' اس سے کھیلنا چاہتا تھا۔ عثمان گھر میں ہوتا تو دیکھتا کہ شہناز نعمان کو کبھی ثوبیہ کے قریب نہیں ہونے دیتی۔ وہ جب بھی ثوبیہ کے قریب جاتا' شہناز اسے جھڑک کر ہٹادیتی۔

"یہ کیا کرتی ہو تم؟" ایک دن عثمان نے چڑ کر کہا "بھائی بہن کے درمیان نہیں آیا کرو۔"

"آپ نہیں سمجھتے' بچے تو معصوم ہوتے ہیں نا۔ خیال تو بڑوں کو رکھنا پڑتا ہے۔" شہناز نے بے حد رسان سے کہا "کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کھیل ہی کھیل میں نعمان ثوبیہ کے سینے پر چڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ تو میں وقت پر پہنچ گئی ورنہ خدانخواستہ...."

"واقعی؟ یہ خیال تو رکھنا پڑے گا۔"

ثوبیہ بھی بڑی ہوتی جارہی تھی' وہ گھٹنوں چلنے لگی۔ ٹوٹی پھوٹی باتیں کرنے لگی۔ پھر ڈگمگاتے قدموں سے چلنے بھی لگی۔ لیکن شہناز کی احتیاط پسندی کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی ہی گئی۔ نعمان ثوبیہ کو بہت چاہتا تھا۔ باپ کو بیٹی ویسے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ وہ ثوبیہ اور نعمان کے لیے اپنی محبت کا موازنہ کرتا تو اسے ثوبیہ کا پلہ جھکتا نظر آتا مگر محبت کا عملی اظہار وہ نعمان کے معاملے میں زیادہ کرتا تھا اس لیے کہ نعمان کی ضرورت بڑی تھی۔ وہ ایک طرف سے محروم جو تھا۔ ثوبیہ خوش نصیب تھی۔ اسے کوئی خانہ خالی نہیں ملا تھا۔

دونوں بچے قدرتی طور پر ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ لیکن شہناز اب بھی دونوں کے درمیان دیوار بنی رہتی تھی۔ عثمان نے اس کا حل بھی نکال لیا۔ وہ شام کو جلدی گھر آتا اور دونوں بچوں کو ساتھ لے کر لان میں چلا جاتا۔ وہ دن بھر کے ترسے ہوئے آپس میں کھیلتے رہتے۔ وہ بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ یہ دیکھ کر کہ نعمان ثوبیہ کا کتنا خیال رکھتا ہے اور اس کی خاطر ہر ایثار کے لیے تیار رہتا ہے' اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

سورج غروب ہوتا تو وہ انہیں گھر میں لے آتا۔ وہ اس کے سامنے کھیلتے رہتے۔ یہاں تک کہ سوجاتے۔

ایک دن نعمان نے اس سے کہا "پاپا.... آپ ہر روز دفتر کیوں جاتے ہیں؟"

عثمان حیران رہ گیا۔ اتنے سادہ اور آسان سوال کا کسی چھوٹے سے بچے کو کیا جواب دیا جاسکتا ہے "بیٹے.... آپ کے لیے پیسے جو کمانے ہوتے ہیں" اس نے کہا۔

"لیکن پاپا' مجھے تو پیسے نہیں چاہئیں۔"

عثمان تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ "بیٹے ایک بات بتاؤ۔ یہ اپنا گھر تمہیں اچھا لگتا ہے.... اور یہ گھر کی ساری چیزیں اور تمہارے کھلونے؟"

"جی پاپا!"

"تو بیٹے' میں ہر روز دفتر نہ جاؤں تو یہ سب کچھ چھن جائے گا اس لیے میں روز دفتر جاتا ہوں۔"

ساڑھے چار سال کا بچہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے بڑوں کے سے انداز میں کہا "یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا پاپا!"

عثمان کو اس پر پیار آگیا "مجھے بتاؤ تو کہ مسئلہ کیا ہے۔ مسئلہ ہے تو اس کا حل بھی ہوگا۔"

"بات یہ ہے پاپا کہ آپ آفس نہ جائیں تو میں اور ثوبیہ دن بھر ساتھ کھیل سکتے ہیں۔"

عثمان سوچنے لگا۔ اس نے پچھلے سال نومی کو اسکول میں داخلہ دلایا تھا اور اب چھٹیاں تھیں "تو مسئلہ حل ہوگیا" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "ہم دفتر سے پندرہ دن کی چھٹیاں لیں گے اور تمہیں پورا پاکستان دکھائیں گے۔ خوب کھیلنا تم۔"

نومی اس سے لپٹ گیا "پاپا.... آپ بہت اچھے ہیں' آئی لو یو"

اس نے اس کے رخسار کو چوم لیا "آئی لو یو پاپا!"
"بس ہم کل ہی چلیں گے۔"

O☆O

شہناز محسوس کر رہی تھی کہ کھیل ختم ہوتا جا رہا ہے! عثمان دونوں بچوں میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ کبھی اس کی طلب نہیں کرتا تھا۔ اسے شاید اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ کم از کم لگتا تو یہی تھا۔ اور یہ بہت بڑی ناکامی تھی۔ وہ تو جلنے اور تڑپنے کے بجائے پُرسکون ہو گیا تھا۔

شہناز متوحش ہو گئی۔ یہ تو سب رائگاں جا رہا تھا۔ عمر ہی رائگاں جا رہی تھی۔ اس نے یہ تو نہیں سوچا تھا۔

وہ سوچتی رہی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی حکمتِ عملی ہی ٹھیک نہیں تھی۔ اس میں کچا پن تھا۔ کسی چیز سے محرومی کا بھرپور احساس تو اس وقت ہوتا ہے، جب اس کی افادیت پوری طرح روشن ہو۔ جس شخص نے کبھی سیر ہو کر پانی ہی نہ پیا ہو، اس کی تشنگی تو بس واجبی ہی سی ہوگی۔ پہلے آدمی پر یہ تو ثابت کیا جائے کہ کوئی نعمت کتنی بڑی ہے۔ اس کے بعد وہ محروم ہوگا تو عمر بھر پچھتائے گا۔ اس نے عثمان کو ابتدا ہی سے لذت سے محروم کر کے غلطی کی تھی۔ تبھی تو بچوں نے اس کی محرومی کی بہ آسانی تلافی کر دی تھی۔

اس نے اپنی حکمتِ عملی درست کرنے کا فیصلہ کر لیا!

اسے لگتا تھا کہ یہ کام مشکل ثابت ہوگا۔ جس طلب سے کسی نے سمجھوتا کر لیا ہو، اسے جگانا آسان نہیں ہوتا لیکن وقت آنے پر اسے معلوم ہوا کہ عثمان نے سمجھوتا نہیں کیا تھا بلکہ وہ غیر معمولی ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جبکہ ضبط ترغیب کے خلاف بہت کمزور ثابت ہوتا ہے اور ضبط بھی وہ جو فطرت پر کیا جا رہا ہو۔

اس کے ہاتھوں کے پہلے ہی لمس نے عثمان کو پگھلا دیا۔ وہ اس پر یوں برسی جیسے برسوں کے تپتے پیاسے صحرا پر موسلا دھار بارش۔ مگر صحرا کی پیاس کہاں بجھتی ہے۔ وہ تو اور بھڑک جاتی ہے۔ صحرا تو سیلاب پی جائے، پھر بھی خشک ہی رہتا ہے۔ ہاں وہ شکر گزار ضرور ہوتا ہے۔

وہ صحرا کو طوفانی بارش پلا کر اسے عادی بنا رہی تھی۔ اس کے لیے اس کے ذہن میں ایک عرصہ تھا۔ اس کے بعد صحرا کے آسمان پر بس چھوٹی چھوٹی بدلیاں رہ جاتیں۔ بدلیاں، جو صرف پیاس بڑھاتی ہیں، برستی کبھی نہیں۔ پیاس کبھی نہیں بجھاتیں۔ وہ بدلیوں کو پکارتا ہے، ان سے التجا کرتا ہے لیکن اپنی پیاس کی دیوار سے سر ٹکرا کر لہولہان ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

وہ جانتی تھی کہ بھڑکی ہوئی پیاس کے ہاتھوں تڑپتا صحرا بہتے ہوئے سیال کو آبِ رواں سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ وہ زہر ہو کہ تیزاب، اس کے حلق میں ابھرے کانٹوں کو اس سے غرض نہیں ہوتی۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنے لیے کیسا عذاب... کیسی موت خریدی ہے۔

وہ بہت خوش تھی۔ وقت کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اب وہ انہیں کھینچنے ہی والی تھی!

O☆O

"...میاں بیوی کا رشتہ دنیا کا سب سے سچا، سب سے پکا اور سب سے قریبی رشتہ ہوتا ہے...." مسز غنیم کی تقریر جاری تھی۔

آدمی چند لمحوں میں کتنا کچھ سوچ سکتا ہے۔ پوری زندگی بھی دہرا لیتا ہے۔ عثمان حفیظ نے حیرت سے سوچا۔ لیکن اب وہ کیا کرے۔ اس کی سوچ اور یادیں زندگی کے جس مقام تک پہنچ گئی تھیں، وہ ناگفتہ بہ تھا۔ اسی لیے سوچوں کا، یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا اور حال کے لمحے سے مسز غنیم کی آواز اس کی سماعت میں در آئی تھی۔

اس نے سوچا، دنیا میں کون ایسا ہوگا، جو پوری سچائی کے ساتھ اپنی پوری زندگی دہرا سکے۔ اتنا ظرف انسان میں کہاں ہوتا ہے اور اتنی صاف زندگی بھی کون گزارتا ہے۔ کون اپنے باطن کو تھال میں سجا کر پوری دنیا کے، لوگوں کے ملاحظے کے لیے لے کر نکل سکتا ہے۔ یہ تو صرف پیغمبروں اور ولیوں کے لیے ہی ممکن ہے۔

ہر انسان کے ساتھ ایسی یادیں، ایسے راز ہوتے ہیں، جنہیں وہ دوسروں پر نہیں کھول سکتا بلکہ ہر کسی کے ساتھ ایسے معاملات بھی ہوتے ہیں، جن پر وہ خود سے بھی بات نہیں کر سکتا۔ جن کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ جنہیں وہ ساری عمر ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔

عثمان حفیظ کے سامنے بھی زندگی کے وہ صفحات آگئے تھے، جنہیں وہ خود بھی نہیں پڑھنا چاہتا تھا لیکن انہیں زندگی کی کتاب سے نکالنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ ایسی یادوں کے لیے کمپیوٹر سے کہیں زیادہ پیچیدہ، اللہ کی تخلیق انسانی دماغ کا ایک حصہ خود کار سنسر کا کام کرتا ہے۔ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے لیکن مکروہ حقیقتیں چھپانا ہی پڑتی ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چھپانے سے حقائق مٹتے نہیں لیکن....

مسز غنیم کی آواز سے.... حال سے اس کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ پھر زندگی کی کتاب پڑھ رہا تھا....

O☆O

ازدواجی زندگی کے سات سال گزر چکے تھے۔ خواب بکھر چکے تھے۔ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ایسا پیاسا تھا جو پینے کے نام پر زہر بھی پی سکتا تھا۔ محرومیوں، ناآسودگیوں اور روح کے ناسوروں سے گھبرا کر اس نے جسم وجاں کے لیے نئے مشغلے ڈھونڈ لیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ گھٹیا ہو گیا ہے۔ ذلت کی گہرائیوں میں گرتا چلا جا رہا ہے۔

شراب اور عورت۔ یہ اس کے نئے ساتھی تھے لیکن یہ سب مشغلے دن کے تھے۔ اس کی شامیں اب بھی اپنے بچوں کے لیے وقف تھیں۔ اس کا دن آسودگی کی جستجو سے شروع ہوتا اور ختم ہوتی

کے کرب کے ساتھ ختم ہوتا۔ شام اس کے لیے حیسنا آسودگی لے آتی۔ بچوں کے ساتھ وہ بہت خوش رہتا لیکن رات اس کے لیے کانٹوں کی سیج بن جاتی۔ رات اپنے ساتھ ایسے عذاب لاتی کہ اسے رات سے خوف آنے لگا تھا پھر یوں ہوا کہ اس نے رات کو گھر میں بھی پینے کا معمول بنالیا۔

وہ خوب عیاشی کر رہا تھا۔ وہ اس کا متحمل ہو سکتا تھا۔ دفتر سے اس کا تعلق برائے نام رہ گیا تھا۔ ابو کے وفادار ملازم اعتبار کے لوگ تھے۔ کاروبار اس کی بے پروائی کے باوجود نہ صرف چل رہا تھا بلکہ پھل پھول بھی رہا تھا۔ وہ تو اب صرف ضروری کاغذات اور چیکس پر دستخط کرتا تھا۔

اپنی عیاشی کے لیے اس نے شہر کے پُرسکون علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ ایسا علاقہ تھا' جہاں کسی کو کسی پر نظر رکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہاں پڑوسی کو پڑوسی کا علم نہیں ہوتا تھا۔ وہ صبح دفتر کے ضروری کام نمٹاتا اور اس فلیٹ کا رخ کرتا۔ وہاں اس کے لیے شراب بھی ہوتی اور ہر روز ایک نئی عورت بھی۔ شہر میں کال گرلز کی کمی تو نہیں تھی۔

کچھ بھی سہی' ایک خیال نشے میں بھی اس کے دماغ میں ڈنک گاڑتا رہتا تھا۔ وہ سوچتا... یہ میں ہوں...! عثمان حفیظ! میں اور ایسا...! یہ سب شہناز کی مہربانی ہے۔ میں نے تو اس سے محبت کی تھی۔ یہ اس نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کیسی محرومیاں دیں اس نے مجھے۔ کیسے زخم لگائے۔ کیسے داغا میری روح کو۔ میں کتنا گر گیا ہوں۔ کیا محبت اتنی بری چیز ہے۔ کیا کمی تھی میری محبت میں۔ کیوں اس طرح ذلیل کیا اس نے مجھے۔

وہ یہ سب کچھ سوچتا اور ہر لمحے شہناز سے اس کی نفرت میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ ایسی نفرت نہیں تھی کہ محبت کی صورت مسخ ہوئی ہو اور اس نے نفرت کا چہرہ اوڑھ لیا ہو۔ وہ کچلی ہوئی محبت نہیں تھی۔ وہ اصلی اور خالص نفرت تھی۔ محبت کی عمارت جل کر راکھ ہوئی تھی اور اس کی جگہ نفرت تعمیر ہوئی تھی۔

کتنا ہی چھپایا جائے' جہاں آگ لگی ہو' وہاں سے دھواں اٹھتا ہی ہے۔

ایک دن شہناز نے اس سے پوچھ ہی لیا "سنا ہے' آپ پینے لگے ہیں؟"

"درست سنا ہے تم نے۔"

"کب سے؟"

"مدتیں ہو گئیں اب تو۔ میں تو گھر میں بھی پیتا ہوں۔"

شہناز کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا "اور مجھے معلوم بھی نہیں؟"

"تمہیں مجھ سے غرض ہی کیا ہے' جو معلوم ہو۔ تمہیں مجھ میں دلچسپی ہی کب ہے۔"

"اور سنا ہے' آپ کی زندگی میں عورتوں کی بھی کمی نہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک سنا ہے تم نے" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"آپ اپنے باپ کی محنت سے کمائی ہوئی دولت یوں اڑا رہے ہیں... کال گرلز پر۔ ان میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں' جو تم میں ہیں" عثمان نے زہریلے لہجے میں کہا "اور اضافی خوبیاں بھی ہیں۔ مثلاً وہ موڈ کی پابند نہیں ہوتیں۔ انکار نہیں کرتیں۔ برف کی سل ثابت نہیں ہوتیں اور یہ کہ وہ ضرورتاً خود کو فروخت کرتی ہیں۔"

"اب آپ مجھے الزام دیں گے۔"

وہ اس پر الزام ثابت کر سکتا تھا لیکن نفرت ایسی تھی کہ وہ اسے اپنی تباہی کا کریڈٹ بھی نہیں دینا چاہتا تھا "تمہیں کیوں الزام دوں۔ میں تم سے ڈرتا ہوں کیا۔ میں تو یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ یہی میرا اصل چہرہ ہے۔ بہت دن نقاب ڈال کر جی لیا۔ اب منافقت نہیں چلے گی۔ سیدھی سی بات ہے۔ میرے پاس دولت ہے تو عیاشی کیوں نہ کروں؟"

"مجھ سے ڈرتے نہیں تو مجھے خود سے کیوں نہیں بتایا' گھر میں چھپ کر کیوں پیتے رہے؟"

"تم سے نہیں ڈرتا۔ بچوں کا... خاص طور پر نومی کا خیال رہتا ہے۔"

شہناز کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نظر آئی "اوہ... یہ بات ہے۔ مجھے سمجھ لینی چاہیے تھی" پھر اس کے تیور بدل گئے۔ "مجھے آپ کی عیاشی پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک بات سن لیں۔ آپ گھر میں کبھی شراب نہیں پئیں گے۔"

یہ وہ وقت تھا جہاں عثمان کو وہ مضبوطی دکھانا تھی' جو اس کے اندر نہیں تھی۔ یہ جنگ تو وہ اپنے آپ سے مہینوں پہلے لڑ چکا تھا اور ہار گیا تھا۔ بچوں کی... اور خاص طور پر ثوبیہ کے مستقبل کی خاطر ضروری تھا کہ ان کی ازدواجی زندگی جاری رہے۔ وہ اپنے بچوں کو منقسم انسان نہیں بنانا چاہتا تھا۔ پھر وہ شہناز کو طلاق دیتا تو اس سے معاشرے میں بچوں کی پوزیشن متاثر ہوتی۔ وہ نکو بن کر رہ جاتے۔ اور یہ بھی ضروری تھا کہ شہناز کو اس کی اس سوچ کا علم نہ ہو بلکہ اس پر بالکل برعکس تاثر نقش کیا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ شہناز کو اس کی اس کمزوری کا علم ہو گیا تو وہ اسے بلیک میل کرے گی۔ اس کی زندگی عذاب بنا دے گی۔

اس نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھایا "یہ میرا گھر ہے۔ یہاں میں جو چاہوں گا' وہی کروں گا۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"یہ میں برداشت نہیں کروں گی" شہناز نے کڑے لہجے میں کہا۔

"نہ کرو" عثمان نے بے پروائی سے کہا "اس گھر کے دروازے بند نہیں ہیں' تم یہاں قید نہیں ہو اور تمہارے پاپا خوشی خوشی تمہیں افورڈ کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

شہناز سناٹے میں آ گئی۔ یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی

نہیں ہوگا کہ وہ ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ بہرحال اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا "واقعی..... یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ لیکن میں بچوں کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"سویٹ ویلکم" عثمان نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا "تم انہیں رکھو یا مجھے دے دو' مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں لے جاؤ گی تو میرے لیے اور سہولت ہو جائے گی۔ میں وہ سب کچھ گھر پر بھی کر سکوں گا' جس کے لیے مجھے ایک مہنگا فلیٹ کرائے پر لینا پڑا ہے اور چھوڑ جاؤ گی تو بھی کوئی بات نہیں۔ یہ سیٹ اپ چلتا ہی رہے گا" وہ کہتے کہتے رکا "شہناز بیگم' تم مجھے سات سال پہلے والا عثمان سمجھنے کی غلطی مت کرو۔ آئندہ میرا تجزیہ نئی روشنی میں کرنا ورنہ پچھتاؤ گی" اس نے سرد لہجے میں اضافہ کیا۔

"یہ ہے آپ کی وہ محبت' جس کے افسانے....."

"ایک منٹ۔ خوب یاد دلایا" عثمان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی "آؤ میرے ساتھ" وہ سوچ رہا تھا' یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ آدمی کو جو کہنا ہو' وہ کہہ نہیں سکتا۔ اور اس کے بجائے کچھ اور کہنا پڑتا ہے۔ "محبت تو ضرورت کے تحت ہوتی ہے شہناز بیگم۔ اب تم میری ضرورت ہی پوری نہیں کرتیں تو محبت کیسی؟" وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ "آج کل تو میں بازاری عورتوں سے محبت کر رہا ہوں۔"

وہ شہناز کو خواب گاہ میں لے گیا' جسے وہ مہینوں سے بھولا ہوا تھا۔ وہ سیدھا بلوری تاج محل کی طرف گیا اور زور لگا کر اسے اسٹینڈ سے کھسکانے لگا۔ بلور کا وہ تاج محل اس کی توقع سے زیادہ بھاری تھا اس لیے چھناکا بھی بہت زوردار تھا۔ "سوری شہناز بیگم! اس علامت کو تو مجھے اسی وقت مٹا دینا چاہیے تھا' جب تمہاری محبت ختم ہوئی تھی۔ خیر' اب سہی۔ امید ہے وہ گھڑی تم خود ہی پھینک دو گی" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا "اب محبت کی اس علامت کو کوڑے کے ڈھیر پر پھنکوا دینا۔ اور اس وقت تک اس کمرے میں ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر چلنا۔"

شہناز پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹوٹے ہوئے تاج محل کو دیکھ رہی تھی۔ بہت باریک کرچیاں بہت دور تک پھیلی تھیں۔ بڑے ٹکڑے اسٹینڈ کے پاس ہی پڑے تھے۔ تو یہ ہوتی ہے محبت؟ اتنی نازک' اتنی غیر محفوظ؟ وہ سوچ رہی تھی لیکن اس کے دل میں دکھ کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

"گڈ نائٹ" عثمان نے کہا اور خواب گاہ سے نکل آیا۔ یہ بات اس کے لیے خوشی اور طمانیت کا باعث تھی کہ تاج محل توڑتے وقت نہ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی نہ اس کے دل میں کوئی ٹیس اٹھی تھی۔ وہ اس پر بھی بہت خوش تھا کہ اس کا بلف کارگر ثابت ہوا۔ اب اسے شہناز کی طرف سے کبھی پریشانی نہیں ہو گی۔

اس رات بہت مدت کے بعد ایسا ہوا کہ وہ سکون سے سویا۔

○☆○

شہناز نے جو سوچا تھا' اس کے مطابق عمل کیا۔ اس نے ایک سال میں عثمان کو اپنی لت لگا دی۔ اس نے اپنا آپ اس پر نچھاور کر دیا۔ قربت میں اس کے انداز میں وارفتگی اور محبوبیت ہوتی۔ وہ ازمنۂ وسطیٰ کی کوئی شاہی کنیز بن گئی' جسے شہنشاہ کو خوش کرنے کے تمام گُر آتے تھے۔

پھر اچانک اس نے خوشیوں کی طنابیں کھینچ دیں۔ پُرتکلف مرغن کھانوں کا عادی عثمان اب بھوکا تھا۔ وہ اس کے خوانِ بدن کا عادی ہو چکا تھا مگر دسترخوان سمیٹا جا چکا تھا۔ وہ بہت سکون سے اسے ٹوٹتے' بکھرتے دیکھتی رہی۔ اس کی ریزگی میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ چڑچڑا اور بدمزاج ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات تو وہ رات بھر نہیں سو پاتا تھا۔ اس کا اثر اس کی صحت پر پڑ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

پھر ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ نسبتاً پُرسکون نظر آنے لگا۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس سے کھنچ بھی گیا تھا لیکن یہ فطری ردِعمل تھا۔ البتہ شہناز کو یہ پریشانی ضرور تھی کہ ریزگی کا عمل کیوں رک گیا ہے۔

ایک ٹیلی فون کال نے اس کی یہ الجھن بھی دور کر دی۔ اسے پتا چل گیا کہ ریزگی کا عمل رکا نہیں' اس نے جہت تبدیل کر لی ہے اور اس کی رفتار بڑھ گئی ہے۔

اس روز ڈیڑھ بجے فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!"

"جی مجھے مسز عثمان سے بات کرنی ہے" دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے کہا۔

"میں بول رہی ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

"بی بی... میں ساجد علی بات کر رہا ہوں۔"

"کون ساجد علی؟"

"آپ کی فرم کا منیجر۔ آپ بھول گئیں مجھے؟ آپ کے گھر کو ہم نے ہی سجایا تھا۔ ہمیں شادی سے پہلے ہی صاحب نے گھر بلا لیا تھا....."

"ہاں..... یاد آ گیا۔ کیسے ہیں آپ؟" شہناز نے خشک لہجے میں کہا "صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"جی... میں جانتا ہوں۔ مجھے آپ ہی سے بات کرنا تھی۔"

"مجھ سے؟ کس سلسلے میں؟ آپ جانتے ہیں' میں کاروباری معاملات میں نہیں پڑتی۔"

"کاروباری بات نہیں ہے بیگم صاحبہ! مجھے آپ کو بہت ضروری..... لیکن بہت مشکل بات بتانی ہے" آواز سے ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

شہناز کو الجھن ہونے لگی "بھئی آپ پہیلیاں نہ بجھوائیں' صاف بات کریں۔"

"بات یہ ہے بیگم صاحبہ کہ ہم بڑے صاحب کے زمانے کے نمک خوار ہیں۔ خیر خواہی ہمارا فرض ہے۔ آپ کے سوا کوئی نہیں، جس سے بات کر سکیں۔ عثمان صاحب نے کاروبار پر توجہ دینا چھوڑ دیا ہے۔ اس سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ وہ غلط سمت میں چل پڑے ہیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" شہناز نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"بتاتے ہوئے دکھ بھی ہو رہا ہے اور افسوس بھی لیکن بتانا ضروری ہے۔ عثمان صاحب کو امیروں والے شوق لاحق ہو گئے ہیں۔"

"وضاحت کیجئے ساجد صاحب۔"

"صاحب پینے لگے ہیں اور عورتوں کا چکر بھی چل گیا ہے۔ دفتر میں سب پریشان ہیں۔ عثمان صاحب ایسے تھے نہیں۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے انہیں۔ ہم لوگ تو کچھ نہیں کر سکتے اس لیے آپ کو صورتِ حال بتادی ہے۔"

"آپ کا شکریہ ساجد صاحب۔ میں دیکھوں گی کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔ اب تک تو مجھے علم ہی نہیں تھا، اچھا خدا حافظ۔"

اس رات شہناز نے عثمان سے بات کی۔ اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اب ایک بدلا ہوا آدمی ہے۔ اس رات عثمان نے وہ تاج محل توڑ ڈالا، جسے اس نے سہاگ رات کو اس کے لیے اپنی محبت کی علامت قرار دیا تھا۔ وہ شہناز کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے اس تاج محل سے یا عثمان کی محبت سے کوئی دلچسپی تھی۔ ملال اس بات کا تھا کہ وہ اس کے ٹرانس سے پوری طرح نکل چکا تھا بلکہ شاید اب وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ بہرکیف اب وہ اس کے قابو میں بالکل نہیں رہا تھا۔ اس کا اندازہ اسے کچھ دیر پہلے اس وقت ہو گیا تھا، جب عثمان نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ چاہے تو اس سے طلاق لے سکتی ہے۔ چاہے تو بچے بھی ساتھ لے جائے۔ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں بڑی سفاکی تھی۔

شہناز کو اس ازدواجی زندگی میں ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسی وقت گھر چھوڑ دیتی۔ نعمان سے تو اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ثوبیہ سے وہ دور نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر اس نے عثمان کی آزادی کی پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا تو اس کی ایک وجہ ثوبیہ ہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ معاشرے میں مطلقہ ماں کی بیٹی کو تمام تر خوبیوں کے باوجود عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کا کوئی اچھا مقام نہیں ہوتا۔ اسے اچھا رشتہ ملنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ اور شہناز کو ثوبیہ کا مستقبل بہت عزیز تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مشکور کی شادی ہو چکی تھی اور وہ جانتی تھی کہ وہ اب بھی اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ امکان ہوتا تو وہ پہلے ہی عثمان کو چھوڑ چکی ہوتی۔

اس کا قیدی آزاد ہو چکا تھا، اس کا اسے افسوس تھا لیکن یہ اطمینان تھا کہ ایک اہم مقصد وہ حاصل کر چکی ہے۔ اس لیے وہ اگلے روز ممی سے ملنے گھر چلی گئی۔

"کیا بات ہے؟ بہت بجھی بجھی نظر آ رہی ہو؟" ممی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

اس وقت وہ بہت اچھی اداکاری کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"کیا بات ہے، تم رو کیوں رہی ہو؟" ممی نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

وہ ممی سے لپٹ گئی "پاپا نے اور آپ نے مجھے جہنم میں جھونک دیا ممی" وہ سسکنے لگی۔

"کیا ہوا؟ بات کیا ہے؟" ممی متوحش ہو گئیں۔

اس نے ساجد علی کی فون کال سے لے کر عثمان سے گفتگو تک سب کچھ من و عن بتا ڈالا "اب آپ بتائیے۔ جن برائیوں کی وجہ سے پاپا نے مشکور کو مسترد کیا تھا، وہی برائیاں عثمان میں بھی نکل آئیں۔ مشکور سے میری شادی ہو گئی ہوتی تو میں شکایت نہ کرتی کہ وہ میرا فیصلہ تھا۔ اب پاپا کیا جواب دیں گے مجھے؟ میں نے یہ سب کچھ انہیں اس لیے نہیں بتایا کہ میں انہیں اپنے سامنے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب وہ بتائیں کہ ان کی مردم شناسی کیا ہوئی۔"

فہمیدہ بیگم سکتے کی سی حالت میں بیٹھی تھیں "یقین نہیں آتا کہ عثمان ایسا ہو سکتا ہے" وہ بڑبڑائیں۔

"پاپا سے کہیں، اس کے دفتر جا کر ساجد صاحب سے پوچھ لیں۔"

"لیکن اتنے برسوں کے بعد ایسا کیوں ہوا؟" فہمیدہ بیگم کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"اس نے خود مجھ سے کہا کہ یہی اس کا اصلی روپ ہے" شہناز نے تند لہجے میں کہا "سات سال وہ چہرے پر پارسائی کا نقاب اوڑھے منافقت کرتا رہا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے مجھے بہت ذلیل کیا ممی۔ کہنے لگا کہ چاہو تو طلاق لے لو۔ تمہارے پاپا تمہیں افورڈ کر سکتے ہیں۔"

"یقین نہیں آتا۔ اتنے برسوں کے بعد کیوں...؟ کوئی سبب تو ہو گا" فہمیدہ بیگم کے لہجے سے بے یقینی نہیں جا رہی تھی۔

"آپ کے خیال میں، میں جھوٹ بول رہی ہوں" اس نے چڑ کر کہا۔

"میں یہ تو نہیں کہہ رہی ہوں" فہمیدہ بیگم نے مدافعانہ لہجے میں کہا "تم پاپا کو بھی یہ سب کچھ بتانا..."

"میں تو اب گھر واپس جا رہی ہوں۔ پاپا کو آپ ہی بتا دیجئے گا ان کی مردم شناسی کے متعلق۔"

ممی اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ اس کا لہجہ بہت خراب تھا۔

○☆○

عثمان مطمئن تھا کہ شہناز کی طرف سے اب اسے کسی پریشان کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کوئی نیا مسئلہ نہیں کھڑا ہو گا۔ وہ اب

تک جو کچھ کرچکی ہے' وہی اس کے لیے بہت ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس بار اس نے دباؤ ڈالا ہے...... اسے کچل کر رکھ دیا ہے۔ اسے سب سے زیادہ علیحدگی کا خوف تھا۔ اپنی ازدواجی زندگی قائم رکھنے کے لیے اس نے بے پناہ اذیت سہی تھی۔ بدترین عذاب اپنے اوپر اٹھائے گھوم رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔ اس لیے اس نے اس معاملے میں بے پروائی لادی تھی۔ اس نے شہناز کو یہ تاثر دیا تھا کہ اسے اپنے بچوں کی' ازدواجی زندگی کی اور معاشرے میں اپنے اور بچوں کے مقام کی کوئی پروا نہیں۔

لیکن اس کا یہ اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ شہناز کسی بھی زاویے سے کوئی وار کرسکتی ہے۔ اسے بس اس کی کوئی کمزوری معلوم ہو جائے۔ کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا ہنر اسے خوب آتا ہے۔

اس شام وہ بچوں کے ساتھ لان میں بیٹھا تھا۔ اچانک نعمان نے اس سے پوچھا "پاپا...... شراب بہت بری چیز ہوتی ہے؟"

اسے شاک لگا۔ وہ اپنے بیٹے کے معصوم چہرے کو تکتا رہ گیا۔ اس کا بیٹا اب آٹھ سال کا ہونے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سات سال کی عمر کتنی نازک ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے' جب بچہ معصومیت کی دہلیز پر کھڑا شعور اور آگہی کی طرف پہلا قدم بڑھا رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھ داری کے دور میں داخل ہونے والا ہوتا ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے کہ اس عمر میں بچوں کو نماز سکھائی جائے۔ نماز پڑھنے کی تلقین کی جائے۔ تلقین سے کام نہ چلے تو سختی کی جائے تاکہ سن شعور کا آغاز دین کے ساتھ ہو۔

اور یہاں اسی عمر میں اس کا بچہ شراب کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اسے خود سے شرم آنے لگی۔ غصے سے اس کا خون کھول اٹھا۔

"آپ نے بتایا نہیں پاپا" نعمان نے کہا۔

"ہاں بیٹے۔ شراب بری نہیں...... بہت بری چیز ہوتی ہے"

عثمان نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ اللہ کے حکم کا حوالہ نہیں دیا اس لیے کہ وہ خود شراب پیتا تھا۔

"میں نہیں مانتا پاپا کہ شراب بری چیز ہوتی ہے" نعمان کے لہجے میں یقین تھا۔

عثمان نے گھبرا کر ثوبیہ کو دیکھا' جو پوری توجہ سے یہ گفتگو سن رہی تھی "ثوبی بیٹا' بھاگ کر اندر جاؤ اور ثریا سے چائے بنوا کر لاؤ۔ چائے خود لے کر آنا میرے لیے" اس نے کہا۔

"پاپا... میں کہہ کر آجاؤں۔ چائے انّا خود لے آئیں گی" پانچ سالہ ثوبیہ نے کہا۔

"نہیں بیٹی۔ چائے تمہی لے کر آنا۔ تمہارے ہاتھ لگیں گے تو چائے اچھی ہو جائے گی۔ جاؤ بیٹا" اس نے چمکارا۔

ثوبیہ خوش ہو گئی "ابھی لاتی ہوں پاپا" اس نے چہک کر کہا اور گھر میں چلی گئی۔

عثمان اب نومی کو گھور رہا تھا "یہ جو تم نے کہا کہ تم شراب کو بری چیز نہیں مانتے' اس کا کیا مطلب ہے؟" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"میں سمجھتا ہوں پاپا کہ شراب بری نہیں' اچھی چیز ہوتی ہے۔"

عثمان کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی "یہ بے ہودہ بات کیسے سوجھی تم نے؟"

"ایک بات بتائیں پاپا۔ آپ شراب پیتے ہیں؟"

وہ الجھن میں پڑ گیا۔ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی... اور کیسے؟ اب کیا بتائے اسے؟

"اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے پاپا" اس کے بیٹے نے بے حد معصومیت سے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے۔ میں بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

اس نے فیصلہ کرلیا "ہاں... میں شراب پیتا ہوں بیٹے" اس کا سر جھک گیا۔ شرمندگی کا احساس پہلی بار ہوا تھا "لیکن تمہیں یہ بات بتائی کس نے؟"

"مما نے بتائی تھی۔ اور میں نے مما سے کہہ دیا تھا کہ میرے پاپا شراب پیتے ہیں تو شراب بری چیز نہیں ہوگی۔ مما کہنے لگیں' شراب تو ہوتی ہی بری ہے۔"

عثمان کا خون پھر کھولنے لگا۔ وہ اس لمحے کو کوس رہا تھا' جب اس نے شہناز کے سامنے اس کمزوری کا اعتراف کیا تھا کہ وہ اس سے نہیں ڈرتا لیکن بچوں کو بچانا چاہتا ہے۔ کم ظرف عورت نے وار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی "مما ٹھیک کہتی ہیں بیٹا" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"میں نہیں مانتا' میں نے مما سے کہہ دیا تھا کہ بڑا ہو کر میں بھی شراب پیوں گا۔"

"کیوں کہی تم نے یہ بات؟" وہ غرایا۔

"میں آپ جیسا بننا چاہتا ہوں پاپا' آپ تو ہیرو ہیں۔"

عثمان کو احساس ہوا کہ بچے پر غصہ کرنا جائز نہیں۔ اس کا اس میں کیا قصور۔ قصور تو اس کا اور شہناز کا ہے بلکہ درحقیقت اس کا اپنا ہے "بیٹے۔ میں انسان ہوں' انسان بھی خامیوں بھرا' برائیوں سے پاک نہیں ہوسکتا۔ تمہیں مجھ جیسا نہیں بننا چاہیے۔ ویسا بننا چاہیے' جیسا اللہ نے حکم دیا ہے" وہ نرم لہجے میں کہتا رہا۔ "اللہ کا ہر حکم سچا' اس کی ہر بات برحق۔ اللہ نے شراب کو بہت بری چیز قرار دیا ہے۔ حرام' گندی' غلیظ۔ سمجھے بیٹے' تو میں کوئی برا کام کروں تو وہ میرے کرنے کی وجہ سے اچھا نہیں ہو جائے گا' برا ہی رہے گا۔"

ننھا نومی کچھ دیر سوچتا رہا۔ وہ جیسے کسی اندرونی کشمکش سے دوچار تھا پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا "مگر پاپا... میں تو آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے بیٹے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ ہر برائی چھوڑ کر اچھا بننے کی کوشش کروں گا" اس نے بلا جھجک کہا۔

"پرامس پاپا!" نوی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"پرامس مائی سن" اس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی وقت ثوبیہ چائے لے آئی۔ وہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی۔ پھر بھی آدھی چائے ساسر میں چھلک چکی تھی۔

"شاباش میری بیٹی" اس نے بچی کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے کہا۔

اس روز اسے احساس ہوا کہ اولاد کو نعمتِ عظمیٰ کیوں کہا جاتا ہے۔ اولاد انسان کو راہِ راست پر لے آتی ہے۔ کم از کم وہ تو سیدھا ہو گیا تھا۔

اب یہ اس کا نصیب کہ تین دن بعد وہ اس وعدے کی قید سے آزاد ہو گیا۔

جمعرات کے دن فہمیدہ آنٹی سعود اور محمود کے ساتھ آگئیں۔ اگلے روز حیدر آباد میں ان کے دور پرے کے کسی رشتے دار کے ہاں شادی تھی۔ وہ لوگ اس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ دعوت نامہ عثمان کو بھی ملا تھا اور آنٹی اصرار کر رہی تھیں کہ وہ لوگ بھی چلیں۔ شہناز نے صاف انکار کر دیا "میں تو نہیں جا سکتی ممی۔"

آنٹی نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا "اب کچھ نہیں ہو سکتا آنٹی۔ آپ اپنی بیٹی کو جانتی ہیں۔ انکار کے بعد یہ اقرار کر لیں تو بھی انکار ہی رہتا ہے۔"

"لیکن بیٹے' انہوں نے فون پر بھی بہت اصرار کیا تھا تم لوگوں کے لیے۔"

"مجھ سے بھی کیا تھا آنٹی لیکن اب کیا ہو سکتا ہے" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "ہاں بچے میری نمائندگی کر سکتے ہیں۔ آپ انہیں لے جائیں۔"

"بچے نہیں۔ آپ بس ان کے بیٹے کو لے جائیں۔ ان کی نمائندگی کے لیے وہی بہت کافی ہے۔ ثوبیہ کو میں نہیں بھیجوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم نوی کو تیار کر دو" آنٹی نے شہناز سے کہا اور شہناز نے آیا کو بلا کر نعمان کا بیگ تیار کرنے کی ہدایت دی۔

نعمان بہت خوش تھا کہ وہ حیدر آباد جا رہا ہے لیکن جب اسے پتا چلا کہ پاپا نہیں جا رہے ہیں تو وہ مچل گیا "آپ بھی چلیں نا پاپا۔"

"سوری بیٹے۔ میں نہیں جا سکتا۔"

"تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"جاؤ گے کیسے نہیں۔ اب تمہارا بیگ تیار ہو گیا ہے۔ تمہیں جانا پڑے گا" شہناز نے نعمان پر آنکھیں نکالیں۔

"میں پاپا کے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

عثمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور آخر میں قائل کر ہی لیا "تم کیسے بیٹے ہو۔ کیا محبت کرتے ہو پاپا سے" اس نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "پاپا کی بات تو مانتے نہیں۔"

"پاپا' میں۔"

"پلیز نوی' میری خاطر چلے جاؤ۔"

"اچھا پاپا۔ جا رہا ہوں' لیکن ایک شرط ہے' اب کی چھٹیوں میں آپ ہمیں مری لے کر چلیں گے۔"

"منظور ہے۔"

نوی جا تو رہا تھا لیکن خوش نہیں تھا۔ عثمان جانتا تھا کہ وہ بس اس کے لحاظ میں جا رہا ہے۔ یہ اس کی بے پناہ محبت کا ثبوت تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن آنسوؤں کی چمک تھی۔

"ٹاٹا پاپا۔ گڈ بائی" جب تک کار نظر آتی رہی' وہ ہاتھ ہلاتا نظر آتا رہا۔

وہ لوگ چلے گئے۔ ایک گھنٹے بعد فون پر اطلاع ملی کہ سپر ہائی وے پر ایک بدمست ٹرالر نے آنٹی کی ننھی منی سوزوکی کو روند ڈالا۔

ثوبیہ سو چکی تھی۔ اسے آیا کے پاس چھوڑ کر وہ اس ہاسپٹل گئے' جہاں سے فون آیا تھا۔ وہاں نجم انکل پہلے سے موجود تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر ان کے دل بیٹھنے لگے۔ انہوں نے اسے لپٹا لیا۔

"بیٹے' صبر سے۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے" انہوں نے اسے تلقین کی لیکن ان کی اپنی آواز بکھری جا رہی تھی۔

وہ انہیں اسپتال کے ایک کمرے میں لے گئے "بیٹے۔ صبر سے۔ حوصلے سے" کمرے میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے پھر کہا۔

بیڈ پر لہولہان نعمان لیٹا تھا۔ اسے دیکھ کر تو شہناز بت بن کر رہ گئی۔ عثمان تیزی سے بیڈ کی طرف لپکا۔ "آپ اس سے بات کریں۔ دیکھیں' پہچانتا ہے یا نہیں" ڈاکٹر نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کچھ کرتے کیوں نہیں" عثمان ڈاکٹر پر الٹ پڑا "کیسے ڈاکٹر ہیں آپ۔ دیکھیں' اسے کچھ ہونا نہیں چاہیے۔"

"سوری عثمان صاحب۔ اللہ کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں۔ ہم جو کر سکتے تھے' کر چکے ہیں۔ اب دعا کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"آپ کا مطلب ہے۔" عثمان سے بات پوری نہیں کی گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ڈاکٹر نے جواب نہیں دیا۔ لیکن جواب اس کے چہرے پر صاف لکھا ہوا تھا۔ عثمان بے تابی سے بیٹے کے چہرے پر جھک گیا۔ نوی کی آنکھیں بند تھیں۔ سانس بھی ٹوٹ ٹوٹ کر اور مدھم مدھم چل رہی تھی "نوی۔ نوی بیٹے۔ دیکھو یہ میں ہوں" اس نے بیٹے کو پکارا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

تیسری بار پکارنے پر نوی نے بہت زور لگا کر آنکھیں کھولیں۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔

"نومی... بیٹے... یہ میں ہوں... تمہارا پاپا۔"
نومی کے ہونٹ ہلے۔ آواز بہت ہلکی تھی۔ عثمان نے اس کے ہونٹوں سے کان لگا دیے "پاپا... سویٹ پاپا... آئی لویو۔ آپ بہت اچھے ہیں پاپا۔ آئی لویو" بچہ ہانپنے لگا۔
"میرے بیٹے۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ میری تو پوری کائنات تم ہو۔" اس نے پوری سچائی سے کہا۔
نومی اب کمزور آواز میں ماں کو پکار رہا تھا۔
"مما... مما... مما۔" عثمان نے پلٹ کر دیکھا۔ شہناز دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ وہ صدمے سے شل ہو رہی تھی۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا پورا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔
"شہناز... یہ تمہیں بلا رہا ہے" عثمان نے رندھی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔
شہناز بیڈ کے پاس آگئی۔ نومی پر جھک گئی۔
"نومی... یہ آگئیں تمہاری مما" عثمان نے کہا۔
بچے کی ڈوبتی آنکھوں میں چمک سی ابھری پھر اس کی نگاہیں دھندلا گئیں "مما... مما... آپ مجھے گود میں کیوں نہیں لیتیں؟" وہ آٹھ سالہ نومی کی نہیں، چھوٹے بچے کی آواز تھی۔ عثمان اسے پہچان سکتا تھا... یاد کر سکتا تھا... وہ برسوں پہلے کے نومی کی آواز تھی، جب وہ بہت چھوٹا تھا۔
شہناز نے بچے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ عثمان اس پر جھکا ہوا تھا "آئی... لو... یو پاپا..." نومی نے بمشکل کہا۔ اسی لمحے ہچکی آئی اور سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی۔
یہ تو انہیں بعد میں پتا چلا کہ آنٹی، مسعود اور محمود پہلے ہی جا چکے تھے۔ بوڑھے نجم الحسن نے جس وقت اسے صبر اور حوصلے کی تلقین کی تھی، اس وقت وہ خود پہاڑ جیسے صبر اور حوصلے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کی تو کائنات لٹ چکی تھی۔ ان کے لیے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔
اس غم نے عثمان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ زندگی کا بہت مضبوط سہارا چھن گیا تھا اس سے۔ رات کو دکھ اور اذیت کے کانٹے اسے چبھتے تو وہ نومی سے لپٹ کر سو جاتا تھا۔ اب وہ بستر ہی خالی ہو گیا تھا۔ سچ اس کی بہت پہلے اجڑ گئی تھی۔ اب بستر بھی اجڑ گیا تھا، اب وہ کیا کرے گا۔
شام آتی تو اس کا دل ہولنے لگتا۔ برسوں سے اس کا شام کا معمول تھا کہ شام بچوں کے ساتھ گزرتی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جو ہر روز اسے خوش گوارت کا احساس دلاتا تھا۔ بڑے سے بڑے دکھ اور پریشانی میں بھی یہ لمحے اسے جینے کا حوصلہ اور توانائی دیتے تھے۔ اب وہ شام کو لان میں بیٹھتا تو صرف ثوبیہ کی خاطر۔ اور اس کے معصوم سوالات اس کا دکھ اور بڑھا دیتے۔
"پاپا... بھائی کہاں گئے؟" وہ پوچھتی "بھائی کو بلائیں پاپا۔"
"بیٹا... بھائی اب نہیں آئے گا۔ اسے اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا" وہ رندھے ہوئے گلے سے کہتا۔
"تو اللہ میاں نے مجھے کیوں نہیں بلایا۔ بھائی تو میرے بغیر کھیلتے بھی نہیں تھے۔"
وہ کچھ جواب نہ دے پاتا۔ چپ چاپ آنسو بہاتا رہتا۔
"پاپا... آپ مجھے بھی اللہ میاں کے پاس بھیج دیں۔ میں بھائی کے پاس جاؤں گی۔"
"تو بیٹی، یہاں پاپا کے پاس کون رہے گا پھر۔ اکیلا چھوڑ دو گی ہمیں؟"
"اچھا پاپا، میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ آپ رو کیوں رہے ہیں؟"
"تم ایسی باتیں جو کرتی ہو۔"
پانچ سالہ بیٹی ایک دم بڑی ہو جاتی۔ وہ اپنی فراک کے دامن سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے چمکارتی "اچھے بچے روتے نہیں ہیں۔ ہے نا پاپا۔"
نومی کی وجہ سے اس نے توبہ کی تھی۔ جو تین دن اسے ملے تھے، اس نے نہ شراب کو ہاتھ لگایا تھا، نہ ہی فلیٹ کا رخ کیا تھا۔ بیٹے سے وعدہ جو کیا تھا اس نے۔ لیکن نومی ہی کی وجہ سے اسے پرانی راہوں پر جانا پڑ گیا۔ دکھ اور اذیت اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے تھے۔ پھر یہ خیال بھی تھا کہ جس کی خاطر سب کچھ چھوڑا تھا، جب وہی چھوڑ گیا تو اب کیسا لحاظ۔
اس کی مے نوشی صرف دوبارہ شروع نہیں ہوئی، پہلے سے بڑھ گئی۔ وہ ہر دکھ، ہر پریشانی، ہر اذیت کو شراب میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اذیت تو اور بڑھ جاتی تھی۔ نشے میں وہ عجیب انداز میں سوچنے لگتا۔ نومی کی موت کا ذمے دار وہ تھا۔ نومی تو نہیں جانا چاہ رہا تھا۔ وہ تو صرف اس کے لحاظ میں... اسے خوش کرنے کے لیے گیا تھا۔ جاتے ہوئے وہ افسردہ تھا۔ اسے ان کی وہ آخری جیتی جاگتی جھلک نظر آتی۔ کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر ہاتھ ہلاتے ہوئے... ٹاٹا پاپا، گڈبائی کہتا ہوا نومی، جس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن آنسوؤں کی چمک موجود تھی۔ وہ سوچتا... کاش، وہ بھی ان کے ساتھ چلا گیا ہوتا۔ تب وہ یقیناً اپنی کار لے جاتا اور نومی اس کے ساتھ ہوتا۔ یا تو نومی نہ مرتا، یا پھر وہ بھی ان کے ساتھ مر جاتا۔
ایک دن نشے میں وہ بڑبڑانے لگا... خود کلامی کرنے لگا۔
"تم... تم راندۂ درگاہ ہو عثمان حفیظ... بد نصیب انسان۔ تمہاری تو دنیا بھی گئی اور عاقبت بھی۔ خدا نے بیٹے کے روپ میں تمہیں آخری ہدایت دی اور پھر وہ واپس بھی لے لی۔ اب تو تمہارے لیے ہدایت کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ ڈوب جاؤ... غرق ہو جاؤ گناہوں میں۔ لعنت ہو تم پر... غرق ہو جاؤ۔"
ایک تبدیلی اور آئی تھی۔ رات کو وہ نجم انکل کے پاس ضرور

جاتا۔ کبھی ثوبیہ بھی اس کے ساتھ ہوتی اور کبھی شہناز بھی۔ اس رات وہ اکیلا ہی گیا تھا۔

"اچھا ہوا' تم اکیلے آئے؟" نجم انکل نے کہا "مجھے تم سے کچھ ضروری اور اہم باتیں کرنا تھیں۔"

"جی انکل' فرمایئے؟"

"دیکھو بیٹے' ایک بات مجھے معلوم ہے۔ میں اب زیادہ عرصے نہیں جی سکوں گا۔"

"ایسی باتیں نہ کریں انکل' پلیز" عثمان نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ انکل کی صحت بہت تیزی سے تباہ ہو رہی ہے۔

"مجھے معلوم ہے اس لیے کہہ رہا ہوں۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہ کچھ کاغذات ہیں۔ ان پر تمہیں دستخط کرنے ہیں" انہوں نے اس کی طرف کاغذات بڑھائے۔

اس نے بتائی ہوئی جگہوں پر دستخط کر کے کاغذات واپس کردیے پھر پوچھا "یہ کاغذات کیسے ہیں انکل!"

"یہ میری وصیت کے کاغذات ہیں۔ میرے بعد میرا سب کچھ تمہارا ہے.... صرف تمہارا۔"

"یہ تو زیادتی ہے انکل.... شہناز کے ساتھ۔ آپ کو یہ سب کچھ شہناز کے نام کرنا چاہیے۔"

"یہ میں زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہوں" نجم صاحب نے سرد لہجے میں کہا "عورتیں نادان ہوتی ہیں.... نادان اور کم عقل۔ کاروبار کی انہیں تمیز نہیں ہوتی۔ وہ تو بڑی آسانی سے لٹ جاتی ہیں۔ اور بیٹی ویسے بھی پرائی چیز ہوتی ہے' اپنی نہیں۔ برسوں پہلے میں نے بہت اچھی سرمایہ کاری کی تھی۔ اس پر میں آج تک پچھتایا نہیں" ان کے ہونٹوں پر بجھی بجھی مسکراہٹ نظر آئی۔ "میں نے پرائی بیٹی دے کر اپنے لیے ایک اضافی بیٹا حاصل کرلیا تھا۔ اپنے بیٹوں کی بے وفائی کے بعد اب وہی میرے کام آ رہا ہے۔"

عثمان کی آنکھیں بھیگنے لگیں "میں جانتا ہوں انکل کہ آپ نے مجھ سے ابو جیسی محبت کی ہے لیکن میں اس سب کا مستحق نہیں۔ میں بہت بدل چکا ہوں' بہت گر چکا ہوں انکل۔"

"جانتا ہوں بیٹے۔ تم اور بڑے ہو گئے ہو۔ گر کر اور بلند ہو گئے ہو" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "میں بہت کچھ.... شاید سب کچھ جانتا ہوں۔ میں تم سے ایک التجا ضرور کروں گا۔"

"آپ حکم کر سکتے ہیں انکل۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم کبھی خوش نہیں رہے پھر بھی میری خواہش ہے کہ ثوبیہ کی شادی ہو تو اس کے ماں باپ یکجا ہوں۔"

"آپ بے فکر رہیں انکل!"

اس رات وہ گھر آیا تو اور بوجھل ہو گیا تھا۔

تین دن بعد اپنے دفتر میں نجم الحسن پر دل کا دورہ پڑا۔ وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ طبی امداد ملنے سے پہلے وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

○☆○

شہناز پر صدمے اس تواتر سے پڑے کہ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔

نعمان کی موت کا صدمہ اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ تو ہمیشہ اسے ایک بوجھ محسوس ہوا تھا۔ وہ تو ایک چیز تھی' جو زبردستی اس پر تھوپ دی گئی تھی۔ وہ بچہ جسے اس نے کبھی اہمیت اور محبت نہیں دی' جاتے جاتے اسے اَن گنت پچھتاوے سونپ گیا تھا۔ جس بچے کو اس نے محرومیوں کے سوا کچھ نہیں دیا' اس نے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے ہوئے اپنی تمام محرومیوں کو ایک شکایتی جملے میں سمو دیا تھا اور وہ شکایت اس کا دل چیر گئی تھی۔ بے بسی یہ تھی کہ نہ وہ اس کی محرومی کی تلافی کرسکتی تھی' نہ ہی اس کی شکایت کا جواب دے سکتی تھی۔ اس کی ٹوٹتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں جم کر رہ گئی تھی "مما.... آپ مجھے گود میں کیوں نہیں لیتیں۔" اور اس وقت وہ اپنی اس عمر کی آواز میں بولا تھا' جب اسے پہلی بار اس محرومی کا احساس.... دکھ ہوا ہوگا۔

اس لمحے اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے بے قصور بچے کو کیسی محرومی دی ہے۔ وہ بچہ اپنی مرضی سے تو اس دنیا میں نہیں آیا تھا۔ اور اپنی وہ صورت بھی اسے اپنی مرضی سے نہیں ملی تھی۔ اب شہناز کو سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ جب وہ چلتا پھرتا' جیتا جاگتا بچہ اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا تو اس کی آنکھیں بولتی تھیں.... التجا کرتی تھیں.... مما.... میری مما' مجھے گود میں لے لو۔ اس نے کبھی اس کی آواز نہیں سنی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں وہ منظر لہرا گیا کہ وہ ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد کیسے مایوسی سے کندھے لٹکائے اپنے باپ کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس بچے کو کبھی یہ ضد کرنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ پونی ممی سے دھلوائے گا۔ وہ ضد کرتا تھا.... "میں پونی پاپا سے دھلواؤں گا۔"

کیسے کیسے منظر اس کی آنکھوں میں پھرتے تھے۔ وہ نظروں میں چاہت اور محبت لیے کیسے ثوبیہ کے پاس آتا تھا۔ کیسے نفرت سے وہ اسے جھڑک دیتی تھی۔ کیسے وہ ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھتا' کیسی بے بسی ہوتی اس کے معصوم چہرے پر۔ مما.... یہ میری گڑیا بہن ہے' مما' میں اسے پیار کروں گا۔ میں اپنے سارے کھلونے اسے دوں گا۔ مما' میں اسے ماروں گا نہیں۔ مما یہ تو میری گڑیا بہن ہے۔ مما' مجھے اس کے پاس آنے دو۔ اور کیسے وہ اسے جھڑکتی اور دھتکارتی تھی۔ کیسے وہ سر جھکائے' کندھے لٹکائے تھکے تھکے ننھے قدموں سے واپس چلا جاتا تھا۔ پھر شام کو لان میں اپنے پاپا کے سامنے کیسے وہ اپنی گڑیا بہن کو پیار کرتا.... اس کے واری صدقے جاتا۔

کیسے وہ اس کی جھڑکیاں سن کر اسے محبت اور بے چارگی سے تکتا تھا۔ کیسے بہانے بہانے سے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

اس کی ہچکیاں بند ہیں تو وہ چونکی۔ ایسا غیر اہم' قابلِ نفرت بچہ کسی کو اتنا رلا سکتا ہے؟ اب تو یہ رونا' یہ پچھتانا عمر بھر کا ہے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر تو اس کے لیے ممتا بھری تھی۔ نہ جانے چھپی کیسے رہ گئی۔ ارے... وہ تو اس سے محبت کرتی تھی۔ بدنصیب ماں' وہ محبت کبھی اسے نہ دے سکی۔ اب وہ ہمیشہ ناسور بن کر اس کے وجود میں رہے گی اور وہ اسے نکال بھی نہیں سکے گی۔ اس کی تو وہ کوکھ ہمیشہ کے لیے اجڑ گئی تھی' جسے اس نے کبھی اس کے وجود سے آباد نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ خلا تو کبھی نہیں بھر سکے گا۔ وہ جسے وہ ہمیشہ رد کرتی رہی' اس کے جگر کا پہلا ٹکڑا تھا۔ وہ اس کے گوشت' اس کے خون سے بنا تھا۔ اس کی ہڈیوں نے رس اس کی ہڈیوں سے حاصل کیا تھا۔ ارے... یہ کیسا زیاں ہے؟

پھر ممی' مسعود اور محمود کی موت کا صدمہ! یہ اتنے صدمے ایک ساتھ کیسے اٹھائے جا سکتے ہیں؟ لگتا تھا' دنیا خالی ہو گئی ہے۔ ہر طرف خلا ہی خلا ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں بچا۔ عثمان ہے' جسے اس نے کبھی قبول ہی نہیں کیا۔ پاپا ہیں' جو اس کی شادی کے بعد پہلے جیسے نہیں رہے۔ وہ تو اسے بے رخی کی سزا دے رہے ہیں' بس ایک ثوبیہ ہی ہے۔

ان دکھوں نے اسے بدل کر رکھ دیا۔ وہ خود بخود بدلتی جا رہی تھی۔ اس نے عثمان کے سلسلے میں بھی اپنا رویہ تبدیل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ چھپی رہنے والی محبتوں سے ڈر گئی تھی' جو اس وقت سامنے آتی ہیں' جب ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کون جانے۔

پھر چھ ماہ بعد پاپا بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ ان کی موت کا دکھ کیا کم تھا کہ ان کی موت نے عثمان کو اس کا رقیب بنا دیا۔ یہ شکایت تو اسے پہلے سے تھی کہ پاپا کو ممی اور بھائیوں کی موت کا دکھ اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہیے تھا لیکن انہوں نے نہیں کیا۔ وہ عثمان سے اور قریب ہو گئے۔ شاید اپنی جھوٹی مردم شناسی کا بھرم رکھنے کے لیے۔ پھر وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو اسے ایک اور صدمہ دے گئے۔ انہوں نے وصیت میں اس کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ سب کچھ عثمان کے نام کر گئے۔ یہ نہیں کہ اسے کوئی خواہش تھی پاپا کی دولت سے۔ غم یہ تھا کہ وصیت میں کہیں اس کا نام تک نہیں آیا۔ جیسے وہ وجود ہی نہیں رکھتی۔ کم از کم وہ بنگلا تو اسے دے جاتے کہ وہ ان کی اور تمام جانے والوں کی نشانی تھی۔

پاپا کی موت کے بعد اس کے بدلنے کا عمل رک سا گیا۔ احساسِ جرم اور ندامت کو نفرت اور رقابت نے دبا لیا۔ وہ بھی کیا کرتی۔ عثمان کے حوالے سے ہمیشہ اس کے ساتھ زیادتیاں ہوتی آئی تھیں۔

پھر عثمان نے وہ ذلیل حرکت کی کہ احساسِ جرم' ندامت اور ہر محبت مٹ گئی۔ اس کا ہدف اس بار بھی مشکور ہی بنا تھا۔ مشکور نے بتایا کہ اس بار اسے اس کی تین بیٹیوں کے حوالے سے دھمکی دی گئی ہے۔ اس روز وہ اپنے بیڈ روم میں ٹہلتی اور غراتی رہی۔

عثمان حفیظ' میرے پچھتاوے غلط تھے۔ تم ہو ہی اس قابل۔ تم تو حد درجہ کمینے انسان ہو۔ یاد رکھو' میں تمہیں ایسا سبق دوں گی' ایسا انتقام لوں گی تم سے کہ کبھی نہیں بھولو گے۔

عثمان کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے کا تصور بھی اب محال تھا لیکن اسے یہ زہر پینا تھا اور ایک ہی مرتبہ نہیں' قطرہ قطرہ کر کے پینا تھا۔ صرف اور صرف ثوبیہ کی خاطر۔

اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ ثوبیہ کی شادی بہت جلدی کرے گی!

○☆○

اذیت کے دن رینگ رینگ کر گزرتے رہے۔ دنوں کے' اذیتوں کے ڈھیر لگ جاتے تو کہیں ایک سال گزرتا۔ نوی کا خیال' اس کی یاد عثمان کے دل سے کبھی محو نہیں ہوا۔ وہ ثوبیہ کو ہمیشہ وقت دیتا رہا۔ ایک اسی کی وجہ سے تو وہ زندہ تھا۔

ایک بات اسے عجیب لگتی تھی۔ ثوبیہ کے معاملے میں اس کے اور شہناز کے درمیان مکمل ہم آہنگی تھی۔ اس کے لیے دونوں ایک ہی انداز میں سوچتے تھے۔ اس کی تعلیم و تربیت ایک خاص انداز میں ہو رہی تھی' جو مثالی تھا۔ اسے خود اعتمادی تو دی گئی لیکن ان خرابیوں سے دور رکھا گیا' جو ان کی سوسائٹی میں عام تھیں۔

ایک بات پر عثمان ہمیشہ فخر کرتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ ثوبیہ کو بہت چاہتا تھا لیکن یہ بھی درست تھا کہ شہناز اسے اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ چاہتی ہے بلکہ وہ ثوبیہ سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔ لیکن ثوبیہ نے ہمیشہ شہناز کے مقابلے میں اسے زیادہ چاہا تھا۔ بچپن میں بھی اس سے پوچھا جاتا کہ تم کس کی بیٹی ہو تو وہ ہر ترغیب کو نظرانداز کر کے فخر سے کہتی تھی... "میں پاپا کی بیٹی ہوں" اس کی ترجیح جوان ہو کر بھی پاپا ہی رہے۔

درمیان میں بارہا ایسا ہوا کہ شہناز عثمان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اس کے ساتھ رہنا اسے ہر نفس موت کی اذیت معلوم ہونے لگا۔ اس بار ثوبیہ کا خیال بھی اسے ضبط پر مائل نہیں کر سکتا تھا لیکن نجم انکل کی آخری خواہش کی خاطر وہ یہ زہر پیتا اور ہر نفس مرتا رہا۔

چودہ سال گزر گئے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ ثوبیہ نے گریجویشن کر لیا۔ وہ اتنی خوب صورت نکلی تھی کہ اس کی کہیں مثال نہیں تھی۔ صورت شکل میں وہ ماں پر گئی تھی مگر شخصیت کی انفرادی خوب صورتی خالص اس کی اپنی تھی۔ وہ بہت نیک' اطاعت شعار اور خوب سیرت لڑکی تھی۔

عثمان کو اس کی شادی کا خیال ستانے لگا۔

ایک دن شہناز نے اس سے کہا "مجھے آپ سے ایک ضروری اور اہم بات کرنی ہے۔"

عثمان کو حیرت ہوئی۔ ان کے درمیان گفتگو کم ہی ہوتی تھی

"ہوکو، کیا بات ہے؟"

"اب ہمیں ثوبیہ کی شادی کردینی چاہیے۔"

یعنی ہم آہنگی ثوبیہ کے معاملے میں یہاں تک چلی آرہی ہے۔ عثمان نے حیرت سے سوچا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کوئی رشتہ نظر میں ہے؟"

"رشتے تو اس کے کب سے آرہے ہیں لیکن آج مسز آفاق نے اسے مانگا ہے۔"

"یہ آفاق صاحب وہی ہیں نا، جن کا اسٹیلس میں کاروبار ہے؟"

"جی ہاں۔ اشفاق ان کا بیٹا ہے۔ امریکا کی شہریت ہے اس کے پاس۔ وہیں اپنا ذاتی کاروبار بھی ہے۔"

"بہت مناسب ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ اچھی فیملی ہے لیکن یہ بتاؤ، اور کوئی قابلِ ذکر رشتہ بھی آیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ عباسی صاحب کے بیٹے کا رشتہ بھی ہے۔"

"اوہ... یہ تو بہت اچھا ہے۔ بھئی مجھے تو وہ لوگ بہت پسند ہیں" اس نے کہا "اور وہ لڑکا تو مجھے بہت ہی پسند ہے۔"

"پسند تو مجھے بھی ہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ ثوبیہ امریکا چلی جائے" شہناز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

واہ رے ہم آہنگی! اس نے دل میں سوچا۔ وہ تو خود یہ چاہتا تھا کہ ثوبیہ شادی کے بعد ملک سے باہر رہے "ٹھیک ہے" اس نے گہری سانس لے کر کہا "لیکن سب سے اہم بات تو ثوبیہ کی مرضی کی ہے۔ یہ تو معلوم کرو کہ ثوبیہ کسی کو پسند تو نہیں کرتی؟"

"آپ کے نزدیک بھی اس بات کی اہمیت ہے" شہناز نے طنزیہ لہجے میں کہا "ویسے یہ میں اس سے پہلے ہی پوچھ چکی ہوں۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔"

"تو پھر اس رشتے کے سلسلے میں بات کرو اس سے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ یہ بات آپ کی موجودگی میں ہو۔"

"تو اسے ابھی بلوالو۔"

شہناز نے ثریا سے کہہ کر ثوبیہ کو بلوالیا۔ ثوبیہ کو اس رشتے کے بارے میں بتایا گیا۔ شہناز کے پاس اشفاق کی تصویر بھی تھی۔ وہ بھی ثوبیہ کو دکھادی گئی۔

"پاپا، میرا ایمان ہے کہ میرے معاملے میں آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں گے، اس میں میری بہتری ہوگی" ثوبیہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا "لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے امریکا پسند نہیں۔ میں اپنے وطن میں ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"کیا تمہیں خود پر اعتماد نہیں؟ ہم نے تو تمہاری تربیت ایسی کی ہے کہ..."

"یہ بات نہیں پاپا۔ لیکن بلاوجہ خود کو آزمائش میں کیوں ڈالا جائے۔"

"ٹھیک ہے بیٹی۔ ویسے میری خواہش تو یہی تھی کہ... تمہارے پاپا بھی یہی چاہتے ہیں" شہناز نے کہا۔

"تو ممی مجھے انکار کب ہے۔ آپ کی اور پاپا کی خوشی میری خوشی ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس روز عثمان نے سکون کی سانس لی۔

○☆○

پُرزور تالیوں کی مسلسل آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔ مسز شمیم ابھی اسٹیج پر موجود تھیں اور سبھی لوگ تالیاں بجارہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ اسی وقت احسان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گرم جوشی سے دبایا "مبارک ہو دوست، دلی مبارک باد۔"

"کس بات کی مبارک باد دے رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کہاں کھوئے ہوئے تھے؟ تم نے سنا ہی نہیں.... عجیب آدمی ہو۔ فکر کیوں کرتے ہو۔ ابھی چند منٹ میں تمہیں بھابی کے ساتھ تنہائی میسر آجائے گی۔"

وہ چڑ گیا "بتاتے کچھ نہیں ہو اور اپنی ہانکے جارہے ہو، ہوا کیا ہے؟"

"مسز شمیم نے اپنی انجمن کی طرف سے تمہیں اور بھابی کو اس سال کے مثالی جوڑے کا ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ چلو، ان کا شکریہ تو ادا کرو" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اسٹیج کی طرف لے چلا۔ شہناز پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

تالیاں تھم گئیں تو احسان نے مائیک تھامتے ہوئے کہا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ اب عثمان حفیظ مسز شمیم کا شکریہ ادا کریں گے" اس نے مائیک عثمان کی طرف بڑھایا۔

عثمان نے مائیک ہاتھ میں لے کر ایک نظر شہناز کے مسکراتے چہرے کو اور پھر چہروں کے ہجوم کو دیکھا۔ مسکراہٹ تو سبھی کے چہروں پر تھی لیکن زیادہ تر کی آنکھوں میں حسد بھی نظر آیا۔ کچھ ہونٹ ایسے بھی تھے جن پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی "خواتین و حضرات! سب سے پہلے تو میں آپ سب کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ نے اس تقریب کو رونق بخشی پھر میں انجمنِ شادی شدہ خواتین کے حسنِ ظن پر ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیں اس ایوارڈ کے قابل سمجھا۔ یہ انجمن کے اراکین کی محبت اور نوازش ہے کہ انہوں نے ہمیں نوازنے کا فیصلہ کیا لیکن میں بہت عاجزی، دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ان کے اس فیصلے سے اختلاف کررہا ہوں...." اس پر احتجاجی آوازیں ابھریں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا "یہ کوئی رسمی انکسار نہیں، سچی بات ہے۔ میں نے اور شہناز نے ایسی ازدواجی زندگی نہیں گزاری کہ مثالی جوڑا کہلائیں۔ یہ بات ہم دونوں سے زیادہ تو کوئی نہیں جانتا اس لیے میں یہ ایوارڈ قبول کرنے سے مؤدبانہ انکار کرتے ہوئے یہ التماس کروں گا کہ یہ ایوارڈ ہمارے بجائے کسی

مستحق جوڑے کو دیا جائے۔"
دیر تک سناٹا رہا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کچھ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹیں تھیں۔ پھر مسز شمیم نے کہا "یہ تو آپ کا فیصلہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شہناز اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں۔"
"میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے" عثمان نے کہا۔ "ایوارڈ دونوں کا مشترکہ ہے۔ لہٰذا ایک فریق کا انکار بھی کافی ہے۔ اس سے بہترین جوڑے کے ایوارڈ کی نفی ہو جاتی ہے۔"
"بات معقول ہے" اختر ہاشمی نے سہلاتے ہوئے کہا۔
"اس کے باوجود میں شہناز سے جواب سننا چاہوں گی" مسز شمیم بولیں۔
شہناز مسکراتی ہوئی اسٹیج پر آئی اور مائیک میں کہا "خواتین و حضرات! ۲۵ سال میں شاید یہ پہلا موقع ہے کہ میں اور عثمان کسی بات پر متفق ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کیا کہوں۔"
اس شگفتہ جواب اور اس کے مزاحیہ لہجے نے لمحوں میں ماحول کی کشیدگی دور کردی۔ خوب قہقہے لگے۔
مسز شمیم نے اپنی کھسیاہٹ دور کرنے کے لیے خود بھی شگفتگی کا سہارا لیا "اگرچہ ان دونوں کا اس موقع پر اتفاق رائے انہیں مثالی جوڑا ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ تاہم انجمن شادی شدہ خواتین اپنے اعلان کو واپس لیتی ہے۔ ہم سب ان دونوں کی سچائی اور دیانت کو سلام کرتے ہیں۔"
ایک بار پھر لان تالیوں سے گونج اٹھا۔

○☆○

اور اب وہ اکیلے تھے!
تقریب ختم ہو چکی تھی۔ لان کی تمام روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ نوکر سرونٹ کوارٹرز میں جا دبکے تھے۔ لیکن ان دونوں کو یہی روشن کمرا بھی تاریک سا لگ رہا تھا۔ آدمی بہت زیادہ روشنی میں بہت دیر رہے تو یہی ردِّعمل ہوتا ہے۔ نارمل روشنی روشنی ہی نہیں لگتی۔ اندھیرا معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی روشنی آنکھوں سے دل تک اندھیرے ہی اندھیرے بکھیرتی ہے۔
عثمان اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ اس نے آکر شراب کی بوتلوں والی کیبنٹ کھولی اور اس میں رکھی ہوئی بوتلوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے شوکیس سے جام نکالے۔ پہلا جام اس نے بڑے اہتمام سے توڑا اور ڈسٹ بن کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ ملیں "کم ان" اس نے کہا۔
دروازہ کھلا اور شہناز کمرے میں آگئی۔ اس نے بڑی دلچسپی سے اس کے ہاتھ میں موجود ٹوٹے جام کو دیکھا "ٹوٹ گیا؟" اس نے پوچھا۔
عثمان نے ٹوٹے ہوئے جام کو ڈسٹ بن میں اچھال دیا "نہیں، توڑ دیا" اس نے جواب دیا "اب ضرورت جو نہیں رہی۔"

"میں بیٹھ سکتی ہوں۔"
"بی مائی گیسٹ" عثمان نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔
شہناز صوفے پر بیٹھ گئی "بہت خوش نظر آرہے ہو؟"
"اس کا تو مجھے علم نہیں۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ آج میں بہت خوش ہوں۔"
"شاید اس لیے کہ آج اتنے بہت سارے لوگوں کے سامنے میری بے عزتی اور توہین کرنے کا موقع ملا تھا" شہناز کے لہجے میں کاٹ تھی۔
عثمان نے تمام جام سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیے "تم غلطی پر ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا "مواقع تو بہت ملے لیکن میں نے ان سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم کس توہین اور بے عزتی کا حوالہ دے رہی ہو۔"
"بنو مت۔ تم جانتے ہو۔ تم نے وہ ایوارڈ ٹھکرا کے میری توہین کی، مجھے تماشا بنایا، لوگوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع دیا۔"
"بہت خوب۔ یہ تمہارا نکتہ نظر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ایسا کر کے تمہیں مستقل طور پر اور مسلسل تماشا بننے سے بچالیا ورنہ لوگ ساری عمر تم پر ہنستے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں اس پر اعتراض کیوں ہے۔ کیا میں نے غلط کیا؟ کیا ہم مثالی جوڑا ہیں؟"
"اتنے برسوں کی منافقت کے بعد ایک اور منافقت میں کوئی حرج نہیں تھا" شہناز نے کہا۔ وہ بے حد نرم لہجے میں بات کر رہی تھی۔
"یہ ایوارڈ اب سے ایک سال پہلے بھی دیا جاتا تو میں شکریے کے ساتھ ہنسی خوشی اسے قبول کر لیتا۔ اس وقت تک میں منافقت پر مجبور تھا مگر آج نہیں ہوں۔ آج ہم مثالی جوڑا کہلاتے تو کل نشانِ عبرت بن جاتے۔ میں اپنے معاشرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ شادی کے انسٹی ٹیوشن پر لوگوں کا ایمان رہے۔ یہ تباہ نہ ہو ورنہ معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔"
"کیسی ہیرو جیسی باتیں کر رہے ہو۔"
"حالانکہ ولن ہوں، ہے نا؟"
شہناز اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی پھر وہ رک کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی "سنو عثمان حفیظ، تمہیں شاید معلوم نہیں۔ آج تم حد سے گزر گئے۔ ساری حدیں پھلانگ گئے اور آج میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلک گیا۔ میرا ضبط جواب دے گیا ہے۔"
"حد! تمہیں معلوم بھی ہے کہ حد کیا ہوتی ہے؟ صبر.... اس عظیم جذبے کو سمجھتی بھی ہو تم؟ ضبط.... ضبط کا مفہوم بھی معلوم ہے تمہیں؟" عثمان نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔
"مجھ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے، میں نے ۲۵ سال ضبط کیا ہے۔"

"بہت خوب!" عثمان ہنسنے لگا "میں چاہتا تو یہ تھا کہ تم ہیروئن ہی رہو اور میں ولن ہی رہوں لیکن تم نہیں چاہتیں تو یہی سہی۔"

"آج یوم احتساب ہے عثمان حفیظ!"

"ٹھیک ہے جان۔ شروع ہو جاؤ" عثمان نے بڑے پیار سے کہا۔

"بتاؤ کہ میں نے کیا کیا زیادتیاں کیں تمہارے ساتھ۔ کیا کیا ظلم کیے۔ کیا ضبط کیا ہے تم نے؟ مجھے یقین ہے کہ آج بڑے پیارے لفظوں کے بہت مختلف مفاہیم سامنے آئیں گے۔ آج میں تمہیں بتاؤں گا کہ عمر بھر بھاگتے رہنے والا چور کوتوالی کو کیسے ڈانٹتا ہے" یہ کہہ کر وہ گنگنانے لگا "کل شب احتساب تھی، شب بھر۔ آئینوں میں کھڑے رہے ہم بھی۔"

شہناز اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی "پوچھتے ہو کہ میں نے کیا ضبط کیا! جانتے نہیں ہو کیا؟ یاد نہیں ہے کہ کیا کچھ کرتے رہے ہو تم؟ تم نے خود کو شراب میں ڈبو لیا۔ تم مسلسل بدکاری میں مبتلا رہے۔ خود کو آوارہ کال گرلز پر نچھاور کرتے رہے۔ وہ میری توہین نہیں تھی؟ تم شرابی اور عیاش کہلائے۔ تمہارے حوالے سے مجھے طعنے ملے۔ بچوں نے بھی یقیناً یہ اذیت اٹھائی ہوگی۔ انہوں نے اپنے دوستوں، اپنی سہیلیوں سے تمہارے کارنامے ضرور سنے ہوں گے....."

"لیکن وہ پھر بھی مجھ سے محبت کرتے رہے۔"

"بیچ میں مت بولو۔ مجھے اپنی بات پوری کرنے دو" پہلی بار شہناز کے لہجے میں تندی آئی۔

"سوری، تم کہتی رہو۔"

"تم نے خود سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو رسوائی دی میرے پاپا تمہاری وجہ سے عمر بھر شرمندہ رہے۔ تم سمجھتے تھے کہ تمہاری عیاشیاں سب سے چھپی ہوئی ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ تم ذلت کی کس گہرائی میں گر چکے ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا عثمان حفیظ۔ سب جانتے تھے، تمہارے دفتر کے تمام ملازم جانتے تھے۔ ان کے ذریعے پورے شہر کو یہ سب کچھ معلوم ہو گیا۔ لوگ مجھ سے ہمدردی کرنے کے بہانے نشتر زنی کرتے رہے۔ یہ سب کچھ سہا میں نے..... اور بچوں نے۔ اور تم نے مجھے کیا دیا؟ عزت تک نہیں دی۔ آج ان سب لوگوں کے سامنے مجھے ذلیل کر دیا، جو تمہاری اصلیت سے واقف ہیں۔ جنہیں سب کچھ معلوم ہے۔ یہ عزت دی تم نے مجھے" وہ اب ہانپ رہی تھی۔

"کہہ چکیں؟ اب مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟" عثمان نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔

شہناز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"پہلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہوں گا" عثمان نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ اگر میں نے یہ سب کچھ ایسے کیا ہوتا کہ تمہارے سوا کسی کو پتا نہ چلتا تو کیا تم اسے درست کہتیں؟ اگر تمہیں اور بچوں کو میری بدکاریوں کے طعنے نہ سننے پڑتے تو کیا تمہارا کرب کم ہو جاتا؟ کیا بدکاری چھپانا کوئی کامیابی ہے؟ کیا اس صورت میں بدکاری لائق عذاب نہیں ہوتی؟ اگر یہ درست ہے تو میری اصل غلطی یہ ہوئی کہ میں چھپ کر گناہ نہیں کر سکا۔ گناہ کر کے پردہ نہیں رکھ سکا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہے یا نہیں۔ گناہ تو گناہ ہے۔ بدکاری تو بدکاری ہے۔ بری عورتوں کے پاس جاؤ گے تو کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو، میری توہین و تذلیل تو بہرحال ہوگی۔ مجھے اذیت تو بہرکیف پہنچے گی۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔ کیسا درست اور سچا جواب دیا ہے تم نے۔ اب ایک بات اور بتاؤ، تمہیں اب اس رسوائی میں زیادہ اذیت پہنچی ہے یا اس صورت میں تمہاری اذیت زیادہ ہوتی کہ میرے کرتوتوں کا کسی کو علم نہیں ہوتا؟ کون سی اذیت زیادہ بڑی ہے، سوچ سمجھ کر جواب دو۔"

شہناز کی آنکھوں سے الجھن جھانکنے لگی "تم تو یوں تبادلۂ خیال کر رہے ہو، جیسے یہ کوئی علمی مسئلہ ہے، جسے عقل اور منطق سے حل کیا جانے والا ہو۔"

"بات ایسی ہی ہے۔ اس بات کی بہت اہمیت ہے" عثمان نے گہری سانس لے کر کہا "چلو، تمہاری آسانی کے لیے میں اس سلسلے میں ایک تھیوری پیش کرتا ہوں۔ تم صرف اتنا بتانا کہ تمہیں اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ لوگوں کو معلوم ہونے کی صورت بہتر ہے۔ وہ تم سے ہمدردی کرتے ہوں گے۔ تمہیں مظلوم سمجھتے ہوں گے اور مظلومیت کا احساس اذیت کو کم کر دیتا ہوگا۔ اب سوچو کہ میری بدکاری کا علم صرف تمہیں ہے، کوئی اور اس بارے میں نہیں جانتا۔ ظاہر ہے، تم کسی کو بتانا بھی نہیں چاہو گی تو دوہرا عذاب اکیلے ہی سہتی رہو گی۔ تمہارا دل کبھی ہلکا نہیں ہوگا اور وہ بوجھ گزرتے لمحے کے ساتھ دگنا ہوتا جائے گا۔ وہ اذیت زیادہ ہوگی یا نہیں؟"

"میں علمی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنی اذیت کی بات کر رہی ہوں۔"

"میں بھی اذیت ہی کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے جواب چاہیے۔"

"تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ اپنے گناہوں کی تشہیر کر کے تم نے میری اذیت کم کر دی۔ مجھ پر احسان کیا" شہناز نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تم نے بالواسطہ تسلیم کر لیا کہ میری تھیوری درست ہے۔ خاموشی سے اکیلے عذاب سہنے کی اذیت کہیں زیادہ ہے۔"

شہناز خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"لہٰذا ثابت ہو گیا کہ میری اذیت بہت بڑی تھی" عثمان نے کہا۔

شہناز مضحکہ اڑانے والے انداز میں مسکرائی "تو تم نے بھی اذیت اٹھائی ہے؟ بہت خوب۔ واقعی.... اذیت دینے میں تو بہت زیادہ اذیت ہوتی ہوگی۔"

"میں نے۔" عثمان نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "...میں نے تو وہ اذیت اٹھائی ہے کہ پہاڑ اٹھاتا تو ریزہ ریزہ ہوجاتا۔ سمندر پر پڑتی تو وہ غیظ و غضب میں پوری زمین نگل جاتا۔ میں نے وہ اذیت بڑی خاموشی سے اٹھائی ہے۔ اندر سے ہر لمحہ ٹوٹتا رہا ہوں میں" اس کی آواز بھرا گئی۔

"واقعی؟ ولن تو ہیرو بن رہا ہے۔"

عثمان نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں "تم کہتی ہو کہ میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ عزت بھی نہیں دی۔ جھوٹ کہتی ہو تم۔ میں نے تمہیں وہ محبت دی' جو تمہیں کہیں اور سے نہ کبھی مل سکی اور نہ ہی مل سکے گی' جس کی تم مستحق بھی نہیں تھیں۔ میں نے تمہیں پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ سب سے قیمتی چیز دی جو کوئی مرد کسی عورت کو دے سکتا ہے۔ تم کہتی ہو' میں نے تمہیں عزت نہیں دی۔ ارے میں نے تو تمہیں اپنی عزت بنالیا' کوئی مرد کسی عورت پر اس سے بڑا اعتبار نہیں کرسکتا۔ اس سے زیادہ کچھ دے نہیں سکتا۔ اور تم نے کیا کیا؟ میری عزت کو دنیا کے بازار کی سب سے ارزاں چیز بنادیا۔ میں نے تمہیں اپنی عزت بنایا تھا' تم نے خود کو رہگذر کی طرح بچھادیا.... عام رہگذر بنالیا خود کو' جس کو ہرا یرا غیرا' چور' چمار جب چاہتا روند سکتا تھا۔ کون سا ایسا طبقہ ہے' جس کا کوئی فرد اس رہگذر سے نہیں گزرا۔ باہر کے لوگوں کی بات چھوڑو۔ میرے نوکر' میرے مالی' میرے ڈرائیور تک کو تم نے سیراب کیا۔ پیاسا صرف میں ہی رہا" اب وہ طوفان کی طرح گرج رہا تھا۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ دم بخود سہمی ہوئی بیٹھی ہے۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا ہے "برسوں پہلے تم نے کال گرلز کی بات کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا.... ان میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ میں نے کہا تھا' ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں' جو تم میں ہیں۔ اور اضافی خوبیاں بھی ہیں۔ مثلاً وہ موڈ کی پابند نہیں ہوتیں۔ انکار نہیں کرتیں' برف کی سل ثابت نہیں ہوتیں اور یہ کہ وہ ضرورتاً خود کو فروخت کرتی ہیں۔ یہ سوال اب پوچھو تو میں کہوں گا.... نہیں شہناز بیگم' وہ بے چاریاں تمہارے سامنے بے حقیقت ہیں۔ وہ تمہارے قدموں کی دھول ہیں۔ انہوں نے اپنا ریٹ مقرر کرکے خود کو ایک معیار تک محدود کرلیا ہے۔ جبکہ تم لامحدود ہو' تمہارا کوئی معیار نہیں۔ وہ بے چاریاں خود کو ضرورتاً فروخت کرتی ہیں۔ جبکہ تم خود کو بلا ضرورت فروخت کرتی ہو بلکہ تم خود کو فروخت بھی نہیں کرتیں۔ تمہاری کوئی قیمت ہی نہیں۔ تم تو زمین پر پڑی مٹی ہو' جسے کوئی بھی اٹھالے۔ لوگ مفت میں ملنے والی دولت بھی یوں خرچ نہیں کرتے' جیسے تم خود کو بانٹتی ہو۔ ہر جھولی میں گرجاتی ہو۔ خواہ وہ پھیلی ہوئی بھی نہ ہو۔"

"عثمان' تم حد سے...."

"خاموش رہو۔ آج شبِ احتساب ہے۔ یہ احتساب کی فرمائش بھی تمہاری ہی تھی۔ اب ساکت کھڑی رہو' آئینوں کے سامنے۔ اپنا چہرہ ہر زاویے سے دیکھ لو" عثمان دہاڑا "میں نے تمہیں اپنی عزت بنایا تھا۔ تم میری عزت تھیں۔ تم نے میری عزت کو تار تار کرڈالا لیکن یہ بھول گئیں کہ تمہارا وجود تار تار ہورہا ہے۔ تم میرے ذلت کی گہرائیوں میں گرنے کی بات کررہی تھیں۔ تمہیں کبھی یہ نظر نہیں آیا کہ تم کس پستی تک پہنچ چکی ہو۔ اب بیٹھ کر اپنے خسارے کا حساب کرو۔ تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں بچے گا اور کھاتے میں تمہارے حساب میں اب بھی بے حساب ہوگا۔"

دیر تک خاموشی رہی۔ شہناز گم صم بیٹھی تھی پھر اس نے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ نقوش کرخت ہوگئے تھے۔ آنکھوں میں خوف ناک چمک تھی "تو تمہیں مجھ سے کیا توقع تھی؟ تم سمجھتے تھے کہ تمہاری آوارگیوں پر میرا کوئی ردِ عمل نہیں ہوگا؟"

"ردِ عمل!" عثمان نے حقارت سے کہا "تم کسی بڑی خوش فہمی میں ہو۔ یہ تمہارا ردِ عمل تھا میری آوارگی پر؟"

"ہاں۔ میں تم سے انتقام لے رہی تھی۔"

"انتقام لے رہی تھیں تو پھر ضبط کا ڈھنڈورا کیوں پیٹتی ہو۔ انتقام اور ضبط ساتھ ساتھ نہیں چلتے" عثمان نے زہریلے لہجے میں کہا "اور یہ انتقام بھی خوب ہے۔ تم نے میرا کیا بگاڑا' سوچو تو خود کو ہی تباہ کیا۔ ارے تم تو آئینہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہیں۔ میں خراب ہوا تھا تو تم نے خود کو اور زیادہ خراب کرلیا۔ کس بات کا انتقام تھا یہ...؟"

"وہ بھی بتادوں گی" شہناز کے لہجے میں مضبوطی آگئی "ورنہ تم یہی سمجھتے رہوگے کہ مجھے تمہاری عیاشی بری لگتی تھی" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی "مجھے تمہاری عیاشی سے کوئی غرض نہیں تھی' کوئی پروا نہیں تھی مجھے۔"

"میں جانتا ہوں کہ یہ بات نہیں" عثمان نے اعتماد سے کہا "بنیادی طور پر تمہاری فطرت ہی خراب تھی۔"

"تم مشکور کو جانتے ہو؟" شہناز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں.... جانتا ہوں۔"

"اس سے ملے ہو؟"

"دوبار دیکھا ہے اسے۔ ایک بار ملا ہوں۔ دوسری بار ملنا نہیں چاہتا۔"

"تم نے اسے دھمکی دی تھی؟"

"دھمکی تو خالی خولی ہوتی ہے۔ میں نے اسے وارننگ دی تھی۔ عقل مند آدمی ہے' سمجھ گیا۔"

شہناز نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے اعتراف کرلے گا "کتنی ڈھٹائی ہے تمہارے اندر۔ کیسے سکون سے کہہ رہے ہو کہ اسے وارننگ دی تھی۔ تم ان باتوں کا تذکرہ اتنے فخر سے کررہے ہو؟" اس کے لہجے میں ملامت تھی۔

"وارننگ نہ دیتا تو کیا تو مینی خط لکھتا اسے" عثمان نے سخت لہجے میں کہا "اور گھٹیا پن کی بات مت کرو۔ میں نے ایسا گھٹیا پن دیکھا ہے کہ جس سے انسانیت شرم سار ہو کر رہ جائے۔ اور کم از کم تمہارے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔"

"مشکور کی سب سے بڑی بیٹی کی کیا عمر ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی کوئی بیٹی بھی ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم خوب جانتے ہو کہ اس کی تین بیٹیاں ہیں۔"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر وہ تین بیٹیوں کا باپ ہو کر ایسا ہے تو اس کی بے غیرتی میں کوئی کلام نہیں۔"

"اور کسی باپ کو اس کی معصوم بیٹیوں کے حوالے سے بلیک میل کرنے والے کو کیا کہو گے؟" شہناز نے تند لہجے میں کہا "تمہیں اس کی بچیوں کے متعلق رکیک دھمکیاں دیتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

"تو موصوف جھوٹ بھی غضب کا بولتے ہیں" عثمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مشکور جھوٹا نہیں۔ وہ مرد ہے، صاف بات کرتا ہے اور منہ پر کرتا ہے" شہناز کا لہجہ فخریہ تھا۔

"اور پھر بھی اس نے تمہیں اصل بات نہیں بتائی کہ میں نے اسے کیا وارننگ دی تھی؟"

"وہ مجھے بتا چکا ہے۔ تم جھوٹ بول کر اپنے گھٹیا پن پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔"

"جھوٹ سچ تو خیر تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال میں تمہاری.... بلکہ اس کی بات درست مان لیتا ہوں۔ اب مجھے بتاؤ کہ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم مجھ سے اس دھمکی کا انتقام لے رہی تھیں؟"

"ہاں۔ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں اس گھٹیا پن کی بدترین سزا دوں گی، جسے تم کبھی نہیں بھول سکو گے۔"

"چلو مان لیا کہ تم نے مجھے سزا دینے کے لیے خود کو طوائف بنا ڈالا.... بلکہ اس سے بھی بدتر۔ زمین پر پڑی ہوئی کھوٹی چونی، جسے ہر راہ گیر اٹھا کر دیکھتا تھا اور چند لمحے بعد دوبارہ وہیں پھینک دیتا تھا۔ جیب میں رکھنے کی زحمت کوئی بھی نہیں کرتا تھا" وہ غور سے شہناز کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہر لفظ پر وہ یوں سمٹ رہی تھی جیسے وہ کوڑا بن کر لگ رہا ہو۔ "مگر اب یہ بتاؤ کہ بہت پہلے.... اٹھارہ برس.... بلکہ شاید اس سے بھی پہلے سے جو گھناؤنا کھیل تم مشکور کے ساتھ کھیل رہی تھیں، اس کا کیا جواز تھا؟ اس وقت تو میں نے یہ نوٹس بھی نہیں شروع کی تھی۔ میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی دوسری عورت بھی نہیں تھی۔ بولو.... جواب دو مجھے اس بات کا؟"

شہناز اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "تت.... تت.... تو.... تک.... تو کیا....؟" اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں۔ مجھے اٹھارہ برس سے معلوم ہے یہ بات" عثمان نے نفرت بھرے لہجے میں کہا "تم ابھی کچھ دیر پہلے حد کی بات کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ میں حد سے گزر چکا ہوں۔ ساری حدیں پھلانگ چکا ہوں۔ تم حد کیا جانو۔ حد تو تم پر عائد کی جا سکتی تھی۔ ساری حدیں تو تم پھلانگ گئی تھیں۔ تم صبر و ضبط کی بات کر رہی تھیں ابھی۔ صبر اور ضبط تم کیا سمجھو گی۔ میں نے صبر کیا ہے.... میں نے ۱۸ برس ضبط کیا ہے۔ میں زہر تھوکنے کے بجائے اپنے اندر اتار تا رہا ہوں۔ سمجھیں زہریلی ناگن...."

"لیکن کیسے؟"

"موسم.... ہاں، وہ موسم تھا، جس نے تمہارے گناہ کو بے نقاب کیا تھا...."



عثمان حفیظ اس رات کو کبھی نہ بھول سکا۔ بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی تمام جزئیات اس کے دماغ پر نقش ہو گئی تھیں۔

اندر کا حال بھی ابتر ہی تھا۔ وہ ان دنوں شہناز کے مزاج کے سرد و گرم کا سب سے سخت موسم جھیل رہا تھا۔ ایک دن اچانک ہی وہ اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ مہربانی طول پکڑے گی، مگر ہوا ایسا ہی۔

شہناز کی مہربانی کا وہ موسم ایک سال سے زیادہ عرصے پر محیط تھا اور وہ بہت خوش تھا۔ زندگی خوب صورت ہو گئی تھی۔ گھر جنت بن گیا تھا۔ شہناز کے ہونٹوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ کے گلاب ہوتے۔ اس کی آنکھوں میں بلاوے ہوتے اور انداز میں محبت۔ وہ سوچتا کہ شاید یہ حقیقت نہیں، محض ایک خوب صورت خواب ہے۔ لیکن خواب میں ایسا کیف کہاں ہوتا ہے؟

ہر زمین کا اپنا ایک موسم ہوتا ہے۔ شہناز کو اس نے پانچ سال دیکھا تھا۔ اس کے موسم روز بدلتے تھے.... پل پل بدلتے تھے۔ اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کا کوئی موسم دیرپا بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ حیران تھا اور اس حیرانی نے اس کے انبساط کو دوچند کر دیا تھا۔

وہ بہار سے پہلے آنے والی بارش کا موسم تھا۔ وہ بارش جو بہار کی نقیب ہوتی ہے۔ جس کا ایک ایک قطرہ سوکھے درختوں کو نمو سونپتا ہے۔ جس کی وجہ سے شاخوں کے مساموں سے کلیاں

سفر کے دوران ایک عمر رسیدہ اور تھکے ہارے تاجر نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ رات ہوتے ہی وہ بستر میں جا گھسا۔ اچانک دروازہ کھلا اور شوخ لباس والی ایک خوش ادا حسینہ نے اندر جھانکا۔

"معاف کیجیے.... میرا خیال ہے میں غلط کمرے میں آ گئی ہوں" وہ ایک خاص ادا سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں خاتون! آپ نہ صرف غلط کمرے میں آ گئی ہیں بلکہ بیس سال تاخیر سے بھی پہنچی ہیں۔" تاجر نے کراہ کر جواب دیا۔

سر اٹھاتی ہیں۔ شرماتی ہوئی ہری ہری کونپلیں پھوٹتی ہیں، شگوفے کھلتے ہیں۔

ہاں، وہ بہار سے پہلے کی بارش تھی۔ وہ برس رہی تھی اور وہ بھیگ رہا تھا۔ اس بھیگنے میں، شرابور ہونے میں ایسی سرشاری تھی، جس سے وہ واقف ہی نہیں تھا۔

ایسی لذت تھی کہ وہ ساکت ہو جاتا تھا لیکن اس کے اندر رقص کا سماں جاگ اٹھتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے وجود میں پورا گلستان بن گیا ہے۔ رنگا رنگ اور مہک سے لدے ہوئے پھول جھوم رہے ہیں۔ بارش اور کچھ دیر ہو گئی تو وہ باہر سے بھی کھل اٹھے گا۔

لیکن اس پر بہار نہیں آئی۔ بارش وقت سے پہلے رک گئی۔ موسم تبدیل ہو گیا۔ آسمان چلچلاتی دھوپ سے بھر گیا۔ چلچلاتی دھوپ.... اور وہ بھی بارش کے بعد کی دھوپ جس کی ہر سانس نیزے کی تیز دھار والی انی ہوتی ہے۔ آخری نمو کی محتاج کلیاں سہم گئیں۔ اس دھوپ میں کملانے لگیں، مرجھا گئیں۔ کونپلوں کی سانسیں تھمنے لگیں۔ شگوفوں کے دم گھٹ گئے۔ آتی ہوئی بہار کے بجائے خزاں کے آنے کا تجربہ بالکل نیا تھا۔

اس کے اندر رقص کا سماں تو اب بھی تھا لیکن اب وہ رقصِ وحشت تھا۔

جیسے ایک سال پہلے شہناز مثبت طور پر بدلی تھی، اب منفی طور پر بدل گئی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔ لیکن نہیں، پہلے جیسا کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ درست کہ وہ وہی بے رخی اور سرد مہری جھیل رہا تھا، جو اس نے شادی کے پہلے پانچ برس میں جھیلی تھی۔ وہ اسی برفانی دیوار سے اپنا وجود ٹکرا رہا تھا، جو اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ لیکن فرق تھا... بہت بڑا فرق تھا۔ اب وہ اس دیوار کے اندر کی حدت پی چکا تھا۔ جانتا تھا کہ وہاں لاوا بھی ہے۔ لیکن اس لاوے کو جگانے والا منتر اسے معلوم نہیں تھا۔ وہی اذیت، جو وہ پہلے بھی اٹھاتا رہا تھا اور زندہ رہا تھا، اب اسے لذت کے، کیف و انبساط کے بعد ملی تھی تو لگتا تھا کہ وہ نہیں سہہ سکے گا۔ یہ اذیت اب اسے مار ڈالے گی۔ ختم کر دے گی۔ تیز بارش میں بھیگنے والے جسم پر اچانک تیز دھوپ پڑے تو وہ تو ٹوٹے گا ہی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ ایک لڑکا تھا، جو لذتوں سے بے خبر تھا۔ جسے کچھ معلوم نہیں تھا مگر پچھلے ایک سال نے اسے مکمل مرد بنا دیا تھا جس پر زندگی کے تمام راز کھل چکے ہوں۔ اب وہ اذیت کا ہر مفہوم سمجھ سکتا تھا۔

وہ سوچتا کہ یہ سب کیوں ہوا.... کیسے ہوا۔ وہ تو اپنی جگہ قانع ہو چکا تھا۔ اس نے محرومی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ پھر شہناز میں وہ تبدیلی کیوں آئی اور اب وہ پھر پہلے جیسی کیوں ہو گئی۔ جو اذیت وہ اٹھا رہا ہے، وہ شہناز کو بھی تو ہوتی ہوگی۔

لیکن اسے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔

تو یہ وہ حالات تھے، یہ اس کی کیفیت تھی کہ وہ رات آ پہنچی۔

اسے ایک اجازت نامے کے سلسلے میں اسلام آباد جانا تھا۔ نائٹ کوچ میں اس کی سیٹ ریزرو تھی۔ فلائٹ ساڑھے دس بجے کی تھی۔

وہ شام کو گھر جانے کے لیے دفتر سے نکلا تو موسم بہت خوش گوار ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ ڈرائیو کرنے میں اسے بہت لطف آیا۔ لیکن یہ وہ دن تھے جب اسے بارش سے نفرت ہو گئی تھی۔ اندر محرومی کا موسم چل رہا ہو تو باہر کا خواہش جگانے والا موسم کسے اچھا لگتا ہے۔ اس روز موسم نے اسے اور بھڑکا دیا تھا۔ اپنی خودداری اور عزتِ نفس کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اس نے شہناز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ معمول کے مطابق اس کا ہاتھ جھٹک دیا گیا۔ اپنے مزاج کے خلاف اس نے التجائیں کیں۔ اس نے خوشامد کی لیکن شہناز ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں" شہناز نے تنگ کر کہا تھا "یہ جسم اور روح، دل اور دماغ کے امتزاج کا مسئلہ ہے۔ یہ کوئی بجلی نہیں کہ سوئچ دبایا، روشنی کر دی۔ سوئچ دبایا، اندھیرا کر دیا۔ یہ گیس کا چولھا نہیں کہ ناب گھمائی، دیا سلائی دکھائی اور چولھا جل گیا۔"

"مگر میں کیا کروں؟" اس نے بے بسی سے کہا "تم نے مجھے ایسا آن کیا ہے کہ میں خود کو آف کر ہی نہیں پا رہا ہوں۔"

"میرے آن کرنے سے آن ہو گئے تو آف کرنے سے آف کیوں نہیں ہوتے۔"

"مجھے نہیں پتا" وہ جھنجلا گیا "تم خود سوچو۔ کتنا عرصہ ہو گیا۔ ایک نارمل آدمی کے لیے یہ بہت ہوتا ہے۔"

"مگر میں کیا کروں۔ میری آمادگی کا بھی تو کوئی سوئچ نہیں۔"

"بس آج تم میری خاطر.... پلیز...." وہ گڑگڑانے لگا۔

"یہ تو ممکن نہیں عثمان۔ ہاں، میں یہ کر سکتی ہوں کہ پہلی فرصت میں کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کروں۔"

"پلیز شہناز...."

"سوری عثمان۔ چھوڑو۔ یہ بتاؤ، کھانا کھاؤ گے؟"

"نہیں۔ بھوک نہیں ہے۔"

"آج بارش ہو رہی ہے۔ کچھ پکوان تیار کراؤں؟"

"نہیں۔ مجھے خواہش نہیں ہے۔"

"حالانکہ برسات میں پکوڑوں کے لیے پاگل ہو جاتے ہو۔"

"پاگل تو اب بھی ہو رہا ہوں لیکن تمہارے لیے۔"

"واپس کب آؤ گے؟" شہناز نے پوچھا۔

"کل تک آنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے امکان یہی ہے کہ واپسی پرسوں ہی ہوگی۔"

وہ ائرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکلا تو بوندا باندی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ڈرائیور اسے ائرپورٹ چھوڑ کر گھر واپس چلا گیا۔ اس نے بورڈنگ ٹکٹ لیا اور لاؤنج میں چلا گیا۔

جہاز نے ٹھیک ساڑھے دس بجے ٹیک آف کیا۔ وہ بے حد ہموار پرواز تھی لیکن اس کے نصیب میں اسلام آباد لینڈنگ نہیں تھی۔ وہ اسلام آباد پہنچے تو وہاں موسم اتنا خراب ہو چکا تھا کہ جہاز کا لینڈ کرنا ناممکن تھا۔ متبادل ائرپورٹس کو بھی ٹرائی کیا گیا لیکن بات نہیں بنی۔ آخری فیصلہ یہی ہوا کہ فلائٹ کراچی واپس جائے گی۔

جہاز خیریت سے کراچی پہنچ گیا۔ بوندا باندی اب بھی جاری تھی۔ ٹرمنل سے باہر آکر اس نے ٹیکسی کی اور گھر کی طرف چل دیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ بارش تیز ہو گئی ہے۔ اس نے کھڑکی کے شیشے چڑھا دیے۔

بارش مسلسل زور پکڑ رہی تھی۔ بارش کی ٹپاٹپ اسے اپنے دل پر بجتی محسوس ہوئی۔ وجود میں پھر شوریدہ سر خواہشوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی دل میں امید بھی جاگ اٹھی۔ شہناز تنہائی محسوس کر رہی ہو گی۔ کون جانے، یہ موسم اس پر بھی اثر انداز ہوا ہو۔ وہ سوچ رہی ہو کہ کاش اس وقت وہ اس کے پاس ہوتا۔ کون جانے، اس کے وجود میں بھی اس وقت خواہشیں اسی طرح شور مچا رہی ہوں۔ اور ایسے میں وہ اچانک پہنچے تو.... وہ عجیب سی سرشاری محسوس کرنے لگا۔

"اب کدھر چلنا ہے صاحب؟" ٹیکسی ڈرائیور نے اسے چونکا دیا۔

وہ ٹیکسی ڈرائیور کو گائیڈ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "بس یہاں روک دو۔"

ٹیکسی والے کو پیسے دے کر اس نے پہلے جیب سے گھر کی چابیاں نکالیں، جو ہمیشہ اس کے پاس رہتی تھیں۔ پھر وہ اپنا بریف کیس لیے نیچے اترا۔ چوکیدار یقیناً اپنی کوٹھری میں سو رہا ہو گا۔ وہ سوائے شہناز کے کسی کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے چابی لگا کر گیٹ کھولا اور صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ بری طرح بھیگ گیا اور اسے سردی لگنے لگی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر گیا۔ ماسٹر بیڈ روم کی طرف بڑھتے بڑھتے وہ رک گیا۔ اسے خیال آیا کہ سب سے پہلے اسے ان بھیگے کپڑوں سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ وہ اس کمرے میں چلا گیا، جسے اس نے نومی کی پیدائش کے بعد اپنی خواب گاہ بنایا تھا۔

شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے وہ باہر آیا۔ ماسٹر بیڈ روم کے دروازے کا ہینڈل گھمانے پر اندازہ ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔ اس کی چابی بھی اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ دروازے پر دستک دے۔ اسے جگائے یا اپنے کمرے میں جا کر سو جائے۔ عام حالات میں اسے کبھی کسی سوتے ہوئے کو ڈسٹرب کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ جذبات سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ اس وقت رک نہیں سکتا تھا۔

اس نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن ہاتھ درمیان میں ہی رک گیا۔ اندر سے اسے واضح طور پر ایک مردانہ آواز سنائی دی تھی۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دروازہ لاک ہے۔ صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ شہناز کے کمرے میں کوئی مرد کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ یقیناً اس کی سماعت کا وہم ہے۔ اس نے پھر ہاتھ اٹھایا۔ اس بار وہ عین دستک دیتے وقت ٹھٹک گیا۔ آواز پھر سنائی دی تھی۔

وہ بہت مہذب انسان تھا۔ چھپ کر باتیں سننا، کسی کی خواب گاہ میں جھانکنا، کسی کی پرائیویسی ڈسٹرب کرنا اس کے مزاج میں نہیں تھا۔ لیکن وہ بے حد مختلف صورتِ حال تھی۔ وہ خواب گاہ اس کی بیوی کی تھی، جو اس کی محرم تھی۔ وقت رات کے آخری پہر کا تھا اور اندر سے کسی مرد کی آواز آ رہی تھی۔

وہ جھکا اور اس نے کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ اندر پوری طرح روشنی ہو رہی تھی۔ اس کی محبت کا تاج محل جگمگا رہا تھا مگر تاج محل کے پیش منظر میں اسے جو کچھ نظر آیا اس نے اس کے وجود میں آگ بھڑکا دی۔ اس کا جی چاہا، اپنی آنکھیں پھوڑ لے۔

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کا جسم بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

جو اس نے دیکھا ہے، حقیقت ہے؟ یا وہ فریبِ نظر ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے اسے پھر جھکنا تھا... پھر کی ہول سے جھانکنا تھا۔ لیکن اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اگر وہ حقیقت نکلا تو کیا ہو گا۔ نہیں... وہ فریبِ نظر ہے... محض تمہارا وہم۔ ذہن کے ایک حصے نے کہا۔ سوچو تو۔ ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟

وہ ہمت کر کے پھر جھکا اور کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے اس نے آنکھ ہٹا دی۔ سیکڑوں چیخیں اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ وہ منظر وہم نہیں، حقیقت تھا۔ جگمگاتے تاج محل کے سامنے وہ دونوں کھڑے تھے... اور وہ جس حال میں تھے، کاش انہیں دیکھنے سے پہلے اسے موت آجاتی۔

مرد اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اجنبی تو وہ عورت بھی تھی۔ وہ اس کی بیوی، اس کی شہناز تو نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر اس نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی ایسی چمک تو اسے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن نہیں۔ وہ شہناز ہی تھی۔ اصل شہناز، جو اسے کبھی نہیں ملی تھی۔ اسے تو شاید ڈمی ملی تھی شہناز کی۔

اس کا ردِعمل وہی تھا، جو ایسی صورتِ حال میں کسی مرد کا ہو سکتا ہے۔ جو ازل سے ہوتا آیا ہے۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ دماغ پر چڑھ دوڑا تھا۔ وہ اس وقت دروازہ توڑ دیتا اور اپنے ہاتھوں سے.... صرف اپنے ہاتھوں سے ان دونوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا۔ انہیں ختم کر دیتا۔ اس وقت اس کی پوری اہلیت تھی اس میں۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ اس وقت کچھ بھی کر سکتا تھا۔

لیکن کوئی طاقت ور... بے حد طاقت ور جبلت اس کی رہنمائی کررہی تھی ورنہ اس وقت وہ سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اتنا کچھ دیکھنے کے بعد عقل کہاں ساتھ دیتی ہے۔

اندر سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اس بار اس نے جھک کر کی ہول سے کان لگادیا۔ زہر اس کی سماعت میں اترنے لگا۔

"تمہارا جسم تاج محل سے زیادہ حسین ہے جان" ہوس میں ڈوبی ہوئی مردانہ آواز... توقف... "تمہارا شوہر بہت خوش نصیب ہے۔"

"اگر اس سے پوچھو تو وہ یہ نہیں کہہ سکے گا" وہ بھرائی ہوئی آواز شہناز کی نہیں لگ رہی تھی۔ لہجے میں تضحیک تھی۔

"کیا مطلب؟ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ بدذوق ہے؟"

"میں یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ بدنصیب ہے۔"

"وضاحت کرو۔"

"اس نے مجھے کبھی ایسے نہیں دیکھا۔"

"اوہ... بے چارہ۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ اس کے دیے ہوئے اس تاج محل کی روشنی میں اس سے زیادہ حسین عمارت دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ تو ہے" اٹھلاتی ہوئی نسوانی آواز...

"ویسے آدمی خوش ذوق ہے۔ یہ تاج محل گواہی دے رہا ہے۔"

"گھٹیا آدمی اور اعلیٰ ذوق۔ عجیب کامبی نیشن ہے۔"

"تم نے تو پھر سے بھوک جگا دی۔ چلو..." ملی جلی حیوانی آوازیں...

عثمان نے جھٹکے سے کان ہٹالیا۔ اسے حیرت تھی کہ اسے کچھ ہو کیوں نہیں رہا۔ وہ پاگل کیوں نہیں ہوجاتا... دھماکے سے پھٹ کیوں نہیں جاتا۔ اس کے اندر وحشتیں ناچ رہی تھیں۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ دروازے کو ٹکریں مار کر توڑ دینے کی خواہش بے حد شدید تھی مگر اسی طاقت ور جبلت نے ایک بار پھر اسے روک دیا... جکڑلیا لیکن اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

اس کے قدم بے ساختہ اٹھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ اس نے تو خود کو بس اپنے کمرے میں پایا۔ دروازہ اس نے بہت آہستگی سے لاک کردیا تھا۔ سوچے سمجھے بغیر... غیر ارادی طور پر۔ کمرے کی لائٹ آن تھی۔ اس نے اسے بھی آف کردیا۔

اندر کی وحشت رک نہیں رہی تھی بلکہ بڑھتی جارہی تھی۔ اس وقت وہ پوری کائنات کو کھلونے کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ سکتا تھا۔ لیکن جبلی طور پر اسے احساس تھا کہ اس وقت اسے خود کو باندھ کر رکھنا ہے۔ پہلے اسے عقل کی روشنی میں سوچنا سمجھنا اور کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کچھ بھی کرنا خطرناک ثابت ہوگا۔

بند کمرے میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھا اور اس نے کھڑکی کھول دی۔ بارش اور سرد ہوا نے احساس دلایا کہ اب وہ کم از کم سانس لے سکتا ہے۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ اندر کی آگ سرد تو نہیں ہوئی۔ البتہ کچھ قابلِ برداشت ضرور ہوگئی۔

بارش کا رخ کھڑکی ہی کی طرف تھا۔ ذرا دیر میں ہی وہ پوری طرح بھیگ گیا لیکن خاصی دیر تک اسے احساس نہیں ہوا۔ پھر اچانک ہی اسے تھرتھری چڑھ گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بارش تھم گئی تھی اور سرد ہوا کی کاٹ بڑھ گئی تھی۔ جسم کو سردی لگی تو اندر کی تکلیف تو نہیں، تکلیف کا احساس ضرور کم ہوگیا۔ نہ ہوا ہوتا تو اسے پھر کپڑے بدلنے کا خیال نہ آتا۔ اس نے کپڑے بدل لئے اور پھر کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا۔ ہوا اب بھی سرد لگ رہی تھی... ڈسٹرب کررہی تھی۔ لیکن اس وقت ڈسٹرب کرنے والی کوئی ایسی چیز اس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح وہ کچھ سوچنے کے قابل ہوسکتا تھا۔ وہ ایسی صورتِ حال تھی جس میں سکون آدمی کو بے سکونی میں مبتلا کرتا ہے۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ فوراً ہی اس کے تصور میں وہ منظر لہرایا اور وہ پاگل ہونے لگا۔ دھیان بٹانے کے لیے اس نے اِدھر اُدھر کی باتیں سوچنے کی کوشش کی۔ اسے بچوں کا خیال آیا۔ ہاں۔ بچے تو سب سے اہم ہیں۔ ہر چیز سے... ہر چیز سے... ہر بات سے زیادہ اہم۔ بچوں کا خیال بے حد خوش آئند تھا۔ جیسے اوپر سے گرنے والے کو کوئی مضبوط گرفت مل جائے۔

سوچنا تو پڑے گا۔ اس نے اپنے ذہن کو تیار کرنے کی کوشش کی۔ حقائق سے تو منہ نہیں موڑا جاسکتا۔ پھر وہ دنیا میں کوئی پہلا مرد تو نہیں، جس کے ساتھ یہ ہوا ہے۔ اور وہ آخری بھی نہیں ہوگا۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ اخباروں میں تقریباً ہر روز ایسی کوئی خبر شائع ہوتی ہے۔

وہ پھر بھڑک گیا۔ اخباروں کی سرخیاں اس کی نظروں میں پھر گئیں۔ خبروں میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ غرایا۔ ساتھ ہی ایسی بیوی کی اور دوسرے شخص کے قتل کی خبر بھی تو ہوتی ہے۔ اور میں بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔ وہ کون سی قوت تھی، جس نے مجھے روک دیا۔ مجھے نہیں رکنا چاہیے۔ میں بھی وہی کروں گا...

سرد ہوا جسم کو تھپکیاں دے رہی تھی اور وہ شانہ، ذہن پر دلیل کی تھپکیاں دے رہا تھا۔ لیکن بپھرا ہوا شیر قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اس کے بعد کی خبریں اخبار میں نہیں چھپتیں۔ اس نے جھنجلا کر خود سے کہا۔ چھپتی ہیں... بہت بعد میں تو یہ حوالہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی واقعے کا تسلسل ہے۔ ورنہ سوچو۔ آدمی نے اپنی بیوی کو قتل کردیا۔ خود پھانسی پر چڑھ گیا۔ اور بچوں کا کیا بنا۔ یہ جیب کترے، قاتل، جرائم پیشہ نوجوان اور طوائفیں... یہ سب کہاں سے آتے ہیں۔ ایسے ہی تو ہوتے ہیں، جن کے سر پر ماں باپ کا سائبان نہیں ہوتا۔

اس خیال نے اسے دہلا دیا۔ اس کے بچے بے سائباں ہوں۔ معاشرے میں بے نشاں ہوں۔ نہیں۔

تو پھر میں کیا کروں؟ دماغ کے اندر کوئی چلایا۔ طلاق دے دو اسے؟

بات وہی ہے۔ اس نے سوچا۔ طلاق دوں گا تو وجہ کیا بتاؤں گا؟ اصل بات بتاؤں گا تو میری اور بچوں کی بے توقیری ہوگی۔ ہم معاشرے میں طنز و تضحیک کا نشانہ بنیں گے۔ میرا تو خیر کچھ نہیں لیکن بچے تباہ ہو جائیں گے۔ یہ وجہ نہ بتاؤں تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگا۔ میری پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ بچے مجھ سے نفرت کریں گے اور اپنی غلیظ ماں کو اچھا سمجھیں گے۔ کون جانے' اس کے ساتھ رہنا بھی پسند نہ کریں۔ ماں کے ساتھ رہیں۔ یہ بھی خسارہ ہوگا بچوں کا۔

تو اس سے باز پرس کروں؟ سختی کروں اس پر؟ یہ تو اللہ کا حکم ہے۔ دماغ چیخا۔

لیکن اب عثمان کے پاس بہت روشنی تھی۔ مکمل آگہی تھی۔ تمام معمے حل ہو گئے تھے۔ شہناز کی شخصیت' اس کی ہر بات' ہر عمل کا بھید اس پر کھل چکا تھا۔ وہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی کے روکے رکنے والی نہیں تھی۔ سختی کی جاتی تو جو کچھ چھپ کر ہو رہا تھا' کھلے عام ہونے لگتا۔ اس کے بعد طلاق کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ یہ طے تھا کہ شہناز کو عزت کی کوئی پروا نہیں۔ وہ تو عزت کو اپنے پیروں تلے روندنے کی قائل ہے۔

تو کیا یہ سب ہونے دوں؟ پھر ایک چیخ ابھری۔

ہاں۔ ہونے دو۔ اپنے بچوں کی بہتری' ان کے مستقبل کی خاطر یہ زہر پیتے رہو۔ وہ بھی چلایا۔ اور کچھ نہیں کر سکتے تم۔

آنکھیں بند کر لوں؟

بے غیرت بن کر زندہ رہوں؟

بیٹی کے باپ ہو۔ یہ بے غیرتی برداشت نہیں کرو گے تو اس سے بڑی بے غیرتی نصیب میں آئے گی۔ چپ ہو جاؤ۔

عثمان کی سمجھ میں سب کچھ آ رہا تھا۔ شہناز روزِ اوّل سے اس سے نفرت کرتی رہی تھی۔ وجہ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ دانستہ اسے دھتکارتی رہی تھی۔ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس نے اسے پیاسا رکھا تھا۔ پھر جب اسے احساس ہوا کہ اس نے پیاس سے سمجھوتا کر لیا ہے تو اس نے انداز بدل کر وار کیا۔ اسے اپنا عادی بنایا اور اس کے بعد پھر دھتکارا تاکہ وہ آئندہ بھی سمجھوتا نہ کر پائے۔

وہ پہلے دن سے اس کے ساتھ کھیل کھیلتی رہی تھی۔ وہ اسے تباہ کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے کوئی کسر بھی نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ تباہ ہو چکا تھا۔ اور اب جو تباہی ہونا تھی' اس کا تو اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

صدر دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ عثمان نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا پانچ بجے تھے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا لیکن آسمان پر اب بھی گھٹا تھی جس کی وجہ سے کافی اندھیرا تھا۔ پھر بھی عثمان کو ان کی دیدہ دلیری پر حیرت تھی۔

شہناز نے گیٹ کھول کر اپنے مہمان کو گرم جوشی سے رخصت کیا۔ وہ پلٹی تو عثمان کھڑکی کے سامنے سے ہٹ چکا تھا۔ عثمان کو صدر دروازہ بند ہونے کی' ہر راہداری میں شہناز کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر ماسٹر بیڈ روم کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔

اتنی دیر میں عثمان فیصلہ کر چکا تھا۔ چوکیدار یا کسی اور ملازم کے بیدار ہونے سے پہلے اسے رخصت ہو جانا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ تیار ہو کر بنگلے سے نکل آیا۔ خاصی دور تک پیدل چلنے کے بعد اسے ٹیکسی ملی۔ وہ انٹر کانٹی نینٹل چلا گیا۔ اسی رات نائٹ کوچ سے وہ اسلام آباد چلا گیا۔ کام نمٹانے میں اسے دیر نہیں لگی۔ اگلے دن وہ گھر واپس آ گیا۔

اس بار شہناز کو روبرو دیکھنا ایک مختلف تجربہ تھا۔ وہ اس کی نفرت سے پھنک رہا تھا۔ چلو' خواہشوں کے عذاب سے تو نجات ملی۔ اس نے سوچا۔

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں؟" شہناز نے پوچھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ تم اتنی خوب صورت بھی نہیں ہو" اس نے جواب دیا "لیکن میں نے تمہیں دیکھا بھی کہاں ہے؟"

"کیا مطلب؟" شہناز بری طرح چونکی۔

"میں اس طرح سے تمہیں کہاں دیکھ سکا ہوں' جیسے دیکھنا میرا حق ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"دکھانا پسند کرو گی؟" اس نے شہناز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ حجاب بھی کوئی چیز ہوتی ہے" شہناز کے لہجے میں ترشی تھی۔

"واقعی؟ خیر اب مجھے ضرورت بھی نہیں۔ میں تمہیں دیکھ چکا ہوں۔ یہ بتاؤ' تم ماہرِ نفسیات سے ملیں۔"

"نہیں۔"

"حیرت ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم میرے جاتے ہی اس سے ملی ہوگی" اس نے پھبتے ہوئے لہجے میں کہا "اب تو ملنے کی ضرورت بھی نہیں۔"

"کیوں؟ کیا ہو گیا؟"

"میں نے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ جیسا ہے...." اس نے شہناز کے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "..... یہ تو مجھے کہیں بھی مل سکتا ہے۔ بعض اوقات مشکل مسائل کا سامنے کا حل بھی آدمی کو نظر نہیں آتا" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور شہناز کو جواب دینے کا موقع دیے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

چند روز میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ فیصلہ کرنا آسان ہے۔ لیکن اس پر عمل بہت مشکل ہوتا ہے۔ جو عذاب اس نے سہنے کا

فیصلہ کیا تھا' وہ بہت بڑا' بہت خوف ناک تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ دفتر میں کام کررہا ہوتا تو کی ہول سے نظر آنے والا وہ خوف ناک نظارہ اسے ستاتا۔ اس کی تو رات کی نیند بھی حرام ہوگئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی نظروں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہی تھی۔ اتنا کچھ ہوگیا اور اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ مرد تو بہت بااختیار ہوتے ہیں۔ وہ سوچتا۔ میں کیسا مرد ہوں۔ اسے خود پر شک ہونے لگتا۔

وہ شک اسے گناہ کی راہ پر لے گیا۔ عورتوں کے ساتھ اس کا انداز بے حد متشددانہ ہوتا۔ لگتا تھا کہ اسے ساری دنیا کی عورتوں سے نفرت ہوگئی ہے۔ عورت نے اسے پامال کیا تھا۔ وہ ساری دنیا کی عورتوں سے بدلہ لے رہا تھا۔

مگر بے غیرتی کا احساس سوہانِ روح بن کر رہ گیا۔ وہ کبھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اس نے خود کو شراب میں غرق کرلیا کہ اس طرح خود فراموشی تو ملے گی۔ لیکن نشے میں ہوتا تو وہ منظر اسے اور ستاتا۔ وہ تو آسیب کی طرح اس کی یادداشت سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ کبھی ایک رات بھی سکون سے نہیں سوسکا۔ ہر رات وہ وہی سب کچھ خواب میں بھی دیکھتا تھا۔ اس کی ہر مختصر نیند اسی خواب پر ختم ہوتی تھی.... بعض اوقات ایک رات میں کئی کئی بار!

اس کانوی دنیا سے چلا گیا۔ ایک بیڑی کٹ گئی مگر دوسری تھی... اور وہ زیادہ مضبوط بھی تھی۔ وہ بیٹی جو تھی۔ بیٹی کے لیے عزت اور آبرو سے رخصت ہونے کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو کوئی محرومی نہیں دینا چاہتا تھا۔

پھر ثوبیہ کی شادی ہوگئی۔ اسے رخصت کرنے کے بعد وہ ہلکا پھلکا ہوگیا۔ اب وہ آزاد تھا۔ باضابطہ طور پر بھی آزاد ہوسکتا تھا۔ لیکن اس نے سوچا' جہاں اتنا صبر کیا ہے' کچھ دن اور سہی۔ وہ اپنی آزادی کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔ ازدواجی عذاب کی سلور جوبلی بھی ہوجائے اور نئے سال سے نئی زندگی کا آغاز ہو۔ اس کے لیے اسے یکم جنوری کا انتظار تھا۔



"تم ضبط کی بات کرتی ہو" عثمان نے حقارت سے کہا "مجھے سکون کی نیند سوئے اٹھارہ برس ہوگئے۔"

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شہناز کا چہرہ بدلنے لگا۔ خدوخال کی خوب صورتی یکسر ختم ہوگئی۔ اب وہ چڑیل سی نظر آرہی تھی۔ "مجھے خوشی ہے کہ میری قربانی رائگاں نہیں گئی" وہ بولی۔

"تمہیں مجھ سے بہت نفرت تھی؟"

"ہاں' اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"لیکن کیوں؟ میں نے تو تم سے ایسی محبت کی تھی کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔ پھر تمہیں مجھ سے نفرت کیوں تھی؟"

"مجھے تمہاری شخصیت سے نفرت تھی۔ تم کمزور تھے' بزدل تھے۔ تم مرد نہیں تھے۔ مردانگی نہیں تھی تم میں۔ تم خود سوچو۔ تم نے کبھی مردانگی کا ثبوت دیا؟"

عثمان اس کے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کرلیا۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا "میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں" اس نے کہا "پھر بھی میں تمہاری زبان سے مردانگی کی تعریف سننا چاہتا ہوں۔"

"مرد طاقت ور ہوتا ہے" شہناز نے کہا "اس کے ارادے اور عزائم بلند ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں جو چاہتا ہے' حاصل کرلیتا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ کوئی کام چھپ کر نہیں کرتا۔ اس میں بزدلی نہیں ہوتی۔ وہ عورتوں کی طرح چھپ کر وار نہیں کرتا" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں نے تمہیں ذلیل کیا' دھتکارا۔ تم میرے سامنے گڑگڑائے۔ میں پھر بھی نہ مانی تو تم ہار کر بیٹھ گئے۔ مرد ایسے ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں" عثمان نے چیخ کر کہا اور شہناز کی کلائی پوری طاقت سے پکڑلی "تم یہ کلائی چھڑا سکتی ہو؟ چھڑا کر دکھاؤ۔"

شہناز نے کلائی چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ گرفت بہت سخت تھی۔

"نہیں چھڑا سکتیں۔ اسی طاقت کی بات کررہی تھیں نا تم" عثمان نے حقارت سے کہا "یہ طاقت تو قدرتی طور پر ہے مجھ میں۔ لیکن طاقت کا اظہار مردانگی نہیں۔ میں اسے چھچھوراپن سمجھتا ہوں۔ طاقت ور کی ذمے داری ہے کمزور کو تحفظ فراہم کرنا۔ نہ کہ اسے دبانا۔ اگر میں صبح و شام مرمت کرتا تو تمہاری نظر میں مرد ٹھہرتا۔ لیکن اپنی نظروں میں گرجاتا" اس نے شہناز کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اسے سہلانے لگی "اور میرے ارادے اور عزائم بلند تھے۔ میں بہت اچھا انسان بننا چاہتا تھا۔ میں اپنے بچوں کی بہت اچھی پرورش کرنا چاہتا تھا۔ انہیں حتی الامکان دکھ اور تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر کیا۔ لیکن ایک کمزور شخص نے میری راہ کھوٹی کردی۔ مجھے شکست دے دی۔ لیکن نہیں۔ مجھے میرے طاقت ور ہونے کے احساس نے شکست دی تھی۔

"تم کہتی ہو' مرد دنیا میں جو چاہتا ہے' حاصل کرلیتا ہے۔ یہ بھی مردانگی نہیں۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ میرے نزدیک یہ مقولہ بھی نامردوں کا بنایا ہوا ہے۔ یہ تو خود کمزوری کا اظہار کررہا ہے۔ مرد کے لیے بااصول ہونا ضروری ہے۔ جائز بات پر ڈٹ جائے اور ناجائز بات سے ہٹ جائے۔ خواہشیں تو بے شمار ہوتی ہیں دنیا میں۔ عورت کمزور اسی لیے ہے کہ آسانی سے سرنگوں ہوجاتی ہے۔ طاقت اللہ اس لیے نہیں دیتا کہ انسان اپنی مرضی کے سامنے کسی کا احترام نہ کرے۔ مرضی تو صرف اللہ کی چلتی ہے۔ اس کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔ اور میں نے کوئی کام چھپ کر کیا تو صرف بچوں کی وجہ سے ورنہ جہاں توی خدا سے نہ ڈرے تو کسی بندے سے کیا ڈرے گا۔

"اور سنو۔ یہ درست ہے کہ تم نے مجھے ذلیل کیا۔۔۔ دھتکارا۔ میں تمہارے سامنے گڑگڑایا۔ تم نہ مانیں تو میں نے خواہش کو اپنے سر پر سوار کرنے کے بجائے اسے تسخیر کرلیا۔ میرے نزدیک یہی مردانگی تھی۔ تم اسے ہارنا کہتی ہو۔ وہ تو بہت بڑی فتح تھی۔ تمہارے خیال میں یہ مردانگی ہوتی کہ میں من مانی کرتا۔۔۔ زبردستی کرتا۔ طاقت کے زور پر تمہیں زیر کرلیتا۔ اسے ریپ کرنا کہتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو' ریپ کرنا مردانگی ہے۔ اس مردانگی کا ثبوت تو میں اب بھی دے سکتا ہوں" اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"اب تم بے غیرتی کو بھی قربانی قرار دو گے" شہناز نے مضحکہ اڑایا "تم سب کچھ جانتے تھے۔ پھر بھی تم نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ الگ بات کہ میں رکتی نہیں۔ تم نے مجھے سزا بھی نہیں دی۔"

"میں تمہیں اور تمہارے اس عاشق کو اپنے ان ہاتھوں سے ختم کرسکتا تھا۔۔۔ نمونہ دیکھ لو" اس نے پوری قوت سے شہناز کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ چند منٹ وہ کوشش کے باوجود نہیں اٹھ سکی۔ اس نے گرے گرے منہ سے خون تھوکا۔ ایک دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ کئی دانت ہل گئے تھے۔

"درندے۔۔۔ وحشی۔۔۔" وہ بولی۔

"درندہ' وحشی نہیں' مرد کہو۔۔۔ مرد!" عثمان نے زہریلے لہجے میں کہا "یہی تو مردانگی ہے تمہارے نزدیک۔ ورنہ میں تو عورت پر ہاتھ اٹھانے کو بزدلی سمجھتا ہوں۔ کہو تو اس وقت بزور تمہیں حاصل کرکے دکھاؤں۔"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"غلط! کرسکتا ہوں۔ لیکن کروں گا نہیں۔ یہ جسم جسے تم ان گنت انسان نما کتوں کے آگے پھینک چکی ہو' میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا" وہ کہتے کہتے رکا "تو میری خوبیوں اور اپنی جہالت کی بنا پر تم مجھ سے نفرت کرتی رہیں؟"

"نہیں۔ اصل بات تم جانتے ہو۔ تم نے مجھ سے میری محبت چھینی تھی۔"

"تو یہ تو مردوں والا کام ہوا نا۔ مرد دنیا میں جو چاہیں' حاصل کرلیتے ہیں" عثمان نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ پھر وہ سنجیدہ ہوگیا "یہ الگ بات کہ یہ مردانگی مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔ یہ میرے مزاج میں ہی نہیں۔ ویسے یہ حوالہ مشکور ہی کا ہے نا؟ تم اس سے محبت کرتی تھیں؟"

شہناز اٹھی اور صوفے پر بیٹھ گئی "بنو مت۔ تم یہ بات جانتے تھے۔"

"اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ پہلے ایک بات پوچھ لوں تم سے۔ تمہارے خیال میں مشکور میں تمام مردانہ خصائل ہیں۔ وہ ایک مکمل مرد ہے؟"

"ہاں۔ اس لیے میں تمام عمر اپنی محبت اس پر نچھاور کرتی رہی۔۔۔"

"اپنی محبت بھی اور آبرو بھی۔ اور میری عزت بھی؟"

"ہاں" شہناز نے کہا "وہ ایک مکمل مرد ہے۔"

"اب ذرا یہ بھی بتادو کہ میں نے تمہاری محبت کیسے چھینی؟"

"سب جانتے ہو تم" شہناز نے غصے سے کہا "تم میری محبت جیت بھی سکتے تھے لیکن تم نے اس کے لیے ناجائز طریقے اختیار کیے۔ تم کہتے ہو کہ تم جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز کے مقولے کو درست نہیں سمجھتے۔ یہ بتاؤ کہ بلیک میلنگ مردانہ وصف ہے؟ تم نے میری محبت چھیننے میں بزدلی دکھائی۔ عورتوں کی طرح چھپ کر وار کیا۔ تمہیں سزا کوئی عورت ہی دے سکتی تھی۔ میں نے تمہیں بدترین سزا دی۔ مجھے اس پر کوئی پچھتاوا۔۔۔"

"ایک منٹ" عثمان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "یہ دعویٰ تھوڑی دیر بعد کرنا تو بہتر رہے گا۔ جلد بازی مت کرو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے کیا جرم کیا تھا؟ کیسے چھینی تھی تمہاری محبت؟"

شہناز کی نظروں میں ریسٹورنٹ کا وہ ۲۵ برس پرانا منظر پھر گیا۔ اس کی سماعت میں مشکور کی وہ گفتگو گونجی' جب اس نے بتایا تھا کہ وہ اس سے شادی نہیں کرسکتا۔

اس نے وہ گفتگو دہرادی۔ اس کے ہر ہر لفظ پر عثمان کا رنگ بدلتا گیا "اب بولو تم" شہناز نے چیلنج کیا "آئینے میں دیکھو کہ تم کیا ہو۔"

"دیکھ رہا ہوں۔ تم بھی دیکھتی رہو۔ جب نظر آئے گا تو گزری ہوئی پوری زندگی پچھتاوا بن جائے گی" عثمان نے کہا "ابھی تو اپنے پسندیدہ مکمل مرد کا اصل چہرہ دیکھو۔ یہیں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں ایک منٹ میں۔"

وہ کمرے سے چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو کاغذ تھے۔ اس نے ایک کاغذ شہناز کی طرف بڑھادیا "یہ لو۔ یہ ہے تمہارے مکمل مرد کا بیع نامہ۔ اس سے تمہیں پتا چلے گا کہ اس نے کس طرح خود کو فروخت کیا۔ کیسے خود کو غلامی میں دیا۔ پڑھو اسے" اس کا لہجہ تحکمانہ ہوگیا۔

شہناز نے اس دستاویز کو پڑھا۔ اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔

"تم وہ تاریخ تو کبھی نہیں بھول سکتیں جب مشکور نے تمہیں میری بزدلی اور بلیک میلنگ کی کہانی سنائی تھی۔"

"کیسے بھول سکتی ہوں۔ مجھے یاد ہے۔ وہ ۲۷ ستمبر تھی۔"

"اور اس پر تاریخ دیکھو۔ ۲۶ ستمبر۔ یہ معاہدہ اس سے ایک دن پہلے ہوا تھا۔"

"میں کیسے یقین کرلوں کہ یہ دستاویز جعلی نہیں ہے" شہناز نے کمزور لہجے میں کہا۔

"یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ ویسے میں کل اسے ادائیگی کا نوٹس بھجواؤں گا تو سب پتا چل جائے گا۔"

"میں نہیں مان سکتی" شہناز کا انداز خودکلامی کا سا تھا "لیکن

تم بتاؤ تو۔ تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"
"میں کچھ ثابت کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو تمہیں اس کا اصل چہرہ دکھا رہا ہوں۔"
"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"
"تمہارے آئیڈیل مرد کی مردانگی" عثمان نے کہا "یہ نہ بتاؤ کہ تم کچھ سمجھی ہی نہیں ہو۔ جو حقیقت ہے اس کا سامنا کرو۔"
"میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔"
"میں حاضر ہوں" عثمان نے تمسخرانہ لہجے میں کہا "پہلے تو اس دستاویز کو سمجھ لو۔ اس کے مطابق تمہارے پاپا نے ۲۹ ستمبر کو مشکور علی کو بیس لاکھ روپے قرض دیے تھے۔ اب ۲۵ سال ہو چکے ہیں۔ طے شدہ شرح سود کے مطابق اب اسے کم از کم پچاس لاکھ ادا کرنے ہیں۔ اب وہ خود کو فروخت بھی کرے گا تو اتنی رقم اکٹھی نہیں کرسکے گا۔ اب سوچو کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بس یہ کہ اب وہ اپنے انجام کو پہنچے گا۔"
"لیکن اس نے اس رقم سے کاروبار شروع کیا تھا تو تھوڑا تھوڑا کر کے قرض چکایا کیوں نہیں؟" شہناز نے اعتراض کیا۔
"بھولی بننے کی کوشش مت کرو۔ تم سب سمجھ چکی ہو" عثمان نے ترشی سے کہا "ادا کرنے کا تو جب خیال آتا کہ یہ قرض ہوتا۔ مشکور مطمئن تھا کہ اسے رقم واپس نہیں کرنی۔ اس لیے کہ یہ قرض نہیں' یہ تو اس نے اپنی محبت کی قیمت وصول کی تھی۔ ذرا سوچو تو.... کتنی مہنگی تھی تمہاری محبت' بیس لاکھ روپے میں بکی۔ اب اس سودے کی غیر تحریری شرائط بھی سن لو۔ اسی بیس لاکھ کے بدلے مشکور نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود تم سے شادی سے انکار کردے گا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی تمہاری زندگی میں مداخلت نہیں کرے گا۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ اس نے گہری سانس لی۔ پھر سلسلۂ کلام جوڑا "خالص فلمی اور افسانوی سچویشن ہے نا۔ فلم یا افسانے میں ہیرو ایسی بڑی سے بڑی پیشکش ٹھکرا دیتے ہیں۔ ولن قبول کر لیتے ہیں لیکن تحریر کبھی نہیں دیتے۔ اس سے اندازہ لگاؤ کہ تمہارا ہیرو کتنا لالچی تھا۔ نجم انکل نے اس سے اس کی قیمت پوچھی۔ اس نے بتادی۔ انکل نے قبول کرلی۔ لیکن یہ شرط عائد کردی کہ اسے قرض کی تحریر دینی پڑے گی تاکہ خلاف ورزی کی صورت میں اسے سزا دی جاسکے۔ اس نے اس شرط کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ انکل مرحوم ڈٹ گئے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ اس کے بغیر وہ اسے ایک دھیلا نہیں دیں گے۔ بے شک وہ تم سے شادی کرلے۔ اس صورت میں بھی اسے کچھ نہیں ملے گا۔ وہ تمہیں عاق کردیں گے۔ اگر مشکور اسٹینڈ لے لیتا تو شاید انکل کو ہار ماننا پڑتی لیکن تمہارا ہیرو تو بیس لاکھ کی ترغیب سے ہار چکا تھا۔"
"اور تمہیں یہ سب معلوم ہے" شہناز نے نفرت سے کہا "یہ آئیڈیا بھی تمہارا ہی ہوگا۔ تم نے یوں میری محبت خریدی...."
"مجھے تو مشکور کے متعلق معلوم تک نہیں تھا۔ میں نے تو پہلی بار اس رات تمہاری خواب گاہ میں اسے دیکھا تھا۔ یہ سب تو انکل کی موت کے بعد مجھے معلوم ہوا۔ انہوں نے میرے لیے خط چھوڑا تھا۔ یہ وہ خط ہے۔ یہ بھی پڑھ لو" اس نے شہناز کی طرف دوسرا کاغذ بڑھایا "انکل احساسِ جرم کا شکار تھے۔ اسی لیے انہوں نے کبھی مجھے میری آوارگی اور بے راہ روی پر نہیں روکا۔ شکر ہے کہ انہیں تمہاری گراوٹ کا علم نہیں تھا ورنہ وہ جیتے جی مر جاتے۔ اور پھر مشکور سے قرض کی رقم واپس مانگتے کیونکہ اس نے اپنے وعدے کی دھجیاں اڑادی تھیں۔ شکر ہے کہ انہیں معلوم نہیں ہوا۔"
"پھر بھی پاپا ہمیشہ مجھ سے خفا رہے" شہناز کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔
"اب تمہارا اپنے ہیرو کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ تو مثالی مرد تھا نا" عثمان نے طنزیہ لہجے میں کہا "بیس لاکھ کے عوض وہ تمہاری محبت سے دستبردار ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اسے تم سے نہیں' تمہاری دولت سے محبت تھی۔ دوسری بات' وہ لالچی ثابت ہوا۔ پھر وہ کم حوصلہ بھی تھا کہ تمہیں سچ نہیں بتاسکا۔ اس نے جھوٹ بولا۔ یہ بھی مردوں کا شیوہ نہیں۔ اس نے تمہیں تحفظ نہیں دیا بلکہ بے وقوف بنایا۔ اس نے مجھ پر چھپ کر وار کیا اور وہ بھی اوچھا۔ پھر اس نے عہد شکنی کی۔ اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ وہ تمہیں پامال کرتا رہا۔ اس نے تمہیں استعمال کیا اور میری عزت اور میرا گھر بھی تباہ کردیا۔ ایسے ہی ہوتے ہیں مثالی مرد؟ اب دیکھو آئینے میں اپنی زندگی.... اور باقی عمر نفرت کرو.... خود سے بھی اور اس سے بھی۔"
شہناز کا چہرہ نفرت نے مسخ کردیا تھا "وہ ولن تھا تو ہیرو تم بھی نہیں تھے۔ تم بے غیرتوں کی طرح مجھے لٹتا دیکھتے رہے۔ تمہیں مجھ کو روکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔"
"اپنی بے غیرتی مجھے تسلیم۔ لیکن میں نے بیٹی کی خاطر وہ زہر ہلاہل پیا۔ اس کی شادی ہوگئی تو میں آزاد ہوا۔ مگر بعد کی بھی تو سن لو۔ انکل کی موت کے بعد مجھے ان کا خط اور قرض کی دستاویز ملی۔ میں نے مشکور کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور تنبیہہ کی کہ اگر اب کبھی وہ تم سے ملا تو اسے تباہ کردوں گا۔ کاش.... میں تمہیں وہ منظر دکھا سکتا۔ وہ کیسے گڑگڑایا۔ اس نے میرے پاؤں تک پکڑ لیے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا اور وہ پورا بھی کیا لیکن تمہیں اس نے پھر ایک جھوٹی کہانی سنا دی۔ میں اسے اس کی بیٹیوں کے حوالے سے بلیک میل کروں گا! ارے' میں تو اسے ختم بھی کرا سکتا تھا۔ خود بھی ختم کر سکتا تھا اسے۔ اس نے گھٹیا پن کی حد کردی۔"
"اپنی بیٹی کی محبت میں تم نے خود کو بے غیرت بنا لیا۔ یہی کہہ رہے ہو نا تم؟"
"ہاں۔ ورنہ اس رات میں خود تمہیں اور اس کو قتل کردیتا۔ لیکن دانش مندی' دوراندیشی اور برداشت بھی مردانہ اوصاف ہی ہیں۔"
"بے چارے تم" شہناز نے عجیب سے لہجے میں کہا "واقعی تم بہت مظلوم ہو۔"

عثمان نے کچھ نہیں کہا۔ اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔
"پرائی چیز کی خاطر اتنے کشٹ جھیلے تم نے۔ کیسا زہریلا ہل پیتے رہے۔ افسوس....."
"بیٹیاں تو ہوتی ہی پرایا دھن ہیں۔ میرے لیے نہیں، سبھی کے لیے۔"
"میرا یہ مطلب نہیں ہے کوڑھ مغز انسان" شہناز نے نفرت سے کہا "میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ثوبیہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔"
عثمان پر یہ الفاظ بم کی طرح گرے۔ اس کے ذہن پر شہناز کے الفاظ کی معنویت پوری طرح اجاگر نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی کچھ کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔
"وہ تمہاری نہیں، مشکور کی بیٹی ہے۔"
"یہ... یہ نہیں ہو سکتا" عثمان نے ہذیانی لہجے میں کہا۔
"یہ بات مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔"
"میں نہیں مانتا۔"
"نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے یاد کرو۔ مجھے اب بھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے نعمان کو کتنی تکلیف پہنچائی۔ کتنی نفرت کی اس معصوم سے۔ صرف اس لیے کہ وہ تمہارا بیٹا تھا۔ تمہاری تصویر تھا وہ۔ لیکن ثوبیہ کو میں نے کتنا چاہا۔ پوری ممتا نچھاور کی اس پر اس لیے کہ وہ میری اور مشکور کی بیٹی تھی۔ تمہاری اولاد سے تو میں محبت کر ہی نہیں سکتی تھی۔"
لمحوں میں عثمان کی نظروں کے سامنے سے برسوں گزر گئے۔ اس نے جان لیا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ اس کے اندر نفرت کا ایک طوفان اٹھا۔ وہ طوفان یقیناً اسے بہالے جاتا۔ وہ اس طوفان کے سامنے بے بس تھا۔ لیکن اسی لمحے اندر سے سمندر جیسی محبت امنڈی اور اس طوفان کو پی گئی۔ وہ محبت ثوبیہ کی تھی۔ وہ اس محبت کو ٹٹولتا رہا۔ اس محبت میں اسے کوئی کھوٹ نہیں ملی۔ اس انکشاف سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا کہ وہ اس کی بیٹی نہیں ہے۔
اس محبت نے تھپک تھپک کر اسے پُرسکون کر دیا۔ اس نے سوچا، سارے عذاب تو میں اٹھا چکا ہوں۔ اب کیا غم کرنا۔ اب تو عمر کی شام ہو گئی ہے اور مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو بیٹی سے بیٹی جیسی محبت ہی کروں گا۔
"یہاں تم ہار گئیں شہناز بیگم" اس کے لہجے میں سمندر کی سی خاموشی اور گمبھیرتا تھی "ثوبیہ کے لیے میری محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مجھے کوئی محرومی نہیں ملی۔"
شہناز نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ آنکھوں میں چیلنج۔ وہ پھنک کر رہ گئی۔ چیلنج تو وہ ہمیشہ کرتی رہی تھی اسے۔ آج وہ اسے چیلنج کر رہا تھا۔ یہ تو اس کی توہین تھی "ایک اہم بات اور بتانی ہے مجھے" اس نے کہا۔
"ضرور بتاؤ۔ اس لیے کہ پھر کبھی موقع نہیں ملے گا۔"
"میں نے شوہر کی حیثیت سے تمہیں کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی لیے میں سہاگ رات کو سہاگ کے جوڑے میں تمہارے سامنے نہیں آئی۔ میں نے تم سے وعدہ کیا کہ شادی کی پہلی سالگرہ پر وہ جوڑا پہنوں گی۔ دوبارہ دلہن بنوں گی۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ لیکن تمہارے لیے نہیں۔ میں اس روز مشکور کی دلہن بنی تھی۔ وہ پہلا دن تھا تم سے میری بے وفائی کا۔ اس روز دلہن بن کر میں نے خود کو مشکور کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اور پھر اسی روپ میں تمہارا استقبال کیا تھا۔"
عثمان کو اندازہ تھا کہ وہ کوئی زہریلا انکشاف کرے گی۔ اس نے خود کو اس کے لیے تیار کر لیا تھا۔ وہ تیاری کام آگئی۔ اس نے بے پروائی سے کہا "میں اتنا کچھ سہہ چکا ہوں کہ اب کسی بات سے مجھے تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ ہاں، یہ بات سنانے کے بعد تم اپنے بارے میں غور کرو۔ اردو لغات لے کر اپنے لیے کوئی مناسب لفظ تلاش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں ایسا کوئی لفظ نہیں ملے گا۔ اور ہاں، بیٹھ کر دنیا بھر کی کتابوں میں مرد کی تعریف تلاش کرو۔ اب تمہارے پاس فرصت ہی فرصت ہوگی۔ اپنے ماضی کو گزارتی رہو اور پچھتاوے کماتی رہو کہ گناہ پچھتاووں کے سوا کچھ نہیں دیتے۔"
"تم مجھے مارو گے نہیں؟"
"جب مارنا تھا، تب نہیں مارا۔ اب کیا فائدہ۔ اب تو ہر سانس تمہارے لیے موت ہوگی۔ میں نے تمہیں وہ محبت دی، جس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ اور تم اس کی مستحق نہیں تھیں۔ یہ میرا دکھ ہے، جسے میں جھیل چکا ہوں۔ اب عذاب اٹھانے کی تمہاری باری ہے۔ اس بار میں تمہیں دو تحفے دوں گا۔ ایک پوری سچائی سے، دل کی گہرائیوں سے تمہارے لیے درازیٔ عمر کی دعا اور دوسرے طلاق۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔"
شہناز اب ساکت بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ست گیا تھا۔
"میں جا رہا ہوں شہناز بیگم۔ یہ گھر تمہیں مبارک ہو۔ میں یہاں سے کچھ لے کر نہیں جاؤں گا.... سوائے آزادی کے، جو آج مجھے مل گئی ہے۔ میں اس گھر میں جا کر رہوں گا، جہاں کبھی تم رہتی تھیں، وہ شہناز جو بہت اچھی تھی۔ جہاں انکل نجم اور آنٹی رہتی تھیں۔ جہاں سعود اور محمود رہتے تھے۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔"
"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی پاپا۔"
دروازے کی سمت سے آنے والی آواز نے ان دونوں کو دہلا دیا۔ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ دروازے میں ثوبیہ کھڑی تھی۔ اس کے قدموں میں ایک بیگ رکھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں لیکن چہرے پر عجیب سی سختی تھی۔
"بیٹی تم.... اندر آجاؤ نا" عثمان نے اسے پکارا۔
"نہیں پاپا۔ اب یہ چوکھٹ پار کر کے میں اندر نہیں آسکتی۔ آپ ہی کو باہر آنا ہوگا۔"
"تم یہاں کیسے....؟" شہناز نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"وہیں رک جائیں خاتون" ثوبیہ نے سرد لہجے میں تنبیہہ کی۔ "میں نہیں چاہتی کہ آپ میرے وجود کو اور گندہ کریں۔"

"ثوبیہ، تم....."

"میرا نام نہ لیں آپ" ثوبیہ نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی "آپ کی زبان میرا نام بھی گندہ کردے گی۔"

"تم کب سے کھڑی ہو یہاں؟"

"بہت دیر ہوگئی۔ میں نے آپ کا بیان سن لیا کہ میں کس کی بیٹی ہوں۔"

شہناز گنگ ہو کر رہ گئی۔ عثمان کا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا۔ "بیٹی، تم تو امریکا میں تھیں۔ تم یہاں کیسے آگئیں؟ خیریت تو ہے؟"

"یہ سب کچھ میں یہاں..... اس اجنبی اور بدخواہ عورت کے سامنے نہیں بتا سکتی" ثوبیہ نے شہناز کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری ماں ہوں، کیسی بھی سہی۔ تمہیں چاہا ہے میں نے" شہناز نے کہا۔

"میں نہیں مانتی۔ میری مما بھی یہی ہیں اور پاپا بھی" ثوبیہ نے عثمان کی طرف اشارہ کیا "آپ تو میرے لیے ذلت کا نشان ہیں" وہ عثمان سے مخاطب ہوگئی "پاپا، آ بھی جائیں، میں آپ سے لپٹنے کو بے تاب ہوں۔"

عثمان نے محبت سے اسے دیکھا۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔ لگتا تھا، وہ کسی بھی لمحے ڈھے جائے گی۔ وہ اس کی طرف لپکا اور اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ پوری جان سے لرز رہی تھی اور اس کے رخساروں کو بار بار چوم رہی تھی "پاپا..... آپ میرے پاپا ہیں نا..... آپ میری مما ہیں نا..... میرے پاپا..... میرے پیارے پاپا....."

"ہاں میری گڑیا۔ میں ہی سب کچھ ہوں تمہارا۔ اور تم..... تم تو میری جان ہو۔ میرا سرمایۂ زندگی ہو تم" عثمان نے اسے سینے سے بھینچ لیا "آؤ چلیں....."

وہ اسے لپٹائے ہوئے راہ داری میں قدم بڑھانے والا تھا کہ عقب سے شہناز نے التجائیہ لہجے میں اسے پکارا "عثمان..... میری ایک بات سنو۔"

عثمان رک گیا لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"اتنا کچھ تم نے مجھے دیا۔ تو ایک چیز میرے کہنے پر بھی دے دو۔"

"بولو۔"

"اس مشکور کو نہ بخشنا" شہناز کے لہجے میں نفرت تھی۔ "اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا۔ اس سے پورا قرض مع سود وصول کرنا....."

"اس کے لیے کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔ یہ تو مجھ پر انکل کا قرض ہے اور قرض میں ضرور چکاتا ہوں" عثمان نے کہا اور ثوبیہ کو لیے آگے بڑھ گیا۔

اس نے گاڑی گھر سے نکالی تو ثوبیہ نے زبان کھولی "پاپا میں اپنے شوہر کا گھر چھوڑ آئی ہوں۔"

"لیکن کیوں بیٹا؟"

"وہ وہاں جو زندگی گزار رہے ہیں، میرے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ میں نے انہیں کہہ دیا کہ وہ مجھے بیوی کی حیثیت سے رکھنا چاہیں تو پاکستان آجائیں۔ میں ایک سال ان کا انتظار کروں گی۔ ورنہ....."

"ٹھیک کیا بیٹا۔ مجھے فخر ہے کہ میری تربیت کام آئی۔ تم نے پوری خود اعتمادی سے درست فیصلہ کیا۔"

"پاپا... آپ تفصیل سنے بغیر اسے درست فیصلہ کہہ رہے ہیں۔"

"تفصیل میں گھر چل کر سن لوں گا۔ ویسے مجھے یقین اور اعتماد ہے کہ تمہارا فیصلہ درست ہوگا۔ اب مجھے ڈرائیونگ پر توجہ دینے دو۔ اوکے؟"

"اوکے پاپا!"

○☆○

وہ کسی گہرے، اندھے کنوئیں میں قید تھی!

رات گزری، صبح ہوئی۔ وہ اسی خواب گاہ میں بیٹھی تھی، جس سے اس نے منفی حربوں سے عثمان کو بے دخل کیا تھا۔ ملازمہ اسے ناشتے کے لیے کہنے آئی تو اس نے اسے ڈانٹ دیا "تم جاؤ۔ میں

ناشتا نہیں کروں گی۔ چلی جاؤ۔"

"بیگم صاحبہ! دوپہر کے کھانے پر کیا پکاؤں؟"

"جو جی چاہے پکالو۔ دن میں بھی اور رات کو بھی۔ مگر خبردار مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو میں خود طلب کرلوں گی۔"

اس کے پاس ایک ہی کام تھا۔ وہ ماضی کے ایک ایک لمحے کو ٹٹولتی رہی۔ یہ عمل ایسا تھا' جیسے کوئی برسوں سے زمین پر پڑے پتھروں کو الٹ کر دیکھے تو کہیں سے کوئی کن کھجورا نکلے اور کہیں سے کوئی اور کیڑا۔ وہ اب سب کچھ سمجھ لینا چاہتی تھی۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ دن گزر گیا۔ شام ہوگئی۔ پھر سورج بھی ڈوب گیا۔ کمرے میں اندھیرا ہوگیا۔ بہت دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ اندھیرے میں بیٹھی ہے۔ اس نے سوچا کہ اٹھ کر لائٹ آن کردے مگر پھر خیال آیا کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ جو کچھ سوچ رہی ہے' دیکھنا چاہ رہی ہے' اس کے لیے تو اندھیرا ہی ضروری ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ وقت دیکھ ہی لے۔ اس نے کلائی کو ٹٹولا۔ اس پر گھڑی نہیں تھی۔ وہ اندازے سے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔ اس نے دراز کھولی۔ گھڑی فوراً ہی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے گھڑی کو کلائی پر باندھا۔ چمک دار سوئیوں نے اسے وقت بتادیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔

وہ اپنے ماضی سے گزرتی رہی۔ ماضی کو اپنے اوپر گزارتی رہی۔ خود کو ٹٹولتی رہی۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتی رہی' جو پہلے نہیں سلجھی تھیں۔

صبح کا اجالا دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا تو وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ سب کچھ سمجھ میں آیا تو اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ ارے یہ کیا.... یہ کیسا زیاں ہے کہ کوئی تلافی بھی ممکن نہیں۔ میں سمجھتی رہی کہ پا رہی ہوں۔ حالانکہ میں سب کچھ کھوئے جارہی تھی۔ اب کیا ہوگا؟

اس نے اپنا' مشکور کا اور عثمان کا ہر روپ دیکھ لیا تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ درحقیقت اسے عثمان سے محبت تھی۔ بس وہ سمجھ نہیں سکی۔ اس لیے نہیں سمجھ سکی کہ وہ ایک فریب میں مبتلا تھی۔ مشکور کی محبت کے فریب میں۔ اور عورت کا ذہن یہ کبھی تسلیم نہیں کرسکتا کہ وہ دو مردوں سے محبت کرتی ہے۔ مشکور کی محبت کے فریب نے اسے کبھی عثمان کی محبت کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا بلکہ اس محبت پر نفرت کا نقاب ڈال دیا۔ اس محبت کی علامتیں کئی بار ظاہر ہوئیں لیکن شعور تک نہ پہنچ سکیں۔ اب وہ جان گئی تھی کہ عثمان نے اس کے دل کو اسی لمحے فتح کرلیا تھا' جب سہاگ رات کو اسے وہ تاج محل دیا تھا۔

اب وہ دونوں مردوں کو دیکھ سکتی تھی۔ نرم خو' نرم گفتار' خوش اطوار' انا کے طلسم سے آزاد' درگزر کرنے' بے پناہ برداشت کرنے والا عثمان مثالی مرد تھا۔ اور مشکور.... وہ بہت گھٹیا آدمی تھا اور وہ خود ایک ناسمجھ بچی تھی' جو خود کو عقلِ کل سمجھ بیٹھی تھی۔

اس نے کیا کیا؟ کیا پایا' کیا کھویا؟ ان میں سے ہر جواب عذاب ہر نفس کا نقیب تھا۔ اس نے برا کیا۔ خود غرضی کے ہاتھوں لٹی۔ محبت کی تذلیل کی۔ اپنے وجود کو گالی بنادیا۔ اپنے لیے کہیں کچھ اچھا نہیں چھوڑا۔ صرف برائی ہی برائی.... دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس نے ذلتیں پائیں۔ اپنی نظر میں' اپنے شوہر کی نظر میں.... اپنے بچوں کی نظر میں.... اور سب سے بڑھ کر اللہ کی نظر میں۔ اور اس نے سب کچھ کھو دیا۔ شبنم کے قطرے سے پاک محبت۔ اپنا شوہر' اپنے بچے' اپنی عاقبت۔ اسے ملا کیا۔ اس کی بیٹی نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ وہ عقل مند ثابت ہوئی۔ اس نے عثمان کی محبت کو پہچان لیا۔ ماں کو چھوڑ دیا۔ اب وہ.... شہناز اکیلی ہے۔ اس کا کوئی مقام نہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہیں۔ وہ تنہا ہے۔ مرتے دم تک تنہا رہے گی۔

اس نے سوچا' خود کو ختم کرلے۔ ایسے کوئی جیا جاسکتا ہے۔ لیکن دماغ نے یہ فیصلہ قبول کرنے سے انکار کردیا۔ یوں آخرت کا بوجھ بڑھانے سے فائدہ؟ بہتر ہے' سزا جیتے جی سہہ لی جائے۔ توبہ بھی کرے۔ وہ تو بخشنے والا ہے۔ بس دل ندامت سے پانی پانی ہو کر بہہ نکلے اور اس حالت میں یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ پھر ایک بات اور ہے۔ اب اسے کچھ مل تو نہیں سکتا لیکن اب وہ باقی زندگی کے ہر لمحے عثمان سے محبت تو کرسکتی ہے۔ یہ بھی تو قرض ہے اس پر۔ اس محبت کا تو لطف ہی کچھ اور ہوگا۔

اس نے اداس نظروں سے سونے اسٹینڈ کو دیکھا' جس پر کبھی وہ جگمگاتا تاج محل رکھا تھا' جو عثمان کی محبت کی علامت تھا۔ اب وہ خالی اسٹینڈ اس کی نفرت کی علامت بن گیا تھا۔ وہ اس کے ایک جرم کی یادگار تھا اب۔ وہ جرم جو اس نے سچی محبت جیسی نعمتِ عظمیٰ کو ٹھکرا کر کیا تھا۔

اب یہ پچھتاوے' یہ عذاب عمر بھر کے تھے۔ اور عثمان نے اسے درازیٔ عمر کی دعا بھی دی تھی....

اسی لمحے کسی نے.... عثمان نے جیسے اس کے کان میں کہا۔ آئی لو یو.... اور پھر اس رومانوی سرگوشی کو دہرا تا گیا۔ شہناز نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آئی اور اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کو چوم لیا "تھینک یو.... تھینک یو ویری مچ۔ میں تمہاری مستحق نہیں تھی" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "لیکن تم مجھے مل گئیں۔ اب تم ہر روز ماضی کی یہ محبت بھری آواز مجھے سناتی رہنا۔"

اس نے گھڑی کو دل سے لگالیا "آئی لو یو.... آئی ٹرولی لو یو۔ میں تمہیں کبھی خود سے جدا نہیں کروں گی۔ تمہی تو ہر شبِ احتساب کی صبحِ تلافی ہو۔"

گھڑی خاموش ہوگئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب یہی اس کا مقدر تھا!



تیسرا رنگ

جنم کے ساتھ

علیم الحق حقی

گھر جنت بھی ہوتے ہیں ــــ جب تک اُن کی فضا میں یقین اور اعتماد کی سکون بخش ٹھنڈک رچی ہو ــــ اور چوکھٹ سے شک کے سائے رینگتے ہوئے گھر میں چلے آئیں تو وہی جہنم بھی بن جاتے ہیں ــــ اور انسان کے لیے انسان ہی سب سے اچھا گھر بھی ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی اُجلے اور روشن گھروں کی کہانی ہے، جن میں شک کی مکڑیوں نے جالے بُن دیے تھے، جہاں عدم یقین اور بے اعتمادی نے محبّت کا خُون کر دیا تھا۔

ڈاک کے گمشدہ تھیلے سے بارہ سال بعد برآمد ہونے والے خط کا شاخسانہ

ازراہِ کرم اس کہانی میں سرورق تلاش کرنے کے بجائے اسے محسوس کرنے کی کوشش کیجیے



اس ماہ کے سرورق پر ایک پُر تجسّس اور سنسنی خیز کہانی

نام تھا اُس کا نواب خان... اور وہ نام ہی کا نواب تھا۔ تنخواہ کے نام پر اُسے صرف تین سو روپے ملتے تھے۔

وہ گزشتہ پچیس سال سے محکمۂ ڈاک میں ملازم تھا۔ اِس عرصے میں اُس نے دیانت کے حوالے سے نیک نامی کے سوا کچھ نہیں کمایا تھا۔ کوئٹہ شہر کے باہر ایک گاؤں میں اُس کا چھوٹا سا مکان تھا۔ وہ قناعت کی زندگی بسر کرتا آیا تھا اور اس میں خوش بھی تھا مگر پچھلے کچھ عرصے سے زندگی اُس سے سچ مچ کا نواب ہونے کا مطالبہ کرنے لگی تھی۔ جبکہ وہ نام کا نواب تھا۔

اُس نے اپنی اسکیم کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا تھا... بار ہا۔ اُسے اپنے منصوبے میں ایک ہی کمی نظر آئی تھی۔ برف باری۔ برف باری کے بغیر بات نہیں بنتی تھی اور برف باری پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

تیئس دسمبر ۸۶ء کی اُس صبح اُس کی آنکھ کھلی تو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ غصیلا سیاہ آسمان زمین پر روئی کے گالوں جیسی برف برسا رہا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ خوش ہو گیا۔ یہی وہ دن تھا، جس کا وہ عرصے سے منتظر تھا۔

آمنہ غسل خانے سے نکل کر کمرے میں داخل ہوئی۔ رونے کی وجہ سے اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ نواب اُس کے رونے کی وجہ سے بخوبی واقف تھا۔ آمنہ چند لمحے خاموش کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”اُٹھ جاؤ۔ چھ بج رہے ہیں۔“

”میں اُٹھ چکا ہوں آمنہ!“ اُس نے جواب دیا۔

آمنہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ نواب بستر میں لیٹا اُن کاموں کے بارے میں سوچتا رہا جو اُسے آج نمٹانا تھے۔ اُسے جھرجھری سی آ گئی۔ وہ پچیس سال کی کمائی صرف ایک لمحے میں لُٹانے جا رہا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اپنے طور پر وہ دس پندرہ ہزار کی رقم کا بندوبست کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی اپنی حیثیت سے زیادہ مقروض ہو چکا تھا۔

جن معلومات کی بنیاد پر وہ آج اپنی دیانت کے دامن پر داغ لگانے والا تھا، نئی نہیں تھیں۔ وہ پچیس سال سے ڈاک بانٹنے کا کام کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ علاقے کے لوگ سادہ لوح ہیں۔ لفافے میں نقد رقم رکھ کر بھیجتے ہوئے ذرا نہیں ہچکچاتے۔ جو ذرا عقل مند ہیں، وہ پوسٹل آرڈرز بنواتے ہیں۔ جو بہت عقل مند ہیں، وہ بینک ڈرافٹ بنواتے ہیں۔ سہراب خان نے اُس سے کہا تھا۔ ”تم ایسے لفافے مجھے لا دو۔ ڈرافٹ اور پوسٹل آرڈر کیش کرانا میرا دردِ سر ہے۔ منافع آدھا آدھا ہو گا۔“ یہ بات سہراب خان گزشتہ دس سال سے کہے جا رہا تھا۔ اُس نے دوسرے پوسٹ مینوں کے حوالے دیے تھے مگر دیانت دار نواب خان پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ تو وقت وقت کی بات ہے کہ نواب خان بھی ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ اُس کے لیے کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتا تھا لیکن وہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا چاہتا تھا۔

وہ کچھ عرصے سے کام کے لفافے ڈاک کے ایک خالی تھیلے میں ڈالتا جا رہا تھا۔ باقاعدہ چھانٹی کرنے کا تو اُسے موقع نہیں ملتا تھا مگر اس سے کچھ فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ الگ کیے جانے والے لفافوں میں غیر متعلق لفافے کم ہی ہوں گے۔ اِس بات کا اُسے یقین تھا۔ اگر اسے یک مشت بڑی رقم کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ہر روز دو چار لفافے غائب کر کے کام چلا لیتا۔ مگر یک مشت بڑی رقم کے لیے خطرہ مول لینا ناگزیر تھا۔

وہ غسل خانے سے تیار ہو کر نکلا تو گلریز کے کھانسنے کی آواز اُس کے پیروں کی زنجیر بن گئی۔ وہ کشاں کشاں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا جہاں گلریز آمنہ کے ساتھ سوتا تھا۔ اُس نے جھانک کر دیکھا۔ گلریز کا معصوم چہرہ پسینے میں تر بتر ہو رہا تھا۔ وہ اندر گیا۔ اُس نے گلریز کی پیشانی چومی اور پھر چادر سے اُس کا چہرہ پونچھ ڈالا۔ گلریز نے آنکھیں کھول کر اُسے سلام کیا۔ اُس نے جواب دیا اور پھر پوچھا۔ ”کیسی طبیعت ہے بیٹے؟“

”ٹھیک نہیں ہے بابا!“

”تکلیف اب بھی ہو رہی ہے؟“ نواب نے پوچھا۔ گلریز نے اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ڈاکٹر میر آئیں گے اور تمھیں دوا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے بابا!“ گلریز نے خود کار انداز میں کہا۔ وہ جانتا تھا کہ دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کبھی نہیں ہوا تھا۔ ”آپ مجھے کراچی بھیجیں گے بابا؟“ اُس نے پوچھا۔

”ہاں بیٹے... ضرور بھیجوں گا۔“ نواب نے کہا۔ ”تم وہاں کم از کم چھ مہینے رہو گے... انشاء اللہ!“

گلریز کے ماتھے پر پھر پسینہ پھوٹ پڑا۔ ساتھ ہی کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس کے باوجود بھی وہ کراچی کے تصور پر مسکرانے کی کوشش کرتا رہا۔

”سونے کی کوشش کرو بیٹے!“ نواب نے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں کام پر جا رہا ہوں!“

”خدا حافظ ابو!“ گلریز نے کہا مگر اُس کی آنکھیں بجھ کر رہ گئی تھیں۔

اپنے کمرے میں آ کر نواب نے ناشتا زہر مار کیا۔ گلریز کو دیکھنے، اُس کی کھانسی سُننے کے بعد اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا، ساری دنیا کو آگ لگا دے تاکہ اُس کے بیٹے کے دم توڑتے پھیپھڑوں کو کچھ حرارت میسر آ ئے۔ ڈاکٹر میر نے کہا تھا۔ ”کم از کم سردیوں کے موسم میں اسے کسی گرم مقام پر بھیجنا ضروری ہے۔ اس کے پھیپھڑے سخت سردی برداشت نہیں کر سکتے اور ہاں... جانے سے پہلے اس کا آپریشن بھی ضروری ہے...“ ڈاکٹر کا کام تو مطلع کرنا تھا۔ اُسے نواب خان کے مسائل سے کیا غرض ہو سکتی تھی۔ آپریشن کے اخراجات اور پھر کراچی... کراچی میں اس کا نہ کوئی دوست تھا نہ رشتے دار۔ اُس کا اندازہ تھا کہ دونوں کاموں کے لیے دس پندرہ ہزار روپے کا جیب میں ہونا ضروری ہے۔ جبکہ حالت یہ تھی کہ

قرض کی ادائیگی ہی مصیبت ہو رہی تھی۔

"تم رات کو دیر سے آؤ گے؟" آمنہ نے پوچھا۔

"ہاں... آج میں ڈاک کی گاڑی پر ہوں گا۔ شاید گیارہ بج جائیں۔"

برابر والے کمرے سے کھانسی کی سمع خراش آواز آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر آمنہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کو بیٹھ گئی۔

"کیا ہوگا... پیسہ کہاں سے آئے گا؟ میرا بچہ!" وہ رو دی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نواب نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"کیسے ہو جائے گا۔ اب تو کوئی تمھیں قرض بھی نہیں دے گا۔"

"یہ تمھارا نہیں، میرا دردِ سر ہے۔ میں نے کہا نا، میں رقم کا بندوبست کر لوں گا۔" نواب نے سخت لہجے میں کہا اور اٹھ کر یونیفارم کا کوٹ اور اوورکوٹ پہنا۔ پھر وہ کوٹھری کی طرف چلا گیا۔ کوٹھری سے اُس نے ترپال کا خالی تھیلا نکالا اور اُسے تہ کر کے اپنے اوورکوٹ میں چھپا لیا۔ اُس کے منصوبے میں اس تھیلے کی بہت اہمیت تھی۔

بس اسٹاپ پر پہنچ کر وہ شہر جانے والی جی ٹی ایس کی بس میں سوار ہو گیا۔ اُس نے بائیں جانب والی کھڑکی کے ساتھ والی نشست پکڑ لی۔ بس میں اس کے کئی شناسا موجود تھے۔ اُن سے سلام دعا ہوئی۔ پھر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس مخصوص نشست پر بیٹھنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ دو منٹ بعد بس ایک پُلیا پر سے گزرتی۔ اس پُلیا کے پاس ایک نشیبی جگہ تھی، جسے اُس نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ اس جگہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہتا تھا مگر اس روز بس نے پُلیا تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگائے۔ برف باری کی وجہ سے ڈرائیور بس آہستہ چلانے پر مجبور تھا۔ منتخب مقام کو دیکھتے ہوئے نواب کا ہاتھ بلا ارادہ اوورکوٹ پر پہنچ گیا تاکہ اوورکوٹ کے نیچے ترپال کے تھیلے کی موجودگی کو محسوس کر سکے۔

"یہ دیکھا تم نے نواب خان؟"

اُس نے چونک کر دیکھا۔ کانسٹیبل نور محمد اُس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا اخبار لہرا رہا تھا۔ "سزائے موت سے بچ گیا۔"

"کون بچ گیا؟" نواب خان نے خالی خالی نظروں سے نور محمد کو دیکھا۔

"خود دیکھ لو یار!" نور محمد نے اخبار اُس کی طرف بڑھا دیا۔

نواب نے اخبار پر نظر ڈالی۔ سُرخی تھی۔ "ایوب سزائے موت سے بچ گیا۔" خبر کے ساتھ ہی ایوب اور اُس کی بیوی کی تصویر بھی تھی۔ تصویر میں ایوب خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ خبر کے مطابق وہ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں کلرک تھا۔ اُس نے ایک رات کمپنی کے کیشیئر کو قتل کر کے پچھتر ہزار روپے نقد اور تیس ہزار مالیت کے چیک اڑا لیے تھے۔ پھر وہ پکڑا گیا۔ اُس پر مقدمہ چلایا گیا۔ سزا بھی سنا دی گئی مگر لاکھ کوشش کے باوجود پولیس رقم برآمد نہیں کرا سکی۔

"خدا جانے اُس نے رقم کہاں چھپائی ہوگی۔" کانسٹیبل نور محمد نے کہا۔ "پچھتر ہزار روپے کم تو نہیں ہوتے۔"

"واقعی... بہت ہوتے ہیں۔" نواب خان نے دل ہی دل میں کہا "اتنی بڑی رقم تو میرے گلریز کے جینے کی ضمانت ہو سکتی ہے۔" پھر اُس نے نور محمد سے پوچھا۔ "پولیس ایوب سے نہیں اگلوا سکی؟"

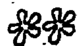
"ہاں۔ یہی تو کمال ہے اس ایوب کا۔" نور محمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کہتا ہے، نہ میں نے قتل کیا ہے، نہ رقم چرائی ہے۔ میں کہتا ہوں وہ بہت بے وقوف آدمی ہے۔ ایسی رقم کس کام کی، جس کے لیے آدمی اپنی پوری عمر جیل میں گزار دے۔"

نواب خان کا بس اسٹاپ آ چکا تھا۔ نواب خان جھرجھری لے کر اٹھا اور بس سے اُتر آیا۔ اُس نے سڑک پار کی اور پوسٹ آفس کی طرف بڑھ گیا۔

دو گھنٹے بعد وہ ڈاک لے جانے والی گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھا تھا۔ اگلے حصے میں اُس کا نائب نادر گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ برف باری اب بھی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا، رات تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ گاڑی کا روٹ ایسا تھا کہ نواب خان کا گاؤں راستے میں پڑتا تھا۔

حسب توقع سڑک سنسان تھی۔ اِکا دُکا راہ گیر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نواب خان نے ڈاک کے تھیلے گنے۔ سرکاری طور پر اُن کی تعداد بارہ تھی۔ تیرھواں اضافی تھیلا۔ یہ وہ تھیلا تھا جس میں نواب خان مال والے لفافے جمع کرتا رہا تھا۔ تمام تھیلے مقفل تھے۔ نواب خان نے اوورکوٹ کے نیچے سے ترپال کا تھیلا نکالا اور تیرھواں اضافی تھیلا اس میں ڈال کر اُس کا منہ ڈوری سے باندھ دیا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ترپال کے تھیلے میں کیا ہے۔ ایسے تھیلے عموماً کاٹھ کباڑ، کوڑا رکھ کر پھینکنے کے کام آتے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ اول تو تھیلا گرائے جانے کے بعد برف میں دھنس جائے گا اور پھر مزید برف باری اُسے ڈھانپ دے گی اور اگر کسی کی نظر پڑی بھی تو وہ کوڑے کے تھیلے کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ رات کو واپسی پر وہ برف ہٹا کر تھیلا نکالے گا اور گھر لے جائے گا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ درحقیقت وہ ڈاک کا تھیلا ہے۔

پُلیا قریب آ رہی تھی۔ اُس نے عقبی دروازہ کھولا اور ترپال کا تھیلا کنارے پر رکھ لیا۔ طے شدہ مقام پر پہنچتے ہی اُس نے تھیلا گرا دیا۔ تھیلا ایک ٹیلے کو نشیب میں لڑھکتا نظر آیا... پھر برف کی دبیز چادر نے اُسے نگل لیا۔



شمیم اور نسیم کی عمریں بالترتیب گیارہ اور نو سال تھیں۔ اُن کے والد بڑے افسر تھے اور ان دنوں کسی کام سے کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ دونوں لڑکے ضد کر کے اُن کے ساتھ ہو لیے تھے۔ اُن کا قیام ایک گاؤں کے قریب سرکاری ریسٹ ہاؤس میں تھا۔ تیئس دسمبر کو انھوں نے برف باری ہوتے دیکھی تو اُنھیں سیر کی سوجھی۔ چوکیدار نے انھیں سمجھایا کہ برف باری

کے بعد بہت سرد تیز ہوا چلتی ہے۔ لڑکوں نے اُسے یقین دلایا کہ وہ دور نہیں جائیں گے۔ صاحب کے بچے تھے۔ چوکیدار کا اُن پر کوئی زور نہیں تھا چنانچہ وہ انھیں نہ روک سکا۔ ویسے بھی وہ جانتا تھا کہ برف باری کم از کم رات تک جاری رہے گی۔ سرد ہوا صبح ہوتے ہی چلے گی۔

لڑکے ٹہلتے ہوئے پیلیا کی طرف چل دیئے جو ریسٹ ہاؤس سے آدھا میل دور تھی۔ سڑک پر انھیں ڈاک کی گاڑی جاتی دکھائی دی پھر گاڑی کا عقبی دروازہ کھلا اور اُس میں سے ایک تھیلا لڑھکتا دکھائی دیا۔ وہ خود بھی اُسی طرف جا رہے تھے، چنانچہ لپک کر تھیلے کے پاس جا پہنچے۔

تھیلا راستے ہی میں گرا تھا۔ انھوں نے مل جُل کر اُسے دھکیلا اور راستے سے ہٹا دیا۔ مگر اس کوشش میں دونوں ہانپ گئے تھے۔ تھیلا بہت وزنی تھا۔

"اتنا وزنی کیوں ہے یہ؟" نسیم نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کھول کر دیکھنا پڑے گا۔" شمیم نے جیب سے چھوٹا سا چاقو نکالا اور وہ ڈوری کاٹ دی، جس سے تھیلے کا منہ بندھا ہوا تھا۔ دونوں نے بڑے بے صبرے پن سے تھیلے کا منہ کھولا اور اندر جھانکا۔ اندر کینوس کا گہرے سبز رنگ کا ایک اور تھیلا تھا۔ انھوں نے وہ تھیلا برآمد کیا لیکن وہ مقفل تھا۔ وہ دونوں نکیلے پتھر لے کر قفل پر ٹوٹ پڑے لیکن اس قفل کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ شمیم نے تھیلے کو چاقو سے کاٹنے کی کوشش کی مگر یہ بھی بے سود ثابت ہوا۔

"اب کیا ہوگا؟ کیسے پتا چلے گا کہ اس کے اندر کیا ہے؟" نسیم نے مایوسی سے کہا۔ تجسس اُسے کچھ کرنے پر اُکسا رہا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

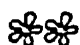
"ہم اسے کھنڈر میں لے چلتے ہیں۔ اسے بھوسے کی کوٹھری میں چھپا دیں گے تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ کل ہتھوڑا اور چھینی لا کر اسے کاٹ ڈالیں گے۔" شمیم نے تجویز پیش کی۔

وہ جسے کھنڈر کہہ رہے تھے، درحقیقت ایک متروک کھلیان تھا۔ اب تک انھوں نے کسی کو اس طرف جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کھلیان کے عقب میں بے حد مہیب ڈھلوان تھی۔ گہری کھائی! دونوں بھائی اُسے دھکیلتے ہوئے کھلیان کی طرف لے چلے۔ راستے میں کئی بار انھیں سانس درست کرنے کے لیے رکنا پڑا۔ کھلیان پہنچ کر انھوں نے چوبی سیڑھی کوٹھری کی دیوار سے لگائی۔ لیکن تھیلا چھت تک پہنچانے میں انھیں دانتوں پسینہ آگیا۔ جیسے تیسے انھوں نے تھیلا اوپر پہنچایا اور اسے لکڑی کے تختوں کی اُس دیوار کی طرف دھکیلنے لگے، جو غالباً چھت کے عقبی حصے میں احتیاطاً لگائی گئی تھی۔ اس سمت نشیب تھا اور بے خیالی میں کوئی نیچے بھی گر سکتا تھا۔ دونوں جھنجلائے ہوئے تھے۔ لہٰذا پوری قوت صرف کر رہے تھے۔

"اچانک تھیلا کھسکا اور پوری قوت سے چوبی تختوں سے ٹکرایا۔ لکڑی چٹخنے کی آواز گونجی اور تھیلا دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گرا۔ دونوں بھائی سہمی ہوئی نظروں سے چوبی دیوار کے خلا کو دیکھتے رہے انھیں پتا بھی نہیں چلا تھا لکڑی کو دیمک چاٹ چکی ہے۔ انھوں نے ہمت کر کے... آگے بڑھ کے کھائی میں جھانکا۔ انھیں چکر آگئے۔ تھیلا نظر آنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مقام شکر یہ تھا کہ وہ خود تھیلے کے ساتھ نیچے نہیں جا گرے ورنہ ہڈیوں کا سُرمہ بن جاتا۔ کھائی میں جھانکنے کے بعد وہ اور سہم گئے۔

تھیلا اب اُن کی پہنچ سے دور تھا۔ لڑکپن کا تجسس بے حد قوی ہونے کے باوجود خوف تلے دب گیا۔ وہ خاموشی سے کھلیان سے نکل آئے۔

چار دن بعد وہ باپ کے ساتھ گھر کے لیے روانہ ہوئے تو انھیں وہ تھیلا یاد بھی نہیں تھا۔



چودہ جون ۱۹۸۸ء کو کوئٹہ کے جی پی او میں اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کا اژدہام تھا۔ بارہ سال پرانے ڈاک کے تھیلے کی دستیابی کی اطلاع انھیں وہاں کھینچ لائی تھی۔ سبھی کو اُمید تھی کہ اس تھیلے کے حوالے سے کوئی چٹ پٹی خبر ضرور ملے گی۔

تھیلا جی پی او کے احاطے میں ایک میز پر رکھا تھا۔ تھیلا سخت ہوگیا تھا اور بعض جگہوں سے پھٹ رہا تھا۔ اُس کا قفل کھول دیا گیا تھا تھیلے کے قریب پوسٹ ماسٹر کھڑا تھا۔ اُس کے پہلو میں ایک پوسٹل انسپکٹر بھی موجود تھا۔ پوسٹ ماسٹر نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر چند خطوط نکالے اس کے ساتھ ہی فلیش بلبوں کے جھماکے ہوئے اور پھر سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ پوسٹ ماسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "حضرات... بیک وقت سب کے سوالوں کے جواب میں نہیں دے سکتا۔ ایک ایک کر کے... ذرا تحمل سے...!"

"یہ تھیلا کہاں سے اور کیسے دستیاب ہوا؟" ایک اخباری نمائندے نے پوچھا۔

"کوئٹہ اور ہندو باغ کے درمیان تعمیراتی سروے ہو رہا ہے۔ تعمیراتی ٹیم کے ایک رکن کو وہاں یہ تھیلا پڑا ملا۔" پوسٹ ماسٹر نے بتایا۔

"یہ تھیلا وہاں کیسے پہنچا ہوگا؟" دوسرے اخباری نمائندے نے سوال کیا۔

"امکان تو یہی ہے کہ ڈاک کی کسی گاڑی سے گرا ہوگا۔ جس جگہ یہ ملا ہے وہ سڑک سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس تھیلے میں دسمبر ۱۹۷۶ء کے خطوط ہیں۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تھیلا دانستہ گرایا گیا ہو؟" ایک اور صحافی نے دریافت کیا۔

"میرے خیال میں تو یہ ممکن نہیں۔" پوسٹ ماسٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ یہ تھیلا ہمیں ملتا ہی نہیں۔ بہرحال ہم نے تفتیش کی ہے کہ تیئس دسمبر ۱۹۷۶ء کو ڈاک کی گاڑی پر انچارج کون تھا۔ ہمیں حیرت ہوئی

کیونکہ اُس روز انچارج نواب خان تھا۔ پچیس سالہ ملازمت کے دوران نواب خان کا ریکارڈ بے داغ تھا۔ البتہ یہ بات عجیب ہے کہ یہ تھیلا نواب خان کے گاؤں کے قریب ہی ملا ہے۔ ہم نے نواب خان سے رابطے کی کوشش کی مگر نواب خان کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ انتقال چھ جنوری ۲۰۰۸ء کو ہوا۔ یعنی تھیلے کی گمشدگی کے دو ہفتے بعد۔ یہ بھی سن لیں کہ نواب خان نے خودکشی کی تھی۔ اُس کی بیوی نے بتایا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی مہلک بیماری کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا۔ اُس کا بیٹا پھیپھڑوں کی بیماری میں مبتلا تھا۔ بیٹا باپ کی خودکشی سے چار دن پہلے فوت ہوا۔ بے چاری آمنہ پر پے در پے قیامتیں ٹوٹیں۔ پہلے بیٹا اور پھر شوہر۔ بہرحال ہم تفتیش جاری رکھیں گے۔ ممکن ہے یہ معمّا حل ہو جائے۔"

"ان خطوط کا کیا بنے گا؟" ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

"ہم انھیں ڈیلیور کر دیں گے۔ اخبارات کے ذریعے کافی تشہیر ہو چکی ہوگی، لہٰذا تاخیر کے سلسلے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تاہم ہم ہر لفافے پر... 'تاخیر سے ترسیل پر ہم معذرت خواہ ہیں...' کی مہر ضرور لگا دیں گے۔" پوسٹ ماسٹر نے کہا۔ اُس نے دانستہ رپورٹروں کو یہ نہیں بتایا کہ تھیلے میں موجود زیادہ تر لفافوں میں پوسٹل آرڈرز یا بینک ڈرافٹس ہیں۔ وہ اپنے محکمے کے ایک دیانت دار مرحوم کارکن کو تحفظ فراہم کر رہا تھا۔

رپورٹرز نے لفافوں پر تحریر پتے دیکھنے چاہے تو اُس نے اُنھیں چند ایسے لفافے تھما دیے، جن کے اندر محض خط تھے۔ رپورٹروں نے پتے نوٹ کیے۔ اُن میں سے ہر ایک یہی توقع کر رہا تھا کہ اتنی تاخیر سے پہنچنے والے خطوط عجیب عجیب اور ممکنہ حد تک کسی دھماکا خیز کہانی کو ضرور جنم دیں گے۔ بروقت خط نہ ملنے سے لوگوں کی زندگی میں ڈرامائی تبدیلیاں بھی آ سکتی ہیں، ایسے بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کسی نے اپنے محبوب کی آمد کا خط نہ ملنے کی بنا پر خودکشی کر لی ہو۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا...

❀❀

سولہ جون ۲۰۰۸ء کی صبح ساجدہ بشیر بیدار ہوئی تو اُس کا موڈ بے حد خوش گوار تھا۔ اُس نے بیڈروم کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بنگلے کے وسیع و عریض لان میں لہلہاتی ہوئی سرسبز گھاس آنکھوں کو فرحت بخش رہی تھی۔ فضا میں عجیب سی مہک تھی۔

بشیر سے اُس کی شادی کو پچیس برس ہو چکے تھے مگر اُن کے درمیان اب بھی ویسی ہی محبت تھی۔ بلکہ اب تو محبت اور بڑھ گئی تھی۔ ساجدہ اکثر یہ سوچ کر دہل جاتی کہ اگر خدانخواستہ بشیر کو کچھ ہو گیا تو وہ بھی نہیں جی سکے گی۔ بشیر کے بغیر جینے کا تصور ہی اُس کے لیے محال تھا۔

پچیس سال پہلے جب اُن کی شادی ہوئی تو بشیر کوئی صاحبِ حیثیت آدمی نہیں تھا۔ وہ تو بس معمولی سا ایک کلرک تھا۔ ساجدہ اُس کے ساتھ بڑے کٹھن حالات سے گزری تھی مگر اُس کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی تھی۔ پھر نذیر اور شاہدہ کی پیدائش کے بعد تنگ دستی اور بڑھ گئی تھی۔ اس حد تک کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا گزارا کیسے ہو رہا ہے۔

شادی کے تیرہ سال بعد حالات اچانک ہی تبدیل ہو گئے تھے۔ بشیر کو سرمایہ کاری میں زبردست منافع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اُن کے دن پھرنے لگے۔ معاشی حالت مسلسل سدھرتی گئی۔ انھوں نے بچّوں کو بہترین تعلیم دلوائی۔ نذیر اپنی خواہش کے مطابق فوج میں بھرتی ہو گیا۔ شاہدہ کی اب شادی ہونے والی تھی۔

ساجدہ نے باتھ روم سے نکل کر کچن کا رُخ کیا۔ ملازمہ نوراں ناشتے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ ساجدہ اُس کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہو گئی۔

نوراں نے میز پر ناشتا لگایا۔ بشیر اور شاہدہ پہلے ہی آ بیٹھے تھے۔ اس وقت باپ بیٹی کے درمیان ہنسی مذاق چل رہا تھا۔ دیوار پر نذیر کی تصویر آویزاں تھی۔ اس تصویر میں وہ لیفٹیننٹ کی یونیفام پہنے، لبوں پر مسکراہٹ سجائے چمک دار آنکھوں سے اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ جیسے درحقیقت اُن کے درمیان موجود ہو اور اُن کی گفتگو سن رہا ہو۔ ساجدہ نے بشیر اور شاہدہ کو ہنستے بولتے دیکھا، پھر بیٹے کی تصویر پر نظر ڈالی اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ اُس کی جنّت کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

وہ جنّت ہی تو تھی اُس کی...

دروازے کی طرف سے اخبار گرنے کی آواز سنائی دی۔ شاہدہ اخبار اُٹھانے چلی گئی۔ پھر وہ خبروں والا صفحہ دیکھتی ہوئی واپس آئی۔ "ابو... اخبار میں ایوب کے بارے میں خبر چھپی ہے۔ آپ یقیناً پڑھنا چاہیں گے۔ ایوب بھی تو آپ کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ اُس نے کمپنی کے کیشیئر کو قتل کر دیا تھا..."

ساجدہ نے ایوب کے تذکرے پر بغور اپنے شوہر کو دیکھا۔ بشیر کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ایوب کا نام سن کر ہمیشہ اُس کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ ساجدہ اپنے حساس شوہر کے کرب کو سمجھتی تھی۔ اس کیفیت کا تعلق بارہ سال پرانے اس واقعے سے تھا، جب بشیر کی گواہی کی وجہ سے ایوب کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔

اُس روز کام کی زیادتی کی وجہ سے بشیر کو دیر تک آفس میں رُکنا پڑا تھا۔ کیشیئر کے قتل اور ڈکیتی کے بعد اُس نے رات کی تاریکی میں کسی شخص کو بلڈنگ سے نکلتے دیکھا۔ ایک پولیس والے نے اُس شخص کا تعاقب بھی کیا مگر وہ شخص بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس نے شبہے کے تحت ایوب کو حراست میں لے لیا۔ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ واردات اُسی نے کی ہے۔ اُس پر مقدمہ چلایا گیا۔ بشیر کی گواہی کے نتیجے میں اُس کے بچ نکلنے کا امکان بھی نہیں رہا۔ اُسے عمر قید کی سزا ہوئی۔ وہ شادی شدہ تھا... اور دو بچوں کا باپ...

کبھی کبھی بشیر کہتا... "ایوب کو میری وجہ سے سزا ہوئی ہے۔ میں

اُسے جیل بھجوانے کا ذمے دار ہوں۔ یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

ساجدہ اُس کے احساسات کو سمجھتی تھی۔ وہ اکثر اُسے مشورہ دیتی کہ ایوب کے بجائے اُس شخص کے بارے میں سوچا کرے جو ایوب کے ہاتھوں قتل ہوا تھا لیکن بشیر پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ کبھی یوں ہوتا کہ وہ بے حد خوش گوار موڈ میں ہوتا اور پھر اچانک ہی اُس کی آنکھوں میں تاریک پرچھائیاں اُتر آتیں۔ ایسے موقعوں پر وہ ساجدہ کو بالکل اجنبی لگتا، کوئی غیر۔ حقیقت یہ تھی کہ گھر میں ایوب کا ذکر چھڑتا تو ماحول ہی بدل کر رہ جاتا۔

بشیر نے کوشش کر کے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور بولا۔ "ہاں بیٹے... کیا خبر ہے؟"

"گورنر نے رحم کی اپیل مسترد کر دی ہے۔" شاہد نے بتایا۔

بشیر نے سگریٹ سلگایا اور سرسری انداز میں بولا۔ "یہ اُس کی دوسری اپیل تھی... اور یہ بھی مسترد ہو گئی۔ ذرا مجھے اخبار تو دکھاؤ۔"

ساجدہ اُٹھ کر بشیر کی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی اور اُس کے کندھے پر جُھک کر اخبار پڑھنے لگی۔ خبر کے مطابق ایوب کی بیوی سائرہ کو اپنے شوہر کی بے گناہی پر کامل یقین تھا اور وہ ہمہ وقت اُس کی رہائی کے لیے کوشاں رہتی تھی۔ اخبار میں وہ پتا بھی تھا، جہاں وہ آج کل اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ ساجدہ کے ذہن میں برسوں پہلے شائع ہونے والی ایوب اور سائرہ کی تصویریں گھوم گئیں۔ وہ دونوں نوجوان تھے... اور بے حد خوش نظر آتے تھے۔ تازہ تصویروں میں اُن کے چہروں پر وقت کی گرد کے ساتھ مایوسی اور ناامیدی بھی تھی۔ خبر کے آخر میں لکھا تھا...

"گورنر نے کہا ہے کہ ایوب کی رحم کی اپیل پر اُس وقت تک غور نہیں کیا جا سکتا، جب تک وہ حکام کو اس مقام سے آگاہ نہیں کر دیتا، جہاں اُس نے مسروقہ رقم چھپائی ہے۔ دوسری طرف بارہ سال سے قید ایوب کا کہنا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ مجھے بلاوجہ پھانسا گیا ہے۔ اگر میں نے جرم کیا ہوتا تو مسروقہ رقم دے کر پیچھا چھڑا لیتا۔ میں اپنے بیوی بچوں کو عسرت کی زندگی بسر کرتے کیوں دیکھتا۔ میں یہ دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اصل مجرم پکڑا جائے تبھی حکام کو احساس ہو سکے گا کہ میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہوا ہے۔"

خبر پڑھنے کے بعد ساجدہ کی نظروں کے سامنے عدالت کے منظر پھر گئے۔ ایوب کا چہرہ سپید پڑ چکا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ "میں نے جرم نہیں کیا۔ میں مجرم نہیں ہوں... خدا کی قسم!" اور اُس کی بیوی سائرہ چلا رہی تھی۔ "میرا شوہر بے قصور ہے۔ اس نے جرم نہیں کیا۔" پھر اسے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا بشیر نظر آیا۔ اُس کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔ چہرے کی رنگت زرد تھی۔ وہ ایوب اور اُس کی بیوی سے نظریں چرا رہا تھا مگر اس کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ "وہ ایوب ہی تھا۔ میں نے صاف دیکھا تھا۔ وہ ایوب ہی تھا...!"

خبر پڑھنے کے بعد بشیر نے خاموشی سے اخبار میز پر رکھ دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں جا رہا ہوں۔" اُس نے کہا اور کمرے کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ "آ جاؤ... میں تمھیں مارکیٹ ڈراپ کر دوں گا۔" اُس نے ساجدہ سے کہا۔

"میں ابھی آئی۔"

ساجدہ پرس اٹھا کر نکل رہی تھی کہ باہر سے ہارن کی آواز آئی۔ وہ باہر نکلی اور کار میں جا بیٹھی۔ یہ دیکھ کر اُسے خاصا سکون ہوا کہ بشیر کا موڈ پھر خوش گوار ہو گیا ہے۔ بشیر نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور پوچھا۔ "چلیں؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بشیر نے گاڑی بڑھا دی۔

راستے میں بشیر نے کہا۔ "آج میرا سوٹ کیس پیک کر دینا۔"

"کیا... پھر کہیں جا رہے ہو؟"

"ہاں... کل صبح چمن جانا ہے۔ وہاں کے باغات کا کچھ معاملہ ہے۔"

"چمن؟" ساجدہ نے دُہرایا۔ "آج مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ چمن میں تمھارے کچھ باغات بھی ہیں۔"

"میں کاروباری معاملات کو گھر سے دور رکھنے کا قائل ہوں۔"

"ایسا بھی کیا۔ بیویاں اپنے شوہروں کے معاملات کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں۔ بیوی سے کچھ چھپایا تو نہیں جاتا۔"

"چھپاتا تو میں بھی کچھ نہیں ہوں، مگر میں مَردوں کے معاملات میں عورتوں کی دخل اندازی ناپسند کرتا ہوں۔ میں اُن مَردوں کو بے وقوف سمجھتا ہوں، جو کاروباری اُمور پر بیویوں سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔" بشیر نے جواب دیا۔

"کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں تمھیں نہیں جانتی۔ میں تمھاری شخصیت کے صرف ایک رُخ سے واقف ہوں... وہ رُخ جس کا تعلق گھر اور گھریلو معاملات سے ہے۔"

بشیر ہنس دیا۔ "میری شخصیت کا سب سے پُرکشش رُخ یہی ہے۔"

"مذاق مت کرو۔ میں سنجیدہ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کرتے کیا ہو۔ کاروبار کیا ہے تمھارا؟"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں ایک گڈز کمپنی کا مالک ہوں۔ میرے ٹرک ملک کے ہر حصے میں مال لے جاتے اور لاتے ہیں۔ باغات کا سلسلہ علیحدہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمھیں اور بچوں کو ہر آسائش میسر ہے۔"

آسائش کے ذکر پر ساجدہ کو بیتا زمانہ یاد آ گیا۔ اُن دنوں پیسے کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ پیسے کے بارے میں گفتگو کرتے وقت اُن کا انداز مختلف ہوتا تھا۔ اُن دنوں وہ چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ بشیر کی تنخواہ بہت کم تھی۔ بہت زیادہ محنت سے اُسے عزت تو ملتی تھی مگر تنخواہ میں اضافہ کبھی نہیں ہوتا

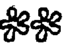
تھا۔ ساجدہ کو یاد تھا کہ اُن دنوں بشیر کس قدر دل گرفتہ رہتا تھا۔ تنگ آ کر اُس نے شیئرز خرید نے شروع کیے اور اس کے لیے ساجدہ کو اپنے زیور کی قربانی دینی پڑی۔ یہ علم ساجدہ کو بعد میں ہوا کہ بشیر کو نقصان اُٹھانا پڑا ہے لیکن بشیر حوصلہ ہارنے والا نہیں تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ یہ رقم گنوا کر اُس نے اہم تجربہ حاصل کیا ہے۔ اب وہ منافع کما سکے گا لیکن ہوا یہ کہ منافع کے چکر میں اُس کا بال بال قرضے میں بندھ گیا۔ پھر ایک رات وہ گھر آیا تو اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُس نے ساجدہ کو بتایا کہ پوری رقم ڈوب چکی ہے اور وہ بیس ہزار روپے کا مقروض ہے۔ ساجدہ کو خوب یاد تھا، اُس رات بشیر نے کہا تھا۔ ’’اگر مجھے کہیں اتنی بڑی رقم یقینی طور پر ملنے کا امکان نظر آئے تو میں ڈاکا ڈالنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔‘‘

وقت جیسے تیسے گزر گیا تھا۔ ساجدہ نے بشیر کی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ کر آدمی کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ البتہ کر گزرنے کی اور بات ہے... اور بشیر بہر حال ایسا نہیں تھا۔

لیکن اُس واقعے کے چند ہی روز بعد گھر میں معجزاتی طریقے سے روپے پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔ پیسہ کسی سیلاب کی طرح چلا آ رہا تھا مگر کہاں سے؟ اس سوال کا جواب ساجدہ کو کبھی نہیں ملا۔ اُس نے بشیر سے پوچھا تو ایک ہی جواب ملا۔ ’’شیئرز کے کھیل میں یہی ہوتا ہے جان۔ جاتا ہے تو جاتا ہے، آتا ہے تو آتا ہے۔ میں نے کامیابی کا راز پا لیا ہے۔‘‘ ساجدہ نے مزید تفصیلات جاننے کے لیے زور دیا تو اُس نے کہا۔ ’’تم صرف خرچ کرو جان۔ پیسہ لانا میری ذمّے داری ہے۔‘‘

پھر بشیر نے اپنی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی شروع کی... اور اُس کا کاروبار بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہ سب کچھ ساجدہ کو خواب سا محسوس ہوتا تھا۔

’’چلو... اب اُترو بھی۔‘‘ بشیر کی آواز اسے حال میں کھینچ لائی۔ وہ اُتری اور بشیر کو خدا حافظ کہہ کے بازار کی طرف چل دی۔



خریداری سے نمٹ کر ساجدہ گھر پہنچی تو شاہدہ، ڈاکیے سے خط وصول کر رہی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی اُس نے کہا۔ ’’دیکھیے امّی... کتنا پُرانا خط ہے۔‘‘ اُس نے ساجدہ کی طرف خط بڑھا دیا۔

ساجدہ نے لفافہ لیا اور اُسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لفافے پر پیتیس دسمبر ۷۶ء کی مُہر تھی۔ خط لکھنے والے کا پتا ندارد تھا۔ خط بشیر کے نام تھا اور پتا وہ تھا جس پر وہ بارہ سال پہلے رہتے تھے۔ پھر اس پتے کو کاٹ کر اس پر موجودہ پتا لکھا گیا تھا۔ ڈاکیے نے خط تاخیر سے آنے کے سلسلے میں وضاحت کی اور پُرتجسّس نگاہوں سے کبھی ساجدہ کو اور کبھی خط کو تکنے لگا۔

ساجدہ نے لفافہ چاک کر کے خط نکال لیا۔ شاہدہ نے فخریہ انداز میں ڈاکیے سے کہا۔ ’’ہمارے گھر میں کوئی چیز ذاتی نہیں ہوتی۔‘‘ ڈاکیا بہت پُرانا تھا۔ اسی لیے شاہدہ اور نذیر اُس سے بے تکلّف تھے۔

’’میں اور میرا شوہر ایک دوسرے کے خط کھول لیتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس ایک دوسرے سے چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔‘‘ ساجدہ نے کہا اور خط کھول لیا۔ پھر اُس نے تیزی سے خط پڑھ ڈالا۔ لکھا تھا...

’تمہارا کہنا ہے کہ نادر کو ایوب نے قتل کیا تھا۔
تمھاری گواہی پر اُسے سزا ہو گئی۔ تم نے سب کو بے وقوف بنا دیا مگر مجھے نہیں بنا سکتے، اس لیے کہ میں نے خود تمھیں نادر کو قتل کرتے اور رقم لے جاتے دیکھا تھا۔ میری زبان بندی کی قیمت پچیس ہزار روپے ہے۔ نقد رقم پہنچانے کے لیے میں تمھیں ایک ہفتے کی مہلت دے رہا ہوں۔ تم نہ آئے تو میں پولیس کو مطلع کر دوں گا۔ تم ایک بار مجھے دھتکار چکے ہو۔ اس بار میں اپنے کہے پر عمل کر گزروں گا۔
کریم بخش‘

ساجدہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی لیکن اُسے احساس تھا کہ شاہدہ اور ڈاکیا اسے متوقع نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اُنھیں دھماکے کی توقع تھی... اور خط بہت بڑا دھماکا تھا مگر یہ بات اُس کے چہرے سے عیاں نہیں ہونا چاہیے۔ اُس نے بھرپور کوشش کی کہ اُس کا چہرہ بے تاثر رہے۔ خط اُس نے تہ کر کے اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا۔

’’کس کا خط ہے امّی؟‘‘ شاہدہ سے رہا نہ گیا۔

’’کریم بخش صاحب کا ہے۔‘‘ ساجدہ نے جواب دیا۔ اپنے لہجے کے سکون پر اُسے خود بھی حیرت ہونے لگی۔ ’’وہ تمھارے ابّو کے بچپن کے دوست ہیں۔ وہ ایک دن کے لیے کوئٹہ آ رہے تھے۔ اُنھوں نے تمھارے ابّو سے روبی ہوٹل میں ملاقات کے لیے لکھا تھا۔ اب تو اُنھیں آ کر گئے ہوئے بھی بارہ سال کے قریب ہو گئے۔‘‘

شاہدہ اور ڈاکیا بُجھ کر رہ گئے۔ اُنھیں دھماکے کی توقع تھی اور وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکیا سلام کر کے رُخصت ہو گیا۔ ساجدہ، شاہدہ کے ساتھ گھر میں چلی آئی۔

ساجدہ کے دل و دماغ میں طوفان سا برپا تھا مگر اُس کا چہرہ کسی چٹان کی طرح بے تاثر تھا۔ وہ کچھ دیر کچن کے کاموں میں مصروف رہی، پھر ٹہلتی ہوئی باغیچے کی طرف نکل گئی اور مالی سے باتیں کرنے لگی۔ وہ خود کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس خط کو ایک بھیانک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ کریم بخش کا نام اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ یہ نام اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں اُس نے یہ نام سنا ضرور تھا۔ کہاں؟ یہ اُسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

مالی سے گفتگو کر کے وہ پلٹی تو اُس کے ذہن پر اچانک ہی خیالات کی یلغار ہو گئی۔ اُسے ایوب یاد آیا جو عدالت میں اپنی بے گناہی کے لیے چلّا رہا تھا۔ اس کی بیوی یاد آئی، جو عدالت میں اپنی ننھی بچّی کو گود میں لیے

چیخ رہی تھی کہ اُس کا شوہر بے قصور ہے۔ سب سے بڑھ کر بشیر کا رویّہ تھا جو گواہی دیتے وقت واضح طور پر الیوب اور اُس کی بیوی سے نظریں چُرا رہا تھا۔ میرے خدا! میں کیا کروں؟ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اُسے اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا شوہر مجرم۔۔ قاتل بھی ہو سکتا ہے لیکن ہر چیز اُس کے خلاف جا رہی تھی۔ ہر چیز بشیر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ دفتر فون کر کے بشیر کو خط کے بارے میں بتا دے۔ بشیر یقیناً کوئی وضاحت کرے گا کہ وہ بے قصور ہے۔

دفتر سے پتا چلا کہ بشیر کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے۔ ساجدہ نے ریسیور رکھا اور دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہنے لگی۔ اُسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ ایسی باتیں فون پر کرنا مناسب نہیں ہے۔

وہ صرف ایک بات سے خوف زدہ تھی۔ اگر یہ سب کچھ سچ ثابت ہوا تو؟ اس سے آگے سوچنے کی اُس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ تھک ہار کر اُس نے خود کو مصروف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خود کو خیالات کی یلغار سے بچانے کی یہی ایک صورت تھی۔ اُس نے حسبِ ہدایت بشیر کا سوٹ کیس پیک کرنا شروع کر دیا۔

شام کو اُسے شاہدہ کے لیے جو زیورات بننے کو دیے تھے، وہ لانا تھے۔ یہ بات گزشتہ رات طے پا چکی تھی کہ بشیر دفتر سے واپس آتے ہوئے بازار سے اُسے ساتھ ہی لے آئے گا۔ جیسے تیسے اُس نے وقت گزاری کی۔ شام کے وقت اُس نے رکشا پکڑا اور صراف کی دکان پر پہنچ گئی۔ زیورات وصول کرنے کے بعد وہ دکان میں رُکی رہی۔ بالآخر اُسے دکان کے باہر بشیر کی کار رکتی دکھائی دی۔ پھر بشیر نے ہارن دیا۔ وہ باہر نکل آئی۔ بشیر نے زیورات کے ڈبّے لے کر عقبی نشست پر رکھے۔ وہ خود اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔

”دن کیسا گزرا؟“ ساجدہ نے پوچھا۔

”مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ آج میں بہت تھک گیا ہوں۔“ بشیر نے کہا پھر پوچھا۔ ”تم سناؤ۔ کوئی اہم ڈاک؟“

یہ ہر روز کا معمول تھا۔ بشیر گھر پہنچتے ہی یہ سوال کرتا تھا۔ آج کیونکہ وہ باہر ملے تھے، اس لیے بشیر نے یہ سوال کار چلاتے ہوئے کر لیا۔ ساجدہ نے سوچا اس وقت بشیر بہت تھکا ہوا ہے۔ کھانے کے بعد اس خط کا تذکرہ کروں گی۔ ”کوئی نہیں۔ بس ایک خط آیا ہے، میری سہیلی کا۔“ پھر اسے خیال آیا کہ خط بشیر کو دکھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ چپکے سے پھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ ترغیب بہت قوی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا کر نہیں سکے گی۔ وہ اس خط کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

وہ گھر پہنچے۔ دروازے پر انہیں ایک موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی۔ نمبر پلیٹ کے اوپر ایک اور پلیٹ تھی۔۔۔ اور اُس پر پریس لکھا تھا۔ بشیر گیٹ کھولنے کے لیے گاڑی سے اُترا تو ایک شخص اُس کی طرف بڑھا۔ ”آپ بشیر افضل صاحب ہیں نا؟“ اُس نے کہا۔ ”میں روزنامہ گلستان کا نمائندہ ہوں۔“

”ہاں۔۔۔ میں ہی بشیر افضل ہوں۔ فرمایئے۔۔۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

ساجدہ کو گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ وہ بھی نیچے اُتر آئی۔

”میں اُس خط کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، جو آپ کو بارہ سال کی تاخیر کے بعد ملا ہے۔ ہم ایسے تمام لوگوں سے مل رہے ہیں، جن کے خطوط گمشدہ تھیلے میں تھے۔ چند افراد سے تو میں مل چکا ہوں۔ اب اس خط کے بارے میں آپ کا تاثر معلوم کرنا ہے۔ یہ فرمایئے، خط کس نے لکھا اور اُس کا مضمون کیا تھا؟ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کا نام نہیں چھاپیں گے۔“

”کیسا خط؟ میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی۔“

”اوہ۔۔۔ اس کا مطلب ہے، ابھی آپ کو خط نہیں دکھایا گیا۔“ رپورٹر نے کہا اور ساجدہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”خط یقیناً آپ کے پاس ہی ہوگا۔ آپ بیگم بشیر ہیں نا؟“

”ساجدہ۔۔۔ یہ تم تو کہہ رہی تھیں، کوئی خاص خط نہیں آیا ہے؟“ بشیر نے ساجدہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

ساجدہ بری طرح گڑبڑا گئی۔ اُس کی عقل مندی کو وقت حماقت ثابت کر رہا تھا۔ وہ پہلے ہی بتا دیتی تو اچھا تھا۔ معاملہ اب اُس کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔

”بولو نا ساجدہ۔ ایسا کوئی خط ملا ہے آج؟“ بشیر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”جی ہاں۔“

”کس کا خط تھا؟“

”کریم بخش کا۔“ جواب دینے ہی میں عافیت تھی۔

”کریم بخش!“ یہ نام بشیر کی زبان سے یوں ادا ہوا جیسے گالی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ریخ بستگی اتر آئی۔

”بشیر صاحب۔۔۔ یہ کریم بخش صاحب کون ہیں؟“ رپورٹر نے پوچھا۔

”مسٹر۔۔۔ میں اس سلسلے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔“ بشیر نے سخت لہجے میں کہا۔

”جناب۔۔۔ میں نے عرض کیا نا کہ میں۔۔“

”اور میں جو عرض کر رہا ہوں کہ میں اس سلسلے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔ آپ تشریف لے جائیں۔“ بشیر نے کہا، بڑھ کر گیٹ کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”بشیر صاحب، میں۔۔“ رپورٹر نے پھر زبان کھولی۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ اس بار بشیر نے گرج کر کہا پھر وہ گاڑی اندر لے گیا۔ کار سے اتر کر اس نے گیٹ بند کیا۔ رپورٹر بڑی نفرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ تاہم اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی بشیر ساجدہ پر برس پڑا۔ ”تم نے اس

خط کے بارے میں مجھے فون کرکے کیوں نہیں بتایا؟"

"میں نے فون کیا تھا۔ تم کہیں گئے ہوئے تھے۔"

"تو اب راستے ہی میں بتا دیتیں۔"

"میں نے سوچا تھا کھانے کے بعد مناسب رہے گا۔"

بشیر سخت نگاہوں سے اُسے گھورے جا رہا تھا۔" ساجدہ... تم نے پڑھا تھا وہ خط؟" اُس نے پوچھا۔ ساجدہ کے اقرار پر وہ بولا۔" ایک شخص مجھے قاتل ٹھہرائے اور تم اُس کا خط مجھے دینے میں لیت و لعل سے کام لو۔"

"بشیر... تمھیں کیسے پتا چلا کہ اُس نے تم پر قتل کا الزام لگایا ہے جو تم نے تو ابھی وہ خط پڑھا بھی نہیں۔" ساجدہ نے آہستہ سے کہا۔

بشیر نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔" لاؤ... خط مجھے دے دو۔" اُس نے کہا۔ ساجدہ نے ہینڈ بیگ سے خط نکال کر اُسے دے دیا۔ اُس نے وہ خط پڑھا۔ پھر پوچھا۔" کسی اور نے تو یہ خط نہیں دیکھا؟"

"شاہدہ نے دیکھا تھا مگر پڑھا نہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ یہ تمھارے پرانے دوست کا خط ہے۔" ساجدہ نے کہا اور اپنے جھوٹ کی تفصیل سُنا دی۔

بشیر نے سکون کا سانس لیا اور خط کے پُرزے کرکے اُسے ٹوکری میں پھینک دیا۔" کوئی پڑھ لیتا تو مصیبت آجاتی۔ کیسی کیسی سُرخیاں لگتیں اخباروں میں۔ گڑے مُردے اکھاڑے جاتے...۔" وہ کہتے کہتے ٹھٹکا کیونکہ ساجدہ ٹوکری کو گھورے جا رہی تھی۔" کیا بات ہے ساجدہ؟"

"کیا یہ سچ ہے؟" ساجدہ کو خود اپنی آواز اجنبی لگی۔

بشیر خاموشی سے ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اُس کی نگاہوں میں ساجدہ کو صرف برہمی نہیں، شدید نفرت بھی محسوس ہوئی۔ وہ لرزنے لگی۔ بشیر نے پہلے کبھی اُسے ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پچھتا بھی رہی تھی۔ اُسے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن زبان سے نکل جانے والی بات تو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ہوتی ہے۔ لوٹ کر کبھی نہیں آتی۔

بالآخر بشیر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔" ساجدہ... اِس سوال کا جواب میں نہیں دوں گا... تم دو گی۔ بولو... تمھارے خیال میں یہ ممکن ہے؟ میں ایسا کرسکتا ہوں؟" ساجدہ خاموش رہی۔ بشیر اچانک پھٹ پڑا۔" کیوں نہیں دیتیں جواب؟ تم مجھے ساری دنیا سے زیادہ بہتر طور پر جانتی ہو۔ بولو۔ کیا میں قتل کرسکتا ہوں؟ ڈاکے کی اہلیت ہے مجھ میں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک معصوم شخص کو جیل میں سڑوا سکتا ہوں میں؟ جواب دو۔"

ساجدہ گُنگ کھڑی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ بشیر اُس کے جواب کا منتظر ہے لیکن اُس کی آواز تو جیسے چھن گئی تھی۔

"بولو ساجدہ؟" بشیر بپھر گیا۔ اُس نے ساجدہ کی کلائی تھام لی۔" جواب دو ساجدہ۔ کیا تمھیں اس خط پر یقین ہے؟"

"نہیں... نہیں۔ یقین کرو بشیر! میں جانتی ہوں، خط میں جو کچھ لکھا ہے، جھوٹ ہے۔" ساجدہ نے دُکھتی ہوئی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم نے مجھ سے پوچھا کیوں؟"

"بشیر... میری کلائی چھوڑ دو۔ تم مجھے تکلیف پہنچا رہے ہو...۔"

بشیر نے جلدی سے اُس کی کلائی چھوڑ دی۔ اُس کی آنکھوں میں مچلتے شعلے سرد پڑنے لگے۔" سوری ساجدہ... مجھے احساس ہی نہیں تھا۔" اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

ساجدہ رونے لگی۔ بشیر نے اُسے لپٹا لیا۔ ساجدہ اس کے کندھے پر آنسو بہاتی... سوچتی رہی۔ 'یہ ہے میرا مقام... یہ ہے میری جنّت میں اسے تباہ کررہی تھی۔'

بشیر نے اسے ہٹایا اور اُس کی کلائی سہلانے لگا۔ وہ بار بار معذرت کیے جا رہا تھا۔

ساجدہ کے آنسو تھمنے میں کچھ دیر لگی۔

"بیٹھو ساجدہ۔" بشیر نے اُس کے سنبھلنے کے بعد کہا۔" اس خط کے بارے میں جو کچھ میں جانتا ہوں، تمھیں بتا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ ضرور کہوں گا کہ تمھارے رویے پر مجھے حیرت ہے۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ یہ سچ بھی ہوسکتا ہے!"

ساجدہ نے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔" دراصل... دراصل اس خط نے مجھے بہت بڑا شاک پہنچایا ہے۔" بالآخر وہ بولی۔

"شاک تو مجھے بھی لگا ہے۔" بشیر نے کہا۔" ظاہر ہے، ایسا موقع روز روز تو نہیں آتا کہ آدمی کو قتل کے الزام کا سامنا کرنا پڑے۔"

"اور پھر تمھارا ردِعمل...۔"

"اور کیا ہوسکتا تھا۔" بشیر نے اُس کی بات کاٹ بھی دی اور مکمل بھی کردی۔" فرض کرو... تمھیں کوئی ایسا خط ملے جس میں تم پر مجھ سے بے وفائی کا الزام لگایا گیا ہو... تمھارے کردار پر کیچڑ اچھالی گئی ہو تو تمھارا ردِعمل کیا ہوگا؟"

ساجدہ سے نظریں نہیں اُٹھائی گئیں۔ شرمندگی اور احساسِ جرم اس قدر شدید تھا کہ وہ اُس سے نظریں نہیں ملا سکتی تھی۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔

"اور پھر اچانک پن پر بھی غور کرو۔ مجھے سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ سر پر ایک رپورٹر سوار تھا۔ بہرحال... مجھے خود پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔"

"یہ کریم بخش کون ہے؟" ساجدہ نے پوچھا۔

"ہماری کمپنی میں چوکیدار تھا۔ رات میں ڈیوٹی ہوتی تھی اُس کی۔ یاد نہیں ہے، اُس روز گواہی کے بعد عدالت میں ایک شخص نے مجھے روکا تھا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا اور تم بھی میرے ساتھ تھیں۔"

ذہن پر زور دینے پر ساجدہ کو کچھ کچھ یاد آگیا۔ اُس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

" اس روز بھی اس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔" بشیر نے کہا۔ " اُس نے زبانی طور پر بھی یہی دھمکی دی تھی، جو تم خط میں پڑھ چکی ہو۔"

" مگر کس بنیاد پر؟ اسے جرأت کیسے ہوئی بلیک میل کرنے کی؟"

" پتا نہیں۔ مجھے تو وہ پاگل ہی لگا تھا۔ شاید اُس نے سوچا ہو کہ مجھے ڈرا دھمکا کر مجھ سے رقم حاصل کر سکے گا۔"

" بشیر... میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔"

" میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔" بشیر نے بے بسی سے کہا۔ " اس روز بھی اُس نے دھمکی دی تھی کہ رقم نہ ملی تو وہ پولیس سے بات کرے گا۔"

" لیکن اُس نے یہ نہیں سوچا کہ تم پچیس ہزار روپے کہاں سے لاؤ گے؟"

" پتا نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

" لیکن بشیر... کوئی وجہ تو ہوگی...!"

" کیسی وجہ؟ کاہے کی وجہ؟" بشیر نے تیز لہجے میں کہا۔ اُس کے چہرے پر پھر سائے لہرانے لگے۔

ساجدہ پھر گڑبڑا گئی۔ " میرا مطلب ہے، اُس نے اس یقین کے ساتھ دھمکی دی ہوگی کہ وہ مؤثر ثابت ہوگی... اور... اور یہ کہ تم اسے وہ رقم ادا بھی کر سکو گے۔ ورنہ اسے جرأت کیسے...!"

" میں نے کہا نا... وہ مجھے پاگل معلوم ہوتا ہے۔"

" تم نے اسے کیا جواب دیا تھا؟"

" میں نے کہا... اپنی یہ خرافات پولیس والوں ہی کو سناؤ۔ وہ خود تمہاری خبر لیں گے۔ دماغ درست کر دیں گے تمہارا۔ اور میں سمجھا تھا کہ میں نے اُس سے جان چھڑا لی ہے۔ اِس خط کا تو مجھے علم ہی نہیں تھا۔ میں بالکل ہی لاعلم رہا اُس سے۔ ویسے یہ خط مجھے بروقت مل گیا ہوتا تو میں اس کا جواب ہرگز نہ دیتا۔ بلکہ ممکن ہے، میں یہ خط لے کر تھانے چلا جاتا۔"

" میری سمجھ میں نہیں آتا۔" ساجدہ بولی۔ " پھر اس نے تم سے رابطہ بھی نہیں کیا؟"

" نہیں... اور نہ ہی وہ پولیس کے پاس گیا۔ میرا خیال ہے، اُس کے جھوٹ کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر وہ سچا ہوتا تو اُس نے پولیس سے رابطہ ضرور کیا ہوتا۔"

" ہاں... یہ تو ہے۔" ساجدہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ " لیکن ایوب کے خلاف شہادت...؟"

" کیا مطلب؟ اس گواہی کا کہاں سے تذکرہ نکل آیا؟ اس معاملے سے کیا تعلق ہے اس گواہی کا؟" بشیر کا لہجہ تیز ہوگیا۔

" میں نے کب کہا کہ کوئی تعلق ہے۔"

" تو پھر تم نے ذکر کیوں چھیڑا اس کا۔ ایوب جیل میں ہے تو اس لیے کہ وہ مجرم تھا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں... وہ مجرم تھا۔" بشیر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

ساجدہ خوف زدہ نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ وہ اعصابی اختلال کا شکار ہو رہا تھا... " کیوں؟" میں نے کب کہا کہ ایوب مجرم نہیں ہے۔"

" مجھے تو ایسا ہی لگا، جیسے تم اُس کی بے گناہی جتا رہی ہو۔"

" ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ساجدہ نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ " تم اتنے نروس اور زود رنج کیوں ہو رہے ہو؟"

" پتا نہیں۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ گواہی کے متعلق تم کیوں اُلجھ رہی ہو؟"

" میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ایوب کے خلاف تمہاری گواہی بے حد مؤثر تھی۔ اس کے باوجود اس کریم بخش نے تمہیں بلیک میل کرنے کی ہمت کی۔ کیوں؟"

بشیر قدرے پُرسکون نظر آنے لگا۔ اُس نے ساجدہ کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ " ساجدہ... اِس خط نے مجھے دہلا دیا ہے۔ وہ یادیں اُبھار دی ہیں، جنھیں میں بھلانا چاہتا ہوں۔ دیکھو نا... یہ خیال مجھے ہر وقت ستاتا ہے کہ ایوب صرف میری گواہی کی وجہ سے قید کاٹ رہا ہے۔ یہ بوجھ ہے مجھ پر۔ میں یہ بات بھول جانا چاہتا ہوں مگر...!"

" مجھے احساس ہے اس بوجھ کا۔"

" تو جو کچھ میں نے کہا اس پر تمہیں یقین ہے نا؟"

" کیوں نہیں۔ یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے اس میں؟"

" بس... پھر سب ٹھیک ہے۔ اب اس خط کو بھول جاؤ۔ اس میں جو لکھا ہے، جھوٹ ہے۔"

" ٹھیک ہے بشیر۔ مگر میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔" ساجدہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ " تم نے کریم بخش کی بلیک میلنگ کے بارے میں مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا؟ تم نے مجھ سے چھپایا کیوں؟"

بشیر چند لمحے اُسے گھورتا رہا، پھر مسکرا دیا۔ وہ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ " میں تمھیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کریم بخش جھوٹا ہے... بلکہ شاید پاگل بھی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

ساجدہ سوچتی رہی۔ بشیر کو کیسے بتاتی کہ عورت کبھی کبھی پریشان ہونا بھی چاہتی ہے۔ شوہر کی پریشانیوں میں حصّے دار بننے کو اُس کا بھی جی چاہتا ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ بات بشیر کے مزاج کے خلاف ہے۔ اُسے اس بات پر غصّہ بھی نہیں آیا۔ وہ بشیر سے محبت کرتی تھی... اس پر اعتماد تھا اُسے، چنانچہ وہ پُرسکون ہوگئی۔

❀❀

اس رات ساجدہ بستر پر بیٹی بشیر کو تک رہی تھی جو اخبار پڑھ رہا تھا۔ اُس نے ریڈیو بھی آن کیا ہوا تھا۔ ساجدہ کو تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ خط اب بھی کسی ڈراؤنے خواب کی طرح اُس کے ذہن سے چپکا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نہ وہ اس خط کو کبھی بھلا سکے گی اور نہ ہی کریم بخش کا نام اُس

کے ذہن سے مٹ سکے گا۔

پھر ریڈیو پر خبریں شروع ہو گئیں۔ مقامی خبریں تھیں۔ کچھ سیاسی خبروں کے بعد نیوز ریڈر نے کہا: "یہ جیل میں ایوب کا بارھواں سال ہے اور یہ دوسرا موقع ہے کہ اس نے رحم کی اپیل کی ہے۔ اپیل مسترد ہونے کے بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا... 'میں بے قصور ہوں۔ میری دعا ہے کہ اصل قاتل پکڑا جائے۔ اسی کی وجہ سے میں ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں جیل میں سڑ رہا ہوں اور میرے بچے میری زندگی میں یتیم ہو گئے ہیں۔ میرا اللہ پر یقین ہے ایک نہ ایک دن وہ انصاف کرے گا اور حقیقت عیاں ہو جائے گی...'"

خبریں جاری رہیں لیکن ساجدہ اب اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ بشیر کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا تھا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر خوف کی وہ مانوس پرچھائیاں تھیں، جو گزشتہ بارہ سال سے ایوب کے تذکرے پر وہ دیکھتی آئی تھی۔ وہ سوچتی رہی... کہیں یہ احساسِ جرم تو نہیں... ضمیر کا بوجھ تو نہیں؟

اچانک خوف اس کے رگ و پے میں رینگ آیا۔ بشیر نے جھلا کر ریڈیو بند کیا اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے یا نہیں۔ ساجدہ نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں اور سوتی بن گئی۔ بشیر کے چہرے کا وہ تاثر وہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی... نہ بشیر دکھانا چاہتا ہو گا۔

چند لمحے بعد بشیر کی انگلیوں کا لمس اسے اپنے ہاتھوں پر محسوس ہوا۔ وہ بلاارادہ سمٹ گئی اور آنکھیں کھول دیں۔

"کیا بات ہے ساجدہ؟" اس کے طرزِ عمل نے بشیر کو چونکا دیا۔ وہ تو ہمیشہ اس لمس سے بے سدھ ہو جاتی تھی۔

"کک... کچھ نہیں۔ بشیر... میں بہت تھک گئی ہوں۔" ساجدہ نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

"میں سمجھ رہا ہوں ساجدہ۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔" بشیر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ خط تمہیں اب بھی پریشان کر رہا ہے۔ تم گومگو کی کیفیت میں ہو۔ الجھ رہی ہو کہ میرا دعویٰ مانو یا اس خط کو درست سمجھو اور میں تمہیں قصوروار بھی نہیں سمجھتا۔ میں خود کو تمہاری جگہ رکھ کر محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"بشیر... میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے خط پر ہرگز یقین نہیں ہے۔"

"اس کے باوجود تم خط کی وجہ سے پریشان ہو۔"

"ہاں... مگر بہت تھوڑی۔"

"جتنا اعتراف کر رہی ہو، اس سے زیادہ پریشان ہو تم۔"

وہ خاموش رہی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ یہ خاموشی تو تائید ثابت ہو گی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "بھول جاؤ اس خط کو۔"

"میں بھول سکتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ جھوٹ ہے۔ مگر تم نہیں بھول سکتیں۔" بشیر کا لہجہ پھر تلخ ہو گیا۔

"میں بھی بھول جاؤں گی... بھول ہی جاؤں گی۔"

"میں جانتا ہوں، تم بھولنے کی کوشش کرو گی۔ مگر یہ آسان نہیں ہو گا۔ تم انسان ہو۔ تمہیں ہمیشہ مجھ پر شک رہے گا۔ کاش... کاش! میں ثابت کر سکتا...!"

"تمہیں کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے۔"

"ساجدہ... نادر کو ایوب ہی نے قتل کیا تھا۔ صرف وہی اسے قتل کر سکتا تھا۔ میں نے خود اسے تھیلا لیے بھاگتے دیکھا تھا۔" بشیر کی آواز بلند ہو گئی۔ "وہاں اندھیرا تھا، اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ بھاگنے والا ایوب ہی تھا۔ اور پھر میں نے مرتے ہوئے نادر کی چیخ سنی تھی۔ نادر نے بھی ایوب کا نام لیا تھا۔ نادر نے اپنے قاتل کو پہچان لیا تھا۔ تم اور کیا ثبوت چاہتی ہو ساجدہ! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟"

"میں ثبوت مانگ ہی کب رہی ہوں۔" ساجدہ نے کہا۔ مگر اس کے ذہن میں شک کا سایہ لہرا گیا۔ آخر بشیر مجھے قائل کرنے کی اتنی زیادہ کوشش کیوں کر رہا ہے؟ میں اسے بتا چکی ہوں کہ مجھے اس پر اعتماد ہے۔ کیا اس کے لیے اتنا کافی نہیں؟

بشیر نے اسے شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ پچیس سالہ ازدواجی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ ان کے لہجے گرم جوشی سے محروم تھے۔ بشیر کے لہجے میں یاسیت تھی اور ساجدہ کے لہجے میں بے گانگی اور کشیدگی، جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

بشیر کے جانے کے بعد ساجدہ نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن کی کال کوٹھری کے دروازے سے ناخوش گوار یادیں سر ٹکرا رہی تھیں۔ "ہمیں باہر آنے دو... ہمیں باہر آنے دو۔" وہ دروازہ بند رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔

جب بھی کوئی ایوب کا نام لیتا، بشیر کی رنگت متغیر ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتی، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بارہ سال کم تو نہیں ہوتے۔ اتنے عرصے میں تو بڑے سے بڑا زخم بھر جاتا ہے، آدمی ہر بات بھول جاتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا ضمیر مطمئن ہو۔ اسے دامن صاف ہونے کا یقین میسر ہو۔

اسے تنگ دستی کے وہ دن یاد آئے، جب بشیر مقروض تھا۔ وہ بے حد مایوس تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس وقت وہ رقم کے حصول کے لیے ڈاکا بھی ڈال سکتا ہے۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ مایوسی کے عالم میں انسان کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ البتہ کرنے کی بات اور ہے اور بشیر ایسا نہیں ہے۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس نے ٹھیک سوچا تھا؟ کیا بشیر صرف تذکرہ کر کے رہ گیا تھا جرم کا... یا اس نے اپنے کہے پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔

پھر اسے وہ رات یاد آئی... قتل کی رات! اس رات بشیر گھر آیا تو اس کی نگاہوں میں خوف تھا۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ اس نے ساجدہ کو قتل کے بارے میں بتایا مگر جزئیات بتانے سے گریز کرتا رہا۔ ساجدہ کے اصرار پر اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ "میں اس سلسلے میں کوئی بات کرنا

نہیں چاہتا؟"

پھر جتنے عرصے مقدمہ چلتا رہا، بشیر جیسے اپنے آپ میں سمٹا رہا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کوئی بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً اُس پر غشی کے دورے پڑتے۔ یہاں تک ہوا کہ نیند کی گولیوں کے استعمال کی نوبت آگئی۔

اب ساجدہ کے ذہن میں سوالات سر اُٹھا رہے تھے... جواب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ کیا کریم بخش کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر بشیر کو بلیک میل کر سکتا تھا؟ بشیر کا کہنا تھا کہ اُس نے کریم بخش کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ پولیس نے کبھی اُن کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔ مگر اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بشیر نے چپکے سے کریم بخش کا مُنہ بند کر دیا ہو... اُسے رقم دے دی ہو۔ کچھ بھی ہوا ہو۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ بشیر کے پاس دولت کہاں سے آئی؟ ساجدہ نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ ایوب کو سزا ہونے کے چند ماہ بعد ہی اُس کے گھر میں دولت کی ریل پیل شروع ہوئی تھی۔ ایوب نے بھی تو یہی کہا تھا "میرے پاس کوئی رقم نہیں۔ میں نے کوئی رقم نہیں چرائی۔ کسی اور نے چرائی ہوگی۔"

ساجدہ سوچتی گئی اور اُلجھتی گئی۔ اسے بشیر سے محبت تھی۔ اُس پر اعتماد تھا۔ لیکن اُس کے لیے یہ ضروری تھا کہ حقیقت جاننے کی کوشش کرے۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اُسے نیند آگئی۔

❀❀

صبح ناشتے کی میز پر وہ ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے تھے۔ شاہدہ نے بھی یہ بات محسوس کرلی۔ اُس نے امّی اور ابّو کو چھیڑنے کی کوشش کی مگر فوراً ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ معاملہ سنگین ہے یا نہیں اُس کی مداخلت ناقابلِ قبول ہے۔ وہ خاموشی سے ناشتے پر جھک گئی۔

ساجدہ اور بشیر کے درمیان ایک خاموش سمجھوتا بہرحال ہو چکا تھا۔ خط کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا جائے گا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر بشیر نے ساجدہ سے کہا "تم مجھے بس کے اڈّے تک پہنچا دو کار میں۔"

کچھ دیر بعد وہ باہر نکل آئے۔ بشیر نے گیراج سے کار نکالی۔ اِس بار ڈرائیونگ سیٹ ساجدہ نے سنبھالی۔ دونوں کے چہروں پر کشیدگی اور تناؤ تھا اور لبوں پر خاموشی۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

بالآخر بشیر نے خاموشی توڑی "کیا بات ہے ساجدہ؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔" ساجدہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"ایک نیم دیوانے شخص نے مجھ پر قتل کا الزام لگایا اور تم نے اس پر یقین کر لیا۔ میری تردید پر تمھیں یقین نہیں آیا۔ تم اُس کی بات کو میری بات پر ترجیح دے رہی ہو، جس کی تمھیں شکل بھی یاد نہیں۔ جس کے بارے میں تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔" بشیر نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ سچ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی..." ساجدہ نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔ وہ اڈّے پر پہنچ چکے تھے۔

بشیر نے اُسے کندھوں سے تھام کر جھنجوڑ ڈالا "جھوٹ مت بولو مجھ سے۔ میں نے تمھیں بتایا کہ قتل ایوب نے کیا تھا۔ عدالت میں یہ بات ثابت ہوگئی اور کیا چاہتی ہو تم؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کریم بخش نے تمھیں یہ خط کیوں لکھا؟"

"میں سمجھ گیا۔" بشیر نے سر جھٹکتے ہوئے کہا "تم اس خط پر یقین نہیں کرنا چاہتیں لیکن اس خط نے تمھارے ذہن میں شک کا بیج بو دیا ہے۔ یہی بات ہے؟ مجھے رات ہی اندازہ ہوگیا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ خود کو کس طرح بے قصور ثابت کروں لیکن مجھے پتا چل گیا۔ میں اپنی برّات ثابت نہیں کر سکتا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تم مجھ پر یقین کرو گی یا کریم بخش پر۔ یہ صرف موازنے کا کھیل ہے۔" اُس کے لہجے میں یاسیت اُتر آئی "اگر تمھیں مجھ سے محبت ہے تو اس خط کو بھول جاؤ۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکیں تو ہم مستقبل میں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔"

"تم مجھے یہ کیوں نہیں بتاتے کہ تمھارے پاس دولت کہاں سے آئی؟" ساجدہ اچانک پھٹ پڑی۔

"دولت؟"

"ہاں۔ ایوب کو سزا ہونے کے چند ماہ بعد ہی ہم اچانک خوش حال ہو گئے تھے۔ کیسے؟ کہاں سے آئی تھی وہ دولت؟"

بشیر کے چہرے سے لگتا تھا اُس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود نہیں۔ وہ چند لمحے ساجدہ کو دیکھتا رہا، پھر بولا "تو یہ بات ہے؟ گویا میں اس وقت عدالت میں ہوں۔ ملزم کی حیثیت سے!"

"بشیر...!"

"اور شاید ساری زندگی میری یہی حیثیت رہے گی۔ ہے نا؟ میں جو کچھ بھی کہوں گا اُس کا کوئی اور ہی مطلب لیا جائے گا۔"

"مجھے افسوس ہے بشیر۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔"

"میں تمھیں بتا چکا ہوں... اور پھر بتا رہا ہوں۔ مجھے شیئرز کے کاروبار میں فائدہ ہوا تھا۔ اب یہ اتفاق ہے کہ فیصلے کے کچھ عرصے بعد ہی مجھے کامیابی نصیب ہوگئی۔ ویسے تم جانتی ہو کوشش تو میں بہت پہلے سے کر رہا تھا... اور مجھے نقصان بھی کم نہیں ہوا تھا۔ اب بولو... اور کچھ پوچھنا ہے تمھیں؟"

"نہیں... کچھ نہیں۔"

"اب ایک سوال مجھے کرنا ہے۔ ہم پچیس سال سے ساتھ ہیں۔ اور ایک دن میں اتنا بڑا انقلاب آگیا ہے۔ میں نے تمھیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔ مجھ پر اعتبار... اعتماد کرو۔ اس خط

کو بھول جاؤ لیکن شاید یہ تمہارے لیے ممکن نہیں۔ چنانچہ اب سوچ لو۔ جہاں تک ضمیر کا تعلق ہے، تم سے زیادہ حساس اور صاحبِ ضمیر ہوں۔ بہرحال فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ اگر تمہارے نزدیک میں قتل کا... اور ایک بے قصور شخص کو دانستہ سزا کے لئے قید دلانے کا گناہ گار ہوں تو اس صورت میں ہم ساتھ نہیں رہ سکتے۔ تمہیں کچھ کرنا چاہیے۔ اس صورت میں تمہارا فرض ہے کہ پولیس کو مطلع کر دو۔ خوب سوچ لو ساجدہ۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔ اب میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"بشیر...! تم نہیں جانتے، میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔" ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔ "میں تم پر یقین رکھنا چاہتی...!"

"صرف چاہنا کافی نہیں ہے۔ یقین رکھنا ضروری ہے۔" بشیر نے اُس کی بات کاٹ دی اور کار سے اُتر گیا۔ "ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ سڑک کراس کر گیا۔

❀❀

ساجدہ نے گھر جانے کے بجائے لائبریری کا رُخ کیا۔ اس نے لائبریرین سے ۱۹۷۶ء کے اخبارات کی فائل نکلوائی۔ اُس کے سر میں صرف ایک ہی سودا سما گیا تھا۔ اُسے حقیقت کی جستجو کرنا تھی... اُسے بے نقاب کرنا تھا۔ وہ پرانے اخبارات اُسے کورٹ روم میں لے گئے...

کورٹ روم میں چہروں کا ازدحام تھا۔ جج صاحب اپنی کرسی پر متمکن تھے۔ ایک طرف وکیلِ استغاثہ کھڑا تھا اور دوسری طرف وکیلِ صفائی۔ ملزموں کے کٹہرے میں ایوب سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے کندھے ڈھلکے ہوئے تھے، چہرے پر شکست خوردگی تحریر تھی۔ ساجدہ کو سب سے زیادہ ترس سائرہ پر آیا جو اگلی صف میں اپنی شیر خوار بچی کو سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ وہ کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

ساجدہ نے بشیر کی طرف دیکھا۔ بشیر کسی سحر زدہ شخص کی طرح ٹکٹکی باندھے ایوب کو دیکھے جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایوب کے چہرے سے نظریں ہٹانا اُس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

پھر ایوب گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ وکیلِ استغاثہ اُس سے سوالات کر رہا تھا۔ "تم سولہ جون کی رات دفتر میں موجود تھے؟"

"جی ہاں جناب۔ کام بہت زیادہ تھا۔ میں نے سوچا نمٹا کر ہی اُٹھوں گا۔"

"کیا تم عام طور پر رات دیر تک کام کرنے کے عادی ہو؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر اس رات ایسی کون سی خاص بات تھی؟"

"میں نے بتایا نا جناب، دو تین دن کے تساہل کے نتیجے میں کافی کام اکٹھا ہو گیا تھا۔"

"اور تم کمپنی میں پانچ سال سے کام کر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ اس رات کیشیئر کے پاس زیادہ کیش ہوگا۔ اگلے دن ملازمین کو تنخواہ دی جانی تھی۔"

وکیلِ صفائی نے اُٹھ کر احتجاج کیا۔ جج صاحب نے اس سوال کو کارروائی سے حذف کرنے کی ہدایت دی۔ وکیلِ استغاثہ نے ایوب سے پوچھا۔ "دفتر میں تم کہاں بیٹھتے ہو؟"

"نچلی منزل پر... زینوں کے ساتھ والے کمرے میں۔" ایوب نے جواب دیا۔

"اور مقتول نادر کہاں بیٹھتا تھا؟"

"نچلی منزل پر... زینوں کے اُس طرف والے کمرے میں۔"

"یعنی زینوں کے ایک طرف تمہارا کمرا تھا اور دوسری طرف مقتول نادر کا؟"

"جی ہاں جناب۔"

"یعنی تم اپنے کمرے سے اُٹھ کر نادر کے کمرے میں جاؤ تو اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کوئی تمہیں دیکھ سکے؟"

ایوب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ اُسے گھیرے جانے کا احساس ہو رہا تھا۔

"زینوں کے دوسری طرف عقبی دروازہ ہے نا؟" وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"تم نے اُس رات عقبی دروازہ استعمال کیا تھا؟"

"جی ہاں جناب۔"

"کیا تم ماضی میں بھی ایسا کرتے رہے ہو؟ خصوصاً رات کے وقت؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر اُس رات تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس یونہی...!"

وکیلِ استغاثہ نے آگے جھک کر ایوب کو شوخ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "تم شراب سے شوق کرتے ہو؟"

"کبھی کبھار پی لیتا ہوں۔ عادی نہیں ہوں۔"

"فکرمند ہوتے ہو یا کوئی ملال پریشانی ہوتی ہے تو پی لیتے ہو۔ یہی بات ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"سولہ جون کی رات تم نشے میں تھے؟"

"جی نہیں جناب۔"

"یاد کرو۔ اس رات تم نے کئی جام پیے تھے۔"

ایوب نے گھرے ہوئے جانور کی طرح وحشت بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے بھاگنے کے لیے راستہ تلاش کر رہا ہو۔ "میں... میں... وہ...!" اُس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں یا نہیں میں جواب دو۔" وکیلِ استغاثہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"جی ہاں جناب۔"

وکیلِ استغاثہ نے ہاتھ بڑھا کر میز سے کوئی چیز اُٹھائی، جو بھورے رنگ کے کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی۔ اُس نے کاغذ ہٹایا اور شراب کی بوتل برآمد کی، جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ "جس رات تم نے نادر کو قتل کیا، اُس رات اِس میں سے کتنے جام پیے تھے؟ ہمیں علم ہو چکا ہے کہ یہ بوتل تم نے اسی شام خریدی تھی۔ کہاں سے خریدی تھی، ہمیں یہ بھی معلوم ہے۔"

ایوب کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ "چلو... میں نے مان لیا کہ میں نشے میں تھا۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ نادر کو میں نے ہی قتل کیا تھا۔"

"تم دفتر سے کس وقت نکلے تھے؟"

"دس بجے... یا زیادہ سے زیادہ دس بج کر پانچ منٹ پر۔"

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ خاص طور پر شراب کی آدھی بوتل معدے میں انڈیلنے کے بعد وقت کا کسے خیال رہتا ہے۔ نادر کو سوا دس بجے قتل کیا گیا تھا۔"

"تم... تم بلاوجہ مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہے ہو۔" ایوب نے دہاڑ کر کہا۔ اُس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

جج نے اُسے تنبیہ کی اور سوال کا جواب دینے کی ہدایت دی۔

"میں جواب دے چکا ہوں۔" ایوب نے تلخ لہجے میں کہا۔

وکیلِ استغاثہ نے کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک اور چیز اُٹھائی اور کاغذ ہٹایا۔ وہ لفافے چاک کرنے والا چاقو تھا۔ "مسٹر ایوب... نادر کے دل میں یہ چاقو گھونپا گیا تھا۔ اسے پہچانتے ہو؟"

ایوب کا رنگ فق ہو گیا۔ "ہاں... یہ میرا ہے۔"

"درست جواب دیا تم نے۔ انکار ممکن نہیں تھا۔ اس پر تمھاری انگلیوں کے نشان موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نشے میں دُھت تھے۔ تمھیں رقم کی ضرورت تھی۔ تمھیں معلوم تھا کہ نادر کے پاس اُس رات رقم ہوگی۔ قتل کا حوصلہ تم میں نہیں تھا۔ تم شراب کی بوتل خرید لائے۔ نشے نے تمھارے اندر جرأت پیدا کر دی۔ تم نے نادر کو قتل کیا اور رقم لے بھاگے۔"

"جھوٹ۔" ایوب حلق کے بل چیخا۔ "یہ جھوٹ ہے...!"

پھر منظر بدلا۔ اب گواہوں کے کٹہرے میں بشیر کھڑا تھا۔ اُس کا رنگ زرد تھا۔ چہرے سے کشیدگی ہویدا تھی۔ اِس بار وکیلِ استغاثہ کا لہجہ نرم تھا کیونکہ وہ اُس کا اہم گواہ تھا۔

"مسٹر بشیر...! آپ اس رات دفتر میں دیر تک کیوں رُکے؟"

"میں ٹرکوں کے لیے نیا شیڈول بنا رہا تھا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، ایوب کو دفتر میں آپ کی موجودگی کا علم تھا؟"

"میرا خیال ہے، اسے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ میرا کمرا اوپری منزل پر ہے۔"

وکیلِ استغاثہ مسکرایا۔ "اب ہمیں یہ بتلائیے کہ اُس رات آپ نے کیا دیکھا؟"

بشیر کی نظریں جھک گئیں۔ وہ بولا تو اُس کی آواز بھی بہت دھیمی تھی۔ ساجدہ نے اُس وقت بھی یہی سوچا تھا، یہ بشیر نظریں کیوں نہیں اُٹھاتا... زور سے کیوں نہیں بولتا۔ پھر ساجدہ کی نظریں ایوب کی طرف اٹھیں۔ وہ کسی معمول کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر بشیر کو دیکھے جا رہا تھا۔

"میں نے کام مکمل کیا ہی تھا کہ نچلی منزل سے چیخ سنائی دی۔" بشیر نے کہا۔ "میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اسی لیے چیخ مجھے واضح طور پر سنائی دی۔ چیخ نادر کی تھی۔ اُس نے ایک نام پکارا تھا۔"

"وہ نام بھی بتلائیے۔"

بشیر ہچکچایا۔ اُس نے ایک نظر ایوب کو دیکھا، جو اُسی کی طرف نگراں تھا۔ پھر اُس نے نظریں جھکا لیں۔ "نادر نے چیخ کر ایوب کا نام لیا تھا۔" اِس بار اُس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

"آپ کو یقین ہے...؟"

"جی ہاں جناب۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"میں نے عقبی راہداری میں بھاگتے قدموں کی آواز سنی۔ پھر عقبی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز۔ میں کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف لپکا اور باہر جھانکا۔ ایک شخص سیاہ تھیلا اُٹھائے بھاگتا نظر آیا۔"

"اس شخص کو پہچانتے ہیں آپ؟"

بشیر پھر ہچکچایا۔ کورٹ روم میں سنّاٹا چھا گیا۔ بالآخر بشیر نے نظریں اُٹھائے بغیر کہا۔ "جی ہاں جناب۔ وہ ایوب تھا۔"

ساجدہ نے ایوب کو دیکھا، جس کا چہرہ خون سے یکسر محروم لگنے لگا تھا۔

"آپ کو یقین ہے مسٹر بشیر کہ آپ نے ایوب ہی کو بھاگتے دیکھا تھا؟" وکیلِ استغاثہ نے زور دے کر کہا۔

"جی ہاں... مجھے یقین ہے۔"

استغاثہ کا اگلا گواہ کانسٹیبل صاحب داد تھا۔ اُس نے کہا۔ "وقوعے کی رات سوا دس بجے میں معمول کے مطابق ڈیوٹی دے رہا تھا کہ میں نے بلوچ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے عقبی گیٹ سے ایک شخص کو نکلتے دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں سیاہ تھیلا تھا۔ باہر نکلتے ہی اُس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ میرے للکارنے پر بھی وہ نہیں رُکا تو میں نے اُس کا تعاقب کیا لیکن وہ میرے ہاتھ نہیں آیا۔ اُس کی طرف سے مایوس ہو کر میں کمپنی کے دفتر پہنچا۔ وہاں بشیر صاحب، نادر صاحب کی لاش کے پاس کھڑے تھے۔ وہ پولیس کو فون کر چکے تھے۔ پانچ منٹ بعد تھانے والے آ گئے۔"

"تم نے بھاگنے والے کا چہرہ دیکھا تھا؟" وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ایک جھلک دیکھی تھی۔"

"کیا وہ یہ شخص تھا؟" وکیلِ استغاثہ نے ایوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

صاحب داد نے ایوب کو بغور دیکھا پھر بولا۔ "جناب! قد مماثلت تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"اُس کے قد کاٹھ کے بارے میں تو بتا سکتے ہو۔"

"قد کاٹھ تو ایسا ہی تھا جناب۔" اِس بار صاحب داد نے ایوب کی طرف اشارہ کیا۔

پیش کار نے اگلے گواہ کا نام پکارا۔ وہ نام ساجدہ کو حال میں واپس لے آیا۔ وہ لائبریری میں بیٹھی پرانے اخبار پڑھ رہی تھی، جن میں مقدمے کی روداد چھپی تھی۔ کریم بخش... یہ نام... اِس نام سے تو اسے خصوصی دلچسپی تھی۔ وہ اخبار پر جھک گئی، جیسے اس طرح اسے کریم بخش کا چہرہ نظر آجائے گا...

'اگلا گواہ کریم بخش تھا۔ کریم بخش نے بتایا کہ جس رات واردات ہوئی، وہ اُس کی چھٹی کی رات تھی۔ وکیلِ استغاثہ نے اُس سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے باہر کا کوئی آدمی دفتر میں گھس گیا ہو اور اُس نے نادر کو قتل کیا ہو۔ کریم بخش نے بتایا کہ اُس کے خیال میں یہ ناممکن ہے... کیونکہ دروازوں میں اسپرنگ لاک لگے ہیں اور انھیں اندر ہی سے کھولا جا سکتا ہے۔ باہر سے بغیر چابی کے دروازے نہیں کھولے جا سکتے۔'

ساجدہ نے اخبارات سمیٹ کر ایک طرف رکھے اور لائبریرین کا شکریہ ادا کر کے باہر آگئی۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر پھر گیا جس کا گزشتہ روز بشیر نے حوالہ دیا تھا... کریم بخش سے ملاقات کا منظر! اُسے یاد آگیا۔

وہ فیصلے کا دن تھا۔ ایوب کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی تھی اور اُسے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ کورٹ بلڈنگ میں ہیجانی کیفیت تھی۔ اخباری نمائندے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ فون کھڑکائے جا رہے تھے۔ وہ بشیر کے ساتھ عمارت سے نکل رہی تھی۔ اُسی وقت اُس نے ایک رپورٹر کو کہتے سنا۔ "اُس کی بیوی اور شیر خوار بچی نے اسے بچا لیا۔ ورنہ یقیناً سزائے موت ہوتی اسے!"

پھر اچانک ایک شخص بشیر کی طرف بڑھا۔ وہ کریم بخش تھا۔ 'بشیر بابو... مجھے اکیلے میں تم سے بات کرنی ہے۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں انتظار نہیں کر سکتا۔' اُس نے بشیر کو مخاطب کیا تھا۔

ساجدہ کی نظروں میں کریم بخش کا چہرہ پھر گیا۔ وہ مدقوق سا آدمی تھا۔ اُس کی شخصیت نے ناگوار تاثر چھوڑا تھا۔ اُس کے لہجے اور انداز میں احترام کے ساتھ ساتھ عجیب سا تحکم بھی تھا۔

بشیر اُس کے ساتھ ایک گوشے میں چلا گیا تھا۔ ساجدہ کو یاد تھا، کریم بخش کہتا اور بشیر سنتا رہا تھا۔ پھر اُس نے بشیر کو برہم ہوتے دیکھا۔ ساجدہ کو اب بھی بشیر کی وہ برہمی یاد تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بشیر اُس شخص پر ہاتھ چھوڑ بیٹھے گا، خون پی جائے گا اُس کا۔

اُس نے بشیر کو برہمی سے سر کو منفی جنبش دیتے دیکھا۔ کریم بخش اب بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ بشیر نفی میں سر ہلائے جا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں کی جنبش بھی انکاریہ تھی۔ پھر بشیر اُس کی طرف آنے لگا۔ کریم بخش نے ہاتھ تھام کر اُسے روکنے کی کوشش کی۔ بشیر نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اُس کے پاس چلا آیا۔ "آؤ چلیں۔" اُس نے کہا۔ ساجدہ کو یاد تھا۔ اُس نے بشیر سے پوچھا تھا کہ بات کیا ہے۔ بشیر نے کہا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ اور پھر ساجدہ کے اصرار کرنے پر اُسے ڈانٹ دیا تھا۔ "تم بلاوجہ کی فکر میں خود کو کیوں ہلکان کرتی ہو؟"

حال کے اس لمحے میں ساجدہ کو خط کا ایک جملہ یاد آگیا۔ وہ تھرا کر رہ گئی۔ کریم بخش نے لکھا تھا۔ "ایک بار تم مجھے دھتکار چکے ہو۔ اب یہ حماقت ہرگز نہ کرنا۔"

ساجدہ کو احساس ہو گیا کہ حقیقت کو جاننا اُس کے لیے اہم ہو گیا ہے۔ بہت زیادہ اہم! یہ جاننا ضروری تھا کہ بشیر کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟ اس کی ایک ہی صورت تھی۔ صرف بشیر کا بزنس پارٹنر شاہ زیب ہی اسے حقیقت بتا سکتا تھا۔ شاہ زیب کی بیوی سعدیہ سے اس کی دوستی بھی تھی۔ وہ اُس سے ملاقات کے بہانے جا سکتی تھی۔ مگر شام کو تاکہ شاہ زیب بھی موجود ہو۔

شام کو وہ شاہ زیب کے گھر جانے کے لیے نکل ہی رہی تھی کہ ایکسپریس ٹیلی گرام آگیا۔ اُس نے ٹیلی گرام نکال کر پڑھا...

'میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ کل تمھیں فون کروں گا۔ بشیر۔' ٹیلی گرام میں دو لفظ کم تھے۔ ساجدہ کو وہ کمی شدت سے محسوس ہوئی... دو لفظ! یو رز... یورز...!

❀❀❀

ساجدہ نے فیصلہ کیا کہ شاہ زیب سے کھل کر گفتگو کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ باتوں باتوں میں کام کی بات معلوم ہو جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔

سعدیہ نے گرمجوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا اور چھوٹتے ہی بشیر کے بارے میں پوچھا۔ "بشیر تو کسی کام سے چین گئے ہیں۔" ساجدہ نے بتایا۔

"کب آئیں گے؟"

"دو تین دن بعد۔"

"تم بھی خوب ہو۔ تمھیں شوہر کے غائب ہونے پر فکر نہیں ہوتی؟"

"تو بھلا اس میں فکر کی کیا بات ہے۔" ساجدہ نے بے پروائی سے کہا۔

"بھئی... شوہر کثرت سے کاروباری دورے کرنے لگیں تو بیشتر عورتیں پریشان ہو جاتی ہیں۔ انھیں خواب میں خوبصورت سوکنیں نظر آنے لگتی ہیں۔" سعدیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نے بشیر کے متعلق اِس انداز میں کبھی نہیں سوچا۔"

"میں جانتی ہوں اور مجھے یہی بات بہت اچھی لگتی ہے۔ رشک

آتا ہے مجھے۔"

ساجدہ ہنس دی۔" اب ایسا بھی کیا۔"

"نہیں یہ سچ ہے۔" سعدیہ بولی۔" میں سرّیت پسند ہوں۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ شاہ زیب کے ساتھ کوئی اسرار وابستہ ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ شاہ زیب کھلی کتاب کی مانند ہیں۔ مجھے پتا ہوتا ہے کہ کس وقت وہ کیا کہیں گے۔ بعض اوقات تو میں لفظ بہ لفظ درست اندازہ لگاتی ہوں۔ البتّہ بشیر گہرے آدمی ہیں۔ سمندر کی طرح خاموش اور بہت کچھ چھپائے ہوئے۔"

"کیا... کیا مطلب؟"

"لو... اس میں چونکنے کی کیا بات ہے۔ تم گہرائی کا مطلب نہیں سمجھتیں۔ گہرائی سے آدمی کی شخصیت میں عجیب سی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔"

سعدیہ نے موضوع بدل دیا۔ اُن کے درمیان شاہدہ کی شادی اور اس سے متعلق خریداری اور انتظامات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ اسی دوران شاہ زیب بھی آگیا۔ ملازمہ چائے رکھ گئی۔

ساجدہ بے حد محتاط تھی۔ وہ خود سے کوئی تذکرہ چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے امید تھی کہ کسی نہ کسی طرح مطلوبہ موضوع نکل آئے گا اور وہ بے ضرر طریقے سے معلومات حاصل کر سکے گی۔ اُسے سعدیہ کی بشیر کے بارے میں گہرائی والی بات بھی چبھ رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ بشیر گہرا آدمی تھا اور یہ بھی درست تھا کہ گہرائی نے اُس کی شخصیت میں کشش پیدا کر دی تھی لیکن ساتھ ہی وہ بے خبری کا عذاب بھی تو بھگت رہی تھی۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر سعدیہ نے پوچھا۔" کیا بات ہے ساجدہ؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" شاید اس نے ساجدہ کی بے توجہی بھانپ لی تھی۔

ساجدہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔" ایسی کوئی بات نہیں۔ میں شاہدہ کی شادی کے انتظامات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"بات کوئی بھی ہو، روپے پیسے کی پریشانی سے آپ محفوظ ہیں۔" شاہ زیب نے کہا۔" بشیر صاحب کا کاروباری شعور اب بہت پختہ ہو گیا ہے۔"

ساجدہ کو اسی موقع کی تلاش تھی اور ذکر بھی اُس نے خود نہیں چھیڑا تھا۔ اب اسے استفادہ کرنا تھا اس گفتگو سے۔

"بشیر صاحب شروع میں اندھا دھند شیئرز خریدتے رہے ہیں۔ انھیں سمجھاتا تھا کہ ابتدا میں خطرہ مول نہیں لیا جاتا لیکن ان کا کہنا تھا کہ بغیر خطرہ مول لیے بہت بڑا منافع بھی نہیں مل سکتا۔ ویسے مجھے اس بات کا ملال ہے کہ انھیں میرے توسّط سے کبھی منافع نہیں ہو سکا۔"

ساجدہ کے اعصاب تن گئے۔ وہ بہت زیادہ دلچسپی بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ یہ موضوع ختم ہو۔" بشیر سے آپ کا کاروباری تعلق کب شروع ہوا تھا؟" اُس نے سرسری طور پر پوچھا۔

"مجھے خوب یاد ہے۔ یہ مارچ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ بشیر صاحب نے ایک لاکھ روپے سے سرمایہ کاری کا آغاز کیا تھا۔" شاہ زیب نے کہا۔" لیکن انھیں منافع کسی اور کے توسّط سے ہوا ہوگا۔"

"ایک لاکھ!" ساجدہ حیران رہ گئی۔

"جی ہاں۔" شاہ زیب نے کہا پھر ہنس دیا۔" کمال ہے، میں تو یوں بتا رہا ہوں جیسے یہ کوئی انکشاف ہو۔ آپ اُن کی بیوی ہیں۔ بے خبر تو نہیں ہوں گی۔"

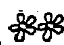
"مجھے معلوم ہے یہ بات۔" ساجدہ بولی۔" اب یہ یاد نہیں آرہا کہ وہ ایک لاکھ روپے کہاں سے آئے تھے؟"

"مجھے اس کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ مجھے تو اس سے غرض ہے کہ کوئی شخص سرمایہ کاری کر رہا ہے میرے توسّط سے۔ مجھے اُس کے ذرائع سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔"

ساجدہ سوچتی رہی۔ نادر کا قتل جون ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا۔ گویا اُس کی موت کے نو ماہ بعد بشیر نے ایک لاکھ روپے سے سرمایہ کاری کی تھی۔ پھر اُسے ایوب کی رحم کی اپیل یاد آئی۔ ایوب نے کہا تھا۔" مجھے رقم کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ رقم میرے پاس ہوتی تو میرے بچے عُسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے۔"

اب ساجدہ کی سمجھ میں بات آرہی تھی۔ ایوب کو واقعی رقم کے بارے میں علم نہیں تھا۔ ہوتا تو رقم دے کر آزادی نہ خرید لیتا۔ اُس کے بیوی بچے مفلوک الحال کیوں ہوتے۔ ساجدہ کا جی گھبرانے لگا۔ پھر بھی دل پر جبر کر کے وہ کچھ دیر اور بیٹھی۔ بالآخر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

گھر پہنچتے ہی اُس نے اخبار کھولا اور سائرہ ایوب کا پتا اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔



اگلی صبح ساجدہ، سائرہ سے ملنے کے لیے نکلی۔ سائرہ اپنے بچوں کے ساتھ جس علاقے میں رہتی تھی، اُس کا نام سُن کر ہی ساجدہ کا دَم گھٹنے لگا تھا۔ علاقہ دیکھ کر تو اُس کا حال اور خراب ہو گیا۔ وہ تو تنگی کے دنوں میں بھی اتنے بُرے حالوں نہیں رہی تھی۔ وہ غریبوں کی بستی تھی۔ تنگ گلیوں سے عجیب طرح کی بدبُو پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ کئی بار اُس کا جی چاہا کہ واپس ہو جائے۔

اُس نے دروازے پر دستک دی۔ اگلے ہی لمحے وہ سائرہ کے روبرو تھی۔ پچھلی بار اُس نے سائرہ کو عدالت میں دیکھا تھا۔ سائرہ اُس وقت بھی دُبلی پتلی تھی۔ مگر اب تو وہ مدقوق ہو گئی تھی۔ بالوں پر وقت سے پہلے ہی برف باری کی رُت آگئی تھی۔ حالانکہ وہ ساجدہ سے کم عمر تھی۔

سائرہ نے متوحش نگاہوں سے اُسے دیکھا۔" جی فرمائیے؟"

"آپ مجھے جانتی ہیں!" ساجدہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

سائرہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے ہونٹ سکوڑ کر کہا: "اوہ... تم بشیر کی بیوی ہو!"

"مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گی؟"

سائرہ بدستور دروازے میں کھڑی ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر کمرے سے دو بچے نکلے۔ ایک لڑکا ایک لڑکی۔ لڑکے کی عمر تیرہ اور لڑکی کی بارہ سال رہی ہوگی۔ صحت دونوں کی خراب تھی مگر نہیں! وہ صحت کی خرابی نہیں تھی۔ وہ غربت کی مہلک بیماری میں مبتلا تھے۔ اُن کے کپڑوں میں پیوند لگے تھے۔ انھوں نے ساجدہ کو متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ ساجدہ کو اندازہ ہو گیا۔ بچی وہ تھی، جو ایوب کے مقدمے کے دوران سائرہ کی گود میں تھی۔

ساجدہ نے بچوں سے نظریں ہٹائیں اور سائرہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دروازے سے ہٹ گئی۔ "اندر آجاؤ!" اُس نے ساجدہ سے کہا۔

کمرے کی حالت اور تباہ تھی۔ وہاں روشنی اور ہوا کا کوئی گزر نہیں تھا۔

"جاؤ... تم دونوں باہر جا کر کھیلو!" سائرہ نے بچوں سے کہا۔

بچے ہچکچائے... مگر چند لمحے بعد باہر چلے گئے۔

ساجدہ نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک شکستہ میز تھی، جس پر فریم ہوئی ایک تصویر رکھی تھی۔ وہ ایوب اور سائرہ کی شادی کی تصویر تھی۔ تصویر میں دونوں نوجوان اور خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ اُن کی مسکراہٹیں ہونٹوں تک محدود نہیں تھیں بلکہ اُن کے چہرے تک جگمگا رہے تھے۔

ساجدہ نے تصویر سے نظریں ہٹا کر سائرہ کو دیکھا۔ تصویر زیادہ سے زیادہ پندرہ سال پرانی تھی لیکن موجودہ سائرہ میں فرق کم از کم تیس سال کا پڑا تھا۔ ساجدہ نے حساب لگایا، سائرہ کی عمر پینتیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھی مگر وہ کم از کم پچاس کی لگتی تھی۔

"بشیر... بشیر، تم نے یہ کیا کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے؟" ساجدہ نے دل ہی دل میں کہا۔

"تم کیوں آئی ہو یہاں؟" سائرہ نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

ساجدہ نے اخبار کا وہ تراشا اُس کی طرف بڑھا دیا، جس میں ایوب کی دوسری اپیل مسترد کیے جانے کی خبر چھپی تھی۔ "میں ایک بات جاننا چاہتی ہوں۔ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمھارا شوہر بے قصور ہے؟"

سائرہ کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ پھر اُن میں فاتحانہ چمک ابھری۔ اُس کے ہونٹوں پر بے حد سفاک مسکراہٹ نظر آئی۔ "اب میں سمجھی، تمھیں تمھارا مجرم ضمیر یہاں لایا ہے!" اُس نے نہایت بے رحمی سے کہا۔

"یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو تم؟"

"تمھارے چہرے پر لکھی ہے یہ بات!" سائرہ نے ہذیانی قہقہہ لگایا۔ "تم جانتی ہو کہ غلط آدمی سزا بھگت رہا ہے۔ تمھارا شوہر بھی اُس بات سے واقف ہے۔"

"لیکن عدالت نے ثبوت کی بنا پر..."

"ثبوت! میرا شوہر صرف اس لیے جیل میں ہے کہ تمھارے شوہر نے اُس کے خلاف گواہی دی تھی۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمھارا شوہر بے قصور ہے؟ اس کا کیا ثبوت ہے تمھارے پاس؟"

"ثبوت تو تم خود لائی ہو!" سائرہ نے کہا اور تراشا اُس کی طرف بڑھا دیا۔ "گورنر نے اپیل مسترد کرتے ہوئے کہا ہے، مسروقہ رقم مل جائے تو اپیل پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اگر رقم میرے شوہر کے پاس ہوتی تو وہ دے نہ دیتا۔ اُسے جیل میں سڑنے کا شوق نہیں ہے۔ اُس رقم سے کیا فیض پہنچا ہے ہمیں۔ ہمارا حال تمھارے سامنے ہے۔"

ساجدہ کو تسلیم کرنا پڑا کہ بات معقول ہے۔ لیکن وہ اس کا اعتراف نہ کر سکی۔ اُس نے پھر میز پر رکھی تصویر کو دیکھا۔

"تمھیں معلوم ہے کہ ہم کہاں سے کہاں آئے ہیں!" سائرہ نے کہا۔ "ہمارا اپنا مکان تھا۔ پڑوس بھی اچھا تھا۔ میں سوچتی تھی، میں اپنے بچوں کی اچھی پرورش کر سکوں گی۔ انھیں اچھا ماحول ملے گا۔ ہم انھیں تعلیم دلائیں گے لیکن پھر ہماری مشکلات کا آغاز ہو گیا۔"

"مشکلات؟"

"ہاں پہلے میری ساس بیمار پڑیں۔ وہ اسپتال میں داخل ہو گئیں۔ اس دوران ایوب کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا۔ اُن کی بیوی اور بچے بے سہارا ہو گئے۔ سب سے بڑا بیٹا اسکول میں تھا بے چارے کا۔ ایوب سے تو غیروں کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی تھی، اپنوں کی پریشانی سے چشم پوشی کیسے کرتے۔ بہرحال وہ حتی الامکان ہر ذمے داری نبھاتے رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں کم ظرف تھی۔ اُن پر لعنت زنی کرتی رہی۔ ایسے میں مرد بے چارہ کیا کر سکتا ہے۔ ایوب کو کچھ سجھائی نہ دیتا تو غم شراب میں ڈبوتے۔ عدالت میں یہ حوالہ بھی انھیں لے ڈوبا۔ قتل کی رات بھی انھوں نے پی تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ دس بجے وہ آفس سے نکلے۔ پھر انھوں نے باہر بھی پی۔ گیارہ بجے پولیس نے انھیں اٹھا لیا۔ اُس دن کے بعد وہ گھر نہیں آئے اب تک۔"

"مجھے افسوس ہے۔"

"افسوس؟ ہونہہ! وکیل کی فیس کے چکر میں ہمارا مکان بک گیا۔ پھر بھی وہ بری نہیں ہو سکے۔ میرا گھر تباہ ہو گیا اور اصل قاتل کہاں ہے؟ وہ عیش کر رہا ہے۔ بنگلے میں رہتا ہے۔ تم جانتی ہو، اُس بنگلے کی کیا قیمت ادا کی گئی ہے... میرے شوہر کی زندگی!"

"نہیں سائرہ... ایسے نہ کہو!" ساجدہ نے تڑپ کر کہا۔

"اُس وقت تمھارا شوہر بھی محض ایک کلرک تھا۔ پھر اچانک دولت کہاں سے آئی؟ آسمان سے برسی یا زمین نے کوئی دفینہ اگل دیا

تھا۔" سائرہ کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ "جواب دو۔ تمہارے شوہر نے بنگلا کیسے خریدا؟ تم حقیقت سے واقف تھیں مگر تمہیں کیا پڑی تھی کہ کچھ کرتیں۔ تم نے میرے شوہر کو جیل میں...!"

"نہیں سائرہ، نہیں۔" ساجدہ کے وجود میں زہر اُتر رہا تھا۔ "یقین کرو مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں تمہیں نہیں سمجھا سکتی۔ مجھے تو اب احساس ہوا کہ یہ بھی ممکن ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"تمہیں معلوم ہو ہی نہیں سکتا۔" سائرہ نے نفرت سے کہا۔ "تمہیں کیا معلوم کہ قاتل کی بیوی ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ مہینے میں ایک بار اپنے شوہر سے ملنا۔ ملنا کیا... پنجرے میں بند جانور کو دیکھنا کہو۔ کیسا لگتا ہے؟ تم یہ سب کچھ کیسے سمجھ سکتی ہو۔ جس پر بیتے، وہی جانتا ہے۔ تم نے میرا یہ گھر دیکھا۔ میرے بچے دیکھے۔" اب سائرہ کا جسم لرز رہا تھا۔ "تمہیں کیا معلوم، بچوں کو ساتھ کھیلنے والے دوسرے بچے قاتل کی اولاد کہیں تو اُن پر اور اُن کی ماں پر کیا گزرتی ہے۔ حالانکہ میرے بچے اس سزا کے مستحق نہیں تھے... یہ تمہارے بچوں کا مقدر تھا...!"

ساجدہ کو ایک ایک لفظ آتشی کوڑے کی طرح اپنے وجود سے ٹکراتا محسوس ہوا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ دل ہی دل میں اعتراف کر رہی تھی کہ سائرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔

"میری بات سنو۔ خدا کے لیے... اپنا فرض ادا کرو۔ پولیس کو جا کر حقیقت بتا دو۔" سائرہ نے التجا کی۔

"اپنے شوہر کے خلاف...؟"

"دیانت داری کا یہی تقاضا ہے۔"

"نہیں... نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔" ساجدہ رو دی۔

سائرہ نے اُسے جھنجوڑ ڈالا۔ "تمہیں خدا کا واسطہ۔ تمہیں میرے بچوں پر ترس نہیں آتا۔ تمہارے شوہر نے ہماری زندگی کے بارہ برس چرا لیے۔ اب کم از کم اُسے بھی کچھ جھیلنے دو۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ میں کچھ نہیں سنوں گی۔" ساجدہ نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور کمرے سے نکل آئی۔ سائرہ اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"تم ظالم ہو، مگر مجھے تم پر ترس آتا ہے۔" سائرہ نے چیخ کر کہا۔ "تم ساری عمر اپنے ضمیر پر بوجھ اُٹھائے پھرو گی۔ تمہیں کبھی سکون نہیں ملے گا۔"

ساجدہ اُس تباہ گھر سے نکل آئی مگر سائرہ کی آواز اب بھی اُس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ اُسے اپنا وجود کسی کھوکھلے پہاڑ کی طرح لگا، سائرہ کی آواز کی بازگشت اُس میں ہمیشہ گونجتی رہے گی۔

بے سکونی اور بڑھ گئی۔ شواہد کی ہر اُنگلی بشیر کی طرف اُٹھ رہی تھی — اب وہ حقیقت کی تلاش میں اتنا آگے آ چکی تھی کہ واپسی بھی ممکن نہیں تھی۔ دوسری طرف اُسے بشیر سے محبت تھی۔ وہ اُس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کسی قیمت پر نہیں...

***

وہ گھر پہنچی تو بشیر کا کارڈ ملا۔ وہ اُس نے اسپیشل ڈاک سے بھجوایا تھا۔ خوبصورت کارڈ تھا۔ اُس پر لکھا تھا۔ "مجھ پر یقین رکھو... اعتماد کرو۔ بشیر۔"

ساجدہ کو وہ ستم ظریفی لگی۔ ایک خط بارہ سال بعد ملا تھا اور اب ایک خط اُسی دن۔ زمانہ ترقی کر گیا تھا۔

وہ انھی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ شاہدہ نے اُسے چونکا دیا۔

"امی... بھائی کا فون آیا تھا۔ انھیں چھٹی مل گئی ہے۔"

"واہ... خدا کا شکر ہے۔" ساجدہ نے بڑے خلوص سے کہا اور دل میں سوچا۔ "چلو... کوئی اچھی خبر تو ملی۔"

"اور امی... اُن کی ترقی بھی ہو گئی ہے۔ وہ کیپٹن بن گئے ہیں اب۔ ابو سنیں گے تو فخر سے پھول جائیں گے۔"

"اللہ مبارک کرے۔" ساجدہ بولی۔ "کب آ رہا ہے نذیر؟"

"بدھ کی صبح۔" شاہدہ نے جواب دیا پھر اُس نے بشیر کا کارڈ پڑھا اور خوش ہو کر بولی۔ "امی... میرے ابو کتنے اچھے ہیں... ہے نا؟"

"ہاں... وہ بہت اچھے ہیں۔"

"اب پچیس سال بعد بھی وہ آپ کو اپنی محبت کا یقین دلاتے ہیں کمال ہے۔" شاہدہ نے ہنستے ہوئے کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

ساجدہ بیٹھی سوچتی رہی۔ کوئی نہیں جانتا۔ کوئی نہیں جان سکے گا۔ یہ بوجھ صرف مجھی کو اُٹھانا ہے۔ باتیں کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اذیت کم ہو جاتی ہے۔ مگر میں تو اس سلسلے میں کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ یہ بوجھ تو دل پر ہی بہتر ہے۔ اسے ہلکا کیا ہی نہیں جا سکتا۔"

اُس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ اُسے وہ گھر یاد آ گیا جہاں سائرہ اپنے بچوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس موازنے نے احساسِ جرم سوا کر دیا۔ یہ پُرسکون گھر، تمام آسائشات... ہر چیز میں ایک زندہ شخص کا لہو شامل ہے۔ یہ سب چوری کا مال ہے...

وہ اُٹھی۔ اُس نے پانچ ہزار روپے کا ایک چیک کاٹا، اُسے لفافے میں رکھا اور لفافے پر سائرہ ایوب کا نام اور پتا لکھ کر اسپیشل میل ڈلیوری والوں کو فون کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد کوریئر آیا اور لفافہ لے گیا۔ ساجدہ کو پہلی بار نسبتاً سکون کا احساس ہوا۔

بدھ کی صبح نذیر آ گیا۔ وہ پہلے سے دراز قد، وجیہہ اور تندرست لگ رہا تھا۔ ساجدہ اُسے دیکھ کر گویا پھر سے جی اُٹھی۔ ساتھ ہی اُسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ ہو بہو بشیر کا عکس ہے۔ وہ آتے ہی اُس سے لپٹ گیا۔ "امی... سچ سچ آپ مجھے کبھی یاد نہیں آئیں۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا مگر اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"میں بھی تمہیں کبھی یاد نہیں کرتی۔" ساجدہ بھی ہنس دی —

”حساب برابر“
”ادر ابو کہاں ہیں؟“ نذیر نے متلاشی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا ”کسی کام سے چپن گئے ہوئے ہیں“
”وہی پُرانے ابو... بس پیسہ بڑھانے میں لگے رہتے ہیں ہر وقت“ نذیر نے کہا ”اور یہ آپ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے ہیں“
”کچھ بھی نہیں۔ بس شاہدہ کی شادی کے انتظامات کی فکر ہلکان کیے دیتی ہے“
”اب فکر نہ کریں لیکن امّی میری چھٹیاں دلیمے والے دن تک ہیں۔ تقریب سے سیدھا رخصت ہو جاؤں گا میں“
ساجدہ نذیر سے باتیں کرتی رہی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد بشیر بھی آگیا۔ باپ بیٹے کی ملاقات کا منظر دیدنی تھا۔ بشیر کی آنکھوں میں افتخار کی چمک تھی۔ بہت دنوں کے بعد پورا کنبہ یکجا ہوا تھا۔ یہ ساجدہ کی جنت تھی۔ اُس لمحے وہ ان سب کو دیکھ دیکھ کر جی رہی تھی۔ سب کچھ پہلے جیسا لگ رہا تھا... جیسے بیچ میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔
لیکن اِس دوران بشیر اور ساجدہ ایک بار بھی ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوئے تھے۔
پھر ڈاکیہ آیا۔ ساجدہ نے جا کر ڈاک وصول کی اور لائبریری میں چلی آئی۔ تین خط تھے۔ اُن میں سے ایک خط سائرہ ایوب کی طرف سے تھا۔ ساجدہ نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا۔ لفافے میں کوئی خط نہیں تھا صرف اُس کے بھیجے ہوئے چیک کے پُرزے تھے۔
ساجدہ کے رخسار تمتما اُٹھے۔ اُسے ایسا لگا جیسے سائرہ نے اُس کے مُنہ پر تھپّڑ مارا ہے۔ پھر اسے احساس ہوا کہ سائرہ نے بے حد ضرورت مند ہونے کے باوجود رقم قبول نہیں کی ہے۔ اگر وہ سائرہ کی جگہ ہوتی تو خود بھی یقیناً ایسا ہی کرتی۔
اُس نے چیک کے پُرزے ٹوکری میں ڈال دیے۔ اُسی لمحے شاہدہ کمرے میں چلی آئی ”امّی... آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔ چلیے نا... بھائی آپ کو بلا رہے ہیں“
ساجدہ نے خالی لفافہ جلدی سے میز کی دراز میں رکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن اب اُس کا موڈ خوشگوار نہیں تھا۔ پہلے جیسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس خط نے اُسے یاد دلا دیا تھا کہ سب کچھ بدل چکا ہے۔ دلوں کے درمیان بھی فاصلے حائل ہو گئے ہیں۔

❀❀❀

پورا دن نذیر سے ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ساجدہ سوچتی رہی کہ آج بشیر سے کھل کر بات کرے گی۔ جلد یا بدیر حقائق کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔ بشیر کو یہ بھی بتانا تھا کہ وہ سائرہ سے مل چکی ہے... اور یہ بھی کہ ہر سراغ اُسی کا پتا دے رہا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ اب بھی بشیر کوئی ایسی

وضاحت پیش کرے گا جو جادوئی طریقے سے صورتِ حال کو بدل ڈالے گی۔ لیکن رات کو بشیر بیڈ روم میں آیا اور اُسے چُھوا تو وہ سمٹی اور بدن چُرانے لگی۔

"تمھارا رویّہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" بشیر نے شکایتاً کہا۔ اس کے چہرے پر پرچھائیاں اُتر آئی تھیں۔

"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"پہلے مجھے بتاؤ، بات کیا ہے؟ تمھارا یہ غیر معقول رویّہ میں زیادہ دیر برداشت نہیں کرسکوں گا۔" وہ چیخنے لگا۔

ساجدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے، کیسے شروع کرے؟

"یہ سب اُسی خط کا چکر ہے نا؟" بشیر آپے سے باہر ہو گیا۔ "تمھیں میری بات پر یقین نہیں۔ اُس ذلیل اور گھٹیا آدمی، اس بلیک میلر کی بات میرے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

"بشیر...! ایک بات مجھے سچ سچ بتادو۔ یہ دولت کہاں سے آئی؟" ساجدہ بھی چلّانے لگی۔

"میں تمھیں بتاچکا ہوں۔"

"نہیں... تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔"

بشیر ششدر رہ گیا۔ "کیا... کیا کہا ہے تم نے؟"

ساجدہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں شاہ زیب سے مل چکی ہوں۔"

"شاہ زیب سے؟" بشیر کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ "اُس نے کیا بتایا تمھیں؟"

"اُس کا کہنا ہے کہ تمھیں شیئرز میں فائدہ نہیں، نقصان ہوا تھا۔"

"چلو اچھا ہوا۔ اب تمھیں پتا چل گیا۔ اب مطمئن ہو گئی ہو گی۔" بشیر نے سرد لہجے میں کہا۔

"بشیر...! مجھے بتاؤ نا۔ کہاں سے آئی یہ دولت۔" ساجدہ نے اُسے جھنجوڑ ڈالا۔

"اب مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ شاہ زیب سے پوچھو جاکر۔ شاید وہ بتادے۔" بشیر نے ترشی سے کہا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔ "وہ شیئرز میں نے دوسرے بروکر کے توسط سے خریدے تھے۔"

"کس بروکر کی بات کر رہے ہو؟"

"نام بتاؤں گا تو تم پھر جاسوسی کرنے لگو گی۔ میں کہتا ہوں، تم مجھ پہ اعتماد کیوں نہیں کرتیں؟"

"خدا کے لیے بشیر...!"

"اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا ساجدہ۔ وہ بروکر مرچکا ہے۔" بشیر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ساجدہ نے کچھ کہنا چاہا مگر اُس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

"دیکھو ساجدہ... اب یہ گھیراؤ کا کھیل ختم کردو۔" بشیر نے مزید کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تمھارے خیال میں نادر کو میں نے قتل کیا تھا اور رقم بھی چرائی تھی۔ صرف یہی نہیں، میں نے اپنی جان بچانے کے لیے بے قصور ایوب کو جیل میں پہنچانے کا گناہ بھی کیا ہے۔"

ساجدہ خاموش رہی۔ اس بات کے جواب میں کہا بھی کیا جاسکتا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں جا رہا ہوں۔ تم کو اتنی رات گئے ایک قاتل کے ساتھ تنہائی میں خوف آرہا ہو گا۔ تم میرا لمس تک برداشت نہیں کرسکتیں... اور اب سچی بات یہ ہے کہ تمھاری اس خوفناک بدگمانی کے بعد میں تمھاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میرا خیال ہے، ہماری ازدواجی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔"

"میری بات تو سنو...!"

مگر بشیر پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ ساجدہ بستر میں دراز ہو گئی۔ ایک عجیب سے احساسِ زیاں نے اُس کے دل کو مٹھی میں لے لیا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود ہی اپنی جنت کو برباد کر رہی تھی، صرف اس لیے کہ اُسے بشیر پر اعتماد نہیں تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بشیر کے بغیر جی نہیں سکے گی، مر جائے گی۔ اُس کا جی چاہا کہ اُٹھ کر بشیر کے پاس چلی جائے... اُس سے معذرت کرلے۔ وہ بے اعتمادی کی خطاکار تھی۔

وہ اُٹھی... مگر اُس کی نگاہوں کے سامنے ایک بوڑھا مگر مہربان اور باوقار چہرہ گھوم گیا۔ وہ اُس کے باپ کا چہرہ تھا۔ پھر اُس کی آواز ذہن کے نہاں خانے میں گونجی... ہمیشہ حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ آدمی کو سچائی سے کبھی نہیں ڈرنا چاہیے۔

وہ بستر پر ڈھے گئی۔ اُسے ہر حال میں حقیقت کا پتا چلانا تھا اور حقیقت کی تلاش کے لیے ابھی ایک دروازہ اور باقی تھا۔ اس دروازے کو کھولنے کے بعد حقیقت کے سوا کچھ باقی نہ رہتا۔ اُس نے سوچا کہ حقیقت میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ رہے۔ یہ دروازہ بھی کھول ہی لیا جائے۔

**

بارہ سال کی تاخیر سے ملنے والے لفافے پر کریم بخش کا پتا نہیں تھا مگر اندر خط میں پتا موجود تھا اور وہ ساجدہ کو اب بھی زبانی یاد تھا۔ وہ اگلی صبح دس بجے اس پتے پر پہنچی۔ مکان کبھی اچھا خاصا رہا ہو گا مگر اب اپنے مکینوں کی مفلوک الحالی کی داستان سنا رہا تھا۔ دیواروں سے پلاستر اکھڑ رہا تھا۔ مکان برسوں سے رنگ و روغن سے محروم تھا۔

ساجدہ نے دروازے پر دستک دی۔ ایک بھاری بھرکم خاتون نے دروازہ کھولا۔ اُس کی آنکھوں میں سرد مہری تھی۔ "کیا بات ہے؟" اُس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"مجھے کریم بخش سے ملنا ہے۔" ساجدہ نے جواب دیا۔

اندر سے کوئی مردانہ پکار سنائی دی۔ "کون ہے؟"

"ایک عورت تم سے ملنے آئی ہے۔" بھاری بھرکم خاتون نے پلٹ کر چیختے ہوئے جواب دیا۔

"اندر بلالو..!"

بھاری بھرکم خاتون نے ایک طرف ہٹ کر ساجدہ کو راستہ دیا۔ پھر وہ ساجدہ کو اندرونی کمرے میں لے آئی کمرے کے پاس کریم بخش بیٹھا تھا۔ وہ بہت معمر اور ناتواں لگ رہا تھا۔ استخوانی جسم کو دیکھ کر لگتا تھا ہڈیوں پر کھال منڈھ دی گئی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ساجدہ کو اشتباہ کی جھلکیاں نظر آئیں لیکن وہ اُسے پہچانا نہیں تھا۔ "جی فرمایئے؟"

"میرا نام ساجدہ ہے۔ میں بشیر کی بیوی ہوں۔"

"بشیر کی بیوی!" کریم بخش نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اُٹھ نہیں سکا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟" اُس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں تم سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

کریم بخش نے سخت لہجے میں اپنی بیوی سے کہا۔ "ہاجرہ... تم جاؤ۔ چائے بنا کر لاؤ۔"

ہاجرہ نے ایک نظر ساجدہ کو دیکھا۔ پھر کمرے سے چلی گئی۔ اُس نے اپنے عقب میں دروازہ بند کر لیا تھا۔ "اب بولو۔ کیا بات ہے؟" اُس کے جانے کے بعد کریم بخش، ساجدہ سے مخاطب ہوا۔

ساجدہ نے اسے بارہ سال پرانے خط کی تاخیر سے وصولی کے بارے میں بتایا۔ کریم بخش نگاہوں میں حیرت لیے اُسے تکتا رہا۔ ساجدہ کے خاموش ہونے کے بعد اُس نے دیوار پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ "تو یہ بات ہے۔ خط پہنچا ہی نہیں تھا اُس تک۔ اور میں اتنے عرصے پریشان رہا کہ آخر بشیر کے اعصاب کتنے مضبوط ہیں۔ اب یہ بھی بتا دو، تم میرے پاس کیوں آئی ہو یہ اطلاع لے کر؟"

"میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔ تم نے خط میں جو کچھ لکھا ہے جھوٹ ہے یا درست؟ کیا واقعی میرے شوہر نے نادر کو قتل کیا تھا؟"

"ہاں۔ نادر کو بشیر نے ہی قتل کیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا تھا..!"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ تم نے عدالت میں کہا تھا کہ اُس رات تمھاری چھٹی تھی۔"

"میں نے عدالت میں پوری حقیقت نہیں بتائی تھی۔ اُس کی ایک وجہ تھی..!"

"مجھے بتاؤ... اُس رات ہوا کیا تھا؟" ساجدہ بے چین ہونے لگی۔

"بیٹھ جاؤ۔" کریم بخش نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "تمھیں بتانے میں کوئی ہرج نہیں... بلکہ فائدہ ہی ہے۔ میری چھٹی تھی، اُس کے باوجود میں آتش دان چیک کرنے کی غرض سے دفتر چلا گیا۔ میں داخل ہوا ہی تھا کہ میں نے زینوں پر قدموں کی چاپ سُنی۔ کوئی اوپر سے نچلی منزل پر آ رہا تھا۔ وہ تمھارا شوہر تھا۔ میں نے اُسے دیکھ لیا مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکا۔ وہ نادر کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ تمھارے شوہر کے ہاتھ میں سیاہ تھیلا تھا اور وہ دستانے پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اُسے نادر کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولتے اور پھر بتی بجھاتے دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ نادر نے چیخ کر کہا... 'ایوب!' تمھارے شوہر کی دفتر میں موجودگی کا اُسے علم نہیں تھا۔ البتہ ایوب کے بارے میں اُسے معلوم تھا، اسی لیے اُس نے یہ فرض کر لیا کہ کمرے میں آنے والا ایوب ہے۔ چند لمحے بعد تمھارا شوہر کمرے سے نکلا تو اُس کے ہاتھ میں موجود سیاہ تھیلا خالی نہیں تھا۔ اُس نے عقبی کھڑکی کھولی اور سیاہ تھیلا اپنے ساتھی کو دے دیا۔ پھر اُس نے پولیس کو فون کر دیا۔ اُس پر کوئی شک بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"ساتھی؟ میرے شوہر کا ساتھی؟ وہ کون ہو سکتا ہے؟" ساجدہ کے لہجے میں اُلجھن تھی۔

"یہ تم اپنے شوہر سے ہی پوچھو۔ اُس کا ساتھی کبھی سامنے نہیں آیا۔"

"چلو... ٹھیک ہے۔ رقم کی تو بشیر کو ضرورت تھی مگر نادر کا قتل تو ضروری نہیں تھا۔" ساجدہ نے اعتراض کیا۔

"تمھارا شوہر بے وقوف نہیں ہے۔ نادر کی موت بہتر تھی۔ خاص طور پر اُس صورت میں جبکہ آلۂ قتل ایوب کا تھا اور اُس پر اُس کی انگلیوں کے نشانات بھی موجود تھے۔ تمھارا شوہر غضب کا اداکار ہے۔ جس طرح اُس نے ایوب کو جیل بھجوایا، اُس پر میں اسے داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عدالت میں اُس نے زبردست اداکاری کی۔ وہ ایک اچھے شہری کا کردار ادا کر رہا تھا جیسے اپنا ناگوار فرض انجام دینا تھا..!"

ساجدہ اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ پھر اُس نے کہا۔ "تم جانتے تھے کہ ایوب بے قصور ہے۔ پھر خاموش کیوں رہے؟"

"تمھیں تو اس پر میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اگر میں نے عدالت میں سچ بول دیا ہوتا تو آج ایوب کے بجائے تمھارا شوہر جیل میں ہوتا۔" کریم بخش نے مکروہ قہقہہ لگایا۔ "اس اعتبار سے تم میری مقروض ہو۔ تم بارہ سال سے پُرتعیش اور پُرسکون زندگی گزار رہی ہو.. صرف میری وجہ سے۔"

"تم نے صرف دولت کی خاطر بے قصور ایوب کی زندگی تباہ ہونے سے بچانے کی کوشش نہیں کی؟"

"میں غریب آدمی تھا... اب بھی ہوں۔" کریم بخش نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے سوچا تھا تمھارا شوہر امیر ہو جائے گا تو مجھے بھی حصہ دے گا۔ خاموشی کی قیمت ادا کرے گا مجھے۔ میں بھی خوش حال ہو جاؤں گا لیکن میری دھمکی کا اُس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ اُس نے کہا کہ فیصلہ کن شہادت چھپانے کے جرم میں میں بھی ملوث ہو جاؤں گا۔"

"تو بشیر نے تمھیں کوئی رقم ادا نہیں کی؟"

"ایک دھیلا بھی نہیں۔ پہلی بار میں نے براہِ راست دھمکی دی تھی۔ پھر میں نے خط لکھا۔ یہ اب معلوم ہوا کہ وہ خط اُس تک پہنچا ہی نہیں۔ میں اسے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتا تھا لیکن وہ مجھے نظر انداز

کررہا تھا۔ میں گیارہ سال یہ سوچتا رہا ہوں کہ بشیر آہنی اعصاب کا مالک ہے۔ آٹھ سال سے میں بیمار ہوں۔ گزر اوقات بھی مشکل سے ہو رہی ہے۔ میں کوڑی کوڑی کو ترس رہا ہوں۔ اگر میرا خط تمھارے شوہر کو مل جاتا تو میں نے یہ عرصہ سختی میں نہ گزارا ہوتا۔ میں اسپتال میں پرائیویٹ کمرا بھی لے سکتا تھا۔"

ساجدہ کی آنکھوں میں اس تیزی سے آنسو اُمنڈے کہ کمرا دھندلا نے لگا۔ وہ اس ذلیل شخص سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اُس نے ممنوعہ سڑک پر قدم رکھنے کی حماقت کی تھی اور اب ایک بند گلی کے سامنے کھڑی تھی۔ اب وہ خوف زدہ تھی... اپنے لیے... بشیر کے لیے... بچوں کے لیے... وہ واپسی کے خیال سے پلٹی...

"ایک منٹ۔ میری بات سنو۔" کریم بخش نے پکارا۔ ساجدہ نے پلٹ کر دیکھا۔ "تم مجھے اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔ تمھیں میری مدد کرنا ہوگی۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"تمھاری آمد میرے لیے اچھا شگون ہے۔ تمھارا شوہر اب بھی مصیبت میں ہے۔ میں اب بھی پولیس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔"

"یعنی تم اب بھی بلیک میل کرو گے!" ساجدہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیوں نہیں۔ تم نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ اب بھی میں اس صورتِ حال سے فائدہ نہ اٹھاؤں تو یہ میری حماقت ہوگی۔"

"تم غلطی کرو گے۔ اگر بشیر نے ماضی میں تمھارا مطالبہ رد کر دیا تھا تو اب وہ بارہ سال بعد کیسے مانے گا۔"

"تم اسے قائل کرو گی... مجبور کرو گی۔"

"میں؟ یہ کیسے ممکن ہے۔" ساجدہ چیخ اُٹھی۔ "میں تو اُس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ میں تم سے ملی تھی...!"

"میں جانتا ہوں، تم نے یہاں آکر حماقت کی ہے۔" کریم بخش کے لہجے میں خباثت تھی۔ "تم نے مُردے کو زندہ کر دیا ہے۔ اب تم ملوث ہو چکی ہو۔ لیکن میں کوئی لالچی آدمی نہیں ہوں۔ مجھے ہر ماہ تین ہزار روپے دے دو، میں چپ رہوں گا۔ رقم تم دو یا بشیر دے، مجھے اس سے سروکار نہیں۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تو میں پولیس کو مطلع کر دوں گا۔ میری حالت تو تم دیکھ رہی ہو۔ میں زیادہ عرصے نہیں جی سکوں گا۔ لہٰذا مجھے ملوث ہونے سے کوئی خوف نہیں۔ میں سوچنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دے رہا ہوں۔"

**

وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ کسی نے اُسے جھنجوڑ ڈالا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ بشیر کا چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اُس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ بشیر نے اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ لفافہ لہرایا جس میں سائرہ کی طرف سے چیک کے پُرزے موصول ہوئے تھے۔ "سائرہ نے تمھیں خط لکھا تھا... کیوں؟ لاؤ مجھے دکھاؤ وہ خط۔"

ساجدہ اُسے وضاحت سے سب کچھ بتانے پر مجبور ہو گئی۔ ظاہر ہے، خط وہ کہاں سے لاتی۔

بشیر نے اُسے اُٹھا کر بٹھا دیا۔ وہ بہت زیادہ ناراض معلوم ہو رہا تھا۔ ساجدہ رونے لگی۔ بشیر مضطربانہ انداز میں ٹہلنے لگا۔ "تم نے حد کر دی۔" وہ بڑبڑایا۔ "اب کریم بخش کو پھر بلیک میلنگ کی سُوجھے گی اور اس بار اسے ٹالنا آسان نہیں ہوگا...!"

"میں شرمندہ ہوں بشیر۔"

"شرمندہ ہو؟" بشیر جھنجلا گیا۔ "اب شرمندگی کا کیا فائدہ۔ نقصان تو پہنچ ہی چکا ہے۔ اُس نے ادائیگی کے لیے کتنی مہلت دی ہے؟"

"ایک ہفتے کی۔" ساجدہ نے کہا۔ پھر صفائی پیش کی۔ "میں کیا کرتی بشیر۔ مجھے اس سے ملنا ہی تھا۔"

"اب ایک بات صاف صاف ہو جائے۔ تمھیں یقین ہے نا کہ نادر کو میں نے قتل کیا ہے؟" بشیر نے پوچھا۔

ساجدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بشیر نے سگریٹ سلگایا۔ اُس کے انداز میں نہ برہمی تھی، نہ مایوسی اور نہ ہی پچھتاوا۔

"تم پولیس کے پاس جا کر سب کچھ انھیں بتا دو نا۔ خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔ انھیں بتا دو کہ یہ حادثہ تھا...!"

"تم پاگل ہو گئی ہو یا مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہو۔" بشیر نے سفاکی سے کہا۔

"لیکن بشیر... ایوب بے چارہ ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا ہے۔"

"اس سلسلے میں تمھارا ضمیر تمھیں پریشان کر رہا ہے۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔" بشیر نے بے پروائی سے کہا۔ "اب تو فیصلہ تمھیں کرنا ہے ساجدہ۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"یہ تمھارا دردِ سر ہے۔ تم چاہو تو پولیس کے پاس چلی جاؤ۔ میں تمھیں نہیں روکوں گا۔"

ساجدہ رونے لگی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"عجیب محبت ہے تمھاری۔ تمھیں اس معاملے میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ تمھیں بچوں کا خیال بھی نہیں آیا۔ شاہدہ کی شادی ہونے والی ہے اور نذیر... خیر چھوڑو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب ہم دونوں کے لیے کوئی مستقبل نہیں رہا۔ ہمارے راستے جُدا ہو گئے ہیں۔"

"نہیں بشیر... نہیں... ایسا نہ کہو...!"

"تمھارا جو جی چاہے کرو۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ شاہدہ کی

شادی تک خاموش رہو۔ اس دوران ہمیں دنیا پر یہی ظاہر کرنا ہوگا کہ ہم مطمئن اور خوش و خرم ہیں۔ اُس کے بعد... تمہاری مرضی۔ مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔"

ساجدہ نے اُٹھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "بشیر... ایسا نہ کہو۔ میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گی!"

بشیر نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔" پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔

ساجدہ پورا دن کمرے میں رہی۔ نذیر اور شاہدہ کو اُس نے بتایا کہ سر میں شدید درد ہے۔ اُس سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ اُسے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا تھا۔ پھر وہ حل صوری شکل میں اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔ وہ حل تو پہلے ہی سے اُس کے ذہن میں موجود تھا۔ مگر وہ اُس سے نظریں چراتی رہی تھی۔

اب وہ اس سلسلے میں سوچتی رہی... بے حد غیر جذباتی انداز میں۔ سیدھی سی بات تھی۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ کئی دنوں کے بعد پہلی بار اُسے سکون کا احساس ہوا... اور وہ سو گئی۔

باہر کار رکنے کی آواز نے اُسے جگا دیا۔ اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ بشیر دفتر میں دیر تک کبھی نہیں رُکتا تھا۔ اُس نے مکان کا صدر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر اوپر آتے ہوئے قدموں کی آہٹ۔ اور وہ آہٹ اُس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھلتے دیکھا اور سوتی بن گئی۔

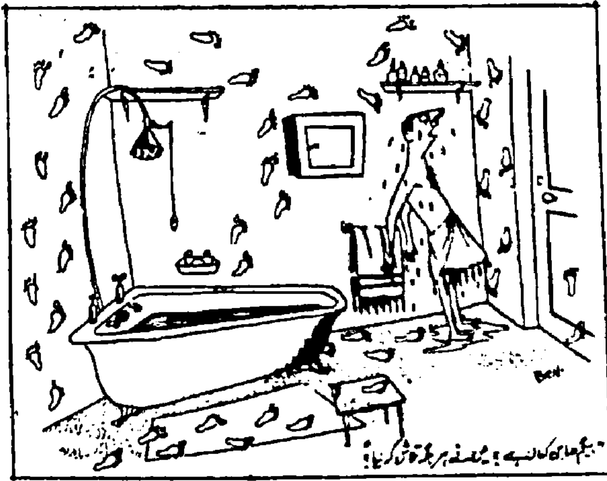
بشیر اُس کے قریب آ کر رکا اور جھک کر اُسے دیکھا۔ بشیر کے مُنہ سے بُو آ رہی تھی۔ وہ نشے میں تھا۔ پھر بشیر نے جھک کر اُس کی پیشانی چومی اور کمرے سے نکل گیا۔

ساجدہ بستر پر لیٹی رہی۔ بہت دیر تک۔ پھر وہ اٹھی اور بشیر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اُس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ بشیر سو چکا تھا۔ وہ اس وقت ایک ایسا نو عمر لڑکا معلوم ہوا جسے تجربہ یا باپ کی طرف سے پٹائی کا خطرہ لاحق ہو۔ ساجدہ نے بڑھ کر اسے ٹھیک طرح کمبل اُڑھایا، جھک کر نرمی سے اُس کی پیشانی چومی اور دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔

اس صبح وہ خود کو خوف سے آزاد محسوس کر رہی تھی۔ ناشتے کی میز پر نذیر اور شاہدہ موجود تھے، بشیر نہیں تھا۔ نذیر نے اس سے طبیعت کے متعلق پوچھا۔ ساجدہ نے جواب دیا کہ اب بہت بہتر ہے۔ پھر اُس نے بشیر کے متعلق پوچھا۔

"وہ تو جا چکے ہیں۔" نذیر نے بتایا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اُس نے اخبار اُٹھایا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اخبار پھیلاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں خود ترسی کے آنسو آ گئے۔



انجام... آخر اس کہانی کا یہ انجام کیوں ہونا تھا۔ کیوں؟ بڑی مشکل سے اُس نے خود کو سنبھالا اور اخبار کی طرف متوجہ ہوئی۔ چند لمحے بعد چھوٹی سی اس خبر نے اسے دہلا دیا۔ لفظ اسے چیختے چنگھاڑتے محسوس ہوئے۔

کسی نے کریم بخش کو قتل کر دیا تھا۔ پولیس قتل کا معاملہ حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

❀❀❀

شاہدہ کی شادی خوش اسلوبی سے ہو گئی تھی۔ اب ولیمے کی تقریب بھی ختم ہونے والی تھی۔ اس تقریب میں اُن کی حیثیت مہمانوں کی تھی۔ ساجدہ کو لگا اُس کے سینے سے کوئی بھاری پتھر اُٹھ گیا ہو۔ اب وہ آزاد ہونے والی تھی۔ اب سے کچھ دیر بعد وہ اپنے ضمیر کی آواز سن کر آزادانہ فیصلہ کر سکتی تھی۔

تقریب سے نمٹ کر وہ گھر آئے۔ اب انھیں نذیر کو رخصت کرنا تھا۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اُسے رخصت کرتے ہوئے ساجدہ ملول اور دلگیر ہو گئی۔ نذیر اُس کا مذاق اڑاتا رہا مگر خود اُس کی پلکوں پر بھی نمی اتر آئی تھی۔ لیکن ساجدہ کے دُکھ کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ اسے معلوم جو تھا۔

نذیر کے جانے کے بعد بشیر اُس سے مخاطب ہوا۔ "ہاں ساجدہ! اب وقت آ گیا ہے کہ اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے نمٹا دیا جائے۔"

ساجدہ کو جھوٹ بولنا تھا اور مؤثر طور پر بولنا تھا۔ وہ اس لمحے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ بالآخر اُس نے کہا۔ "بشیر... مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ تم مجھے معاف کر دو۔ میں جانتی ہوں تم قاتل نہیں ہو سکتے۔"

بشیر حیران رہ گیا۔ "ابھی چند روز پہلے تو تمہیں میرے قاتل ہونے پر یقین تھا۔"

"ہاں۔ میں پاگل ہو گئی تھی شاید۔ اس خط نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں خوف زدہ تھی اور مجھے بُرے بھلے کی تمیز نہیں رہی تھی۔ اب سوچتی ہوں، بے چاری سائرہ کا کوئی قصور نہیں۔ اُس کی ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ وہ ایوب کو بچانے کے لیے کسی پر بھی الزام لگا سکتی ہے۔

دوسری طرف کریم بخش نے مجھے جو کہانی سُنائی اُس میں کوئی جان نہیں تھی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں... تمھیں جانتی ہوں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے کریم بخش کو پھر تمھارے سر پر سوار کر دیا۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ اُس سے میں نمٹ لوں گا۔“

’ہاں... بلکہ نمٹ چکے ہو‘ ساجدہ نے دل میں سوچا ’تم نہیں جانتے کہ میں وہ چھوٹی سی غیر اہم خبر پڑھ چکی ہوں۔‘

بشیر نے محبت سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم نے مجھے بہت پریشان کیا ہے ساجدہ۔ خیر... اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسا کرتے ہیں کچھ دن تمھارے والد کے کاٹیج میں گزارتے ہیں۔ ان دنوں جھیل کے کنارے کچھ اور ہی سماں ہوگا۔ کل صبح چلتے ہیں تم سامان پیک کرلو۔“

ساجدہ کو خوشی تھی کہ یہ تجویز اُسے پیش نہیں کرنی پڑی۔

اُس رات وہ سو نہیں سکی۔ لیکن بشیر کو پتا نہیں چلا۔ وہ خود مزے سے سو رہا تھا۔ صبح ناشتا کرتے ہوئے اُس نے ڈائننگ روم کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ وہ یہاں آخری بار ناشتا کر رہی تھی... بشیر کے ساتھ۔ ناشتے کے بعد اُس نے ملازمہ اور مالی کو ہدایات دیں۔ پھر وہ اور بشیر گھر سے نکل آئے۔

بشیر نے راستے میں رک کر کھانے پینے کا سامان لیا۔ ساجدہ نے بڑے جوش و خروش سے خریداری کی۔ انھوں نے ایک ہفتے کا سامانِ خورونوش لے لیا۔ حالانکہ ساجدہ جانتی تھی کہ یہ غیر ضروری ہے لیکن وہ بشیر کو کسی شبہے میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

بالآخر وہ کاٹیج پہنچ گئے۔ ساجدہ نے کاٹیج کی صفائی کی۔ ہر چیز قرینے سے رکھی۔ اسے خود پر حیرت تھی۔ وہ خوف زدہ بالکل نہیں تھی۔

کھانے کے بعد بشیر نے کاٹیج کے سامنے سے خود رو گھاس چھانٹنے کا ارادہ کیا۔ گھاس بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ درانتی لے کر چلا۔ ساجدہ نے اُسے پکارا۔ بشیر نے چونک کر دیکھا۔ ساجدہ کے لہجے میں عجیب سا تناؤ تھا۔ پھر ساجدہ دوڑتی ہوئی آئی اور اُس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا لیا۔ تادیر لگائے رکھا۔ ”یاد رکھنا... میں تم سے محبت کرتی ہوں... شدید محبت۔“ وہ بولی۔

بشیر کا وجود مسرتوں کی پھوار سے بھیگ گیا۔ اُس نے درانتی اُٹھائی اور خود رو گھاس کی طرف بڑھ گیا۔

ساجدہ اگلے مرحلے کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ خواب آور گولیوں سے مدد لے گی لیکن یہاں اُس کی مشکل آسان کرنے کے لیے جھیل موجود تھی۔ ویسے بھی اسے تو بس مرنا تھا۔ کس طرح؟ یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اُس نے برتن دھوئے۔ وہ کاٹیج سے نکل کر جھیل کی طرف چلی تو شام ہو رہی تھی۔ اُس کے ذہن پر خیالات کی یلغار تھی۔ اُسے بزدلی کا احساس ہونے لگا۔ وہ حقائق سے مُنہ موڑ رہی تھی۔ فرار کا راستہ اختیار کر رہی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ بشیر سے محبت کرتی تھی۔ مگر اب بشیر کے ساتھ رہ نہیں سکتی تھی۔ بشیر دو افراد کی جان لے چکا تھا اور اس کی وجہ سے ایک بے قصور آدمی بارہ سال سے سزائے قید بھگت رہا تھا۔ اصولاً اُسے پولیس کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا مگر بشیر کی محبت اُس کے پیروں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔

وہ پانی میں اتر گئی۔ پانی بے حد سرد تھا۔ اچانک اُسے احساس ہوا کہ وہ تو پیراکی کر رہی ہے۔ زندگی سے چمٹے رہنے کی خواہش آدمی کو ہاتھ پاؤں مارنے پر کس طرح مجبور کر دیتی ہے اُس کا اسے پہلی بار احساس ہوا تھا۔ وہ اس خواہش سے لڑ نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ تیرتی رہی۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اچھی پیراک نہیں ہے۔ اور پھر سرد پانی ابھی سے ہاتھ پیر سُن کیے دے رہا تھا۔ جلد ہی وہ وقت آئے گا کہ وہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں مار سکے گی۔ ایسے میں اسے جھیل کے وسط میں موجود ہونا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ تیرتی ہوئی آگے بڑھی۔

دیر ہو گئی۔ اب اُس کے ہاتھوں کی حرکت سست پڑ گئی تھی۔

اُس نے پلٹ کر کاٹیج کی طرف دیکھا۔ بشیر کوئی چیز اُٹھائے شیڈ سے باہر آ رہا تھا۔ پھر بشیر کی نظر اُس پر پڑی۔ وہ کنارے پر آیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر چیخنے لگا۔ ساجدہ اُس کی آواز نہیں سُن سکتی تھی مگر سمجھنا کچھ دشوار نہیں تھا۔ ”واپس آؤ... واپس آؤ... واپس...“ بشیر دیوانہ وار چیخ رہا تھا۔

ساجدہ بُری طرح سسکنے لگی۔ کیسے واپس آؤں بشیر؟ کس لیے واپس آؤں؟ وہ پلٹی اور تیرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اُس کی بینائی دُھندلانے لگی۔ پیر بالکل جواب دے گئے۔ اُسی لمحے اس نے تیزی سے ہاتھ چلائے... اور پہلی بار اسے یہ اذیت ناک احساس ہوا کہ وہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود جینا چاہتی ہے۔ وہ پلٹی... اب جینا مشکل تھا۔ وہ تیر کر کنارے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

دُھندلائی ہوئی نظروں سے اُس نے بشیر کو تیرتے ہوئے... اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے دعا مانگنے کے لیے مُنہ کھولا... تو پانی پھیپھڑوں میں اُتر گیا۔ وہ اس کیفیت میں بھی یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اتنا سرد پانی پھیپھڑوں میں اُتر کر اتنا گرم کیسے ہو جاتا ہے... جیسے پھیپھڑوں میں آگ بھر گئی ہو۔

وہ جینا چاہتی تھی... مگر ڈوب رہی تھی اور بشیر ابھی اس سے خاصا دور تھا۔ جھیل اپنے آبی ہاتھ پھیلائے اُسے آغوش میں بُلا رہی تھی۔ کانوں میں پانی کی چنگھاڑ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی اور لگتا تھا پھیپھڑے دھماکے سے پھٹ جائیں گے۔ پھر وہ گہرے پانی میں چلی گئی۔ درد کا ہر احساس مٹ گیا۔ ہر طرف مہربان اندھیرا تھا۔

❋❋

وہ بہت دور کی آواز تھی... اور اُسے پکار رہی تھی۔ اس کا تسلسل اسے خود سے منکر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ پھر اسے اپنے سینے

پر بے پناہ دباؤ... اور پھر کاٹ دار درد کا احساس ہوا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھولیں۔ اسے آسمان نظر آیا۔ پھر آسمان کی جگہ ایک سائے نے لے لی۔ بشیر اُس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ سسک رہا تھا۔

"ساجدہ... میری ساجدہ... بے وقوف ساجدہ۔"

ساجدہ کو احساس ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ بشیر کے لہجے کی محبت نے اُس کی آنکھیں نم کر دیں۔ اُسی وقت سینے میں درد کی دوسری لہر اُٹھی۔ بشیر اُس کا پیٹ دبا کر پانی نکال رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بشیر نے اسے اُٹھایا اور کاٹیج میں لے آیا۔ اُس نے اسے کمبل میں لپیٹا اور بستر پر لٹا دیا۔ پھر اُس نے آتش دان دہکایا اور اُس کے پاس آ گیا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا ساجدہ؟" اُس نے پوچھا۔

ساجدہ آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان سب کچھ کہہ گئی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ بالآخر ساجدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے دُھندلا گئیں۔

"ساجدہ... تم بے وقوف ہو۔"

"اور کوئی صورت نہیں تھی بشیر۔"

"تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ تم اب بھی مجھے قاتل سمجھتی ہو؟"

"اور کیا سمجھ سکتی ہوں میں؟"

بشیر اسے دیکھتا رہا مگر اُس کی نگاہوں میں برہمی نہیں تھی۔ پھر وہ اٹھا۔ "میں ابھی آیا ساجدہ۔"

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک بنڈل تھا۔ "یہ مجھے خوش قسمتی سے شیڈ میں مل گئے۔" اُس نے کہا۔ "مجھے ان کی تلاش تھی۔ یہ میری بے گناہی کا ثبوت ہیں۔ اِن سے تمہیں پتا چلے گا کہ مجھے درحقیقت شیئرز کے کاروبار میں اچانک زبردست منافع ہوا تھا۔"

ساجدہ خالی خالی نظروں سے اُسے تکتی رہی۔

"تم خود دیکھ لو۔" بشیر نے کاغذات اُس کی طرف بڑھائے۔

ساجدہ نے کمزوری کے باوجود کاغذات دیکھے۔ اس کی آنکھوں سے تحیر جھلکنے لگا۔

"میرا بروکر مر چکا ہے۔ میری کوشش کے باوجود اصلی کاغذات نہیں مل سکے۔ مجھے یاد تھا کہ اُن کی نقول میرے پاس ہیں۔ مگر یہ یاد نہیں آتا تھا کہ کہاں۔ میں بھول گیا تھا۔ میں نے دوسرے بروکر کے توسط سے منافع حاصل کیا۔ پھر اس میں سے ایک لاکھ کی سرمایہ کاری شاہ زیب کے توسط سے کی۔ مگر وہ پیسہ ڈوب گیا۔ شاہ زیب مجھے راس ہی نہیں آیا تھا۔ میں پھر پرانے بروکر سے مل کر کاروبار کرتا رہا۔ اُس کی موت کے بعد میں نے شیئرز کا دھندا چھوڑ دیا۔ ٹرک خریدے، باغات خریدے اور اپنا کاروبار مستحکم کیا۔"

ساجدہ رونے لگی۔ "اور میں تم پر شک کرتی رہی۔ جبکہ مجرم ایوب ہی تھا۔"

"میں تمہیں بتاتا رہا مگر تم نے سنا ہی نہیں۔"

"میں نے کتنا ظلم کیا تمہارے ساتھ۔ میں تو تم سے معافی بھی نہیں مانگ سکتی...۔"

"مزید احمقانہ باتیں مت کرو۔ میں بھی تو تم سے محبت کرتا ہوں۔"

اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ بشیر نے جا کر دروازہ کھولا۔ وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ارجنٹ ٹیلی گرام تھا۔ اُس نے ٹیلی گرام نکالا اور اُسے پڑھا۔

"کیا ہے بشیر؟"

بشیر نے ٹیلی گرام اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ساجدہ نے پڑھا۔ 'آج کے اخبار کا پانچواں صفحہ پڑھ لو۔ اور فوراً واپس آ جاؤ۔ وکیل دوراب خان۔'

"میری سمجھ میں نہیں آتا کیا چکر ہے۔" بشیر بڑبڑایا۔ "بہرحال... اب تو تم ٹھیک ہو۔ بس یہیں لیٹی رہو۔ میں اخبار لاتا ہوں۔ آج اخبار پڑھا ہی نہیں۔"

ساجدہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ بشیر کاٹیج سے نکل آیا۔

❀❀

بشیر واپس آیا تو مڑا تڑا اخبار اُس کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا۔ اُس کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔ "کیا بات ہے؟" ساجدہ نے پُرتشویش لہجے میں اُس سے پوچھا۔

بشیر نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ بڑبڑائے جا رہا تھا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا۔ خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں تھا۔"

ساجدہ کو اچانک ہی خیال آیا۔ "تمہارا مطلب ہے۔ کریم بخش کے قتل کے متعلق؟"

"کریم بخش کی مجھے پروا نہیں۔ میں تو ایوب کی بات کر رہا ہوں ساجدہ۔ میں نے اُس کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔"

ساجدہ نے اُس سے اخبار لیا اور لرزتے ہاتھوں سے پانچواں صفحہ کھول کر خبر پڑھی۔ خبر کے مطابق پولیس نے کریم بخش کے قاتل کو گرفتار کر لیا تھا۔ اُسے اس کی بیوی ہاجرہ نے قتل کیا تھا۔ ساجدہ کو وہ موٹی بدنما عورت یاد آ گئی۔ اُس نے پوری خبر پڑھی۔ ہاجرہ کا بیان خبر پر حاوی تھا۔

'میں نے بیس سال کریم بخش کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ بورج گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے کیشیئر نادر کو میرے شوہر نے قتل کیا تھا۔ اس رات کریم بخش کمپنی کے دفتر گیا۔ اُس نے ایوب کے کمرے سے اُس کا لفافہ چاک کرنے والا چاقو چرایا۔ پھر وہ دستانے پہن کر نادر کے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے لائٹ آف کر دی۔ اندھیرے میں نادر اُسے نہیں پہچان سکتا تھا اور نہ ہی اُس کا ذہن کریم بخش کی طرف جا سکتا تھا۔ اُس کے خیال میں حملہ آور صرف ایوب ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

اُس نے اپنی آخری چیخ میں ایوب کا نام لیا ــ وہ چیخ بشیر صاحب نے سُنی تھی۔ بہر کیف میرے شوہر نے نادر کو قتل کیا اور رقم سیاہ تھیلے میں اور چیک جیب میں ڈال کر عقبی دروازے سے بھاگا مگر پولیس والا اُس کے پیچھے لگا تو اُس کے اعصاب جواب دینے لگے۔ اس نے رقم کا تھیلا نہر میں پھینک دیا۔

وہ گھر واپس آیا تو دولت پھینک دینے کے غم میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا جرم رائیگاں ہوا تھا۔ پھر اس کے دیوانگی سے مغلوب دماغ کو کچھ اور سُوجھی۔ اسے علم تھا کہ اس رات بشیر صاحب بھی دفتر میں موجود تھے۔ اُس نے انھیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور ایک دھمکی آمیز خط بھی لکھا۔ لیکن بشیر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کریم بخش کیونکہ خود مجرم تھا، چنانچہ صبر کرکے بیٹھ گیا۔ پھر بشیر صاحب کی بیوی کو وہ خط ملا۔ وہ کریم بخش سے ملنے آگئیں۔ کریم بخش نے انھیں بلیک میل کیا اور انھیں رقم ادا کرنے کا وعدہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

کریم بخش گزشتہ دس سال سے بیمار تھا۔ میں اُس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ میں نے بہت بُرے وقت میں بھی اُس کا ساتھ دیا۔ اگر میں اس کا ساتھ نہ دیتی تو وہ برسوں پہلے مر چکا ہوتا۔

لیکن اب جبکہ اُس نے اپنے لیے وظیفہ بندھوا لیا تھا تو میں اُس کے لیے غیر ضروری اور بے کار ہو گئی۔ حالانکہ آسائش میں اُسے مجھے یاد رکھنا چاہیے تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں۔ اب اُسے میری ضرورت نہیں۔ میں گڑگڑائی۔ میں نے اُس کی منت سماجت کی۔ مگر اُس کا دل نہیں پسیجا۔ وہ مجھے دھکے دینے لگا۔ میں کہاں تک ذلت برداشت کرتی۔ اور اس میں جان بھی نہیں تھی۔ میں نے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔ وہ تھا ہی اسی قابل...،

خبر کے مطابق کریم بخش کے مکان سے بلوچ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے مسروقہ چیک بھی برآمد ہوئے جنھیں وہ ڈر کے مارے کیش نہیں کرا سکا تھا۔

ساجدہ اُن پرچھائیوں کے بارے میں سوچتی رہی جو ایوب کے تذکرے پر بشیر کے چہرے پر اُتر آتی تھیں۔ اُس کا دل ہمدردی اور محبت سے معمور ہو گیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ بشیر کتنا حساس اور صاحبِ ضمیر آدمی ہے۔ اُس نے اخبار ایک طرف رکھا اور بشیر کا ہاتھ تھام لیا۔

"ساجدہ...! مجھے تنہا چھوڑ دو پلیز۔"

"نہیں۔ تم خوامخواہ اتنے پریشان ہو رہے ہو۔"

"خدا کی پناہ... خوامخواہ! میری گواہی کی وجہ سے ایک معصوم شخص نے بارہ سال جیل میں گزارے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے ایوب کو ہی بھاگتے دیکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ نادر نے چیخ کر اسی کا نام لیا تھا۔ شاید اسی لیے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی..."

"تو اس میں تمھارا کیا قصور ہے؟"

"کیسے نہیں ہے۔ میں ایوب کا مقروض ہوں۔ میں نے اس کی زندگی کے بارہ سنہرے سال اُس سے چھین لیے۔" بشیر کے لہجے میں تلخی تھی۔

"لیکن تم نے دانستہ تو ایسا نہیں کیا۔"

"ایوب کو سزا ہونے کے بعد بھی میں اس سلسلے میں سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے پاگل ہو جاتا تھا میں۔ میرے یقین کی پختہ دیوار میں شک کی ہلکی سی دراڑ بھی تھی۔ پتا نہیں کیوں... میں اس دراڑ کو کبھی بھر نہیں سکا اس کے نتیجے میں عمر بھر میرے سینے پر بوجھ رہا۔ میرا ضمیر مجھے ستاتا رہا میں سوچتا... بارہ سال بعد بھی یہ بوجھ مجھے کیوں ستاتا ہے۔ وجہ اب معلوم ہوئی ہے..."

"اور بشیر... اس رات تم دیر سے آئے اور نشے میں بھی تھے اگلی صبح میں نے کریم بخش کے قتل کی خبر پڑھی۔ میں کتنی پاگل تھی کہ میں نے سوچا..."

"اس رات ضمیر کی خلش اتنی بڑھ گئی کہ مجھے نشے کا سہارا لینا پڑا۔ مجھے رہ رہ کر خیال ہوتا تھا کہ میں نے غلط گواہی دی ہے۔ میں سوچتا، تھانے جاؤں اور کہہ دوں کہ مجھے سو فی صد یقین نہیں ہے کہ میں نے ایوب کو دیکھا تھا۔ لیکن اتنے برسوں کے بعد میں حوصلہ کہاں سے لاتا۔"

"تم نے مجھے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا؟ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔"

"نہیں ساجدہ... ایسی باتیں کسی سے نہیں کی جا سکتیں۔"

"مجھ سے بھی نہیں؟"

"کسی سے بھی نہیں۔" بشیر نے کہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنی غلطی سے ایک شخص کی... اُس کے بیوی بچوں کی زندگی تباہ کر دی۔ اس کا کوئی کفّارہ ممکن نہیں۔ لیکن کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ میں اپنا سب کچھ ایوب کو دے کر اُس سے معافی مانگوں گا۔ کاش... وہ مجھے معاف کر دے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا بشیر۔" ساجدہ نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم تنہا نہیں ہو ــ اب جو کچھ بھی ہوگا ہم مل کر جھیلیں گے..."





تاریخ کے صفحات میں ان درس گاہوں کا نام ہمیشہ روشن رہے گا جن کے فارغ التحصیل طلبا کے کارہائے نمایاں سے قوموں کو سرفرازی نصیب ہوتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا کی تمام عظیم درس گاہیں اپنے نامور اساتذہ اور طلبا کی یادگار ہیں۔ زیرِ نظر داستان بھی ایک یونیورسٹی کے ماحول کی عکاس اور ایک قوم کے مستقبل کا آئینہ ہے۔ اس شہر کا ماجرا جہاں ہر شعبۂ زندگی پر "مافیا" کی گرفت تھی۔

ماضی کے سازِ پرحال کا نوحہ۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسرار

گاڈ فادر کے مصنف ماریو پوزو کے دوسرے ناول دی سسلین کے ایک باب سے متاثر ہو کر لکھی گئی ایک تحریر

مافیا یونیورسٹی

اقلیم علیم

مسولینی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ جنگ امریکیوں نے جیت لی تھی اور اپنی طاقت کے بل پر روم میں اٹلی کی جمہوری حکومت بحال کرا دی تھی لیکن شمال میں ہونے والی ان تبدیلیوں کا سسلی کے ماحول، طرزِ معاشرت اور باشندوں پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ مسولینی کے اقتدار سے پہلے مافیا کے بڑے ان کے مقدر کے فیصلے صادر کرتے تھے پھر مسولینی نے مافیا کی متوازی حکومت کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے سسلی میں اپنی مہم کا آغاز کیا تو بیشتر "ڈان" اور "چیف" زیرِ زمین چلے گئے پھر مسولینی کی سفاک سپاہ کو جس پر بھی مافیا سے رابطے کا ذرا بھی شبہ ہوا، اسے سرسری کارروائی کے بعد موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا یا دُور دراز جیلوں میں سڑا دیا گیا۔ یوں مسولینی کی اس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ سسلی میں شمال والوں کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات اور گہرے ہو گئے جو حالات کی بنا پر پہلے سے ان کے دلوں میں پروان چڑھ رہے تھے۔ اس دَور میں سسلی کے ہزاروں شہری مافیا سے روابط رکھنے کے شبہے میں گھروں سے گھسیٹ کر نیپلز، روم، میلان اور دوسرے بڑے شہروں کی جیلوں میں پہنچا دیے گئے۔

مسولینی کے خاتمے پر روم میں جو حکومت بنی وہ بے اختیار

اور بے وسائل تھی البتہ امریکیوں کے ایما پر جیلوں کے دروازے کھول دیے گئے تاکہ مسولینی کے عتاب کا شکار ہونے والوں کو آزاد زندگی گزارنے کا موقع مل سکے۔ اس طرح جہاں عام شہری رہا ہوئے وہیں مافیا کے بعض سفاک ڈان بھی آزاد ہو گئے جو اپنی خود اعتمادی یا کسی اور وجہ سے مسولینی کی سپاہ کا نشانہ بن گئے تھے۔ اس طرح سسلی میں مافیا نے پہلے سے زیادہ قوت سے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔

جنگ کے بعد ملک میں اشیائے ضرورت کا کال پڑا ہوا تھا، کاشت کار اپنی پیداوار نہایت سستے داموں پر سرکاری گوداموں میں پہنچانے پر مجبور تھے۔ لیرا کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سرکاری گوداموں سے راشن بندی کی بنیاد پر اشیائے ضرورت فروخت کے لیے تقسیم کی جا رہی تھیں۔ اپنے اثر و رسوخ اور عوام پر پرانی دھاک کے سہارے تقسیم کا نظام سسلی میں مافیا والوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ جن چیزوں کی مانگ تھی، وہ کھلے بندوں، اٹلی کی قومی پولیس کے تعاون سے اس کی اسمگلنگ کر رہے تھے۔ عام شہری چند کلو پنیر بھی خچر پر لاد کر لاتے تو اسمگلنگ کے جرم میں دھر لیے جاتے تھے۔

مافیا کے ڈان، سسلی میں زندگی کے ہر شعبے پر تیزی سے چھاتے چلے گئے۔ دکان داروں سے "لوٹ مار سے تحفظ" کے نام پر بھتے لیے جا رہے تھے۔ مچھلی پکڑنے والوں پر مافیا ٹیکس لاگو تھا۔ ان لوگوں کی مرضی اور حصے کے بغیر سسلی کی سرزمین پر ایک لیرا کا لین دین کرنا بھی عملاً ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کے فیصلوں سے انحراف کا نام موت رکھ دیا گیا تھا۔ انحراف خواہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، سزا صرف موت تھی اور ان کی اسی سفاکی نے انہیں سسلی کا بے تاج حکمراں بنایا ہوا تھا جو اپنے ملک، اٹلی کے قانون کو خرید کر اپنی حکومت چلا رہے تھے اور پالرمو میں رہنے والا ڈان کردسے مالو پورے سسلی میں مافیا کا سب سے طاقتور ڈان تھا جو پوری قوت کے ساتھ اپنے فیصلوں کو جاری اور نافذ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ انتہا یہ تھی کہ سسلی کا سیکیورٹی چیف انسپکٹر دیلارڈی ہر چھوٹے بڑے آپریشن سے پہلے ڈان کردسے سے مشورہ کر کے اس کی رضا کو شامل حال کرنا ضروری سمجھتا تھا اور اکثر کھانے کی میز پر ڈان کے پہلو میں نظر آتا تھا۔

پالرمو سسلی کے انتہائی شمال مغرب میں ایک مردہ آتش فشاں کے تخلیق کیے ہوئے گہرے پیالے کے بالکل پیندے میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے تین اطراف سے پہاڑ دیکھنے والے پر آتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور چوتھی سمت میں سمندر کا نیلگوں پانی لہریں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ سسلی کو جتنے فاتحین نے اپنے قدموں تلے روندا، ان سب کی یادگاریں اس شہر میں اب بھی سر بلند نظر آتی ہیں۔ یونانی مندر، بلند مینار مسجد، اسپینی کیتھیڈرل، یہودیوں کے معبد اور نارمنوں کا قلعہ سب جوں کے توں موجود ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے ان کا رنگ روپ ضرور بدل گیا ہے لیکن یہ عمارتیں آنے اور پھر چلے جانے والوں کی عظمتوں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ اسی پالرمو سے پہاڑی راستوں پر تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر مونٹے لیپرے کی پسماندہ تاریخی بستی ہے جہاں کے باسی آج بھی ہر برس اپنے مکان پر دوبارہ وہی رنگ کرتے ہیں جو ان کے بزرگوں نے مکان تعمیر کرانے کے بعد پہلی بار کرایا تھا۔ جنھیں تاریخ سے ذرا بھی دلچسپی ہے وہ مکان کا رنگ دیکھ کر معمار کی نسل بتا سکتے ہیں کیونکہ وہ صدیوں سے اسی رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔

جب نارمن فاتح آئے تو انھوں نے اپنے مکانوں کے لیے سفید رنگ پسند کیا۔ یونانیوں نے ہمیشہ نیلے رنگ کو ترجیح دی، عربوں کو سرخ یا گلابی رنگ پسند تھا اور یہودی اپنے گھروں کی صرف پیلے رنگ سے تزئین کرتے تھے۔ صدیاں گزر گئیں، آپس کی شادیوں سے نسلیں خلط ملط ہو گئیں، اب وہاں کے رہنے والے صرف عیسائی اور اطالوی ہیں۔ غیر ملکیوں کے سامنے وہ دبے لہجے میں خود کو اطالوی کہہ لیتے ہیں لیکن اپنی تمام تر غربت اور پسماندگی کے باوجود وہ خود کو سسلی والا کہلوانا زیادہ پسند کرتے ہیں جو اٹلی کی سرحدوں میں اطالوی قانون سے ماورا ایک خواب ناک جزیرہ ہے۔

ہیکٹر ایڈونیس اسی سسلی کی پالرمو یونیورسٹی میں تاریخ اور ادب کا سینئر پروفیسر تھا۔ قدرت نے اسے بے پناہ ذہانت اور قابلِ رشک یادداشت سے نوازا تھا لیکن یہ مقدر کی ستم ظریفی تھی کہ اس کا قد غیر معمولی حد تک کم تھا۔ وہ ہمیشہ بہترین تراش کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کرتا تھا۔ ٹائی کی میچنگ قابلِ دید ہوتی تھی۔ سر کے سفید اور موٹے موٹے بال قرینے سے سنورے رہتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں، دل کش چہرے اور خم دار ہونٹوں کی وجہ سے وہ بہت وجیہہ اور بارعب نظر آتا تھا لیکن وہ سسلی کے اس معاشرے میں رہ رہا تھا جہاں کسی بھی فرد کو اس کی جسمانی خامی پر بڑی بے رحمی سے نشانہ بنایا جاتا ہے اس وجہ سے یونیورسٹی میں اس کے ہم عصر استاد اس کی وہ عزت نہیں کرتے تھے جس کا علمی درجہ متقاضی تھا۔ البتہ یونیورسٹی کا صدر اس کی دل سے قدر کرتا تھا اور ہیکٹر ایڈونیس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ سسلی میں پیدا ہوا تھا، سسلی والوں

کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اس جیسے بونے پروفیسر کو دیکھ کر ہنسنا بھی سسلی والوں کی عادات کے لحاظ سے عزت افزائی کا ایک اہم طریقہ تھا۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ فاتح امریکی افواج سسلی کو روندتی ہوئی مین لینڈ اٹلی میں داخل ہو چکی تھیں۔ مسولینی کا فاشزم مر چکا تھا، اٹلی کو ایک نئی زندگی مل گئی تھی اور سسلی کی چودہ سو سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سسلی کوئی حقیقی مالک نہیں تھا۔ وہ تاریخ کا ماہر تھا اور تاریخ کی سنگین حقیقتوں سے خوب واقف تھا۔ مافیا نے سسلی کا قانون اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا تھا، وہ کینسر کی طرح قانون اور ریاستی اختیارات کی جڑوں میں اترتے جا رہے تھے اور جلد ہی خود ایک ریاست کا روپ لینے والے تھے۔

اس نے مایوسی کے ساتھ کھڑکی سے باہر نظریں دوڑائیں۔ وسیع و عریض قطعۂ زمین پر گنتی کی چند عمارتیں کھڑی ہوئی تھیں جنھیں بمشکل کیمپس کہا جا سکتا تھا۔ وہاں زیادہ عمارات کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دوسرے ملکوں کے برعکس وہاں کیمپس لائف کا تصور ہی رواج نہیں پا سکا تھا۔ جو پڑھنا چاہتے تھے وہ گھروں پر پڑھتے تھے اور پہلے سے طے شدہ اوقات میں حسب ضرورت اپنے پروفیسروں سے مدد لے لیا کرتے تھے۔ کلاسوں میں کبھی کبھار پروفیسر لیکچر دیتے تو طلبا منزا و جزا کے احساس سے بے نیاز سپاٹ چہروں سے خلاؤں میں تکتے رہتے۔ ان کی دلچسپی صرف امتحان دینے میں ہوتی تھی جو بدقسمتی سے مقررہ اوقات پر ہوتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو داخلہ لیتے ہی امتحان دے کر حساب بے باق کر لیتے۔

ہیکٹر ایڈوینس اس رجحان پر دل ہی دل میں کڑھتا تھا کہ اس طرح سسلی والے خود اپنا نقصان کر رہے تھے، ڈگری یافتہ احمقوں کی فوج پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے حالانکہ انہیں تو اپنی سرزمین سے جہالت، بیماری اور غربت کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے تعلیم کے میدان میں دوسروں سے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت تھی۔

یونیورسٹی کا وہ موسم اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ مسولینی کے عروج کے مختصر سے عرصے کو چھوڑ کر، ان دنوں سسلی کے ہر علاقے سے مافیا کے چیف اس مادر علمی کی زیارت کو آتے تھے اور اپنی اپنی غرض کے شعبے میں پروفیسروں میں اپنی لابی بنانے کی کوشش کرتے تھے یا کچھ کام لاتے تھے۔ فاشسٹوں کے دور میں یہ چیف ذرا نرم خوئی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے لیکن امریکا بہادر کی بحال کرائی ہوئی جمہوریت کے سائے میں وہ اپنی تند خوئی کے ساتھ برساتی مینڈکوں کی طرح ابل پڑے تھے۔ کسی کے چہرے پر نرمی یا مصالحت نام کو نظر نہ آتی تھی۔

مافیا کے چیف اور سسلی کے دور دراز دیہاتوں میں پھیلے ہوئے مقامی گروہوں کے سربراہ ہر سال چھٹیوں میں اپنے رشتے داروں یا اپنے علاقے کے امرا کے بیٹوں کے کام کرانے آتے تھے۔ ان لڑکوں میں بیشتر وہ ہوتے تھے جو فیل ہو رہے ہوتے تھے اور جانتے تھے کہ کسی سخت کارروائی کے بغیر انہیں کبھی ڈگری نہیں مل سکے گی۔

ہر گھرانے میں ان ڈگریوں کی بہت اہمیت تھی۔ ان کے بغیر والدین کی اپنے بے حس، کند ذہن اور آوارہ بیٹوں سے نجات ناممکن تھی۔ ڈگری نہ ملنے پر وہ ساری عمر باپ کے اوپر بوجھ بنے روٹیاں توڑتے رہتے لیکن ڈگری ملتے ہی یہ آوارہ گرد اور نکمے لڑکے استاد، ڈاکٹر یا پارلیمنٹ کے رکن بن سکتے تھے۔ یہ سب نہ ہوتا تو بھی انھیں چھوٹی موٹی انتظامی اسامیاں تو مل ہی جاتیں جہاں سے ان کی گزر بسر ہو جاتی۔

ہیکٹر ایڈوینس جھرجھری لے کر رہ گیا پھر تاریخ نے اسے کچھ سہارا دیا۔



اپنی سلطنت کی عظمت کے دنوں میں برطانیہ عظمیٰ نے اپنی فوجوں کو اُمراء اور رؤسا کے ایسے ہی نکمّے لاڈلوں کے سپرد کر دیا تھا جن کے والدین نے پیسہ بہا کر شاہی بحریہ اور فوج میں کمیشن دلوایا تھا۔ اس کے باوجود سلطنت ترقی کرتی رہی۔ اس اَمر میں کوئی شُبہ نہیں کہ کمانڈروں نے غیر ضروری طور پر اپنے آدمیوں کا قتلِ عام کرایا، ناتجربہ کاری سے پورے پورے جہاز غرق کر دیے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے کمانڈروں نے اپنے آدمیوں کے ساتھ موت کا ذائقہ چکھا اور بہادری کی تاریخ میں اپنا نام چھوڑ گئے لیکن اسی کے ساتھ ریاست کا بھی مسئلہ حل ہو گیا کہ نااہل اور اوچھے لوگ مُلک کے خزانے پر بوجھ بننے کے بجائے بہادری اور تجربے کے نام پر کہیں کام آ گئے لیکن اطالوی اتنے بے مہر اور خود غرض نہیں تھے کہ اپنے جگر گوشوں کو صرف ذرا سی نالائقی کی بنا پر موت کی آغوش میں ڈال دیتے۔ انہیں اپنے بچّوں سے پیار تھا وہ اُنھیں مصائب سے محفوظ دیکھنا چاہتے تھے اس لیے اس کھیپ کی نگہداشت کا فرض ریاست پر ڈال دیا گیا تھا۔

اس وقت ہیکٹر ایڈونیس کو کھڑکی سے کم از کم تین ایسے مقامی مافیا چیف نظر آ رہے تھے جو اپنے شکار کی تلاش میں تھے۔ ان سب کی وضع قطع کم و بیش یکساں تھی۔ سروں پر کپڑے کی ٹوپیاں، پیروں میں چمڑے کے جوتے، ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور بازوؤں پر مخمل کی وزنی جیکٹیں، کیونکہ موسم قدرے گرم تھا۔

کسی کے پاس پھلوں سے لدی ہوئی ٹوکری تھی، کوئی تحفے میں دینے کے لیے بانس کی کونپلوں میں خوب صورتی سے لپٹی ہوئی خانہ ساز شراب کی بوتلیں لایا تھا۔ یہ رشوتیں نہیں تھیں بلکہ ان بھیانک چہروں سے ملاقات کے وقت اساتذہ کے دلوں میں پیدا ہونے والی دہشت کو کم یا ختم کرنے کا ٹوٹکا تھا۔ بیشتر پروفیسر سسلی کے باشندے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ ان خبیثوں کی کسی التجا کو کبھی رَد نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مافیا چیف جو انتہائی بدوضع، دیہاتی لباس میں تھا، اسی بلڈنگ میں گھسا اور زینے چڑھنے لگا۔۔۔ ہیکٹر اپنے لبوں پر بے جان مسکراہٹ سجا کر آنے والے لمحات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہیکٹر ایڈونیس اس شخص کو جانتا تھا۔ اس کا نام بکیلا تھا اور وہ ایک قریبی قصبے میں ایک فارم اور بھیڑوں کے ریوڑ کا مالک تھا۔ دونوں نے ہاتھ ملائے اور بکیلا نے پھلوں کی ٹوکری پروفیسر کو دے دی۔

"ہمارے ہاں اس قدر فروٹ گر کر گل سڑ رہا ہے کہ میں نے سوچا کیوں نہ کچھ تمھارے لیے لیتا چلوں۔" اس نے سادگی سے کہا۔ وہ پستہ قامت اور چوڑے بدن کا مالک تھا۔ مشقت کی قوت اس کی نس نس سے ظاہر تھی۔ ایڈونیس جانتا تھا کہ وہ بہت ایماندار ہے اور مافیا کے ان پرانے بڑوں کی نسل سے تعلق رکھتا ہے جو پیسے کے لیے نہیں بلکہ عزت اور وقار کے لیے لڑا کرتے تھے۔

ایڈونیس فروٹ لیتے ہوئے مُسکرایا۔ سسلی میں ایک بیر بھی ضائع نہیں ہوتا تھا۔ زمین پر گرنے والے ایک زیتون پر سیکڑوں بچے ٹوٹ کر گرتے تھے اور زیتون کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔

بکیلا مُسکرایا۔ وہ خوش خلقی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن ایڈونیس جانتا تھا کہ پل بھر میں وہ خوش خلقی جنون میں بدل سکتی تھی لہٰذا وہ جواباً زیادہ مُسکرایا اور بکیلا کہنے لگا۔ "زندگی بھی کس قدر بکواس ہو کر رہ گئی ہے۔ مجھے اپنی زمینوں پر کافی کام کرنا ہے لیکن جب میرے پڑوسی نے ایک چھوٹے سے کام کے لیے کہا۔ تو بتاؤ میں کیسے انکار کر سکتا تھا؟ ہمارے باپ دادا کے زمانے سے شناسائی چلی آ رہی ہے اور یہ میری فطرت ہے یا شاید بدقسمتی کہ میں ہر وہ کام کر ڈالتا ہوں جس کے لیے میرا کوئی دوست مجھ سے کہے۔ آخر کار ہم سب آپس میں عیسائی بھی تو ہیں نا؟"

"ہم سسلی والے سب ایک جیسے ہیں۔" ایڈونیس نے نرمی سے کہا۔ "ضرورت سے زیادہ فراخ دل۔ یہی وجہ ہے کہ شمال میں روم سے حکومت کرنے والے ہم سے شرمناک فائدے اُٹھا لیتے ہیں۔"

بکیلا نے مکّارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور سوچا "یہاں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیے۔ میں نے تو شاید کہیں یہ بھی سُنا تھا کہ پروفیسر ہم ہی میں سے ہے اور اگر ایسا ہے تو آخر میں نے اس کی تصدیق کیوں نہیں کی؟ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا۔ لیکن خیر، مافیا میں بھی بہت سے مرتبے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو، کم از کم یہ آدمی جس دُنیا اور ماحول میں رہتا ہے اس کے تقاضوں کو خوب سمجھتا ہے۔"

"میں تمھارے پاس مدد کے لیے آیا ہوں۔" قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ "جیسے ایک سسلی والا دوسرے کے پاس جا سکتا ہے اس سال یونیورسٹی میں میرے پڑوسی کا بچہ فیل ہو گیا۔ میرے پڑوسی کا دعویٰ ہے کہ اسے تم نے فیل کیا ہے۔ میں نے یہ سُنتے ہی کہا تھا کہ سینور ایڈونیس تو دُنیا کا مہربان ترین شخص ہے اگر اسے سارے حقائق کا علم ہوتا تو وہ ہرگز ہرگز بھی ایسی نامہربانی نہ کرتا۔ بس اس پر دونوں میاں

بیوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انھوں نے مجھ سے التجا کی ہے کہ میں پوری کہانی تمھارے گوش گزار کردوں اور عاجزانہ درخواست کروں کہ بچے کا گریڈ بدل دو تاکہ وہ ڈگری حاصل کرکے دُنیا میں کہیں اپنی روزی کمانے کے قابل ہوسکے۔"

ایڈوینس نے اس کی انتہا درجے کی عاجزی اور انکسار سے دھوکا نہیں کھایا۔ وہ جانتا تھا کہ سینور بکیلا کی درخواست کو رَد کیا گیا تو اس کا جواب کسی تاریک رات کے سنّاٹے میں اس پر آگ اُگلتی ہوئی گن ہی دے گی۔

"اوہ! ہم اس ماحول میں ایک جوان بچّے کی زندگی برباد نہیں ہونے دیں گے۔" اس نے بکیلا کے لائے ہوئے پھلوں میں سے زیتون ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "بچّے کا نام کیا ہے؟" بکیلا نے نام بتایا تو اس نے اپنی ڈیسک کے نچلے خانے سے ایک رجسٹر نکالا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا حالانکہ وہ اس نام سے اچھی طرح واقف تھا۔

ناکام لڑکا بہت احمق، ناکارہ، غبی اور ظالم طبیعت کا مالک تھا۔ سست مزاج تھا اور ہر وقت لڑکیوں کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایسا جاہلِ مطلق تھا جسے اپنے مضمون کی مبادیات تک کا علم نہیں تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود ایڈوینس بکیلا کی طرف دیکھ کر محبّت سے مُسکرایا اور تحیّر آمیز لہجے میں بولا۔ "اوہ! اس نے اپنا ایک پرچا ذرا خراب کیا تھا لیکن یہ کوئی بات نہیں، ٹھیک ہوجائے گا۔ اسے میرے پاس بھیجو۔ میں اسے چند روز تیاری کراؤں گا اور اسے امتحان کا ایک اور موقع دیا جائے گا۔ اس بار وہ فیل نہیں ہوگا۔"

دونوں نے ہاتھ ملائے اور آنے والا چلا گیا۔

'خونیوں اور قاتلوں میں ایک اور دوست بنا۔' ایڈوینس نے سوچا۔ اسے غصّہ آرہا تھا۔ صلاحیت سے عاری ان بیہودہ اور ناکارہ لڑکوں کو ڈگریوں کی کیا ضرورت تھی؟ ڈگریوں سے استغنا کرکے وہ متوسط درجے کے کسی بھی کام میں گھس سکتے تھے۔

فون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

دوسری طرف یونیورسٹی کا صدر تھا جو عام طور پر پیشہ ورانہ لحاظ اور آداب پر سختی سے عمل کراتا تھا لیکن اس وقت اس کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔ معلوم ہورہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے رو پڑے گا۔ "ڈیئر پروفیسر ایڈوینس! کیا میں تمھیں اپنے دفتر تک آنے کی زحمت دے سکتا ہوں؟ یونیورسٹی کو ایک سنگین مسئلے کا سامنا ہے جسے صرف تم ہی حل کرسکتے ہو۔ یہ بے انتہا اہم ہے۔ یقین کرو ایڈوینس! میں سچّے دل سے تمھارا احسان مند رہوں گا۔"

اس کے الفاظ اور لب و لہجے نے ایڈوینس کو پریشان کردیا۔ اس نے نرمی سے پوچھا۔ "مجھے کچھ تو بتاؤ تاکہ میں تمھارے دفتر آنے تک راستے میں کچھ سوچ سکوں۔"

"عزت مآب ڈان کروسے نے ہمیں شرفِ ملاقات بخشا ہے۔" اس کی آواز ایک سرگوشی میں مُرجھا گئی تھی۔ "ان کا بھانجا ہمارے یہاں میڈیکل کا طالبِ علم ہے۔ اس کے پروفیسر کا خیال ہے کہ اس کا عزت سے کالج چھوڑ دینا ہی بہتر رہے گا۔ ڈان کروسے بڑے اخلاق اور انکسار کے ساتھ ہمارے پاس نظرِ ثانی کی درخواست لے کر آئے ہیں لیکن میڈیکل کالج کے پروفیسر کا اصرار ہے کہ اس نوجوان کو کالج سے چلا جانا چاہیے۔"

"وہ اُلّو کا پٹھا کون ہے؟" ایڈوینس کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوگیا۔

"ڈاکٹر نے ٹورے!" صدر کی آواز سسک رہی تھی۔ "موصوف میڈیکل فیکلٹی کے نئے رکن ہیں لیکن دُنیا ذرا کم دیکھی ہے۔"

"میں ابھی پہنچتا ہوں۔" ہیکٹر ایڈوینس نے کہا اور فوراً ہی کرسی چھوڑ دی۔ صدر کے دفتر کی طرف جاتے ہوئے وہ سخت پریشان تھا۔ کوئی راستہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ صدر کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے معاملات میں ایڈوینس کی رائے پر انحصار کرتا تھا۔ اصل دُشواری ڈاکٹر نے ٹورے کے ساتھ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک سخت بااصول آدمی تھا۔ اس کے اصولوں میں کوئی لچک نہیں ہوتی تھی۔ طبّی پیشے کا وہ ایک مایہ ناز ماہر تھا۔ اس کی ناگہانی موت پورے نسل کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ثابت ہوتی اور اگر وہ اختلافِ رائے پر استعفا دے کر چلا جاتا تو یہ یونیورسٹی کا نقصان ہوتا۔

ڈاکٹر نے ٹورے نے یقیناً ڈان کروسے کے بارے میں سُن رکھا ہوگا۔ اس کے پاس سمجھ بوجھ کی بھی کمی نہیں تھی پھر وہ اس معاملے پر کیوں اُلجھ رہا تھا؟ یقیناً بات کچھ اور ہی تھی۔

مرکزی عمارت کے سامنے ایک لمبی سیاہ کار کھڑی ہوئی تھی جس سے دو خطرناک صورت والے آدمی ٹیک لگائے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے نفیس کاروباری سوٹ بھی ان

کے خدوخال کی اصلیت کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شاید ڈان کروسے کا ڈرائیور تھا اور دوسرا باڈی گارڈ جنہیں ڈان کروسے یونیورسٹی کے تقدس کے خیال سے اپنے ساتھ اندر نہیں لے گیا تھا۔

ایڈ وینس کے غیر معمولی پستہ قامت پر نگاہ پڑتے ہی دونوں کی آنکھوں میں تحقیر اور تضحیک کے آثار اُمڈ آئے اور وہ مسکرانے لگے۔ ایڈ وینس نے سرد نگاہوں سے دونوں کو گھورا جس نے انھیں پریشان کر دیا۔

دیواروں کے ساتھ اوپر تک لگی ہوئی کتابوں کی وجہ سے وہ کمرا صدر کے دفتر سے زیادہ لائبریری نظر آرہا تھا کیونکہ صدر، ایڈمنسٹریٹر سے زیادہ ایک نامور اسکالر تھا جس کا زیادہ وقت کتابوں کے مطالعے میں گزرتا تھا۔

ڈان کروسے ایک بڑی کرسی میں دھنسا کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا اور اس کا چہرہ اس وقت گمبھیر نظر آرہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے خوب واقف تھے لیکن ڈان کروسے نے یوں ظاہر کیا جیسے ایڈ وینس اس کے لیے اجنبی ہو۔ ایڈ وینس نے اپنا باقاعدہ تعارف کرایا وہ بیٹھ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر نے تورے اندر آگیا۔

صدر، یونیورسٹی میں سب سے لمبے قد کا آدمی تھا اور ایڈ وینس تقریباً بونا اس لیے صدر اپنی کرسی میں کافی دھنس کر اس طرح بیٹھا کہ تضاد کم سے کم نمایاں ہو۔ وہ ایڈ وینس کا خاصا احترام کرتا تھا۔

"ہمارے درمیان ایک چھوٹا سا اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔" صدر نے کہا اس پر ڈاکٹر نے تورے نے ناک سے ایک غصیلی آواز نکالی جیسے صدر کے وہ نرم الفاظ اسے پسند نہ آئے ہوں لیکن ڈان کروسے نے اپنے سر کو اثبات میں ہلکی سی جنبش دی۔ صدر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ڈان کروسے کا بھانجا ڈاکٹر بننے کی آرزو میں تڑپ رہا ہے لیکن ڈاکٹر نے تورے کا کہنا ہے کہ اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ ڈان کروسے کی مہربانی ہے کہ وہ اپنے بھانجے کا معاملہ لے کر بہ نفسِ نفیس یہاں آئے ہماری یونیورسٹی کے لیے ڈان کروسے کی خدمات اتنی بیش بہا ہیں کہ میرے خیال میں ہمیں ان کی خواہش کا احترام کرنے کی ہر وہ کوشش کرنی چاہیے جو ہمارے بس میں ہے۔"

ڈان کروسے نرمی سے بولا تو اس کی آواز میں طنز کا شائبہ تک نہیں تھا "میں خود ایک جاہلِ مطلق ہوں مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں کاروبار کی دنیا میں ناکام رہا ہوں . . ."

"یقیناً!" ہیکٹر ایڈ وینس نے سوچا "جو شخص وزیروں کو رشوت دے سکتا ہو، قتل کرا سکتا ہو، دکان داروں اور فیکٹری مالکان کو دہشت زدہ کر سکتا ہو اسے لکھنے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں نے اپنی راہ زندگی کے تجربوں سے بنائی ہے۔" ڈان کہہ رہا تھا "میرا بھانجا بھی میری ہی بنائی ہوئی راہ پر چل سکتا ہے۔ اگر میرے بھانجے کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کے لفظ کا اضافہ نہ ہوا تو بے چاری میری بہن کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ ایک سچی عیسائی عورت ہے اور اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنوا کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔"

"میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔" ڈاکٹر نے تورے نے سخت لہجے میں کہا۔

ڈان نے ایک گہرا سانس لیا اور چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا "میرا بھانجا کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ میں اس کو آرمی میں کوئی سرکاری عہدہ دلوا دوں گا یا بوڑھوں کے کیتھولک ہسپتال میں نوکری دلوا دوں گا۔ وہ بوڑھے مریضوں کے ہاتھ تھام کر محبت سے ان کے دکھ درد سنے گا۔ وہ بڑا ملنسار لڑکا ہے، ان بوڑھے ڈھانچوں کا دل بہلایا کرے گا۔ میں نے تم سے کیا مانگ لیا ہے؟ صرف کاغذوں کی ذرا سی ہیر پھیر جو تم یہاں کرتے ہی رہتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دیوار سے لگی ہوئی کتابوں پر حقارت سے نگاہ دوڑائی۔

وہ نگاہیں ایڈ وینس کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ ڈان کروسے کے آخری التجائیہ فقروں سے سخت پریشان ہو گیا۔ اس جیسے آدمی کی طرف سے وہ خطرے کا بدترین سگنل تھا۔ لیکن ڈان ایسے تیور دکھانے میں حق بجانب تھا کیونکہ اس کے پاس اختیار کے ساتھ ساتھ بے پناہ وسائل بھی تھے۔

"مائی ڈیئر ڈاکٹر نے تورے!" ایڈ وینس نے ڈان کی طرف سے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم یقیناً کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ تھوڑا سا پرائیویٹ ٹیوشن، کسی خیراتی ہسپتال میں مزید ٹریننگ۔ اور کیا چاہیے ہمیں؟"

ڈاکٹر نے تورے پیدائش سے اس وقت تک کبھی سسلی والا نہیں محسوس ہوا۔ وہ اپنی جگہ درست تھا اور اسے دبایا جا رہا تھا اس لیے اس نے اپنے غصے کا اظہار کر ڈالا جب کہ سسلی کا کوئی اصل باشندہ ایسی پیچیدہ صورت حال میں بھول کر بھی غصے کا اظہار نہیں کرتا۔

"تم نہیں سمجھ رہے مائی ڈیئر پروفیسر ایڈ وینس۔ وہ بیوقوف لڑکا سرجن بننا چاہتا ہے۔"

ہیکٹر ایڈوینس کو مسیح اور مریم سے لے کر اپنے سارے سینٹ یاد آ گئے۔ اس وقت اس کی سمجھ میں آیا کہ اصل معاملہ کیا تھا، دوسروں کے چہروں پر اپنے انکشاف کے سنگین تاثرات دیکھ کر ڈاکٹر نے ٹورے نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

"تمہارا بھانجا اناٹومی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے ایک لاش کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا جیسے ہم لوگ بھوننے کے لیے کوئی بھیڑ تیار کر رہے ہوں۔ وہ اپنی زیادہ تر کلاسوں سے غائب رہتا ہے، ٹیسٹ کے لیے کوئی تیاری نہیں کرتا۔ آپریشن روم میں اس طرح داخل ہوتا ہے جیسے ہمارے ساتھ ناچنے کے لیے آیا ہو۔ میں مانتا ہوں کہ وہ ملنسار ہے۔ اور اس سے بہتر آدمی شاید ہی مل سکے لیکن ہم ایک ایسے آدمی کے بارے میں بات کر رہے ہیں جسے ایک دن تیز دھار چاقو ہاتھ میں لے کر جسمانی اعضا کو صحیح مقام سے صحیح طرح کاٹنے کے فیصلے کرنے ہوں گے۔"

ایڈوینس ڈان کی ذہنی کیفیت کو خوب سمجھ رہا تھا۔ اسے کیا پرواہ تھی کہ لڑکا کیسا سرجن بنے گا۔ اچھا یا برا، وہ تو اسے سرجن بنانے پر تلا ہوا تھا۔ وہ اس کے گھرانے کے وقار کا معاملہ بھی نظر آتا تھا۔ لڑکا فیل ہو جاتا تو ساکھ کرکری ہو جاتی۔ پھر وہ خواہ کتنا ہی برا سرجن ہوتا، اتنے آدمی تو ہرگز نہیں مار سکتا تھا جتنے ڈان کے معروف، پیشہ ور ملازمین مار لیتے تھے۔

اہم بات یہ تھی کہ نوجوان ڈاکٹر نے ٹورے نے ڈان کی خواہش کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا وہ اس کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا حالانکہ ڈان نے بوڑھوں کے کیتھولک ہسپتال کا حوالہ دے کر یہ واضح کر دیا تھا کہ سرجن نہ سہی، اس کا بھانجا میڈیسن کا ڈاکٹر بنا دیا جائے۔

وقت آ گیا تھا کہ ایڈوینس دخل اندازی کرے۔ وہ بولا۔ "محترم ڈان کروسے! مجھے امید ہے کہ ہم ڈاکٹر نے ٹورے کو سمجھاتے رہے تو وہ تمہاری خواہش تسلیم کر لے گا لیکن تمہارے بھانجے کے دماغ میں سرجن بننے کا خیال کیسے پیدا ہو گیا؟ تم نے خود کہا کہ وہ نرم خو اور ملنسار ہے۔ سرجن تو پیدائشی ایذا پرست ہوتے ہیں۔ نشتر لگا کر سکون محسوس کرتے ہیں۔ اور سسلی میں کتنے لوگ ہیں جو ہنسی خوشی اپنا آپریشن کرانا پسند کریں گے؟" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بولنے لگا۔ "اگر اسے سرجن ہی بننا ہے تو روم میں تربیت لازماً لینی ہوگی۔ روم والے متعصب ہیں۔ ہم اسے یہاں سے پاس کر دیں تو وہ لوگ سسلی کے ایک باشندے کی زندگی تباہ کرنے کے لیے ہزاروں بہانے تلاش کر لیں گے۔ اس طرح اصرار کر کے تم اپنے بھانجے کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہو۔ اجازت ہو تو میں ایک سمجھوتا پیش کروں؟"

"کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر نے ٹورے بڑبڑایا۔

پہلی بار ڈان کی چھپکلی جیسی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ نے ٹورے فوراً خاموش ہو گیا اور ایڈوینس جلدی جلدی بولنے لگا: "تمہارے بھانجے کو پاس کر دیا جائے گا۔ وہ ڈاکٹر بن جائے گا لیکن سرجن نہیں بن سکے گا، اس وجہ سے کہ وہ اس قدر نرم دل ہے کہ انسانی جسم پر نشتر نہیں چلا سکتا۔"

ڈان کروسے نے اپنے دونوں بازو ایڈوینس کی طرف پھیلا دیے اور سرد مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم نے اپنے دلائل اور سمجھ داری سے مجھے ہرا دیا۔ چلو یوں ہی سہی، میرا بھانجا سرجن نہیں، ڈاکٹر بنے گا۔ میری بہن کو اسی پر قناعت کر نی چاہیے۔"

وہ عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گیا اس کا مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ شاید اسے خود بھی اس سے زیادہ کی توقع نہیں تھی۔ صدر اس کو چھوڑنے کے لیے اس کے ساتھ گاڑی تک گیا مگر کمرے میں موجود ہر فرد نے محسوس کیا تھا کہ ڈان کروسے نے جاتے جاتے نے ٹورے کے چہرے پر بڑی عجیب سی نگاہ ڈالی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈان اس کے خدوخال اپنے ذہن کی سلیٹ پر محفوظ کر رہا ہو تاکہ وقت آنے پر وہ اپنی خواہش کو پامال کرنے والے کو پہچاننے میں کسی غلطی کا ارتکاب نہ کرے۔

"میرے عزیز ساتھی!" ان کے چلے جانے کے بعد ایڈوینس نے ڈاکٹر نے ٹورے سے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "اب یہاں سے استعفا دے کر تم روم میں پریکٹس کرنے کی تیاری کر لو۔"

"پاگل ہو گئے ہو تم؟" وہ غصے میں برس پڑا۔

"تم سے کم۔" ہیکٹر ایڈوینس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں پھر کہہ رہا ہوں کہ آج رات تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہمارا سسلی آج تک جنت ارضی کیوں نہ بن سکا۔"

"لیکن میں یہاں سے کیوں چلا جاؤں؟" اس نے احتجاج کیا۔

"اس لیے کہ تم نے ڈان کروسے مالو سے "نہیں" کا لفظ کہا ہے۔ سسلی چھوٹی سی جگہ ہے۔ یہاں تم کہیں بھی اس سے نہ بچ سکو گے۔"

"لیکن اس کا کام تو ہو گیا۔" ڈاکٹر نے ٹورے تقریباً چیخ پڑا۔ "اس کا بھانجا ڈاکٹر بن جائے گا۔ تم نے اور صدر نے یہ تجویز منظور کر لی ہے۔"

"لیکن تم نے منظور نہیں کی۔" ہیکٹر ایڈوینس نے کہا۔ "ہم نے تمہاری جان بچانے کے لیے یہ منظوری دی لیکن اب تم ڈان کی نظروں میں آ گئے ہو۔ سسلی کے روایتی قانون میں

ڈان کی مرضی سے انکار کی سزا صرف موت ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر نے ٹورے کے لیے وہ ساری باتیں ناقابلِ فہم تھیں، وہ بے چارہ اُلجھ کر رہ گیا۔

اسی شام پروفیسر ہیکٹر ایڈوینس پالرمو کے بہترین ریستوران میں ڈاکٹر نے ٹورے سمیت یونیورسٹی کے چھ پروفیسروں کی میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس روز اُن میں سے ہر پروفیسر کو سسلی کے معززین نے شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ ان کے لیے گھر میں کشید کی ہوئی بہترین شراب اور تازہ پھلوں کے تحائف لائے تھے۔ بیشتر معززین نے اس قسم کی رسمی ملاقاتوں کے علاوہ اپنی زندگی میں کبھی یونیورسٹی اور کالج تو کجا، اسکول تک کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن ان میں سے ہر شخص اپنے علاقے میں سب سے زیادہ خوش حال اور کامیاب سمجھا جاتا تھا۔ ان کی عزت اور احترام کا یہ عالم تھا کہ ہر معاملے میں ان کی رائے صائب اور اٹل سمجھی جاتی تھی۔ وہ جس راستے سے گزرتے تھے وہاں لوگ احتراماً اپنے سر جھکا لیا کرتے تھے لیکن ان دوستوں نے یونیورسٹی میں کسی کی توہین نہیں کی، کسی سے تیز زبان میں بات نہیں کی۔ تعلیم سے محروم یہ لوگ یونیورسٹی اور وہاں اپنے خونِ جگر سے علم کے پودوں کی آبیاری کرنے والے لوگوں کا احترام کرتے تھے۔ وہ جس سے بھی ملے اس کو اپنا مداح، ہمدرد اور ہم نوا پایا۔ ریستوران میں موجود ہر اُستاد نے اپنے مہمان کی گزارشات کو بصد احترام قبول کر لیا تھا اور یوں چھ لڑکوں کے نام ناکاموں کی فہرست سے نکال کر کامیابی کے خانے میں درج کر دیے گئے تھے۔ جس لڑکے پر ڈاکٹر نے ٹورے رضامند نہیں تھا اس کا معاملہ پروفیسر ایڈوینس اور صدر نے طے کر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے ٹورے دہشت سے آنکھیں پھاڑے، اپنے ہم عصر پروفیسروں کی کہانیاں سنتا رہا۔ اصل واقعات کے پہلو بہ پہلو وہ سسلی کی سرزمین پر جنم لینے والے بعض اندوہناک واقعات یا حادثوں کا بھی ذکر کر رہے تھے لیکن اپنے مہمانوں کی دل داری کر کے وہ سب ہی خوش تھے۔

"یہ نہیں ہو سکتا... کم از کم طبی پیشے میں یہ نہیں ہو سکتا۔" ان کی کہانیاں ختم ہونے پر ڈاکٹر نے ٹورے بھرائی ہوئی شکست خوردہ آواز میں بولا۔ "ایک نااہل ڈاکٹر بدترین قاتل ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم قاتلوں اور آوارہ گردوں کو یہ مقدس ڈگریاں نہیں بانٹ سکتے۔"

سب ہی اسے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ مسلسل اپنے پیشے کے تقدس کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔ آخر فلسفے کے ایک پروفیسر نے اسے پکڑ لیا۔ "طبی پیشہ کہاں سے مقدس ہو گیا؟ ڈاکٹر تو اسی کو نقصان پہنچاتا ہے جس کا وہ علاج کرتا ہے جبکہ گندے اور منفی رجحانات رکھنے والا ایک چالاک شخص اپنے افکار سے ہزاروں لوگوں کے ذہن بگاڑتا ہے وہ ان پر بھی... اثرانداز ہوتا ہے جنھوں نے کبھی اسے نہیں دیکھا ہوتا۔ افکار کی صحت اور سچائی اور رُوح کی پاکیزگی ہر علم سے زیادہ مقدس ہے۔"

وہاں ایک تلخ علمی بحث چھڑ گئی کیوں کہ ہر شخص اپنے شعبے کا مستند ماہر تھا۔ رات ڈھلتی چلی گئی اور آخرکار ڈاکٹر نے ٹورے نے پالرمو یونیورسٹی سے استعفا دے کر سسلی کی زمین سے بہت دُور، برازیل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے دوستوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ برازیل میں پتے کے امراض عام تھے اور وہ پتے کے آپریشنوں میں بہت جلد خطیر رقم کما سکتا تھا۔

رات گئے پروفیسر ہیکٹر ایڈوینس گھر آ کر بستر پر دراز ہوا تو فتح کے ایک بے نام احساس سے سرشار تھا۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے ایک طبی ماہر، اپنے دوست، ایک اُستاد اور اصول پرست شخص کی طبعی موت آنے تک اس کی زندگی بچا لی تھی۔ انھی خیالات کی رَو میں وہ گہری نیند سو گیا۔

فون کی تیز گھنٹی کی آواز مسلسل گونجتی رہی تو ایڈوینس نے جھلا کر اپنے سرہانے تپائی پر رکھا ہوا فون ٹٹول کر ریسیور اٹھایا اور پھر اس کے چہرے سے غصے کے سارے آثار معدوم ہو گئے۔ اس کی جگہ چہرے پر بدترین ناکامی کی سیاہی پھیلنے لگی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے ٹورے کو دعوت سے گھر واپس جاتے ہوئے ایک ویران مقام پر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے لاش ملنے کی خبر دیر سے موصول ہوئی تھی۔ پولیس سرگرمی کے ساتھ قاتل کو تلاش کر رہی تھی۔

اگلی صبح ڈاکٹر نے ٹورے کے جنازے کے ساتھ پورا شہر اُمڈ آیا تھا کیونکہ معزز ڈان کروسے اپنے مخصوص ماتمی لباس میں جنازے کے جلوس میں پیش پیش تھا۔ اس کے چہرے پر غم و اندوہ کے پہاڑ ٹوٹے پڑ رہے تھے اور وہ رومال سے یوں بار بار اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا جیسے آنسوؤں کو بہنے سے روکنا چاہ رہا ہو مگر ایڈوینس دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں، وہ ڈان تھا اور سسلی میں ڈان رویا نہیں کرتے، دوسروں کو رُلاتے ہیں۔

قاتل کو تلاش کرنے والوں کا سربراہ، سیکیورٹی چیف، انسپکٹر ڈیلارڈی کنورٹیبل شیورلے میں ڈان کے برابر میں موجود تھا۔



کرکٹ کے موسم میں کرکٹ کے ایک سنسنی خیز مقابلے کی دلچسپ روداد

وہ دونوں بہترین بالر تھے اور دونوں ایک ہی لڑکی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تھے۔ لڑکی نے شرط رکھ دی تھی کہ دونوں میں سے جو بھی بہترین بالر کا کپ جیتے گا وہی اس کا بھی حق دار ہوگا۔ مگر مقابلے کے دوران ایک بالر نے بے ایمانی کر لی

ایکشن ری پلے

علیم الحق

پرتھ کے میدان میں شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ اس نے اسکور بورڈ کی طرف دیکھا۔ پاکستان کا اسکور ۳۲۶ رنز ۹ کھلاڑی آؤٹ تھا اور اس کا اسکور ۱۰۶۔ کھیل کا وقت ختم ہونے والا تھا لیکن اب تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ پرتھ کی قاتل وکٹ پر پاکستان کی فتح اب صرف ۳ رنز دور تھی۔ خوش قسمتی سے اسے اگلی ہی گیند پر موقع مل گیا۔ اس نے بہت جلد دیکھ لیا تھا کہ گیند شارٹ پچ ہے اور مڈل آف سے باہر کی طرف سوئنگ ہوگی۔ وہ تیزی سے پچھلے پاؤں پر گیا اور بلے



اعتماد سے کور ڈرائیو کھیلا۔ اس کے ساتھ اس نے کریز چھوڑ دی اور رن بنانے کے لیے آتے ہوئے اپنے ساتھی کا ہاتھ تھام کر پویلین کی طرف بڑھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ شاٹ چوکا ہے۔ سارا اسٹیڈیم تالیوں سے گونج رہا تھا۔ پاکستانی جھنڈے لہرا رہے تھے کیونکہ پاکستانیوں کی خاصی تعداد میچ دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہ جھنڈے ہلا رہے تھے اور ایک ردھم میں خالد کمال، خالد کمال چیخ رہے تھے۔

وہ تماشائیوں کے نعروں کے جواب میں ہاتھ ہلاتا ہوا پویلین کی طرف بڑھتا رہا جہاں اس کے تمام ساتھی کھڑے تالیاں بجا رہے تھے۔ ایک اعصاب شکن اننگ کا خاتمہ۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کرتے ادا کرتے ہوئے سوچا۔ انھیں میچ جیتنے کے لیے ۳۳۹ رنز بنانا تھے اور پاکستان کا دوسری اننگز کا اب تک کا ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔ پھر پرتھ کی اس تیز ترین وکٹ پر پاکستان کی کارکردگی بھی اچھی نہیں رہی تھی۔ اوپنرز نے اچھا اسٹارٹ دیا تھا لیکن مڈل آرڈر میں اس کے سوا کوئی جم کر نہیں کھیل سکا تھا۔ یہاں تک کہ ۲۷۵ رنز پر ۹ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے اور ہر شخص کو یقین تھا کہ پاکستان میچ ہار جائے گا لیکن انھوں نے آخری وکٹ کی ناقابل شکست شراکت میں ۸۵ رنز بنا کر میچ جیت لیا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز فتح تھی لیکن اس کے لیے خالد کو ساڑھے چار گھنٹے تک بے پناہ ارتکاز کے ساتھ اعصاب کو توڑ دینے والی جنگ لڑنا پڑی تھی۔ دنیا کی تیز ترین وکٹ اور پھر آسٹریلیا کی بالنگ۔ سکون کا کوئی لمحہ بھی تو نہ تھا۔ خدا کا شکر کہ ہم سرخرو ہوئے۔ اس نے سوچا۔

توقع کے مطابق مین آف دی میچ وہی قرار پایا۔ دونوں اننگز میں اس نے سنچری بنائی تھی اور اس کی یہ میچ وننگ والی دوسری اننگ تو دیکھنے کی چیز تھی۔

اس کے ساتھی اس سے لپٹ گئے۔ یہ پرتھ میں پاکستان کی پہلی فتح تھی۔

اس میچ نے خالد کو فکر کا وہ لمحہ بھی دیا تھا جو آئندہ کئی دنوں پر محیط ہو گیا۔ اس میچ کی دوسری اننگ میں وہ ایک ہک کھیلنے گیا اور ایکشن کے دوران اس نے دیکھا کہ وہ شاٹ پہلے کھیل گیا ہے۔ وہ تو چونکہ اس نے گیند پر نظر رکھی تھی، اس لیے بچ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کوئی خاص بات نہیں۔ بالر نے بڑی ذہانت سے سلو باؤنسر کرایا تھا لیکن اس باؤنسر نے بہرحال اس پر سوچ کے نئے دروازے کھول دیے تھے۔

اب اسے ریٹائر ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا تھا۔ اس نے سوچا، میں کتنا بدنصیب ہوں کہ تیرہ سالہ ٹیسٹ کیریئر میں اپنے وطن کی سرزمین پر ایک میچ بھی نہ کھیل سکا۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس نے سولہ برس میں صرف وطن کے خواب ہی دیکھے تھے۔ وطن کی گلیاں کوچے، پارک کھیل کے میدان، وہ سب کچھ خواب ہو گیا تھا اور یہ سب کچھ کیوں ہوا، وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس نے دس سال ایک مسلسل حماقت میں گزار دیے ہیں۔ اس نے خود کو بہت اچھی طرح ٹٹولا۔ نہیں، وہ اپنے ضمیر کا مجرم نہیں، اس کا ضمیر مطمئن ہے پھر خواہ مخواہ اس نے خود پر خوشیوں کے دروازے بند کیے رکھے اور جلاوطنی کا عذاب سہتا رہا۔ یہ درست ہے کہ ثمینہ کو سمجھانا مشکل تھا لیکن کوشش تو بہرحال کی جا سکتی تھی۔ سچائی کا تو اپنا ایک لہجہ ہوتا ہے ایک اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ سچ کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ خیر اب بھی سہی اگرچہ بہت دیر ہو چکی ہے۔

اس لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس مرتبہ ویسٹ انڈیز کے خلاف ہوم سیریز کھیلنے وطن ضرور جائے گا اور وہیں اپنی زندگی کا آخری ٹیسٹ کھیلے گا۔ وہ ثمینہ کو حقیقت سے ضرور آگاہ کرے گا، وہ تسلیم کرے نہ کرے۔ محض ایک مردہ شخص کے بارے میں ناگوار حقائق کا اظہار کرنے سے بچنے کے لیے اس نے خود کو زندہ درگور کر لیا تھا۔ پھر ایک طرح سے یہ ثمینہ کے ساتھ بھی زیادتی تھی۔ یہ فیصلہ کر کے اسے روحانی سکون کا احساس ہوا لیکن دس سال کی دوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ممکنہ تبدیلیوں نے اسے خدشوں میں مبتلا کر دیا۔ جانے اسے کس چیز نے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے پاکستان کا تصور کر کے ذہن سے تمام خدشات کو جھٹک دیا لیکن اب بیتابی اسے مستقل طور پر پریشان کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اڑ کر وطن پہنچ جائے۔

چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی مہکتی بھاپ نے اسے پھر اداس کر دیا۔ اس اداسی کا سلسلہ بالآخر اس یادگار دن کے تصور سے جا ملتا تھا، جب اس مہکتی ہوئی بھاپ نے اسے آخری مرتبہ خوشی بخشی تھی۔ اس دن کے بعد چائے پینا اس کے لیے ایک اذیت ناک عمل بن کر رہ گیا تھا۔ چائے سے لبریز پیالی سے مہکتی ہوئی بھاپ کی بدلیاں اٹھتیں اور اس کا ذہن اداسی کی گہری دھند کی لپیٹ میں آ جاتا تھا۔ پھر یوں ہوتا کہ چائے رکھے رکھے سرد ہو جاتی اور وہ کئی دنوں تک اس دھند میں گھرا رہتا۔ یوں وہ چائے سے دور ہوتا گیا۔

❁

وہ ایک ایسا ہی یادگار دن تھا۔ جگہ بھی یہی تھی لیکن درمیان میں دس برس حائل تھے۔ دس طویل سال جو بالوں میں سفیدی چھوڑتے، خدوخال کی نرمی کو پامال کرتے اور آنکھوں میں معصومیت کی جگہ دکھ کی آگہی کی سختی چھوڑتے ہوئے گزر گئے تھے۔ دس برس ادھر کی وہ شام یادگار تھی کہ اس شام وہ تینوں آخری مرتبہ اکٹھا ہوئے تھے۔ اس روز ثمینہ نے مہکتی ہوئی چائے سے لبریز پیالیاں ان دونوں کے سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ سنایا تھا کہ وہ محبت جیسی کسی حماقت پر یقین نہیں رکھتی اور وہ شادی بھی اپنی پسند سے کرے گی۔ لہٰذا اگلے روز ہونے والا کرکٹ میچ ان کا مسئلہ حل کر دے گا۔ مسئلہ وہی روایتی قسم کا تھا۔ وہ دونوں بڑے غیر روایتی انداز میں ثمینہ سے محبت کرتے تھے اور ثمینہ محبت کی قائل نہیں تھی۔ رہی بات پسند کی تو

ایک وقت میں ایک سے زیادہ لوگوں کو پسند کرنا کچھ ایسی بُری بات بھی نہیں ۔

"تم دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو" اس لیے موازنہ ممکن نہیں۔" ثمینہ نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔ طارق تمھارا چچازاد ہے اور میں ماموں زاد۔" خالد نے مزاحیہ انداز میں آنکھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"خالد! اس وقت مذاق مت کرو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔" ثمینہ نے غصے سے کہا تھا۔

"مذاق تو خیر خالد نے بھی نہیں کیا لیکن تم بتاؤ کہ کیا کہنا چاہتی ہو؟" طارق نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تم دونوں میں ایک خصوصیت مشترک ہے۔ تم دونوں کرکٹ کھیلتے ہو اور دونوں ہی اچھے بالر بھی ہو۔ یہی وہ نقطہ ہے، جہاں تم دونوں کا موازنہ ممکن ہے۔"

"ٹھیک ہے، کل ویسے بھی گرین اور ریڈ خاندانوں کا ٹکراؤ ہے۔" اسے آج بھی اپنے لہجے کی شوخی یاد تھی۔

"تم دونوں میں سے جو بھی کل بہترین بالر کا کپ جیتے گا، میں اس کے حق میں فیصلہ دوں گی لیکن یہ شرط صرف ہم تینوں کے علم میں رہنی چاہیے۔" ثمینہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "اور یاد رکھنا، مجھے اسپورٹس مین شپ بہت اپیل کرتی ہے۔"

"خیر یہ خصوصیت تو ہم دونوں ہی میں بہت زیادہ ہے۔" اس نے ہنس کر کہا تھا اور طارق بھی مسکرا دیا تھا۔

خاندان گرین انیون اور خاندان ریڈ انیون کا لطیفہ بھی خوب تھا۔ ان کا خاندان بہت بڑا تھا اور کرکٹ ان کا خاندانی کھیل تھا۔ ان کے خاندان نے ملک کو کئی نامور کرکٹر دیے تھے۔ کرکٹ کا رجحان اتنا زیادہ تھا کہ ہمیشہ ان کے خاندان میں کرکٹ کھیلنے والے نوجوانوں کی تعداد بائیس سے زیادہ ہی رہی تھی۔ اس طرح مستقل طور پر دو خاندانی کرکٹ ٹیمیں تشکیل پا گئیں۔ کھلاڑی جاتے آتے رہے لیکن ٹیمیں قائم رہیں۔ ان ٹیموں میں کھیلنے والے آپس میں رشتے دار تھے۔ اس لیے بڑی ہم آہنگی تھی۔ خاندان کی ایک روایت ہر سال ۱۴ اگست کو دونوں ٹیموں کے درمیان ہونے والا نمائشی میچ بھی تھا۔

"کہاں کھو گئے ہو؟" دفعتاً ثمینہ نے اسے چونکا دیا۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی بدلیوں سے جھلکتا ہوا اس کا خواب خواب چہرہ دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ عمر اس کے چہرے سے پڑھی جانے لگی ہے۔ محض طارق کی وجہ سے۔ اسے طارق پر غصہ آ گیا لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا حال کر لیا ہے تم نے اپنا۔ لگتا ہے زندگی سے کٹ کر رہ گئی ہو؟"

"چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" ثمینہ نے اسے تنبیہ کی۔

"ہاں۔ آج تو میں چائے ضرور پیوں گا۔" اس نے پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا ویسے نہیں پیتے ہو؟"

"پی ہی نہیں جاتی۔"

"احساسِ جرم۔" ثمینہ نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں، ہرگز نہیں۔ لیکن تم نہیں سمجھ سکتیں اور میں تمھیں سمجھانا بھی نہیں چاہتا۔" اس نے شاکی نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"خیر! مجھے کیا؟" ثمینہ نے بے نیازی سے کہا اور اس لمحے وہ اسے وہی پرانی ثمینہ لگی۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

"سنو خالد! میں کٹی نہیں ہوں زندگی سے۔" ثمینہ نے بات کا رُخ بدلا۔ "تمھاری یادگار اننگز کے ویڈیو کیسٹ میرے پاس موجود ہیں۔ ہم انھیں وقتاً فوقتاً دیکھتے رہتے ہیں۔ ابو تمھاری بہت تعریف کرتے تھے۔"

"اور تمھارا کیا خیال ہے؟"

"عمدہ کوچنگ نے تمھیں واقعی اچھا بیٹسمین بنا دیا ہے۔"

"میں ویسے بھی اچھا بیٹسمین ہوں۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

"اور مجھے تمھاری اسپورٹس مین اسپرٹ نے بہت متاثر کیا ہے۔" ثمینہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ "تم ایمپائر کے فیصلے سے پہلے ہی کریز چھوڑ دیتے ہو۔ جانے والا جاتے جاتے تمھیں دو تحفے دے گیا، جنھوں نے تمھیں بلندی تک پہنچا دیا۔ ایک ہی دن میں تم نے کتنا کچھ سیکھ لیا تھا۔ اسپورٹس مین شپ اور....."

"سنو ثمینہ! میں ہمیشہ سے بہت اچھا اسپورٹس مین رہا ہوں۔" اس نے ثمینہ کی بات کاٹ دی۔ "تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔"

"زیادتی۔" ثمینہ کی ہنسی طنزیہ تھی۔ "کیا تم انکار کر سکتے ہو کہ تم نے ہُک کرنا اس کے آخری شاٹ سے سیکھا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ باؤنسرز سے ڈرتے تھے؟"

"مجھے اس سے انکار نہیں۔"

"میں سوچتی رہی۔ میں نے بہت سوچا اس بارے میں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کا محرک احساسِ جرم ہے۔ تم نے دنیا کے تیز ترین بالرز کو بلا جھجک ہُک کیا اور کبھی ہیلمٹ استعمال نہیں کیا۔ شاید اس امید پر کہ کبھی مس ٹائم ہو جائے۔ ممکن ہے شعوری طور پر تمھیں اس کا ادراک نہ ہو۔ ویسے تلافی کی یہی ایک صورت ہے نا؟"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ لیکن میں تمھیں سمجھاؤں گا نہیں۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ اب کیا کر رہے ہو؟"

"ٹیسٹ اور فرسٹ کلاس کرکٹ سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔"

"کیوں؟ ابھی سے؟"

"ہاں۔ میں یہ سننا نہیں چاہتا کہ خالد کمال فاسٹ بالرز سے ڈرنے لگا ہے۔ کہانی کا حسن بھی اجاگر ہوتا ہے جب وہ کلائمکس پر پہنچ کر ختم

ہو جائے۔"

"اچھا خیال ہے۔"

"تمھیں تو مایوسی ہوئی ہوگی کہ اب میرے لاشعور کو تلافی کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔" اس نے چوٹ کی اور وہ خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

"پھر اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

"تم یقین کرو گی کہ کرکٹ میری زندگی ہے۔ اس لیے اس سے جدائی تو ممکن نہیں۔ مجھے کینیڈا میں کوچنگ کے لیے معقول آفر ملی ہے۔ اسے قبول کر لوں گا۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم دس سال وطن سے دور کیوں رہے؟"

"میرا جی چاہتا تھا کہ وطن کی سرزمین پر بھی کھیلوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں حساس بھی ہوں۔ ایک ناکردہ جرم کی سزا کے طور پر میں نے دس برس جلاوطنی میں کاٹ دیے۔ اس عرصے میں میں نے کتنی اہم ہوم سیریز گنوا دیں۔ یوں میں نے اپنے کھیل کے ساتھ بھی ناانصافی کی اور دس برس خود کو پرائی آگ میں بھی جلایا۔"

"پھر تم نے واپس آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"تمھارا لہجہ ایسا ہے، جیسے تم میرا انٹرویو لے رہی ہو۔" اس نے ہنس کر کہا اور پھر یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ "میں اس لیے واپس آیا ہوں کہ میں نے جان لیا ہے، اسپورٹس مین اسپرٹ ضرورت سے زیادہ ہو تو نقصان پہنچاتی ہے۔ میں تاخیر سے سہی لیکن حقیقت سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔" اس نے ثمینہ کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھے اور مسکرانے لگا۔

"معاف کرنا ثمینہ! شاید یہ تمھارے سوال کا جواب نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے وطن میں کیریئر کا آغاز تو نہ کر سکا۔ سوچا اختتام کے لیے ہی اپنی خاک سے رجوع کر لوں۔"

"اوہ۔ تو تم یہاں ریٹائرمنٹ کا اعلان کرو گے؟"

"ہاں۔ پرسوں ویسٹ انڈیز کے خلاف پہلا ٹیسٹ شروع ہو رہا ہے۔ یہ میرا آخری ٹیسٹ ہوگا۔"

"تم بہت خوش قسمت ہو۔"

"شاید۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور، ضرور۔" ثمینہ نے اپنی بےقراری چھپاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ "لیکن میں چاہتی ہوں کہ پہلے ہم ایک یادگار میچ وی سی آر پر دیکھ لیں۔"

"تم سمجھتی ہو کہ میں....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "خیر یہ بھی سہی لیکن اس کے بعد تمھیں میری باتیں تحمل سے سننا ہوں گی۔"

"منظور۔" اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ کیسٹ کیبنٹ سے اس نے وہ ویڈیو کیسٹ نکالا جو وہ سیکڑوں مرتبہ دیکھ چکی تھی۔ کیسٹ لے کر وہ وی سی آر کی طرف بڑھ گئی۔

❋

حسبِ روایت وہاں بہت چہل پہل تھی۔ ویڈیو ریکارڈنگ والے اپنے انتظامات میں مصروف تھے۔ کھلاڑی آپس میں اس طرح گھلے ملے ہوئے تھے کہ پتا ہی نہ چلتا تھا، کون کس ٹیم سے متعلق ہے۔ ایک طرف لڑکیوں کا گروپ باؤنڈری روپ کے باہر کرسیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف خاندان کے بزرگوں کا گروہ تھا، جس میں اکثریت دونوں ٹیموں کے اولڈ بوائز کی تھی۔ وہیں ثمینہ کے ابو بھی عشرت خالو کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ دونوں آج کے میچ میں ایمپائر تھے۔ گراؤنڈمین پچ پر رولر گھما رہا تھا۔

ثمینہ نے ایک ساتھ کھڑے ہوئے خالد اور طارق کی طرف دیکھا ان دونوں میں مزاج کے اختلاف کے باوجود گاڑھی چھنتی تھی۔ انھیں دیکھ کر ثمینہ کو ایک مسرت آمیز سنسنی کا احساس ہوا۔ اس کے یہ دونوں کزن آج اسے جیتنے کے لیے مقابلہ کرنے والے تھے۔ اس مقابلے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ ثمینہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ وہ تھے بھی تو بہت مختلف۔ خالد اس کا ماموں زاد تھا۔ وہ بہت شوخ، ہنس مکھ اور زندہ دل تھا۔ وہ ہر چیز میں چھپی ہوئی مضحکہ خیزی تلاش کر لیتا تھا۔ اس کے مزاج میں جارحیت بہت زیادہ تھی لیکن وہ اسپن بالر تھا۔ اپنے مزاج کے برعکس اس کی بیٹنگ پر دفاع کا عنصر غالب رہتا تھا۔ طارق اس کا چچا زاد تھا۔ وہ بہت سنجیدہ، کم گو اور بردبار تھا۔ اس کی طبیعت میں بلا کی نزاکت اور حساسیت تھی۔ اسے قریب سے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اسے دراصل شاعر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ فاسٹ بالر تھا اور اس کی بیٹنگ جارحانہ ہوتی تھی۔ وہ گرین الیون کا کپتان بھی تھا۔

دونوں کی شخصیت کا یہ تضاد ثمینہ کے لیے بہت پُرکشش تھا۔ اسے کچھ صفات ایک کی پسند تھیں اور کچھ دوسرے کی۔ ان دونوں کی مشترکہ کشش نے اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج کر دی تھی اس لیے اس نے فیصلے کو آج کے میچ پر چھوڑ دیا تھا۔

دفعتاً ثمینہ کی نظریں شفیق اور امجد پر پڑیں۔ وہ دونوں کٹ میں نہیں تھے۔ ثمینہ ان کی طرف بڑھ گئی۔

"تم دونوں نہیں کھیل رہے ہو، آج؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں۔" امجد نے جواب دیا۔

"اور تم دونوں گرین الیون میں ہو نا؟" شفیق نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تب تو طارق کو بہت پریشانی ہوگی۔" ثمینہ نے کہا۔ "وہ دونوں بہترین آل راؤنڈر تھے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" شفیق نے کہا۔ "طارق بھائی سب ٹھیک کر لیں گے۔"

ثمینہ کو فخر کا سا احساس ہونے لگا۔

میچ شروع ہونے کا وقت قریب تھا۔ طارق اور سلیم ٹاس کرنے کے لیے بڑھ گئے۔ ٹاس کر کے واپس آئے تو دونوں بے حد سنجیدہ تھے۔

طارق تو شاید عادتاً سنجیدہ تھا لیکن سلیم کی سنجیدگی معنی خیز تھی۔ ثمینہ کا اندازہ درست نکلا۔ طارق نے ٹاس جیت لیا تھا۔

”سلیم بھائی! آپ لوگ بیٹنگ کیجیے!“ طارق نے کہا اور سلیم کے چہرے پر رونق آگئی۔ پھر طارق نے اشارے سے اپنے کھلاڑیوں کو اکٹھا ہونے کے لیے کہا۔ بارہ کھلاڑی قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ طارق نے اس قطار میں سے تنویر کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تنویر میچ میں بارھواں کھلاڑی ہے۔ تنویر بھی بہت اچھا آل راؤنڈر تھا۔

”میچ تو ہم اسی وقت جیت چکے ہیں۔“ قریب کھڑا سلیم کسی سے کہہ رہا تھا۔ ”گرین الیون میں سوائے طارق کے کچھ نہیں رکھا۔ اب تو ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ تمام کپ ہم اٹھائیں۔“

”مجھے تو دو باتوں پر حیرت ہے۔“ یہ اوصاف کی آواز تھی۔ ”ایک تو یہ کہ طارق نے تنویر کو بھی ڈراپ کر دیا اور دوسرے یہ کہ ٹاس جیت کر ہمیں بیٹنگ دے دی۔“

”میرا خیال ہے، آج وہ بہت مایوس ہے۔“ سلیم نے کہا۔ ثمینہ نے طارق کی طرف دیکھا۔ وہ خلافِ توقع بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی چمک تھی۔ حالانکہ اس کی ٹیم میں تین بہترین... آل راؤنڈر کی جگہ نوآموز کھلاڑی کھیل رہے تھے۔

※

طارق بالنگ شروع کرنے کے لیے قدم گن رہا تھا۔ یہ ایک سنسنی خیز میچ کا آغاز تھا۔ ایسا میچ جس کے نتیجے پر ایک بہت اہم فیصلے کا انحصار تھا۔ ثمینہ بہت زیادہ ہیجان اور سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنی دوربین لے کر مڈوکٹ باؤنڈری کے باہر جا بیٹھی۔ وہ اس میچ کو تنہا بیٹھ کر دیکھنے کی خواہشمند تھی۔

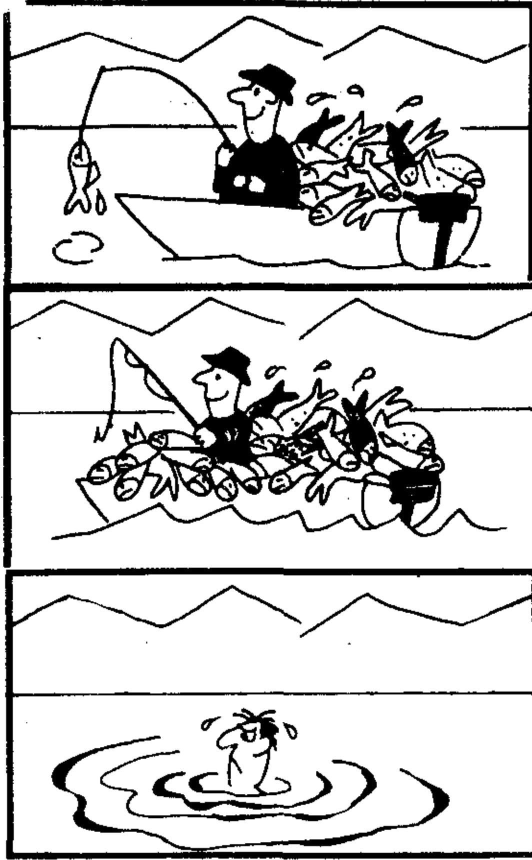
طارق بہت اعتماد سے بالنگ کر رہا تھا لیکن ثمینہ کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا کہ وہ دفاعی بالنگ پر مجبور ہے کیونکہ اس کا ساتھ دینے کے لیے کوئی اور بالر موجود نہیں۔ تین اچھے کھلاڑیوں کی غیر موجودگی نے ٹیم غیر متوازن کر دی تھی۔ ریڈ الیون کے کھلاڑی طارق کا اوور بہت محتاط ہو کر کھیلتے تھے اور دوسرے اوور میں اس کی تلافی کر لیتے تھے۔ رنز بننے کی رفتار کافی تیز تھی۔

”یہاں اکیلی بیٹھی ہوئی ہو؟“ اس نے نظریں اٹھائیں۔ خالد کھڑا تھا۔ پھر وہ اطمینان سے پاؤں پھیلا کر وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔

”لطف آرہا ہے اکیلے بیٹھ کر دیکھنے میں۔“ وہ بولی۔ ”ایک بات بتاؤ، طارق نے ٹاس جیت کر بیٹنگ کیوں نہیں کی؟“

”وہ خود کو بالنگ کا پورا موقع دینا چاہتا ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ بالنگ کا بوجھ تنہا اس کے کاندھوں پر ہے اور سچی بات یہ ہے کہ وہ حق ادا کر رہا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور پھر وہ دونوں خاموشی



سے میچ دیکھتے رہے۔ سولہ اوور میں ایک سو تین رنز بن چکے تھے اور چار وکٹیں گر گئی تھیں۔ ان میں تین وکٹیں طارق کی تھیں۔ خالد کا نمبر آنے والا تھا، اس لیے وہ پیڈ کرنے کے لیے اٹھ گیا۔ کھیل اسی رفتار سے چلتا رہا۔ بڑے اچھے شاٹس کھیلے جا رہے تھے۔ ہر شاٹ پر تالیاں بجتی تھیں اور کبھی کبھی خراب فیلڈنگ پر نوعمر لڑکوں کے کارنر سے ہوٹنگ بھی برستی تھی۔ انیسویں اوور میں پانچویں وکٹ گر گئی۔ یہ وکٹ بھی طارق کی تھی۔ اب خالد کھیل رہا تھا۔ بیس اوور کے بعد پانی کے وقفے پر اسکور ایک سو سینتیس رنز، پانچ کھلاڑی آؤٹ تھا۔

”ثمینہ! انجوائے کر رہی ہو؟“ طارق کوک کی دو بوتلیں لیے اس کی طرف چلا آیا تھا۔ ایک بوتل اس نے ثمینہ کی طرف بڑھا دی۔

”کیا صورتِ حال ہے؟“ ثمینہ نے پوچھا۔

”تمہارے سامنے ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کاندھے جھٹکے۔ ”میچ تو ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ دراصل مجھے اپنے دوسرے بالرز سے سپورٹ نہیں ملی۔“

”تم نے تنویر کو کیوں ڈراپ کر دیا؟“

”تنویر بہت اچھا کھلاڑی ہے لیکن شفیق اور امجد کے بغیر ہمیں ہارنا ہی تھا۔ میں تنویر کو شکست میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کھلاڑیوں کے لیے مورال بہت اہم ہوتا ہے۔ پھر اسی بہانے ان تینوں بچوں کو کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اگلے سال دیکھنا انھی بچوں کا کھیل۔“ اور وہ اس کی اسپورٹس مین اسپرٹ کی قائل ہو گئی۔ وہ شکست کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر رہا تھا۔

درحقیقت آج کا میچ اس کے لیے ایک اعصابی جنگ تھا۔ اس لمحے ثمینہ کو وہ بہت اچھا لگا۔

وقفے کے بعد طارق کا اوور تھا اور اس کے سامنے خالد تھا۔ طارق نے پہلی گیند پھینکی۔ گیند اس قدر اچانک اور تیزی سے اٹھی کہ خالد نے بمشکل اپنا سر ایک طرف جھکاتے ہوئے خود کو بچایا۔ وہ بچ تو گیا لیکن اس کا اعتماد اس گیند کے ساتھ ہی رخصت ہوگیا۔ وہ طارق کے پورے اوور میں ایک گیند بھی اپنے بلّے پر نہ لے سکا البتہ دوسرے اینڈ سے اشرف نے تین چوکے لگا کر رنز کی اوسط برقرار رکھی۔

طارق کا اگلا اوور بھی حسبِ سابق گزر گیا جبکہ شمیم کے اوور میں اشرف آؤٹ ہوگیا۔ اب پچیس اوورز میں اسکور ایک سو چون رنز تھا اور چھ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ ابھی چھ اوورز باقی تھے۔ چھبیسویں اوور میں طارق کی پہلی دو گیندوں پر خالد سنسنی بیٹ ہوا۔ طارق نے اپیل بھی کی لیکن ثمینہ کے ابو خاموش کھڑے رہے۔ خالد تیسری گیند بہت محتاط طریقے سے کھیلنے کے لیے نکلا لیکن گیند سوئنگ ہوئی اور اس کے بلّے اور پیڈ کے انتہائی معمولی گیپ میں سے گزرتی ہوئی وکٹ کیپر کے گلوز میں چلی گئی۔ اس بار طارق نے بہت زیادہ پُراعتماد اپیل کی فیلڈرز نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ خالد بے نیازی سے سر جھکائے بلّے سے وکٹ پر آئے ہوئے گھاس کے تنکے ہٹاتا رہا۔ پھر اس نے ثمینہ کے ابو کی اٹھی ہوئی انگلی دیکھی۔ اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ وہ وکٹ کیپر کی طرف مڑا اور اس نے اپنے پیڈ کو چھو کر کچھ بتایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کریز چھوڑ چکا تھا۔ یہ طارق کی پانچویں وکٹ تھی۔

"کیا تم آؤٹ نہیں تھے؟" ثمینہ نے خالد سے پوچھا۔

"آؤٹ تو نہیں تھا لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"لیکن آواز تو یہاں تک آئی تھی۔"

"گیند پیڈ سے چھو کر گئی تھی لیکن کوئی بات نہیں۔ یہ تو اس کھیل کا لازمی حصہ ہے۔"

ثمینہ کو بہت غصہ آیا۔ طارق کے برعکس اس شخص میں اسپورٹس مین اسپرٹ بالکل نہیں ہے۔ اس نے سوچا اور اس کا جی چاہا کہ طارق اس مقابلے میں جیت جائے۔

تیس اوورز پورے ہو چکے تھے۔ ریڈ الیون نے نو کھلاڑیوں کے آؤٹ ہونے پر دو سو چھ رنز بنائے تھے۔ گرین الیون کے لیے یہ بہت مشکل ہدف معلوم ہوتا تھا۔ طارق نے ستر رنز دے کر سات وکٹیں لی تھیں۔ وہ آٹھویں ممکنہ وکٹ حاصل نہیں کر سکا تھا اور ثمینہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس ناکامی پر خاصا جھنجلا گیا تھا۔ اب کھانے کا وقفہ تھا۔

کھانے کے وقفے کے بعد گرین الیون نے اپنی اننگ شروع کی۔ گرین الیون کے بیٹنگ آرڈر میں تینوں نئے کھلاڑی سب سے اوپر تھے۔ یقیناً یہ اعزاز انہیں اعتماد بخشے گا۔



ثمینہ نے سوچا۔ حسبِ روایت ریڈ الیون کے تیز بالرز نے بالنگ کا آغاز کیا اور انھیں ابتدا ہی میں کامیابی حاصل ہوئی۔ ابتدائی چھ اوورز میں تین کھلاڑیوں کو آؤٹ کر چکے تھے اور گرین الیون کے بیٹسمین بڑے دباؤ میں تھے۔ ان کا ہدف ویسے ہی دشوار تھا۔ اس پر یہ ابتدائی دھچکا قیامت ڈھا گیا۔ بہرحال بارہ اوورز تک وہ سنبھلنے میں کامیاب ہو گئے۔

البتہ رنز بننے کی رفتار بہت سست تھی اور ان کی یقینی شکست کی نشاندہی کر رہی تھی۔ اس اسٹیج پر سلیم نے خالد کو بالنگ کے لیے بلایا۔ اب خالد کے لیے فیلڈ ترتیب دی جا رہی تھی۔

ثمینہ نے حساب لگایا۔ خالد صرف اسی صورت میں جیت سکتا تھا، جب وہ تمام وکٹیں حاصل کرے اور یہ ایک دشوار امر تھا۔ ثمینہ کو ایک بے نام سی خوشی کا احساس ہوا۔

"تم کس نمبر پر بیٹنگ کرو گے؟" اس نے ساتھ بیٹھے ہوئے طارق سے پوچھا۔

"ہم تو دس نمبری ہیں آج۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور وہ دونوں پھر کھیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اگلے لمحات بڑے سنسنی خیز تھے۔ خالد نے اپنی پہلی دو گیندوں پر دو وکٹیں لے لی تھیں۔ طارق کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اسکور تیرھویں اوور میں پانچ وکٹوں کے نقصان پر اڑتالیس رنز تھا۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ خالد کو کھیلنا گرین الیون کے کھلاڑیوں کے لیے بہت مشکل ہے۔ دوسرے اینڈ سے اوصاف بڑی نپی تلی بالنگ کر رہا تھا۔ وہ فاسٹ بالر تھا۔ پھر اچانک اوصاف کی گیند پر پہلا کیچ چھوٹ گیا۔ کیچ اگرچہ دشوار تھا لیکن ہاتھوں میں آ کر نکلا تھا۔

"لعنت ہے۔" طارق غرّایا۔ "یہ فیئر پلے نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" ثمینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کیچ جان بوجھ کر چھوڑا گیا ہے۔"

"بدگمانی مت کرو۔ یہ اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔" طارق خاموش ہو گیا لیکن اوصاف کے اگلے اوور میں اشرف سے ایک آسان کیچ ڈراپ ہو گیا۔

"یہ زیادتی ہے میرے ساتھ۔" طارق اب غصے سے کانپ رہا تھا۔

"لیکن جان بوجھ کر کیچ چھوڑنے کا تو مطلب یہ ہے کہ خالد نے ہماری شرط کے بارے میں اپنی ٹیم کو بتا دیا۔" ثمینہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"کچھ بھی ممکن ہے۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔"

ثمینہ کو اس کی بات پر یقین آ گیا کیونکہ اگر یہ کیچ پکڑ لیا جاتا تو خالد ہار گیا تھا۔ اسے تو تمام وکٹیں لینا تھیں۔

دو کیچ ڈراپ ہونے کے باوجود پانی کے وقفے تک سات کھلاڑی آؤٹ ہونے پر صرف اٹھتر رنز بنے تھے۔ خالد کی چار وکٹیں ہو چکی تھیں اور گرین الیون میچ یقینی طور پر ہار گئی تھی۔ میچ اب یک طرفہ اور غیر دلچسپ ہو گیا تھا۔

"یہ تمھاری اسپورٹس مین اسپرٹ ہے؟" وقفے کے دوران ثمینہ نے خالد پر طنز کیا۔

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تم خوب جانتے ہو میرا مطلب۔ یہ کیچ اتفاقیہ طور پر نہیں چھوٹے ہیں۔"

"تمھارا مطلب ہے میں نے ان لوگوں سے درخواست کی تھی کہ وہ کیچ چھوڑ دیں؟" اس نے بڑے رسان سے کہا۔

"ہاں مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے۔"

خالد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "دیکھو ثمینہ! میں فیئر پلے کا قائل ہوں۔ تمھیں مجھ سے چھچھورے پن کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ میں ہارنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں، سمجھیں؟" اس نے برہمی سے کہا اور اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ کھول کر رہ گئی۔ خالد کی کوئی دلیل سامنے کی حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتی تھی۔

وقفے کے بعد خالد نے پہلے ہی اوور میں ندیم کو لو نڈ کر کے پانچویں وکٹ حاصل کر لی۔ اگلا بیٹسمین طارق تھا۔ اس نے جاتے ہی ایک رن بنایا لیکن خالد کے اسی اوور کی آخری گیند پر نواں کھلاڑی بھی آؤٹ ہو گیا۔ یوں خالد کی چھ وکٹیں ہو گئیں — یہ یک طرفہ اور پھسپھسا میچ کم از کم تین افراد کے لیے خاصا سنسنی خیز ہو گیا تھا۔ ثمینہ کا سوئمبر اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اب نو اوورز باقی تھے اور آخری کھلاڑی کھیل رہا تھا۔ اگر خالد یہ وکٹ حاصل کر لیتا تو وہ کم رنز دینے کی بنیاد پر بہترین بالر کا کپ جیت لیتا۔ اب تک کی چھ وکٹیں اس نے پانچ اوورز میں صرف نو رن دے کر حاصل کی تھیں۔

طارق نے آخری کھلاڑی کو کافی دیر تک کچھ سمجھایا۔ شاید وہ وکٹ بچانے کے لیے لائحۂ عمل ترتیب دے رہا تھا۔ پھر وہ بیٹنگ کریز پر پہنچ گیا۔ ثمینہ نے دیکھا، اس کے چہرے پر جوش، ہیجان اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ بہت مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ اوصاف کے اوور میں وہ بہت کھل کر کھیلا۔ اس نے تین چوکے بھی لگائے۔ کھیل میں پھر سے جان پڑتی دکھائی دینے لگی۔ اوصاف کے اوور کی آخری گیند پر جو ڈراما ہوا، اس نے تمام لوگوں کو ششدر کر دیا۔ طارق نے بڑی بیتابی سے اس گیند کو کھیلنا چاہا لیکن نہ کھیل سکا۔ پھر وہ پیچھے دیکھے بغیر رن بنانے کے لیے دوڑا۔ فہیم نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔ گیند وکٹ کیپر سلیم کے ہاتھ میں تھی اور فہیم ابھی کریز سے بہت دور تھا۔ یہ ایک یقینی رن آؤٹ تھا۔ لیکن سلیم نے گیند وکٹوں پر مارتے مارتے ہاتھ روک لیا۔ یوں ایک رن بن گیا۔

"یہ بھی خالد کو جتوانے کی کوششیں ہیں۔" ثمینہ نے جھنجلا کر سوچا۔ "واقعی یہ فیئر پلے نہیں ہے۔"

آخری گیند پر رن لے کر طارق، خالد کے سامنے آ گیا۔ خالد نے تمام فیلڈرز کو آگے لے لیا تھا لیکن طارق نہایت اعتماد سے کھیل رہا تھا۔ خالد کے اوور کی آخری گیند پر پھر اس نے ویسا ہی رن لیا لیکن انھیں رن آؤٹ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ ثمینہ کو طارق پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ وہ اکیلا ڈٹا ہوا تھا اور گیارہ کھلاڑی اس کے خلاف مصروفِ عمل تھے۔ اوصاف کے اگلے اوور میں اس نے پھر جارحانہ انداز اختیار کیا اور ایک چھکا بھی مارا۔ آخری گیند پر پھر اسی طرح رن لیا گیا۔ طارق نے فیلڈرز کی بے بسی بھانپ لی تھی۔ چوبیس اوورز ہو چکے تھے۔ گرین الیون کے ایک سو دو رنز تھے لیکن رنز کی اب کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اب یہ کھیل صرف تین افراد کے لیے دلچسپ تھا۔ ابھی چھ اوورز باقی تھے اور طارق کو وکٹ بچانا تھی۔ یوں وہ میچ ہار کر بھی فتحیاب ہو جاتا۔

پچیسواں اوور خالد نے پھینکا اور طارق نے بہت محتاط طریقے سے کھیلا۔ آخری گیند پر اس نے پھر ناممکن رن لینے کی حرکت دہرائی۔ فیلڈرز یقیناً بڑی بے بسی محسوس کر رہے تھے۔ ثمینہ باہر بیٹھے ہونے کے باوجود محسوس کر سکتی تھی کہ گراؤنڈ میں ماحول کس قدر کشیدہ ہے۔ طارق نے اوصاف کو پھر بے پروائی سے کھیلا اور پہلی تین گیندوں پر لگاتار چوکے لگائے۔ چوتھی گیند پر اس نے نہایت خراب شاٹ کھیلا۔ گیند اس کے بلّے کو چھوتی ہوئی وکٹ کیپر سلیم کے پاس گئی۔ بہت آسان کیچ تھا لیکن سلیم نے اس کو پکڑنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ثمینہ نے اتنے فاصلے کے باوجود طارق کے بدن میں غصے کی لرزش محسوس کر لی۔ اس نے کریز چھوڑی اور سلی مڈ آن پر کھڑے ہوئے خالد کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ لمحے ان دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ خالد کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور طارق کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ طارق نے اپنے بلّے کو زمین پر کئی مرتبہ مارا اور پھر بیٹنگ کریز کی طرف مڑ گیا۔ وہ بے حد غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ اوصاف اپنے اسٹارٹ پر کھڑا طارق کے تیار ہونے کا منتظر تھا۔ طارق نے کریز پر کھڑے ہو کر لیگ کی فیلڈ کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نظریں ثمینہ پر جم گئیں۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا، پھر اس تناؤ کو دور کرتی ہوئی اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔ وہ مڑا اور کھیلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ثمینہ کے اعصاب چٹخنے لگے۔ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ دوربین پکڑے ہوئے اس کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ اوصاف نے گیند کرائی، طارق بیک فٹ پر گیا، اس کے چہرے کا رخ لیگ ایمپائر کی جانب ہوا، اس نے بلّے کو تیزی سے پُل کرنے کے انداز میں گھمایا، پھر جیسے اس کا توازن بگڑا، سنبھلنے کی کوشش میں وہ کچھ اور پیچھے ہٹا، اس کی ایڑی وکٹوں سے لگی اور بیلز گر گئے۔ اسی لمحے اوصاف

کا پھینکا ہوا باؤنسر اس کی دائیں کنپٹی پر لگا اور وہ مُردہ چھپکلی کی طرح بیلز سے محروم وکٹوں پر گر گیا۔ ثمینہ کے ہاتھوں سے دوربین چھوٹ گئی۔ یک طرفہ میچ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ثمینہ کو کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

❊

خالد نے وی سی آر آف کر دیا تھا لیکن ثمینہ کی نظروں کے سامنے گزرے لمحے اب بھی رواں دواں تھے۔ اس دن کے بعد سے خالد سے اس کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ طارق کی تدفین کے بعد خالد جلد ہی انگلینڈ چلا گیا تھا۔ ماموں جان اور ممانی نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ وہ وہاں تعلیم حاصل کرتا رہا اور کاؤنٹی میں کھیلتا بھی رہا۔ تین سال بعد وہ پاکستانی قومی ٹیم میں بھی منتخب ہو گیا۔ اس نے دنیا کے تیز ترین بالرز کی پٹائی کر کے شہرت حاصل کی۔ وہ کبھی ہیلمٹ نہیں پہنتا تھا۔ اس کی ٹائمنگ اور ہکنگ کرکٹ کے ناقدین کی نظر میں غیر معمولی اور مثالی تھی۔ بیٹسمین کی حیثیت سے اس نے شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا تھا لیکن اس کی بالنگ پس منظر میں چلی گئی۔ اس نے خود بھی بالنگ میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ وہ مستقل کرکٹ کھیلتا رہا لیکن جب بھی اسے پاکستان میں ہونے والی کسی سیریز کے لیے مدعو کیا جاتا، وہ کسی نہ کسی بہانے معذرت کر لیتا تھا۔

ثمینہ یہاں تنہائی کا عذاب سہتی رہی۔ اس کے بہت سے رشتے آئے لیکن اس نے انکار کر دیا کیونکہ وہ اپنا عہد نبھانا چاہتی تھی۔ وہ عہد، جس کے مطابق کسی نے اسے جیت لیا تھا اور خود اپنی زندگی ہار گیا تھا۔ اب طارق کے آخری میچ کی ریکارڈنگ اس کی تنہائیوں کی رفیق تھی۔ اب تو اس میچ کا ایک ایک منظر جزئیات سمیت اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا، خصوصاً اس کا وہ آخری شاٹ۔ اس کے پاس طارق کے قاتل کی تمام یادگار اننگز کے کیسٹ بھی موجود تھے۔ وہ جب بھی اس کو بے پروائی سے دنیا کے تیز ترین بالرز کو ہک کرتے ہوئے دیکھتی اسے روحانی خوشی کا احساس ہوتا۔ یوں لگتا تھا جیسے قاتل ضمیر کی ملامت اور پشیمانیوں کے بوجھ تلے دبا، موت کی آرزو کر رہا ہو، بالکل ویسی ہی موت کی آرزو جیسی اس نے مقتول کو نصیب ہوئی تھی۔

"کہاں کھو گئیں تم؟" خالد نے اسے ٹوکا۔

وہ بُری طرح چونک گئی "اس قتل کا منظر سلو موشن میں دیکھو گے؟" اس نے بڑی نفرت سے پوچھا۔

"جو کچھ دکھانا چاہو، دکھا دو اور جو کچھ کہنا ہو کہہ لو کیونکہ پھر تمھیں مداخلت کیے بغیر صرف سننا ہوگا۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"وہ جان بوجھ کر آؤٹ ہوا تھا نا؟"

"ہاں، اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔"

"اور اس کی وجہ وہ نفسیاتی دباؤ تھا، جو تم نے اس پر ڈالا تھا۔"

"تمھارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ تم نے اس کھیل کی روح کو سمجھے بغیر یک طرفہ فیصلہ کر لیا اور اس پر راسخ ہو گئیں۔ کبھی تم نے اس نفسیاتی دباؤ کا تصور بھی کیا، جو اس نے مجھ پر ڈالا تھا۔ اس پر میرا ڈالا ہوا کوئی نفسیاتی دباؤ نہیں تھا بلکہ میں نے اس کی چال اسی کو لوٹا دی تھی۔"

"ایک بات بتاؤ۔ اس نے آخری شاٹ کھیلنے سے پہلے تم سے کیا بات کی تھی؟"

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اوصاف کی گیند پر سلیم نے جو کیچ چھوڑا ہے، وہ فیئر پلے کے خلاف ہے۔ میں نے جواب دیا تھا کہ میں نے سلیم سے کیچ چھوڑنے کو نہیں کہا... اور وہ جس فیئر پلے کی بات کر رہا ہے اس کی تو وہ خود کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی دھجیاں اڑا چکا ہے۔ پھر بیٹنگ کے دوران اس نے جس طرح ہماری پوری ٹیم کو بلیک میل کیا ہے، اس کے بعد یہ شکایت اس کے منہ سے کچھ اچھی نہیں لگتی۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ یونہی آخری گیند پر رن لیتا ہے، میں اسے شکار کر لوں گا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اب ہمارے درمیان اعصابی جنگ ہو رہی ہے اور میرے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔ تم نے دیکھا کہ میری بات درست ثابت ہوئی۔ وہ بہت بودا ثابت ہوا۔"

"اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ تم نے اس پر نفسیاتی دباؤ نہیں ڈالا تھا، قاتل!"

"سنو ثمینہ!" اس کا لہجہ بہت گمبھیر تھا "آئندہ اس وقت تک مجھے اس طرح مت پکارنا، جب تک میری پوری بات نہ سن لو۔"

"تمھیں قاتل کہہ کر پکارنے کے لیے میں سب کچھ سن سکتی ہوں، سناؤ، کیا سنانا چاہتے ہو مجھے؟"

"تو سنو اور دیکھو، بیچ میں مت ٹوکنا۔" اس نے سختی سے کہا "میں جو کچھ کہنے والا ہوں اس کے لیے میں اللہ کے اور اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوں۔ میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی جلاوطنی کی سزا کاٹتا رہا ہوں کیونکہ میں اپنے مرحوم دوست اور بھائی کی برائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں بھی انسان ہوں۔ آج میں کم از کم تم پر حقیقت ضرور آشکارا کروں گا۔" وہ رُکا اس نے گہری سانس لی "میرا دوست طارق بہت اچھا منصوبہ ساز تھا۔ اس نے ہر چیز کا خیال رکھتے ہوئے پلاننگ کی تھی۔ اس نے اپنے دو بہترین آل راؤنڈرز کو اس میچ میں اَن فِٹ ہونے کے بہانے باہر بیٹھنے پر رضامند کر لیا تھا۔ وہ دونوں اس کے بہت اچھے دوست بھی تھے۔ تیسرے کو اس نے خود ڈراپ کر دیا۔ معلوم نہیں اس کے پاس اس بات کا کیا جواز تھا؟"

ثمینہ کے کانوں میں طارق کا بیان کردہ جواز گونج گیا اور وہ سُن ہو کر رہ گئی۔

"ویسے وہ بہت اچھا ماسک پینٹر تھا۔" خالد نے اپنی بات جاری رکھی "وہ اس بات کے بھی ایسے سیکڑوں جواز سوچ سکتا تھا جو اُلٹا اُسی کی اسپورٹس مین شپ کو اجاگر کر دیں۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ وہ

بہت ذہین تھا۔ اس نے ان تین کھلاڑیوں کی عدم موجودگی سے دو فائدے اٹھائے۔ ایک تو یہ کہ وہ واحد اچھا بالر رہ گیا لہٰذا زیادہ وکٹیں لے سکتا تھا۔ پھر اس نے نئے کھلاڑیوں سے اوپننگ کرائی تاکہ ان کی وکٹیں ہمارے فاسٹ بالرز کو مل جائیں اور ہوا بھی یہی۔ اب تم سوچو کہ اس نے مجھ پر کتنا شدید نفسیاتی دباؤ ڈالا۔ جب مجھے بالنگ ملی تو مجھے باقی ماندہ تمام وکٹیں لینا تھیں اور یہ کوئی مذاق نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے کھیل کی اسپرٹ مجروح نہیں ہونے دی۔ میں فیئر پلے کا قائل تھا اور اب بھی ہوں .... ورنہ میں سلیم سے کہتا تو وہ بالنگ کا آغاز مجھ سے بھی کرا سکتا تھا۔ ہمارا اسکور کم تو نہیں تھا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے اپنے اعصاب کو چٹخنے نہیں دیا اور نیک نیتی سے محنت کی اور مجھے اس کا پھل بھی ملا۔ پھر جب میں چھ وکٹیں لے چکا تو اس نے بلیک میلنگ شروع کر دی۔ حیران نہ ہو، یہ بات تم کیسے سمجھ سکتی تھیں۔ وہ کرکٹر تھا' ذہین بھی تھا اور موقع شناس بھی۔ تم نے دیکھا کہ اس نے ہر اوور کی آخری گیند پر کیسے کیسے احمقانہ رن بنائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ہم اسے رن آؤٹ نہیں کر سکتے کیونکہ اس صورت میں بہترین بالنگ کا جیتا ہوا کپ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا۔ رن آؤٹ نہیں کرتے تو نئے اوور کے آغاز پر وہ بیٹنگ کریز پر موجود ہوتا۔" وہ کچھ لمحے چپ چاپ ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ "تم نہیں سمجھیں ثمینہ! جیتنے والی ٹیم کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ تمام کپ جیت کر مخالف ٹیم کو آؤٹ کلاس کر دے۔" یکلخت ثمینہ کو یاد آگیا کہ اس دن میچ سے پہلے سلیم نے اوصاف سے یہی کہا تھا۔

"طارق کی کھلی بلیک میلنگ نے ہماری ٹیم میں یہ روح پھونک دی کہ میچ تو ہم بہر حال جیت جائیں گے، لہٰذا بالنگ کپ کے لیے آخری وقت تک فائٹ کی جائے اسی جذبے کے تحت سلیم نے اوصاف کی گیند پر اس کا کیچ لینے کی کوشش نہیں کی۔ بخدا میں نے تو اس سلسلے میں کسی سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ تم سے وعدہ جو کیا تھا۔ وہ تو کرکٹ میں خود بخود ہو جانے والی باتوں میں سے ایک تھی۔ اب تم یہ سوچو گی کہ وہ اتنا اچھا کھیل رہا تھا تو اس طریقے سے آؤٹ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ تو بات یہ ہے کہ وہ جارحانہ بیٹنگ کا عادی تھا اور زیادہ دیر تک کبھی نہیں ٹکتا تھا۔ کیونکہ وہ مجھے وکٹ نہیں دینا چاہتا تھا' اس لیے وہ میرے خلاف خصوصی دباؤ میں بھی تھا اور دفاع پر بھی مجبور رہتا۔ یہ بات اس کے اعصاب پر بوجھ تھی۔ میرے دو اوور ابھی باقی تھے اور اسے یقین تھا کہ وہ میرے خلاف غلطی ضرور کرے گا۔ اسی لیے اس نے راہِ فرار اختیار کی اور اسی میں جان گنوا دی۔"

"لیکن وہ تو بہت اچھا ہک کرنے والا تھا۔" ثمینہ نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

"ہاں لیکن اس بے ہودہ شاٹ کی دو وجوہ تھیں۔ ایک اس کی خود نمائی تھی۔ وہ وکٹ پر ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کسی بالر کو اسے آؤٹ کرنے کا کریڈٹ ملے۔ اس لیے وہ بیک فٹ پر گیا، اسٹروک کھیلنے کے ایکشن میں آیا' لڑکھڑایا اور بیلز گرا دیے۔ یہ سارا عمل ایسا بے ساختہ تھا کہ ہر شخص نے یہی سمجھا کہ ایسا اتفاقاً ہوا ہے لیکن وہ زندہ ہوتا تو اس شاٹ کو سلو موشن میں دکھاتا اور تم سے کہتا کہ دیکھو' میں جان بوجھ کر آؤٹ ہوا تھا۔ لیکن اس سے ایک غلطی سرزد ہو گئی اور اس غلطی کا سبب یہ تھا کہ اسے مجھ سے باتیں کر کے غصہ آگیا تھا۔ کرکٹ میں غصہ بہت مہلک ثابت ہوتا ہے، خاص طور پر فاسٹ بالرز کے سامنے۔ وہ شدید غصے میں گیند پر نظر نہ رکھ سکا۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ اوصاف نے باؤنسر پھینکا ہے ورنہ وہ آسانی سے گیند کی لائن سے ہٹ جاتا۔ درحقیقت اس کے غصے نے اس کی جان لے لی حالانکہ اسے غصہ کم ہی آتا تھا۔" وہ کچھ لمحے خاموشی سے ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"اب بولو کیا کہتی ہو؟"

"میں ... میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" اس نے بے لبسی سے کہا۔

"اور سنو، حقیقت یہ ہے کہ اس میچ کا بہترین بالر میں تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"مجھے اس کی گیند پر غلط آؤٹ دیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے میں اس سے جیت گیا تھا اور اس وقت سے میں اس انعام کا منتظر

ہوں جو میرا حق ہے۔"

"اتنا میں بھی جانتی ہوں کہ ایمپائر غلط فیصلہ کر جائیں، تب بھی اسے واپس نہیں لیتے۔"

"ہاں۔ یہ درست ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "اور میں بحیثیت ایک کھلاڑی، احتجاج کرنا پسند بھی نہیں کرتا لیکن اگر فیصلہ زندگی اور موت کا ہو تو اس پر کرکٹ کے قوانین کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال اگر تمھارے فیصلے میں ترمیم کی گنجائش ہو تو مجھے پکار لینا۔ میں نے بھی تمھاری طرح دس برس ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگتی ہے اور سنو، اگر میری کسی بات سے تمھیں تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دینا لیکن میں اس بُت شکنی پر نادم ہرگز نہیں ہوں۔"

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"آج میں لاہور جا رہا ہوں۔ پرسوں سے میرے کیریئر کا آخری ٹیسٹ شروع ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ، میری کارکردگی یادگار ہوگی۔ اور ہاں قتل کا وہ منظر تم نے بارہا دیکھا ہے لیکن اس کی خامیوں کا تمھیں اندازہ نہیں۔ میں تمھیں پرفیکٹ ایکشن دکھاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

وہ بُت بنی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دس برس سے وہ جس شیش محل میں رہ رہی تھی، وہ بارش کی پھوار سے چکنا چور ہو گیا ہے۔



اسے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ طویل عرصے سے ذہن پر چھایا ہوا فریب، ایمان کی طرح اہم ہو جاتا ہے۔ اس نے اس میچ کی ریکارڈنگ کو کئی مرتبہ غور سے دیکھا لیکن خالد کی کہی ہوئی کوئی بات غلط ثابت نہ ہو سکی بلکہ اس کی ہر بات کی تائید ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ دس برس تک اس نے ایک فریب کو ایمان کی طرح پالا ہے۔ طویل فریب کے بعد حقیقت کو تسلیم کرنا بہت دشوار عمل ثابت ہوا۔ وہ اس معاملے کو جُوں کا تُوں چھوڑ دیتی لیکن خالد کی بات اسے یاد آجاتی اور قائل بھی کر جاتی کہ اگر فیصلہ زندگی اور موت کا ہو تو اس پر کرکٹ کے قوانین کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے۔ بالآخر اس نے تسلیم کر لیا کہ اس نے یک طرفہ طور پر غلط فیصلہ کیا تھا اور اس پر واجب ہے کہ اب نہ صرف اسے درست کرے بلکہ شرمندگی کا اظہار اور غلطی کی عملی تلافی بھی کرے۔ یہ فیصلہ کر کے رات وہ بہت سکون سے سوئی۔

صبح ناشتہ کرتے ہوئے اخبار کی سرخی نے اسے چونکا دیا۔ اسے احساس ہوا کہ باطن میں ہونے والی جنگ نے دو دن تک اسے زندگی سے دور کر دیا تھا۔ اس کی نظریں اخبار پر جم گئیں۔

"لاہور۔ ۹ ستمبر۔ نامور اسٹار بیٹسمین خالد کمال نے آج پہلے ٹیسٹ کے پہلے دن پاکستانی ٹیم کو نہ صرف تباہی سے بچا لیا بلکہ اس کی پوزیشن بھی مضبوط بنا دی۔ پاکستان کے ابتدائی بیٹسمین ویسٹ انڈیز کے تیز بالروں کے سامنے سپر ڈال چکے تھے اور ایک مرحلے پر صرف تیرہ رنز پر چار وکٹیں گر چکی تھیں۔ ویسٹ انڈیز کی تیز بالنگ کا طلسم، خالد کمال کی جارحانہ بیٹنگ نے توڑ دیا۔ ان کی بیٹنگ کی کلاس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کھیل ختم ہونے پر ان کا انفرادی اسکور ۲۸ چوکوں اور ۴ چھکوں کی مدد سے ۱۹۸ رنز تھا اور پاکستان نے چھ وکٹوں کے نقصان پر ۳۶۲ رنز بنائے تھے۔

۳۵ سالہ خالد کمال کی وطن کی سرزمین پر یہ پہلی اننگ ہے جو آخری بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے میچ شروع ہونے سے قبل ہی اعلان کر دیا تھا کہ اس ٹیسٹ کے بعد وہ عملی کرکٹ سے ریٹائر ہو جائیں گے۔ آج کی خوبصورت اننگ ان کے کیریئر کی بہترین اننگ ہے۔ انھوں نے اپنے خوبصورت کور ڈرائیو، اسکوائر کٹ اور ہکس سے تماشائیوں کے دل موہ لیے۔ ان پر کسی بھی لمحے کسی بھی بالر کا دباؤ نہیں تھا۔ توقع ہے کہ وہ بآسانی ڈبل سنچری مکمل کر لیں گے۔"

اخبار نے خالد کی متعدد تصاویر بھی شائع کی تھیں۔ ثمینہ کو محرومی کا احساس ہوا۔ کاش اس نے یہ اننگ دیکھی ہوتی۔ "خیر، کوئی بات نہیں۔ میں وی سی آر پر دیکھ لوں گی۔" اس نے خود کو تسلی دی۔ پھر اسے خالد کی آخری بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ تمھارے فیصلے میں ترمیم کی گنجائش ہو تو مجھے پکار لینا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ میچ شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ "لنچ کے وقفے میں کسی طرح قذافی اسٹیڈیم میں اس سے رابطہ قائم کروں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

"امّی، ٹی وی پر خالد کا میچ آ رہا ہے۔ نہیں دیکھیں گی؟" وہ اس وقت بچّوں کی طرح ایکسائٹڈ تھی۔

"اس کا میچ تو کل بھی آیا تھا۔"

"کل مجھے یاد ہی نہیں رہا۔"

"تم بھی سنکی ہو۔" امّی بھنّا کر بولیں۔ "وہ آیا تھا تو منہ پُھلائے بیٹھی رہیں۔ کل وہ اتنا اچھا کھیلا اور تم اپنے کمرے میں بند رہیں۔ آج تمھیں اس کے میچ کا خیال آگیا اچانک۔"

"چھوڑیے امّی ان باتوں کو۔ وقت ہو گیا ہے۔ آیئے نا۔" اس نے ضد کی۔

"میں تو خیر دیکھوں گی ہی۔ کل بھی دیکھا تھا میں نے۔ تم چلو، میں آتی ہوں۔"

وہ اٹھی اور ٹیلیویژن والے کمرے کی طرف چل دی۔ آج وہ خود کو دس برس پہلے کی ثمینہ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ٹی وی آن کیا۔ فیلڈرز اور ایمپائرز میدان میں پہنچ چکے تھے اور پھر پاکستانی بیٹسمین نمودار ہوئے۔

اس کے سر پر پاکستانی گرین کیپ تھی۔ اسے دیکھ کر ثمینہ کو پہلی مرتبہ فخر کا احساس ہوا۔

خالد نے پہلی چار گیندیں بڑے سکون سے کھیلیں۔ پانچویں گیند باؤنسر تھی۔ وہ بہت تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے پوزیشن لی اور نہایت اعتماد اور سکون سے خوبصورت ہک کیا۔ شاٹ بہت اونچا ہونے کے باوجود باؤنڈری کے باہر گرا اور ایمپائر نے چھکے کا اشارہ دیا۔ خالد کی ڈبل سنچری ہوگئی تھی۔ تماشائی میدان میں گھس آئے۔ وہ اسے گلے سے لگا رہے تھے۔ ایک لڑکے نے اس کے گلے میں ہار لا کر ڈال دیا اور دوسرے لڑکے نے اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ مسکراتا ہوا سب سے ہاتھ ملاتا رہا۔ بالآخر پولیس نے تماشائیوں کو باہر نکالا۔ خالد نے ہار گلے سے اتار کر ایمپائر کو دیا اور کھیل دوبارہ شروع ہوگیا۔

اوور کی آخری گیند پر خالد نے رن بنایا۔ اب نئے اوور کا سامنا بھی اسی کو کرنا تھا۔

خالد نے چاروں طرف دیکھا، فیلڈ کا جائزہ لیا... پھر اس کا رخ کیمرے کی جانب ہوگیا۔ وہ کچھ لمحے یونہی کھڑا رہا۔ اسکرین پر اس کا کلوزاپ نظر آرہا تھا۔ یہ پورا منظر جانا پہچانا سا تھا بلکہ کسی منظر کاری پہلے معلوم ہو رہا تھا۔ ثمینہ کانپ کر رہ گئی۔ خالد کی آنکھوں میں ایک واضح چیلنج تھا۔ صرف وہی اس چیلنج کا مفہوم سمجھ سکتی تھی کیونکہ یہ صرف اس کے لیے تھا۔

"قتل کے اس منظر کی خامیوں کا تمہیں اندازہ نہیں۔ میں تمہیں پرفیکٹ ایکشن دکھاؤں گا۔ شاید اسی طرح تم اس منظر کو بھول سکو۔"

وہ لرز کر رہ گئی۔ "نہیں کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

اب وہ کھیلنے کے لیے تیار تھا۔ بالر اسٹارٹ لے چکا تھا۔ وہ وکٹ پر آیا، اس نے گیند پھینکی اور یہ توقع کے عین مطابق باؤنسر تھا۔ خالد تیزی سے بیک فٹ پر گیا۔ اب اس کا جسم اور بلا ہک کی پوزیشن میں آرہا تھا کہ دفعتاً عدم توازن کی وجہ سے اس کی ایڑی وکٹ سے ٹکرائی۔ یہ وہی پرانا منظر تھا نہیں... یہ ایکشن ری پلے تھا، شاید۔

"نہیں...!" وہ زور سے چیخی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ اس کا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ہاتھ ہٹائے اور ٹی وی کی طرف دیکھا۔ اب ایکشن ری پلے دکھایا جا رہا تھا۔ یہ وہی منظر تھا، بارہا دیکھا ہوا منظر۔ وہی پیچھے کی طرف دھیرے دھیرے ہٹتا ہوا پاؤں اور بکھرتے ہوئے بیلز... وہی منظر تھا۔ بس اداکار تبدیل ہوگیا تھا اور اس مرتبہ اداکاری اور حقیقت کے درمیان ایک بال کا فاصلہ بھی نہیں تھا۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی اس میں تاب نہیں تھی۔ دفعتاً اس کے وجود میں جیسے روشنیوں کا تیز جھماکا سا ہوا اور پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اس کے وجود کی ہر روشنی بجھ چکی تھی۔ صرف ٹی وی کا اسکرین روشن رہ گیا تھا۔

اس نے گلوز اتارے اور ایمپائر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ایمپائر سے وہ ہار بڑے احترام سے واپس لیا اور اسے بلّے کے ساتھ سینے سے لگا لیا۔ یہ ہار وطن میں اس کے لیے پہلا اظہارِ محبت تھا، ایک اجنبی نوجوان کا پُرخلوص اور بے لوث اظہارِ محبت۔ محبت کے ان پھولوں کی خوشبو سے اس کا سارا وجود مہک رہا تھا۔ اب وہ تالیوں کی گونج میں وکٹ اور ڈریسنگ روم کا درمیانی فاصلہ طے کر رہا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، آنکھیں خوشی سے نم تھیں اور جسم کا رواں رواں شکر گزاری کے احساس سے شل ہو رہا تھا۔ پریس والوں نے ڈریسنگ روم تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے آلیا۔

"آپ بہت اچھا کھیلے۔" ایک صحافی نے کہا۔

"اللہ کا کرم ہے۔"

"لیکن آپ گندا شاٹ کھیلتے ہوئے آؤٹ ہوئے ہیں۔" دوسرے صحافی نے اعتراض کیا۔

"درست کہتے ہیں آپ۔ میرے بھائی! یہ ایک اعصاب شکن اننگ تھی اور خدا گواہ کہ اس شاٹ سے پہلے میں نے ہر شاٹ اپنی ٹیم کے لیے کھیلا تھا۔ اس کے بعد مجھے کم از کم ایک شاٹ اپنے لیے کھیلنے کا بھی حق تھا۔" اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

"اس کے باوجود وہ ایک خراب شاٹ تھا۔" صحافی نے اصرار کیا۔

"اس کے باوجود بھی گیند، اسٹیڈیم کی آخری سیڑھی پر گرنے کے بعد اسٹیڈیم سے باہر جا گری۔" خالد نے بڑی خوش دلی سے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا اور معترض صحافی کھسیا کر رہ گیا۔

"اور آپ کا ریٹائرمنٹ...؟" ایک اور صحافی نے کہنا چاہا لیکن اس نے گلوز والا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ "باقی آئندہ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

تمام ساتھیوں سے مبارک باد وصول کرنے کے بعد وہ آرام سے پاؤں پھیلا کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پھولوں کا وہ ہار اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

"میرا یہ شاٹ یقیناً مؤثر ثابت ہوا ہوگا۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "آج حقیقت اس پر پوری طرح عیاں ہوگئی ہوگی اور اب ہماری زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ اور میں کینیڈا والی آفر ٹھکرا دوں گا۔ میں یہیں کوچنگ کروں گا، اپنے وطن میں۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ وطن ہوتے ہوئے بے وطن ہونا کتنی بڑی لعنت ہے۔" سوچتے سوچتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے تصور میں ثمینہ کا چہرہ لہرانے لگا۔ اس چہرے کے پس منظر میں بہت سے خوبصورت خواب تھے، متحرک اور سچے خواب!



کٹھ پُتلیاں

علیم الحق حقی

سیاست کی بساط پر ناچنے والی چند کٹھ پُتلیوں کی رُوداد
سیاسی شعبدہ گروں کا ایک تماشائے ستم ایجاد

سیاست آج جس طرح رُسوا سرِ بازار ہے، اسے دیکھتے ہوئے کسی شاعر کا یہ مصرع بڑا برمحل معلوم ہوتا ہے ۔ گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں۔ زیرِ نظر کہانی کوچۂ سیاست کی ایسی ہی کٹھ پُتلیوں کے گرد گھومتی ہے جو سب کی سب ایک ہی ڈور میں بندھی کسی ایک ہاتھ کے اشارے پر رقص کر رہی تھیں کہ اچانک ڈور ٹوٹ گئی اور پُتلی تماشا بند ہو گیا لیکن ایک نئے تماشے کا آغاز بھی اس اختتام سے منسلک تھا جس میں نئی اور پُرانی پُتلیاں ایک نئے انداز میں مختلف دُھنوں پر متحرک ہو رہی تھیں۔
سیاست اور سیاست گروں کے حوالے سے لکھی جانے والی اس داستان کا ہرچند کہ ہمارے مُلک سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر سیاسی انارکی کے اس دَور میں جب کوئی بھی حکومت اپنی میعاد پوری نہ کر پائے اور جمہوریت کا خواب ہر مرتبہ اپنی تعبیر سے محروم ہی رہے تو ایسی کہانیاں بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

ایک ایسی تحریر جس کا مطالعہ نئے انتخابات سے پہلے یقیناً دلچسپ ثابت ہوگا

ایوانِ صدر میں اپنی میز کے پیچھے بیٹھا صدر محمود شامی کوئی سخت مزاج ہیڈ ماسٹر معلوم ہو رہا تھا۔ گزشتہ ماہ شروع ہونے والے سیاسی بحران نے اس کی صحت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے پڑ گئے تھے لیکن اس کی آنکھوں میں وجود کے اندر دہکنے والی آگ کے شعلوں کا عکس مچل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اپنی بارُعب شخصیت اور اپنے عہدے کے دبدبے کے باوجود احساسِ شکست نے اس کا یہ حشر کر دیا تھا کہ لگتا تھا، کسی بھی لمحے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر بڑی تیزی سے قابو پا لیا۔

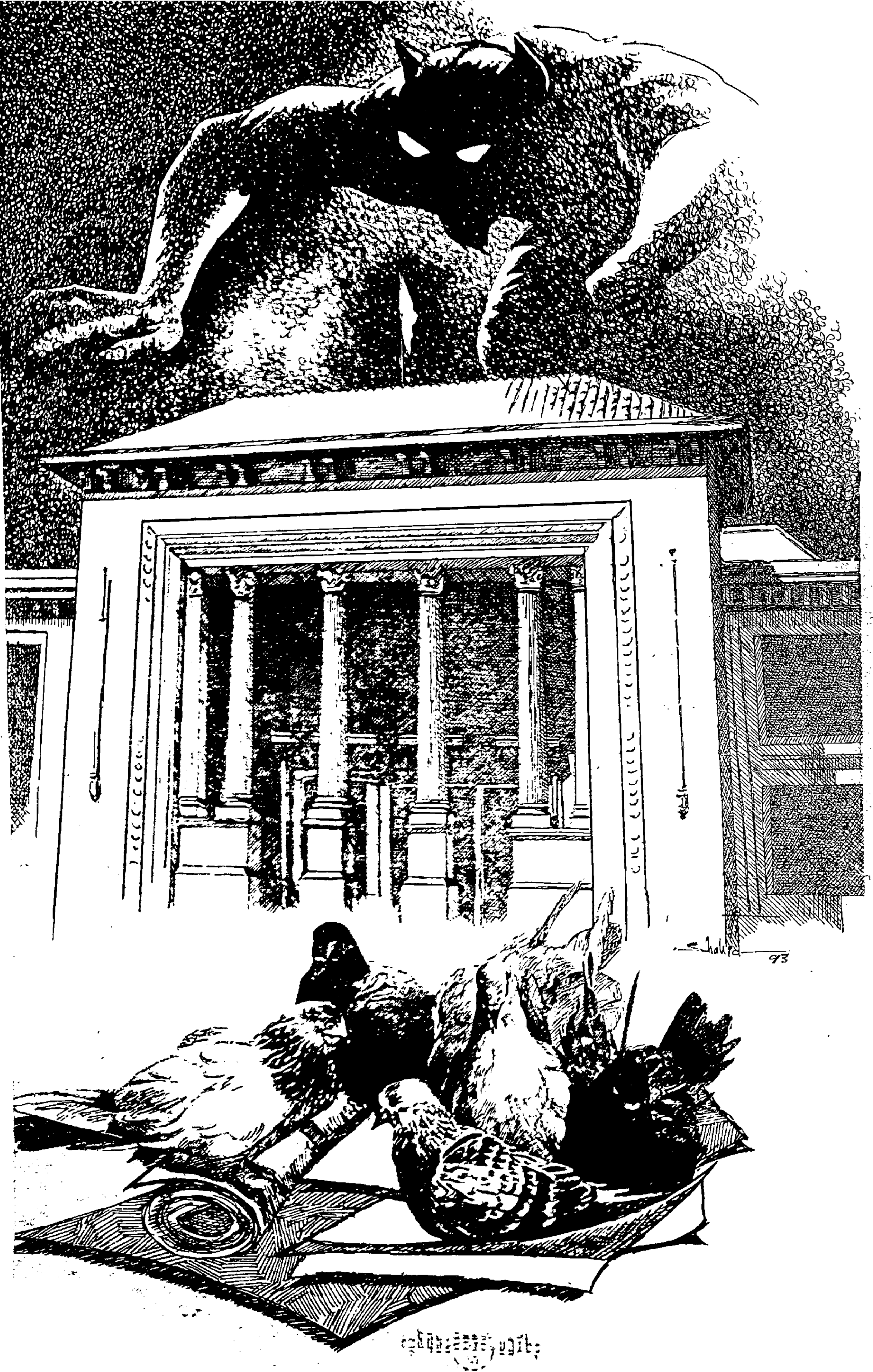
کمرے میں ایک ہی کیمرا تھا، جو اس کی جانب نگراں تھا۔
جیسے ہی سرخ بلب روشن ہوا، اس نے تقریر شروع کر دی۔ اب وہ کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ وہ اپنے کروڑوں ہم وطنوں سے ہم کلام تھا لیکن انداز ایسا تھا، جیسے کمرے میں موجود کچھ لوگوں سے گفتگو کر رہا ہو۔ وہ انتظامیہ کی بدعنوانیوں اور پریس کی بے انصافیوں کے بارے میں انہیں بتا رہا تھا۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ ماہ بدعنوانیوں اور کرپشن کی وجہ سے مجھے اسمبلیاں توڑنی پڑی تھیں۔ اس پر ملا جُلا ردِّعمل سامنے آیا۔ بہت زیادہ تنقید بھی کی گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ کچھ باتیں برحق بھی تھیں۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ بدعنوانیوں کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ صرف چہرے بدلے تھے، باقی سب کچھ وہی کا وہی تھا۔

"مجھے کچھ بھی سمجھا جائے لیکن میں ملک و قوم کا سچا خادم ہوں۔ مجھے اقتدار کی ہوس نہیں۔ مجھے لوگوں کی فلاح و بہبود سے زیادہ دلچسپی ہے۔ مجھے اس ملک کے غریبوں سے محبت ہے۔ میں انہیں خوشحال دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں جمہوریت کو مستحکم دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج میں جو قدم اٹھا رہا ہوں، وہ اسی سمت میں ہے۔

"ناقدین کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ ہمارے آئین میں صدر اور وزیرِاعظم کے اختیارات کے درمیان معقول توازن نہیں۔ اسمبلیوں کے اراکین کو عوام منتخب کرتے ہیں۔ یعنی وہ براہِ راست عوام کے نمائندے ہوتے ہیں جبکہ صدر کا انتخاب عوام کے منتخب اراکین کرتے ہیں۔ یعنی صدر بالواسطہ منتخب ہوتا ہے لہٰذا اسے اسمبلیاں توڑنے کا اختیار حاصل نہیں ہونا چاہیے۔

"میں اس بات سے متفق ہوں لیکن کچھ اعتراضات مجھے بھی ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں جو پارٹیاں جمہوریت کی علمبردار ہیں، جن کے دم سے جمہوریت قائم ہے، وہ خود اپنی بنیاد میں غیر جمہوری ہیں۔ ان کے عہدے دار اپنے کارکنوں کے منتخب کردہ نہیں ہوتے۔ بزعمِ خود بڑے لیڈر عہدے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ اسی لیے تو بعد میں اسمبلی میں ہارس ٹریڈنگ ہوتی ہے۔ مجھے یہ اعتراض بھی ہے کہ



صدر کی طرح وزیراعظم بھی بالواسطہ منتخب ہوتا ہے“ اس لیے کہ عام لوگ پارٹیوں کو ووٹ دیتے ہیں لیکن انہیں علم نہیں ہوتا کہ جیتنے کی صورت میں ان کی منتخبہ پارٹی کسے وزیراعظم نامزد کرے گی۔ اس کا بھی تدارک ہونا چاہیے پھر صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن کی بات اچھی لگے گی۔

”آئین کے تحت مجھے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے ترمیم کا حق حاصل ہے۔ میں ملک و قوم کی بہتری اور جمہوریت کے فروغ کے لیے اپنا یہ آئینی حق استعمال کررہا ہوں۔ میں نے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے حکم جاری کردیا ہے۔ اس نئی ترمیم کے تحت صدر کو یہ اختیار نہیں رہا کہ وہ اسمبلیاں توڑ سکے۔ اب مجھ سمیت کوئی صدر کبھی اسمبلی نہیں توڑے گا۔ اس کے تحت تمام سیاسی جماعتیں پابند ہیں کہ ہر سال ہر سطح پر اپنے تنظیمی عہدوں کے لیے باقاعدہ انتخاب کرائیں گی۔ الیکشن کمیشن اس پہلو پر بھی نظر رکھے گا۔ جو پارٹی ایسا نہیں کرے گی‘ وہ عام انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے گی۔ اس کے علاوہ ہر سیاسی جماعت عام انتخابات سے ایک ماہ پہلے تک اپنا پارلیمانی لیڈر منتخب کرکے اس کا اعلان کردے گی۔ اس کے لیے ابتدائی مرحلے میں امیدوار نامزد ہوں گے۔ ہر شہر میں اس سیاسی جماعت کے کارکن اس انتخاب میں ووٹ دیں گے۔ الیکشن کمیشن اس انتخاب کی بھی نگرانی کرے گا۔ یوں الیکشن کے بعد منتخب وزیراعظم کو بھی مینڈیٹ حاصل ہوگا۔

”ایک اور آرڈیننس بھی میں نے جاری کیا ہے۔ اس سے عدلیہ‘ انتظامیہ اور مقننہ کے درمیان توازن قائم ہوگا اور عدلیہ‘ انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد ہوجائے گی۔ عدلیہ کسی کا بھی مواخذہ بلا روک ٹوک کرسکے گی۔

”مجھے تسلیم ہے کہ آرڈیننس کے ذریعے ترمیم کوئی جمہوری عمل نہیں لیکن میں نیک نیتی سے یہ قدم اٹھا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے سراہیں گے اور اس بار آپ کی منتخبہ اسمبلی ان تبدیلیوں کو باقاعدہ آئینی ترمیم کی شکل میں منظور کرلے گی۔ اس وقت تک آپ صدارتی آرڈیننس سے ہی کام چلائیے۔

”بدعنوانیوں کے سلسلے میں مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر مسلسل الزامات عائد کیے جارہے ہیں۔ الزامات لگانے والوں میں برطرف حکومت اور اخبار نویس پیش پیش ہیں۔ اس سلسلے میں افواہوں کے..... بلکہ سفید جھوٹ کے ہتھیار بھی استعمال کیے جارہے ہیں۔ بہرحال میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے صدر کی حیثیت سے اس ملک کی بے لوث خدمت کی ہے۔ تاہم سیاسی مخالفین اور پریس میڈیا کے حملوں نے مجھے معطل کرکے رکھ دیا ہے۔ اب میں اس عہدے پر مزید کام نہیں کرسکتا۔ میں صدر کے عہدے سے استعفا دیتے ہوئے خود کو احتساب کے لیے پیش کرتا ہوں۔

”اللہ اس ملک کو اور آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ مملکت خداداد پائندہ باد۔“

(پانچ سال بعد)

تنویر الزماں کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ رنگت زرد پڑگئی تھی۔ وہ دبلا پتلا لیکن توانائی سے بھرپور بدن کا آدمی تھا۔ وہ اب بھی مضبوط اور توانا لگتا تھا۔ چار سال کی قید بامشقت نے اسے زیادہ نہیں بدلا تھا۔ بس وہ بجھ کر رہ گیا تھا لیکن اس کی آنکھیں نہیں بجھی تھیں۔ وہ اب بھی چوکنی اور جسم کے آرپار ہوجانے والی تھیں بلکہ چہرے کی زردی نے انہیں اور نمایاں کردیا تھا۔

چار سال پہلے وہ چہرہ ملک کے ہر اخبار سے جھانکتا نظر آتا تھا۔ اس وقت اس چہرے پر سختی تھی اور ڈٹے رہنے کا عزم تھا۔ وہ خوب صورت نقوش کا حامل چہرہ تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن وہ تیس سے زیادہ کا ہرگز نہیں لگتا تھا۔

تنویر نے جیل میں بھی اپنا ہر ممکن حد تک خیال رکھا تھا۔ اس نے ایکسرسائز جاری رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پرانے کپڑے اس کے جسم پر اب بھی فٹ آئے تھے۔ ان کپڑوں میں وہ خود کو بہت اچھا محسوس کررہا تھا۔ چار سال بعد اس نے انسانوں کا سا لباس پہنا تھا۔ ان چار برسوں میں‘ قیدیوں والے لباس میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی خود کو انسان نہیں سمجھا تھا۔ وہ تو بس ایک نمبر تھا..... نمبر ۲۰۴۔

فوزیہ اس کے لیے وہ کپڑے لائی تھی جو اسے سب سے زیادہ پسند تھے۔ نیوی بلیو شرٹ اور سفید پینٹ۔ اسے یاد تھا‘ وہ کپڑے اس نے جمالستان سے خریدے تھے اور انہیں محض تین چار بار ہی پہن سکا تھا۔

فوزیہ کا خیال آیا تو اس نے اسے ذہن کے سب سے نچلے تہ خانے میں دھکیل دیا۔ گزشتہ چار برسوں میں اس نے خود کو اس ہنر کی زبردست تربیت دی تھی۔ ہر اہم خیال‘ ہر اہم یاد کے لیے ذہن کا سب سے نچلا تہ خانہ تھا۔

فوزیہ کے لائے ہوئے کپڑے اسے پہنچا دیے گئے تھے۔ وہ کپڑے پہن کر نکلا۔ باہر پہرے دار اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے جیلر نواز احمد کے کمرے میں لے گیا۔

جیلر نواز کرخت چہرے والا سخت گیر آدمی تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھ اس نے یوں میز پر رکھے ہوئے تھے جیسے تصویر کھنچوا رہا ہو۔

تنویر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ بہت پُرسکون تھا۔ وہ جیلر کے بولنے کا منتظر تھا۔ اس دوران وہ جیلر کے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ کمرے اپنے مکین کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس کمرے کو دیکھتے ہوئے اپنے اس نظریے کی تصدیق پر خود اس کا جی خوش ہوگیا۔

وہ کھڑکی سے محروم کمرا تھا۔ بے ڈھنگا لیکن قدرے صاف ستھرا۔ فضا میں تمباکو کی بُو رچی ہوئی تھی مگر تنویر کو اب تمباکو کی بُو بری نہیں لگتی تھی۔ وہ تو چار سال تک چرس کی بُو برداشت کرنے پر

مجبور رہا تھا۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ نو سال پہلے اس نے سگریٹ نوشی کے نقصانات کو تسلیم کر کے جو سگریٹ چھوڑی تھی تو آج تک اسے سگریٹ سُلگانے کا خیال بھی نہیں آیا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ یومیہ چالیس سے پچاس سگریٹ تک پینے کا عادی تھا۔

"تمہاری آزادی کا دن آگیا ہے" جیلر نے اسے چونکا دیا۔

تنویر نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

"ہمیں ہدایت کی گئی تھی کہ تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے جو عام قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے" نیاز احمد نے کہا "میرا خیال ہے' ہم نے اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا ہے اور تمہارے ساتھ کوئی زیادتی بھی نہیں کی۔"

"میں نے کبھی کوئی شکایت کی بھی نہیں" تنویر کی خاموشی بھی ٹوٹی۔

"یہ درست ہے لیکن شکایت کا تمہیں حق بھی نہیں تھا۔"

تنویر پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ گزشتہ چار برسوں میں وقتاً فوقتاً وہ اس شخص سے شدید نفرت کرتا رہا تھا لیکن اس وقت ایسی بات نہیں تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ قیدی کا ردِ عمل یہی ہو سکتا ہے۔ جو کچھ نہیں کر سکتا' وہ صرف نفرت کے لیے آزاد ہوتا ہے۔ اور قیدی کو نفرت جیلر سے نہیں ہوتی' اس کے اختیارات سے ۔۔۔۔ اس کی اتھارٹی سے ہوتی ہے۔ اس نے سوچا' شاید وہ جیلر نواز کی جگہ ہوتا تو خود بھی وہی کرتا' جو جیلر نے کیا تھا۔

"اب تم باہر جاؤ گے تو فی الوقت کچھ دیر کے لیے سب کی توجہ کا مرکز ہو گے' آگے کی مجھے نہیں معلوم" نواز احمد نے کہا "وہ باہر تمہارے منتظر ہیں۔"

تنویر جانتا تھا کہ جیلر کا اشارہ اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں کی طرف ہے۔ اور اس کی چار سال قید بامشقت کے ذمے دار بھی وہی لوگ تھے۔ اسے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنا کام کر رہے تھے۔ ہر شخص کو اپنے پیشے سے مخلص ہونا چاہیے مگر وہ ان سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی سیاسی وابستگیاں تھیں' جن کے پیشِ نظر اپنے مفادات تھے' جو اپنے پیشے سے مخلص نہیں تھے۔ انہی کی وجہ سے وہ پریس والوں سے نفرت کرتا تھا۔

اور اب اسے پریس سے ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی سزا کاٹ چکا تھا۔ اب وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

"تم پریشان ہو کہ میں انہیں کیا بیان دوں گا؟" تنویر نے جیلر سے پوچھا۔

"نہیں۔ بشرطیکہ تم صرف سچ بولو" جیلر نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے' آج کل سچ کیچڑ کی طرح ہوتا ہے' کسی پر بھی اچھال دیا جاتا ہے۔"

جیلر مسکرایا "میں تمہارے تجربے کو چیلنج نہیں کر سکتا۔"

"ابھی کوئی رسمی کارروائی باقی ہے؟"

"رسمی کارروائی؟ نہیں تو" جیلر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

تنویر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ جیلر کا ہاتھ بڑا اور نرم تھا لیکن گرفت سے اس کی مضبوطی ظاہر ہو رہی تھی۔

دروازے پر تین بار دستک ہوئی پھر دروازہ کھلا۔ ایک باوردی پہرے دار کی معیت میں فوزیہ اندر آئی۔ تنویر کو حیرت ہوئی کہ وہ کتنی مختلف نظر آ رہی ہے۔ پہلے وہ اسے سلاخوں کے پیچھے سے دیکھتا تھا تو وہ کچھ اور لگتی تھی۔ سلاخیں کتنا بڑا فرق پیدا کر دیتی ہیں۔

لیکن فوزیہ بوڑھی لگنے لگی تھی۔ گزشتہ چار برسوں نے اسے اتنا تباہ نہیں کیا تھا جتنا فوزیہ کو کیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی لگ رہی تھی۔ لگتا تھا' اس نے ادھیڑ عمری میں داخل ہوتے ہی ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ وہ کچھ موٹی اور پلپلی ہو گئی تھی۔

تنویر کو اپنے اندر اداسی کی ایک مہیب موج اٹھتی محسوس ہوئی۔ وہ موج اس کے پورے وجود کو شرابور کر گئی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ فوزیہ خود آگے بڑھی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اس کی اداس آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن نہ بول سکی۔ پھر وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جیلر نواز احمد بھی مسکرا رہا تھا۔

"آؤ۔۔۔۔ گھر چلیں" بالآخر فوزیہ نے کہا۔

"خدا حافظ تنویر الزماں" نواز احمد بولا "اینڈ گڈ لک۔"

بیرا شوہر

ایک خاتون کا شوہر ہوٹل میں بیرا تھا' وہ مر گیا۔ کچھ عرصے کے بعد خاتون ایک روحیں بلانے والے عامل سے ملی جس نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس کے شوہر سے اس کی ملاقات کروا سکتا ہے۔ خاتون نے مطلوبہ فیس ادا کی اور عامل نے اپنا عمل شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس خاتون نے محسوس کیا کہ وہ اسی ہوٹل میں بیٹھی ہے جہاں اس کا مرحوم شوہر کام کرتا تھا۔ چند لمحوں بعد اسے شوہر بھی نظر آگیا جو قدرے فاصلے پر ایک میز پر کھانا لگا رہا تھا۔ خاتون نے خوش ہو کر اسے آواز دی اور اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ شوہر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ خاتون نے پریشان سا ہو کر کہا۔ "تم میرے پاس کیوں نہیں آتے؟"

شوہر نے گھبرا کر کہا۔۔۔۔ "میں وہاں نہیں آ سکتا کیوں کہ وہ "میز" میری نہیں ہے۔"

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ باوردی پہرے دار جیل کے مین گیٹ تک ان کے ساتھ آیا اور ان کے لیے جیل کا آہنی دروازہ کھلوایا۔

جیلر کی بات درست ثابت ہوئی۔ باہر اخبار نویس اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔

کیمروں کی کِلک کِلک نے اس کو اندر سے مجروح کردیا۔ ساتھ ہی سوالات کا ایک ہجوم تھا۔ تنویر صاحب' آزاد ہیں تو کیسا محسوس کررہے ہیں آپ؟ جیل میں کیسی گزری؟ کسی سے کوئی شکایت ہے آپ کو؟ جیل میں کیسا برتاؤ ہوا آپ کے ساتھ؟

اس آخری سوال پر تنویر چپ نہ رہ سکا "یہ جاننے کے لیے تو آپ کو جیل جانا پڑے گا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سوال کرنے والا کھسیا کر رہ گیا۔

فوزیہ' تنویر کا ہاتھ تھام کر اسے سامنے کھڑی کار کی طرف لے گئی۔ اس کار کا بندوبست تنویر کے وکیل رضوانی نے کیا تھا۔ تنویر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں اُڑتے ہوئے آزاد پرندوں پر تھیں "یہ اتنی بڑی .... اتنی خوب صورت آزادی ایک بہت بڑا فریب ہے" اس نے سوچا "ان آزاد پرندوں کی آزادی کا انحصار بھی تو ہوا پر ہے"

وہ پچھلی سیٹ پر فوزیہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"مسٹر زماں' گیٹ وے کے سلسلے میں آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟" ایک صحافی نے کار کے اندر مُنہ گھسیڑ کر کہا۔

تنویر نے سوال کرنے والے کو بہت غور سے دیکھا "ہڈی اس مقام پر اور مضبوطی سے جُڑتی ہے' جہاں سے ٹوٹی ہو" اس نے سادگی سے کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی ہڈی تُڑواؤ" تنویر نے کہا پھر ڈرائیور کے کندھے پر تھپکی دی "چلو دوست!"

ڈرائیور نے کار آگے بڑھائی۔ ابتدا میں اس کی رفتار کم تھی۔ تنویر نے پلٹ کر جیل کی دیواروں کو دیکھا۔ کار بائیں جانب مُڑی۔ اس کی رفتار بڑھی۔ جیل' میڈیا اور اذیّت بھرے چار برس پیچھے رہ گئے۔ اب وہ سب ماضی کا حصہ تھے۔ فوزیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

○☆○

حمید نے اخبار میں تنویر الزماں کی رہائی کی خبر پڑھی تو اسے لگا کہ اس کی موجودہ گھٹن بھری زندگی کے زنداں میں بہت چھوٹا سا روزن کھل گیا ہے۔

اس کے روز و شب ایسے لگے بندھے انداز میں گزر رہے تھے کہ اسے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ لگتا تھا' اب معمولات کا طلسم ٹوٹنے والا ہے۔ وہ چائے پیتے ہوئے مسکرا دیا۔

وہ قوی الجثہ آدمی تھا۔ اس کے سخت عضلات پر پلپلے گوشت کی تہ تھی جو کسی کو بھی دھوکا دے سکتی تھی کہ وہ محض گوشت کا پہاڑ ہے لیکن درحقیقت وہ بہت طاقتور اور چاق و چوبند آدمی تھا۔

"کل صبح تنویر کو آزاد کردیا گیا" اس نے اپنی بیوی شاہدہ کو بتایا۔

شاہدہ کی رنگت دبتی ہوئی تھی لیکن وہ بلاشبہ خوب صورت تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی سلائس پر مکھن لگارہی تھی۔ "ہمیں کیا!" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"میرے لیے تو اس بات کی بہت اہمیت ہے۔"

"تنویر بے وقوف آدمی ہے۔"

"صرف وہی نہیں' میں بھی بے وقوف ہوں۔"

شاہدہ نے مکھن لگا سلائس اس کی طرف بڑھایا۔ خود وہ سادہ سلائس کھانے لگی۔ ان کی معاشی صورتِ حال خاصی ابتر تھی۔ وہ چھوٹے سے تنگ فلیٹ میں رہ رہے تھے جہاں گرمی اور گھٹن بہت زیادہ تھی۔ جب سے حمید کی سرکاری ملازمت ختم ہوئی تھی' یہ صورت حال چل رہی تھی۔ اب حمید کا گزارہ ایک کرائے کلب کی معمولی سے ملازمت پر تھا۔ تنخواہ بہت کم تھی۔ بس زندگی کی گاڑی کسی طرح کھنچ رہی تھی۔ اب تو شاہدہ سنجیدگی سے خود بھی کوئی ملازمت تلاش کررہی تھی۔ گھر کے قریب ہی ایک دندان ساز کا مطب تھا۔ اسے ریسپشنسٹ کی ضرورت تھی۔ تنخواہ وہ کم دے رہا تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے بہرحال کچھ ہونا بہتر تھا۔ لہٰذا شاہدہ اس ملازمت کے حق میں فیصلہ کرچکی تھی۔

"میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ اب تم تنویر کے ساتھ ملوث نہیں ہوگے" شاہدہ نے اچانک کہا "لیکن میں تمہیں جانتی ہوں' اس لیے میرا خیال ہے کہ تم سے یہ وعدہ لینا بے کار ہی ہے۔"

"بے کار ہی نہیں' یہ زیادتی بھی ہوگی" حمید نے کہا "تنویر ایک مُحبِّ وطن آدمی ہے اور میری وفاداری کا پوری طرح مستحق ہے۔"

"تمہاری تو آنکھوں پر پردہ پڑگیا ہے۔ اس نے تمہیں مُحبِّ وطن نہیں' چور بنادیا ہے۔"

"تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتیں" حمید نے جواب دیا۔ وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ تنویر کی طرح اس کے ساتھ بھی بے وفائی ہوئی ہے اور جنھوں نے بے وفائی کی تھی' وہ ان چار برسوں میں خوب پھلے پھولے تھے۔ ان لوگوں کو اگر سزا ہوئی بھی تھی تو بہت معمولی۔ کوئی اور ملک ہوتا تو ان لوگوں سے سختی سے نمٹا جاتا۔ انہیں سخت ترین سزائیں دی جاتیں لیکن یہاں تو وہ اور دولت مند ہوگئے تھے۔ جب کہ حمید جیسے نچلے لیول کے لوگ سزا پارہے تھے' بے روزگار ہوگئے تھے۔ ان سے اخبار نویسوں کو بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے حمید جانتا تھا کہ نچلی سطح کے لوگ کتنے اہم ہوتے ہیں' کتنی بڑی قوت ہوتے ہیں۔

"ہم نے اپنی عزت گنوائی' روزگار سے محروم ہوئے اور زندگی

کے دو سال بھی گنوا بیٹھے" شاہدہ نے کہا۔

"مجھے اپنی قید کا ایک ایک لمحہ یاد ہے۔"

"تو پھر یہ بھی یاد رکھا کرو کہ تنویر اور تم جیسے لوگوں کے نزدیک جو کچھ درست اور جائز ہے' وہ اوروں کے نزدیک غلط اور ناجائز ہے اور اسی لیے ہم اس حال میں ہیں۔"

"یہ بحث تو روزِ اوّل سے چل رہی ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا درست۔ اس پر سب کبھی متفق نہیں ہوتے۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے' اسی لیے میں احکامات کی تعمیل کرنے کو ترجیح دیتا ہوں' یہی بہتر بھی ہوتا ہے۔"

"خدا کی پناہ! میں سمجھتی تھی کہ وقت بڑا استاد ہوتا ہے مگر تم کبھی کچھ نہیں سیکھ سکتے" شاہدہ نے جھنجلا کر کہا۔

"ممکن ہے' میں نے کچھ سیکھ لیا ہو" حمید بولا۔ کبھی کبھی شاہدہ کے لیے اس کی محبت بڑی آزمائش سے دوچار ہو جاتی تھی' اس کا سبب یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی بات اسے سمجھا نہیں پاتا تھا "ممکن ہے' جسے میں مضبوطی اور ثابت قدمی سمجھتا ہوں' تمہارے نزدیک ہٹ دھرمی اور بے وقوفی ہو لیکن میں جان گیا ہوں کہ کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم۔"

حمید نے بیوی کے سامنے کبھی اعتراف نہیں کیا تھا کہ تنویر کے ساتھ کام کرنا اس کے لیے کس قدر پُرلطف اور سنسنی آمیز تھا بلکہ اس نے اس سلسلے میں بات کرنے کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔



تنویر کو وہ اپارٹمنٹ دیکھ کر دُکھ ہوا' جس میں فوزیہ رہ رہی تھی۔ اپنا بہت اچھا مکان ہوتے ہوئے ایسے اپارٹمنٹ میں رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔ سکندر آباد میں ان کا اپنا کشادہ اور عالی شان بنگلا تھا لیکن تنویر کو سزا سہراب پور میں کاٹنا تھی۔ سہراب پور' سکندر آباد سے ۱۲۸ میل کے فاصلے پر تھا۔ فوزیہ نے یہ سوچ کر کہ بار بار آنا جانا تکلیف دہ ہوگا' سہراب پور میں ہی یہ اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ یوں اسے تنویر سے ملنے کے لیے آنے جانے میں سہولت رہتی تھی۔ سہراب پور جیسے چھوٹے شہر میں یہ فلیٹ بھی بڑی نعمت تھی۔

بیڈ روم کا دروازہ کھلا۔ دس سالہ نرگس لپکتی ہوئی نکلی اور باپ سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ باپ کے سینے میں چھپالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تنویر بڑی شفقت سے اس کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ نرگس محراب نگر کے ایک کانونٹ اسکول میں پڑھتی تھی' وہیں ہوسٹل میں رہتی تھی۔ فوزیہ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ الٹی سیدھی باتیں کر کے باپ کو پریشان نہ کرے۔ سو اب وہ بے بسی سے رو رہی تھی۔ چار سال کی دوری کی وہ شکایت بھی کیا کرتی۔

ذرا دیر بعد نرگس نے سر اٹھا کر باپ کو بہت غور سے دیکھا "آج میں بہت خوش ہوں ڈیڈی" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

تنویر نے اس کی پیشانی چوم لی اور دل میں سوچا' اب تک تو تمہیں باپ کے بغیر جینے کی عادت پڑجانی چاہیے تھی بٹیا'

"ڈیڈی..... میں آپ کے لیے کیک لاتی ہوں' برتھ ڈے کیک" نرگس نے چہک کر کہا۔

"لاؤ پھر ہو جائے کیک" تنویر نے خوش دلی سے کہا۔

نرگس کچن کی طرف چلی گئی اور فریج سے کیک نکال لائی۔ وہ واقعی برتھ ڈے کیک تھا۔ اس پر کریم سے لکھا تھا..... ہیپی برتھ ڈے ٹو ڈیڈی "یہ تو واقعی برتھ ڈے کیک ہے۔" تنویر نے کہا "اور آج میرا برتھ ڈے تو نہیں۔"

"ایک اعتبار سے برتھ ڈے ہی ہے ڈیڈی۔"

تنویر کو احساس ہوا کہ اس کی بیٹی اپنی عمر سے آگے نکل گئی ہے۔ زیادہ بڑی ہو گئی ہے۔

وہ کیک کھاتے رہے۔ شام کو وہی کار ڈرائیور جو تنویر کو جیل سے لایا تھا' گاڑی لے کر آ گیا۔ نرگس کو فوزیہ نے خصوصی طور پر دو دن کے لیے بلوایا تھا۔ اسے ہوسٹل واپس جانا تھا۔ ڈرائیور اسے محراب نگر لے گیا۔ تنویر نے بیٹی سے وعدہ کیا کہ جلد ہی وہ اس سے ملنے کے لیے اس کے اسکول آئے گا۔

فلیٹ میں تنویر اور فوزیہ اکیلے رہ گئے۔ ان کے درمیان گزرے ہوئے چار برس تھے۔ تنویر کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی گزارنا ہی بھول گیا ہے۔ جیل کے ان چار برسوں میں اس کی بیٹی کتنی بڑی ہو گئی ہے' بیوی کتنی بدل گئی ہے۔ یہ اتنے لمحوں کا فاصلہ کیسے پاٹا جا سکتا ہے؟

فوزیہ چائے بنا کر لائی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ چائے بنا کر اس نے مگ اس کی طرف سرکا دیا۔

"مکان کی کیا پوزیشن ہے؟" تنویر نے پوچھا۔

"نیچے والے حصے میں کرائے دار رہ رہے ہیں' اوپر والا بند پڑا ہے" فوزیہ نے بتایا۔

پتا نہیں کیسے' گفتگو چلتے چلتے چینیوں کے لباس بلکہ کم لباسی پر آ گئی۔ کسی نے کہا۔ "کیا بات ہے' آج دن میں زیادہ تر نوجوان قمیصیں اُتارے' خالی نیکریں پہنے نظر آتے ہیں۔"

"گرمی بہت ہے۔" انتخاب عالم نے بڑی سنجیدگی سے وضاحت کی۔

"کیا یہ گرمی یہاں صرف لڑکوں کو لگتی ہے! لڑکیوں نے تو پورے کپڑے پہن رکھے تھے۔"

"وہ انہوں نے دھوپ روکنے کے لیے پہن رکھے تھے۔" انتخاب نے برجستہ جواب دیا۔

امجد اسلام امجد کے سفرنامے
"ریشم ریشم" سے ایک تراشہ۔

"کل ہم روانہ ہوسکتے ہیں گھر کے لیے؟"
"کیوں نہیں۔ میرا خیال بھی یہی تھا۔"
تنویر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اس کے بہت قریب تھی۔ ادھیڑ عمر فوزیہ، بدلی ہوئی فوزیہ، وہی پرانی والی فوزیہ! اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچا، چار برس کی خلیج پاٹنے میں وقت تو لگے گا۔ چار سال..... خدا کی پناہ..... اور وہ خالی بے رنگ راتیں، جن میں درد کا احساس ہوتا تھا اور یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ درد کہاں ہورہا ہے۔

"مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟" فوزیہ نے اسے چونکادیا۔

"ہاں، کچھ سوچا تو ہے" وہ منمنایا۔ اسے احساس تھا کہ طویل ازدواجی زندگی میں وہ فوزیہ کو کچھ بھی نہیں دے سکا ہے۔ وہ اس کے مستقبل سے ہی نہیں، ماضی تک سے پوری طرح باخبر نہیں تھی۔ شادی سے پہلے بس اسے اتنا معلوم تھا کہ تنویر انٹیلی جنس میں ہے اور اہم آدمی ہے۔ لیکن فوزیہ بہت سمجھ دار عورت تھی۔ وہ کبھی اس سے وہ سوال نہیں کرتی تھی جنہیں پوچھنے کا ہر بیوی کو حق ہوتا ہے۔ تنویر جانتا تھا کہ وہ چاہے بھی تو اسے کچھ نہیں بتاسکتا۔ بتادے تو وضاحت کیسے کرے گا۔ یہ ناممکن ہے۔

"جو عرصہ میں نے جیل میں گزارا ہے....." بالآخر تنویر نے کہا "اس عرصے میں دوسرے لوگ کمیٹی سے ..... محکمۂ قانون سے تعاون اور مفاہمت میں مصروف تھے۔ ان میں سے کچھ کو بہت کم سزا ہوئی، کچھ سزا سے صاف بچ نکلے۔ انہوں نے گواہیاں دیں، ایک دوسرے کی گردنوں میں پھندے ڈالے اور تنگ کیے۔ پھر گردنیں بچانے کے لیے سودے بازی کی دوڑ میں۔ جس عرصے میں جیل میں سڑ رہا تھا، وہ دوبارہ تعلقات بنانے، عہدے حاصل کرنے اور دولت کمانے میں مصروف تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو مشین کا پُرزہ رہے تھے، جو ضابطوں سے واقف تھے۔ اس کے باوجود اپنی جان بچانے کے لیے اصول شکنی کررہے تھے، ضابطوں کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔ شاکر، ظہور، نفیس....."

"ناموں سے تو میں بھی واقف ہوں" فوزیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"سارا نزلہ کسی نہ کسی پر تو گرنا تھا۔ میں سب سے آسان ہدف ثابت ہوا۔"

"اور کون ہو سکتا تھا؟"

"تم کچھ اور چاہتی تھیں؟"

"میں؟ میں تو سمجھ بھی نہیں سکتی، میں کیا چاہوں گی۔ واقعی میری تو سمجھ میں ہی نہیں آتیں یہ باتیں۔"

تنویر نے چائے کا ایک طویل گھونٹ لیا۔ جو کچھ ہوا محمود شامی کی وجہ سے ہوا، اس نے سوچا۔ محمود شامی ہی نے اس سرطان کو پھیلنے دیا۔ اس کی روک تھام نہیں کی۔ کبھی تنویر کو فخر تھا کہ وہ محمود شامی کے لیے کام کررہا ہے۔ ان دنوں اسے یقین تھا کہ ملک اور قوم کو محمود شامی جیسے مسیحا کی ضرورت ہے۔ وہ ایک مضبوط صدر تھا۔ وہ مقاصد کے حصول کے لیے خفیہ۔۔ حتیٰ کہ ناجائز ذرائع سے کام لیتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ بشرطیکہ نتائج مثبت برآمد ہوں۔

لیکن آخری دنوں میں تنویر کو اندازہ ہوگیا تھا کہ نتائج ہمیشہ ہی مثبت نہیں ہوتے اور ملک و قوم کے مفاد میں بھی نہیں ہوتے۔ محمود شامی اپنے مفادات کو اہمیت دینے کا عادی تھا۔ وہ اصول پرست بنتا تھا لیکن کوئی اصول راستے کی رکاوٹ بنتا تو وہ ایک لمحے میں اسے ترک کردیتا۔

پھر گیٹ وے اسکینڈل سامنے آیا۔ اصول پرست صدر نے اس کی ذمے داری قبول کرنے کے بجائے اپنے ماتحتوں کو بھیڑیوں کے سامنے پھینک دیا۔ صدرِ مملکت کو ایسے اسکینڈل میں ملوث ہونے کا سرِعام اعتراف نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اسے قریبی حلقوں میں اپنے ان ماتحتوں کی مذمت بھی نہیں کرنی چاہیے تھی جو اس کے احکامات کی تعمیل کررہے تھے اور اس کے اندھے وفادار تھے۔ محمود شامی نے خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے اور اپنی حفاظت کو مقدم جانتے ہوئے ملکی انتظامیہ کی پوری عمارت گرادی تھی۔ یہ تو ملکی مفاد میں نہیں تھا۔ ذاتی مفاد تھا اس میں۔ ملک و قوم تو برسوں پیچھے چلے گئے تھے۔ سب سے زیادہ نقصان ملک و قوم کا ہی ہوا تھا اور اس عمارت کے ملبے تلے دبنے والے سوائے تنویر الزماں کے سب کے سب پھلے پھولے تھے اور خوش حال ہوگئے تھے۔

"ہر شخص نے ہر ذمے داری مجھ پر ڈال دی اور خود بری الذمّہ ہوگیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں جیل میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاؤں لیکن میں نہیں مرا۔ میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ ان کی خواہش کے مطابق ٹوٹنے بکھرنے کے بجائے پہلے سے زیادہ مضبوط بن کر نکلوں۔"

"اور اب؟" فوزیہ نے پوچھا۔

تنویر نے دل میں سوچا، اب وہ سب میرے مجرم ہیں، لیکن وہ بہ آوازِ بلند بولا "اور چائے دو، ایک پیالی۔"

چار سال کی خلیج سے گزرنے کا کڑا وقت سر پر آگیا تھا، رات ہورہی تھی!

○☆○

نیلے رنگ کی مرسیڈیز رضیہ شامی کو لے کر قلعہ نما عمارت سے نکلی۔ محمود شامی اپنی اسٹڈی کی کھڑکی میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ سیکرٹ سروس والوں نے بجلی کی مدد سے کھلنے اور بند ہونے والے گیٹ کو بند کردیا۔ ۴۶ سالہ رضیہ اپنے معمول کے مطابق شوہر کو اپنی منزل کے متعلق بتانے کی زحمت کیے بغیر ایک بار پھر نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے شوہر کو سیکرٹ سروس کے شامی فیملی کی حفاظت پر مامور دستے کے انچارج منیر سے سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔

شام کی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ عمارت کی دوسری طرف سے

موجوں کے ساحل پر سر پٹکنے کی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔
محمود شامی نے کھڑکی کے سرخ بھاری پردے کھینچ کر برابر کردیئے۔ سمندر کی آواز باہر ہی رہ گئی۔ وہ اپنی بھاری اور بڑی میز کی طرف چلا آیا۔ میز پر ٹیلی فون کے برابر لیمپ شیڈ رکھا تھا۔ درودیوار پر بک شیلف تھے۔ فرش پر سرخ دبیز قالین بچھا تھا۔ ایک طرف بڑا سیاہ چرمی صوفہ سیٹ تھا۔

کچھ دیر تک محمود شامی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ اس کی انگلیاں مضطربانہ انداز میں میز پر ٹھک ٹھک کررہی ہیں۔ وسیع وعریض اسٹڈی کی خاموشی میں ٹھک ٹھک کی وہ آواز بہت زیادہ بلند آہنگ تھی۔

وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور میز کے عقب والی دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کیبنٹ کا دروازہ کھولا۔ کیبنٹ کی بغلی دیوار میں ایک خانہ تھا۔ اس خانے میں کتابوں کے پیچھے ایک ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ لائن تھی جس کے متعلق سیکرٹ سروس والے بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ جدید طرز کا چھوٹا سا انسٹرومنٹ تھا۔ اس کا تار اتنا لمبا تھا کہ اسے بہ آسانی میز تک لایا جاسکتا تھا۔

اس نے انسٹرومنٹ لاکر میز پر رکھا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر ایک نمبر ملایا۔ تیسری گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھالیا گیا
”ظہور؟“ اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

سابق صدر کی آواز پہچان کر ظہور حیران رہ گیا۔ اپنے فون پر وہ پہلی بار اس کی آواز سن رہا تھا ورنہ وہ طے شدہ وقت پر خود کسی پبلک بوتھ سے اسے فون کرتا تھا ”اگر میرا فون ٹیپ کیا جارہا ہوگا تو کال ٹریس کرلی جائے گی' خواہ آپ ایک لفظ بھی نہ بولیں۔“
”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے احتیاطی تدابیر کا خیال رکھا ہے۔“

”یقیناً رکھا ہوگا“ ظہور کے لہجے میں احترام در آیا۔ وہ بھول گیا تھا کہ کس شخص سے مخاطب ہے۔ اقتدار سے علیحدہ ہونے کے باوجود محمود شامی ملک کے طاقتور ترین افراد میں سے تھا۔ وہ اس کے عہدِ صدارت میں اٹارنی جنرل کے عہدے پر فائز رہا تھا اور خود بھی بہت طاقت ور آدمی تھا۔ یہی نہیں' ان دونوں کے درمیان دوستی کا بہت پرانا رشتہ بھی تھا۔
”سکندر آباد کی کیا پوزیشن ہے؟“ محمود شامی نے پوچھا۔
”اچھی ہے۔ بظاہر تو وہ کامیاب ہوتا نظر آرہا ہے لیکن اس کے حق میں کوئی ڈرامائی بات ہوجائے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔“
”انتخابی اندازوں کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی ظہور۔“
”یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں جناب۔“
”اور تمہارے کیس کی کیا صورت حال ہے؟“
”امکان یہ ہے کہ میری آخری اپیل بھی مسترد ہوجائے گی۔“
”جانتے ہو ظہور' جو کچھ میرے بس میں تھا' میں نے کیا۔“
”میں جانتا ہوں جناب۔“
”وقت وقت کی بات ہے“ محمود شامی کے لہجے میں احساسِ تنہائی در آیا۔
”ارے ہاں.... تنویر الزماں رہا ہوگیا ہے۔“
”اور اتنی طویل قانونی جنگ کے بعد تمہاری سزا شروع ہونے والی ہے۔ یہ ہے چھوٹا ہونے کا فائدہ۔“
”اس کے پاس اپیلوں کی گنجائش بھی تو نہیں تھی۔“
”تم نے جو کچھ کیا' فطری تھا۔ تمہیں جنگ لڑنا تھی۔ آدمی ہتھیار تو نہیں ڈال سکتا۔“
”ہتھیار تو تنویر نے بھی نہیں ڈالے۔“
محمود شامی ہنس دیا ”تنویر اپنا احمقانہ کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ شروع سے ہی عجیب آدمی رہا ہے۔ انتہا پسند لیکن قابلِ اعتماد۔ اور اپنے میدان کا منفرد اور اہل ترین شخص۔ یہ تو بتاؤ کہ رہائی کے بعد اس نے بیان کیا دیا؟“

”چند بے معنی لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ٹی وی پر رات کی خبروں میں دیکھیے گا۔ پریس والوں کے ساتھ اس کا رویہ قابلِ دید تھا۔“
”ضرور دیکھوں گا۔ اچھا ظہور' خدا حافظ“ ظہور کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔ پھر اس نے انسٹرومنٹ کو کیبنٹ کے خانے میں مخصوص جگہ پر رکھا اور کیبنٹ بند کردی۔ چند لمحے وہ ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے میز پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک روشن بٹن دبادیا۔ ”نصیر.... میں ساحل پر جاؤں گا“ اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔
”بہتر جناب“ دوسری طرف سے جواب ملا۔
محمود شامی نے باہر نکل کر اپنی اسٹڈی کا دروازہ مقفل کیا اور تنگ راہداریوں کے ایک پیچیدہ سلسلے سے گزرا جو اچھی خاصی بھول بھلیاں تھیں۔ ہر راہداری میں سرخ قالین بچھا تھا۔ راہداریوں کی وہ بھول بھلیاں قصرِ جمہوریت کے حفاظتی انتظامات کا ایک حصہ تھیں۔
وہ قصر سے باہر نکلا اور ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ سیکرٹ سروس والے اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے۔ اگرچہ وہ اسے نظر نہیں آرہے تھے لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ لوگ اپنے کام کے ماہر ہیں۔
اس نے سر اٹھاکر بڑی طمانیت سے آسمان پر چمکتے ہوئے آدھے چاند کو دیکھا اور ساحل کی ریت پر قدم بڑھاتا رہا۔ ساحل پر سر پٹکنے والی موجیں اب اس سے صرف دس قدم دور تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ سمندر کی طرف ایسے حساس آلات نصب کیے گئے ہیں' جو معمولی سی سرگرمی پر بھی اس کے محافظین کو الرٹ کردیں گے۔ یہاں وہ بالکل محفوظ تھا۔ اسے سمندر سے ڈرنے کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔
وہ ساحل کے ساتھ چلتا ہوا خاصا دور نکل گیا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اسے ٹی وی پر خبریں دیکھنی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنے محفوظ قلعے قصرِ جمہوریت کی طرف پلٹ پڑا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی.... صرف ایک بار!

حمید کی آنکھ فوری طور پر کھل گئی۔ اس نے اندھیرے میں ہی بیڈ کے ساتھ رکھی میز کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ریسیور اٹھالیا "لیں؟" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ذرا سے توقف کے بعد حمید بستر پر اٹھ بیٹھا "ہاں ہاں' اچھا' ہیں۔ ریکو میں تین بجے؟ ٹھیک ہے" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے بیڈ کی دوسری سائڈ پر رکھی چمکتے چہرے والی گھڑی میں وقت دیکھا' پونے بارہ بجے تھے۔

"یہ تنویر تھا نا؟" شاہدہ نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

"ہاں" حمید نے جواب دیا اور دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔

"اللہ رحم کرے" شاہدہ بڑبڑائی لیکن اتنی دیر میں حمید دوبارہ سو چکا تھا۔

○☆○

ریکو پرانے طرز کا ریسٹورنٹ تھا۔ وہاں چھوٹی گول میزیں تھیں جن کے درمیان خاصی جگہ تھی۔ ایک سائڈ پر کیبن بنے ہوئے تھے۔ چھت سے زنجیروں کی مدد سے گول' خوب صورت گملے لٹکائے گئے تھے جن میں پودے تھے۔ ان میں موجود بیلیں زنجیروں سے لپٹ کر اوپر چڑھ رہی تھیں۔

تنویر نے اندر داخل ہوتے ہی ادھر اُدھر دیکھا اور ایک گوشے میں اسے حمید بیٹھا نظر آگیا۔ وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ ریسٹورنٹ کا کچن بھی اسی طرف تھا۔ فضا میں اشتہا انگیز مہک رچی ہوئی تھی۔

حمید نے تنویر کو آتے دیکھا تو خیر مقدمی انداز میں... اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت کشادہ مسکراہٹ مچلی۔ دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ تنویر نے اس کے کندھوں کو تھپکا۔ بالآخر دونوں بیٹھ گئے۔

تنویر نے دیکھا کہ جیل نے جسمانی طور پر حمید پر کوئی منفی اثر نہیں چھوڑا تھا۔

ویٹر اُن کی طرف چلا آیا تھا اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا "کھانا کھالیا ہے تم نے؟" تنویر نے حمید سے پوچھا۔

"جی ہاں' چائے ہی منگوا لیجئے۔"

"چائے لے آؤ بھئی" تنویر نے ویٹر سے کہا' ویٹر چلا گیا "تم ٹھیک تو ہو؟" تنویر نے حمید سے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"حالات اچھے ہوں' تب بھی جیل کو صحت افزا مقام نہیں کہا جاسکتا۔"

"مجھے رہا ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ اب تو جیل مجھے یاد بھی نہیں۔"

تنویر مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ حمید جیسے آزادی پسند لوگ جیل کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔

ویٹر چائے لے آیا۔ حمید چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ تنویر اپنے سابق ماتحت کو غور سے دیکھتا رہا۔

"نیاز سے بھی ملاقات ہوئی تمہاری؟" تنویر نے پوچھا۔ حمید کی طرح نیاز بھی تاجوری تھا۔ دونوں صرف آزادی کی خاطر تاجور پر ایک پڑوسی ملک کے غاصبانہ قبضے کے بعد اپنی زمینیں اور گھربار چھوڑ کر خداداد نگر چلے آئے تھے اور وہیں کے ہو رہے تھے۔ دونوں ساتھ کام کرتے تھے۔ گیٹ وے کے معاملے میں بھی دونوں ساتھ تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ گیٹ وے بینک میں ایک رکن قومی اسمبلی کا سیف ڈیپازٹ کھولتے ہوئے وہ رنگے ہاتھوں دھر لیے گئے تھے۔ نیاز دُبلا پتلا مگر صحت مند انسان تھا۔ اس کی رنگت سرخ وسپید تھی اور ہونٹوں پر ہروقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ جس وقت وہ ایکشن میں نہ ہوتا تو اس قدر ساکت ہوتا کہ خوف آنے لگتا۔ تنویر نے یہ صفت صرف حد درجہ خطرناک لوگوں میں دیکھی تھی۔

"دو ایک بار فون پر بات ہوئی ہے نیاز سے۔ ہم دونوں ایک ہفتے کے فرق سے رہا ہوئے تھے۔ وہ بہت تلخ ہو رہا ہے۔"

تنویر نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا "تلخ تو ہم سبھی کو ہونا چاہیے۔"

"تلخی تو گھلا دینے والی چیز ہے۔"

"سچ کہتے ہو۔ اظہار عمل کی شکل میں ہونا چاہیے۔"

حمید نے چائے کی پیالی خالی کر کے رکھی اور ہنسنے لگا "میری بیوی آپ کو ناپسند کرتی ہے۔"

"مجھے تکلیف ہوئی یہ سن کر کیونکہ وہ بہت اچھی اور سمجھ دار عورت ہے۔"

"اسے آپ سے عناد نہیں۔ بس وہ کہتی ہے کہ آپ مجھے دوبارہ کسی مصیبت میں پھنسا دیں گے۔ یہ اس کی زیادتی ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ آپ کو اس کا ذمے دار ٹھہراتی ہے۔"

"یہ کسی حد تک درست بھی ہے۔ تمہیں میں نے بھرتی کیا تھا۔"

"کون جانے' یہ نہ ہوتا تو میں کسی اور بڑی مشکل میں پھنس جاتا" حمید نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا "ویسے شاہدہ کی چھٹی حس بہت تیز ہے۔ اسے پتا چل گیا کہ کل رات مجھے فون آپ نے کیا تھا۔"

"میں یہ بات جانتا ہوں اور ہمیشہ ذہن میں رکھتا ہوں۔"

"آپ یہ بتائیں کہ اس بار کام کیا ہے۔ مجھے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ شاہدہ نے مجھے تنبیہہ کر دی ہے۔" حمید بولا۔

"تم نے ابھی میری بات سنی بھی نہیں اور لگتا ہے آمادہ بھی ہو گئے!"

"میں آمادہ ہوں جناب! اس لیے کہ میں جانتا ہوں' آپ کیا کہیں گے۔ آپ کی طرح میں بھی سوچتا رہا ہوں کہ کچھ کرنا چاہیے۔ ہم تاجوری ویسے بھی انتقام کے قائل ہوتے ہیں۔"

"میں انتقام نہیں' انصاف کہوں گا اسے" یہ لفظ ادا کرتے ہوئے تنویر کو خود بھی ان کی قوت کا احساس ہونے لگا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ" حمید نے پُرسکون لہجے میں کہا "ہمیں اپنے جیسے لوگوں کو اپنے انداز کا انصاف فراہم کرنا ہوگا۔"

تنویر نے سکون کی گہری سانس لی۔ ویسے اسے یقین تھا کہ حمید اس سے متفق ہو گا "یہ بتاؤ میں نیاز سے رابطہ کیسے کروں؟"

"مجھے اندازہ تھا کہ آپ اس سے ملنا چاہیں گے۔ میں اس کا فون نمبر لکھ لایا ہوں" حمید نے کاغذ کا ایک پُرزہ تنویر کی طرف بڑھا دیا۔

تنویر کاغذ کا پُرزہ قمیص کی جیب میں رکھتے ہوئے بولا "یہ سمجھ لو کہ تمہیں میری ہدایات کے مطابق کام کرنا ہو گا" اس نے کہا۔

"کیوں نہیں جناب۔ پہلے کی طرح۔ اور نیاز بھی تیار ہو گا' آپ بے فکر رہیں۔"

"اور میری طرح تمہیں بھی یہ یقین ہونا چاہیے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں' وہ ضروری ہے۔"

"دیکھیں جی' ہمارے اپنے ساتھیوں نے اپنی اپنی کھال بچانے کے لیے ہم سے غداری کی ہے۔ تاجور میں یہ سب کچھ ہوا ہوتا تو یقین کیجیے' انہیں گولی سے اُڑا دیا جاتا۔ یہ آپ کا وطن ہے' یہاں انہیں عزت بھی ملی ہے اور پہلے سے زیادہ خوش حالی بھی۔ یہ ان جیسے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ اچھے آدمی جان دے دیتے ہیں یا جیل جانا گوارا کر لیتے ہیں' غداری نہیں کرتے۔"

"دیکھو حمید' میں جو کچھ چاہتا ہوں' اسے کھُل کر کہوں گا' ڈھکے چھپے لفظوں میں نہیں..."

"ہم جلاّد کا کردار ادا کریں گے۔ یہی بات ہے نا؟"

"ہاں.... جب تک پکڑے نہیں جاتے' ہم سزائے موت دینے والے کہلائیں گے اور پکڑے گئے تو قاتل۔"



نیاز سے ملاقات کے لیے تنویر کو سلطانیہ جانا پڑا۔ اس ملاقات کا نتیجہ بھی ویسا ہی اطمینان بخش تھا جیسا سکندر آباد میں حمید سے ملاقات کا۔ نیاز بھی تنویر کی رہائی کا منتظر بیٹھا تھا بلکہ وہ دو دن سے گھر سے نکلا بھی نہیں تھا' اس اُمید پر کہ اس کا سابق چیف اس سے رابطہ کرے گا۔ یہ خطرناک شخص تنویر کا احسان مند تھا اور احسانات کا صلہ دینے کو بے چین بھی۔

ملاقات اور گفتگو کے دوران وہ بس مسکراتا رہا۔

سکندر آباد واپس پہنچتے پہنچتے تنویر فیصلہ کر چکا تھا کہ اتنا بڑا مکان اس کے لیے بیکار ہے جبکہ ان کا کام کسی چھوٹے سے فلیٹ سے بھی چل سکتا ہے۔ مکان کا مالک ہونے سے بہتر اور ضروری یہ تھا کہ فوزیہ کے اکاؤنٹ میں بھاری رقم موجود ہو۔ سب سے اہم چیز نرگس کا مستقبل تھا۔

یہ سوچ کر وہ مسکرایا کہ سکندر آباد میں زمین کی اور خاص طور پر اچھے مکانوں کی قیمتیں کہیں کی کہیں پہنچ گئی تھیں۔

"سفر کیسا رہا؟" فوزیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

تنویر بھی مسکرا دیا "بس ٹھیک رہا" اس نے کہا اور ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ فوزیہ اس سے کبھی نہ پوچھتی کہ وہ کہاں گیا تھا۔

بے وفا امریکا

ایک امریکی پادری نے چرچ میں اپنے وعظ کے دوران کہا کہ آج ہمارے درمیان ایسا شادی شدہ جوڑا موجود ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہے۔ اگر اس جوڑے نے چندے کی صندوقچی میں دس دس ڈالر نہیں ڈالے تو ان کا راز افشا کر دیا جائے گا۔

دُعا کے بعد چندے کی صندوقچی لوگوں کے درمیان ہوتی ہوئی پادری کے پاس پہنچی تو اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ صندوقچی میں دس دس ڈالر کے بے شمار نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

اسی لیے تو کہیں بھی جاؤ' فوزیہ کے پاس۔ گھر واپس آنا اچھا لگتا تھا۔

"چائے پیو گے؟" فوزیہ نے پوچھا۔ وہ اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھی۔

"پلا دو۔"

فوزیہ کچن میں چلی گئی' ذرا دیر بعد وہ چائے کی ایک پیالی لیے چلی آئی۔ تنویر نے صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارے اور پاؤں پھیلا لیے۔ وہ بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔

"تم نے کچھ سوچا کہ اب ہم کیا کریں گے؟" فوزیہ نے اچانک پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"گزشتہ چار برس میں نے تنہائی کا بڑا عذاب سا ہے۔ نرگس ہاسٹل میں تھی۔ مجھے پتا چلا کہ تنہائی آدمی کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔"

"اور مجھے بڑی اچھی کمپنی ملی تھی" تنویر نے تلخ لہجے میں کہا "نفسیاتی مریض' غنڈے' لفنگے اور ناکام مجرم' جن کی ناکامی کا ثبوت یہ تھا کہ وہ جیل میں تھے۔"

فوزیہ صوفے پر اس کے برابر بیٹھ گئی "اب وہ سب بھول جاؤ۔ ہم ان چار برسوں کی تلافی کر سکتے ہیں۔ اب تم اس چکر سے نکل سکتے ہو۔ اس اعتبار سے سودا مہنگا نہیں۔ یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو تم کبھی اس جنجال سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے تھے۔"

"فوزیہ... یہ وہ جنجال ہے جس سے آدمی کبھی آزاد نہیں ہوتا۔"

فوزیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں' یاد آیا۔ نفیس نے فون کیا تھا۔"

"نفیس نے؟ کیوں؟"

"تمہیں رہائی پر مبارک باد دینا.... نیک تمناؤں کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔"

تنویر سوچ میں پڑ گیا۔ محمود شامی کے عہدِ صدارت میں نفیس

جامی، صدر کا قانونی مشیر تھا لیکن بارہ سال پہلے وہ خود انٹیلی جنس میں ہی تھا۔ محمود شاہی کو رازداری کا بڑا خیال رہتا تھا' اسی لیے اس نے اپنے اردگرد انٹیلی جنس کے سابق اراکین جمع کر رکھے تھے۔

نفیس جامی جانتا تھا کہ اس نے کیسے اصول پامال کیے ہیں۔ وہ اپنی غداری کی اہمیت سے واقف تھا۔

"نفیس نے کوئی فون نمبر بھی دیا تھا؟" تنویر نے بیوی سے پوچھا۔

"نہیں۔ کہہ رہا تھا کہ دوبارہ فون کرے گا۔"

ذرا دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ فوزیہ فون ریسیو کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ گفتگو سے تنویر کو اندازہ ہوگیا کہ فون فوزیہ کی کسی سہیلی کا ہے۔ تنویر نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ نفیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

نفیس ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے اس سے اس کی زندگی کے چار قیمتی سال چھین لیے تھے۔ اس کی جوانی کے آخری چار سال .... اس کی ازدواجی زندگی کے چار سال.... اس کی بیٹی کے بچپن کے آخری اور لڑکپن کے ابتدائی سال۔ انہوں نے اسے آزادی سے محروم کیا تھا۔ اور پھر گلوریا بھی تو تھی....

○☆○

نفیس جامی نے اگلے روز دو بجے تنویر کو فون کیا "میں تم سے ملنے آسکتا ہوں؟"

"بسرو چشم" تنویر نے جواب دیا۔

ٹھیک ڈھائی بجے نفیس آگیا۔ اس نے فوزیہ سے مزاج پرسی کی۔ جواب میں فوزیہ نے اس کی بیوی شبنم کے بارے میں پوچھا۔ پھر وہ چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف چلی گئی۔

تنویر نے نفیس کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ہر اعتبار سے پہلے سے بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی صحت پہلے سے بہتر تھی۔ وہ بیش قیمت لباس پہنے تھا۔ اس کا چشمہ اس کی لمبی ناک پر نیچے پھسل آیا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق انگشتِ شہادت کی مدد سے اسے بار بار اوپر کرتا تھا۔

"تم میری توقعات سے بڑھ کر بہتر لگ رہے ہو" نفیس نے تنویر کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ پھر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔

تنویر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ تنویر کا تاثر پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ تنویر کو یقین تھا کہ اس کی آنکھوں میں نفیس کو کچھ نہیں ملے گا۔

"تم یہاں کیسے؟ کیا یہاں رہائش ہے آج کل؟" تنویر نے اس سے پوچھا۔

"نہیں' میں یہاں یونیورسٹی میں لیکچر دینے آیا ہوں۔"

"مفت؟"

نفیس کچھ گڑبڑا گیا "نہیں بھئی' معقول معاوضہ ملے گا۔ میرے خیال میں تو تمہیں بھی اس پر غور کرنا چاہیے۔"

"میں لیکچر کیا دوں گا' میں تو کھل کر بات کرنے کا بھی قائل نہیں ہوں" تنویر کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔

"ابھی لوگ متجسس ہیں اور ہم لوگوں کو بھی زندگی تو گزارنی ہے۔ یہ تولیوں کی مدد سے سکنجبین بنانے کے مترادف ہے۔"

تنویر مسکرادیا "یہ تو محمود شاہی کا انداز سخن معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ بہت زیادہ بولتا تھا اور یہ خیال نہیں رکھتا تھا کہ کہاں بول رہا ہے۔ غلط جگہوں پر بولتا تھا۔"

"غلط جگہیں تخلیق بھی اسی نے کی تھیں۔"

نفیس نے انگشتِ شہادت سے چشمہ اوپر کیا اور مسکرادیا۔ وہ تنویر سے اختلاف نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے نروس انداز میں پہلو بدلا۔

"تمہارے لیکچر کا موضوع کیا ہے؟" تنویر نے پوچھا۔

"حکومت میں ذمے داریوں کی تقسیم' اور میں اس موضوع پر بولنے کا اہل ہوں" نفیس نے کہا۔ اس کے لہجے میں دبا دبا چیلنج سا تھا "جو کچھ ہوا' اس سے ہم سب نے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔" اب وہ قدرے پُراعتماد دکھائی دے رہا تھا "جیل میں بہت خراب تو نہیں گزری۔ ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"بس گوارا سمجھ لو۔"

"تنویر' تم نے جو کچھ کیا' اس پر میں تمہیں سراہتا ہوں۔ درحقیقت ہم سب کو ہی خاموش رہنا چاہیے تھا لیکن گھبراہٹ جب پھیلتی ہے تو کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیتی اور پھر احتسابی کمیٹی والے دباؤ ڈالنا خوب جانتے تھے۔ انہیں ہراساں کرنے کا ہنر آتا تھا۔ انہوں نے تو کے جی بی اور سی آئی اے کو بھی مات کردیا۔"

"یہ سب ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔"

نفیس نروس انداز میں ہنس دیا "بہرحال امتیاز اس ہنر میں طاق ثابت ہوا۔ جس کسی نے کمیٹی کے سامنے کوئی بات اُگلی' امتیاز نے اسے ایک اینٹ میں تبدیل کردیا۔ آدمی اس کے سامنے خود کو دیوار میں چنا ہوا محسوس کرتا تھا۔"

"تم وکیل ہو' جانتے ہو کہ یہ کام کیسے ہوتے ہیں۔"

"مگر امتیاز کے سامنے میں کچھ بھی نہیں۔"

"اور امتیاز کو احتسابی کمیٹی کا سربراہ محمود شاہی نے بنایا تھا" تنویر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اس کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"بات جب بگڑنا شروع ہوتی ہے تو کسی کے قابو میں نہیں رہتی" نفیس نے طلائی لائٹر سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ اس کا سگریٹ کیس بھی طلائی تھا "میں سوچتا ہوں' کاش میں نے بھی صورت حال کا سامنا تمہاری طرح بہادری سے کیا ہوتا۔ مجھے اپنے آپ پر.... اپنے طرزِ عمل پر شرم آتی ہے مگر ہم میں سے بیشتر کا

طرزِ عمل یہی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ حوصلہ مند نہیں تھے اور نظریات اپنی جگہ، سب سے اہم چیز حوصلہ ہی ہوتا ہے۔ حوصلہ مند صرف تم ثابت ہوئے۔"

تنویر آگے کو جھک آیا "تمہارے منہ سے یہ تعریف سن کر مجھے خوشی ہوئی۔ ایک ماہرِ قانون کا مجھے اس طرح سراہنا ایک اعزاز ہے۔"

"تمہارے نزدیک وہ محض فیلڈ ورک تھا۔ یہ وہ بات ہے جو نہ کمیٹی سمجھ سکی، نہ عام لوگوں کی سمجھ میں آئی۔ تمہارے نزدیک وہ بس ایسا تھا، جیسے تم کسی دوسرے ملک میں پکڑ لیے گئے ہو اور تمہاری زبان کھلوانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

"تم نے اور شبنم نے یہ فیصلہ کیوں کیا کہ دارالحکومت میں ہی رہو گے؟" تنویر نے گفتگو کا رخ بدلا۔

"ہم دارالحکومت میں تو نہیں، ہم تو کیٹلام میں رہ رہے ہیں۔ ساحلِ سمندر کے قریب ایک اچھا اپارٹمنٹ مل گیا ہے۔ بالکنی سے بہت خوب صورت ویو نظر آتا ہے۔"

"پوری فیملی ہے وہاں؟"

"نہیں۔ بچے تو دارالحکومت میں ہی ہیں۔ میں اور شبنم کیٹلام میں ہیں۔ میں تو زیادہ وقت سفر میں رہتا ہوں۔ میرا ایجنٹ میرے لیے لیکچرز ترتیب دیتا رہتا ہے۔ تم بھی لیکچر کے سلسلے میں غور کرو یا کوئی کتاب لکھ ڈالو۔ دیکھو.... ایک وقت آتا ہے، جب آدمی کو زبان کھولنا پڑتی ہے۔ اور ہم لوگ جس گندگی میں اُترے تھے، اس کے بعد ہمارا اتنا تو حق بنتا ہے اپنے آپ پر۔ اس کیچڑ سے کچھ تو حاصل ہونا چاہیے ہمیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو نفیس لیکن مجھے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بہت سوچنا پڑے گا۔ جیل نے مجھے زندگی کی ہر اُمنگ سے محروم کر دیا ہے۔ بہرحال امید ہے کہ چند ہفتوں میں یا چند مہینوں میں مَیں خاصا بہتر محسوس کرنے لگوں گا۔"

نفیس نے اسے ہچکچاتی ہوئی لیکن حوصلہ افزا مسکراہٹ سے نوازا "ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ہم لوگ اس اعتبار سے فائدے میں رہے۔ ذرا ظہور کے بارے میں سوچو۔ ابھی تو اس کی سزا کا آغاز بھی نہیں ہوا ہے۔ کتنی اپیلیں کیں اس نے لیکن لاحاصل۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم لوگ اعترافِ جرم کر کے جان چھڑا لیتے تو بہتر ہوتا۔ انجام تو طے شدہ تھا۔"

"کوئی انجام طے شدہ نہیں ہوتا" تنویر نے کہا۔

نفیس نے متجسس نگاہوں سے اسے دیکھا "ممکن ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"ہم اب بھی زندگی کی تعمیرِ نو کر سکتے ہیں مگر پہلے مجھ میں زندگی کا کوئی شعلہ تو جاگے۔"

نفیس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا "اب میں چلتا ہوں۔ اس ہفتے دو لیکچر اور ہیں میرے پھر آرام کا وقفہ۔"

آخری اطلاع

ہوائی جہاز میں سوار ایک تاجر ایک بڑے کاروباری منصوبے کے تانے بانے بُننے میں مصروف تھا۔ اتنے میں کھڑکی کے پاس سے ایک آدمی پیرا شوٹ کے ذریعے نیچے جاتا دکھائی دیا۔ وہ آدمی تاجر سے کہنے لگا "چاہو تو تم بھی پیرا شوٹ لے کر میرے ساتھ آجاؤ۔"

تاجر بولا "مجھے کیا تم نے بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟ میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

اس آدمی نے کہا "تمہاری مرضی۔ ویسے میں اس جہاز کا پائلٹ ہوں۔"

تنویر اسے لے کر دروازے کی طرف بڑھا "تم سے دوبارہ مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تم تو اب میرے ہیرو بن گئے ہو" نفیس نے کہا۔

نفیس کے لہجے میں سچائی اور خلوص تھا۔ تنویر نے سر جھکا۔ وہ جانتا تھا کہ لہجے میں خواہ مخواہ سچائی اور خلوص سمونے کے فن سے نفیس خوب واقف ہے۔

"لیکچر دینے کے حق میں فیصلہ کرو تو مجھے مطلع کر دینا۔ میں اپنے ایجنٹ سے تمہارے لیے بات کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے نفیس۔ شکریہ۔"

"گڈ لک تنویر۔"

تنویر اسے رخصت کر کے ڈرائنگ روم میں واپس آیا اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد فوزیہ آئی تو اس نے اسے بتایا "میں کہنا بھول گیا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام سے سلطانیہ جانا ہے۔"

فوزیہ سر کو تفہیمی جنبش دے کر رہ گئی۔

"میں باہر جا رہا ہوں، کچھ منگوانا ہے؟"

"نہیں۔"

○☆○

تنویر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑے اسٹور کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے چیک کر لیا تھا کہ اس کی جیب میں سکے ہیں۔ اسٹور کے سامنے والے فون بوتھ سے اس نے کیٹلام کے سنوبال ہوٹل فون کر کے اپنے لیے کمرا بک کرایا۔ پھر اس نے سلاٹ میں ایک اور سکہ ڈالا اور حمید کا نمبر ڈائل کیا۔

"مسٹر ایچ کیٹلام کے سنوبال ہوٹل میں موجود ملیں گے... جمعے کی رات آٹھ بجے۔"

دوسری طرف سے حمید نے کہا "اس نام کے کسی آدمی کو میں

نہیں جانتا۔ رانگ نمبر۔"

رابطہ منقطع ہوگیا۔ تنویر نے ڈائریکٹری میں ڈبلیو نکالا اور وسیم کا نام دیکھا۔ وہاں بہت سارے وسیم تھے۔ وسیم احمد، محمد وسیم، وسیم علی وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ایک اور فون کیا اور کینٹلام جانے والی جمعے کی صبح کی فلائٹ میں محمد وسیم کے نام سے سیٹ ریزرو کرالی۔

بوتھ سے نکل کر اس نے اخبار خریدا اور سیٹی بجاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ مدت بعد وہ خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

○☆○

اگلی صبح تنویر کرینٹ اسٹریٹ پر واقع سینٹرل کمرشل بینک جانے کے لیے نکلا۔ قریب پہنچ کر اس نے اخبار خریدا اور ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا۔ ابھی ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ بینک نو بجے کھلتا تھا۔ اس نے کافی طلب کی اور اخبار پڑھنے لگا۔

بینک کھلتے ہی وہ بل ادا کر کے ریسٹورنٹ سے نکلا اور سڑک پار کر کے بینک کی طرف بڑھ گیا۔ بینک میں ایک فرضی نام سے اس نے سیف ڈیپازٹ باکس لیا ہوا تھا۔ اس باکس میں بے شمار فرضی ناموں کے شناختی کاغذات اور ڈرائیونگ لائسنسز کا ذخیرہ تھا۔ ان میں کریڈٹ کارڈز بھی تھے، قومی شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور تصویریں بھی تھیں۔ وزیٹنگ کارڈز اور پیدائشی سرٹیفکیٹ بھی تھے۔ وہ اس کا ان دنوں کا اسلحہ خانہ تھا جب وہ انٹیلی جنس میں کام کرتا تھا۔ کچھ سادہ فارم بھی تھے جنہیں بھر کر وہ کوئی بھی نیا نام اور شخصیت اختیار کر سکتا تھا۔

اس نے ڈیپازٹ باکس سے اپنے مطلب کی کچھ چیزیں نکالیں اور بینک سے باہر آگیا۔ باہر آکر اس نے ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو ائرپورٹ چلنے کی ہدایت کی۔ ٹرمنل کے باتھ روم میں جا کر اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر صرف کنگھے کی مدد سے اپنا بالوں کا اسٹائل تبدیل کیا۔ اب اس کے بال پیشانی پر جھکے ہوئے تھے جس کی وجہ سے پیشانی تنگ لگ رہی تھی پھر اس نے گہرے رنگ کے فریم والا چشمہ لگایا۔ وہ دور کی نظر کا چشمہ تھا، جس کا نمبر ۰.۵ تھا۔ اسے کوئی بھی استعمال کر سکتا تھا۔ ان معمولی تبدیلیوں سے اس کی شخصیت خاصی تبدیل ہوگئی.... اور وہ بھی بڑے قدرتی انداز میں۔ اس فن کا وہ ماہر تھا اور کئی بار اس فن کی وجہ سے ہی اس کی جان بچی تھی۔

ویسے یہ احتیاط غیر ضروری تھی۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اسے کوئی پہچان سکے گا لیکن رہائی کے بعد اخبارات میں بھی اس کی تصویریں چھپی تھیں اور ٹی وی پر بھی اسے دکھایا گیا تھا۔ لوگوں کی یادداشت کا کیا بھروسہ۔ وہ کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ محمد وسیم کی حیثیت سے کینٹلام جانے والے ڈی سی ۹ میں بیٹھا ہوا تھا۔

وہاں پہنچ کر اس نے ذیشان کے نام سے ایک کار کرائے پر لی اور سنو بال ہوٹل کی طرف چل دیا۔ راستے میں وہ نفیس کے بارے میں سوچتا رہا۔

نفیس نے اسے اس کی ثابت قدمی پر سراہا تھا، یہ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا کہ اس کی بات پر یقین کر لیتا۔ ممکن ہے، نفیس سچ کہہ رہا ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آئندہ ایسی ہی صورت حال میں وہ پھر ایسا ہی نہیں کرے گا۔ لہٰذا ماضی کے کیے دھرے کی تلافی ضروری تھی۔

اس نے گاڑی پارک کی اور اپنا سامان ڈکی میں ہی چھوڑ کر استقبالیہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے وسیم کے نام کا حوالہ نہیں دیا بلکہ ذیشان کے نام سے ایک کمرا لے لیا پھر اس نے اپنا سامان نکالا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔

کمرا آرام دہ اور پُرتکلف تھا۔ وہاں رنگین ٹی وی بھی موجود تھا، فریج بھی تھا۔ بہت آرام دہ ڈبل بیڈ تھا۔ سبز ٹائلوں والا باتھ روم بہت خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔ دُھلے ہوئے تولیے بھی موجود تھے۔ اس کی زندگی ہوٹلوں کے ایسے ہی کمروں میں گزری تھی۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں بہت سے غیر ممالک بھی جاتا رہا تھا۔

ٹیلی فون ڈائریکٹری سے اسے نفیس جامی کا فون نمبر اور پتا معلوم ہوگیا۔ وہ اس نے نوٹ کر لیا پھر اس نے سوٹ کیس کھول کر سامان نکالا اور سلیقے سے رکھا۔ اس کے بعد وہ باہر نکلا، اپنی گاڑی میں بیٹھا اور نفیس جامی کے گھر کی طرف چل دیا۔

رضوان ٹیرس جدید طرز کی ایک بلند و بالا عمارت تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ نیا کینٹلام پرانے کینٹلام سے کس قدر مختلف ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں بلڈنگ کے سامنے سے گزر تا گیا۔ یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ بلڈنگ کا اپنا چوکیدار تھا اور انداز سے وہ سابق فوجی معلوم ہوتا تھا۔

سڑک کے دوسری طرف رضوان ٹیرس کے سامنے کچھ دُکانیں تھیں۔ ان میں ایک بوتیک اور ایک جوتوں کی دُکان تھی۔ کچھ آگے بس اسٹاپ کے ساتھ ایک ٹیلی فون بوتھ تھا۔ وہاں ایک اور بلڈنگ تھی... نعمان ٹیرس۔

تنویر نے نعمان ٹیرس کے سامنے کار کھڑی کی، ایک کاغذ کے پُرزے پر کچھ لکھا اور کار کو لاک کر کے پیچھے رضوان ٹیرس کی طرف چل دیا۔ لابی میں داخل ہو کر وہ پوسٹ باکسوں کی قطار کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ہر پوسٹ باکس پر مکین کا نام اور فلیٹ نمبر لکھا ہوا تھا۔ اسے نفیس جامی، فلیٹ نمبر 27B کا پوسٹ باکس فوراً ہی نظر آگیا۔ مگر وہ کچھ اور تلاش کر رہا تھا۔

"میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" باوردی چوکیدار نے اس سے پوچھا۔ وہ اس کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔

"فلیٹ نمبر 20C شاہد علی خان" تنویر نے کہا اور بدستور پوسٹ باکس کو دیکھتا رہا۔

"اس نام کے کوئی صاحب یہاں نہیں رہتے جناب۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں جناب۔"

تنویر نے کاغذ کا وہ پُرزہ چوکی دار کی طرف بڑھا دیا جس پر کار میں بیٹھے بیٹھے اس نے کچھ لکھا تھا۔

چوکی دار نے کاغذ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا "یہ پتا نعمان ٹیرس کا ہے جناب جبکہ آپ اس وقت رضوان ٹیرس میں کھڑے ہیں۔"

تنویر نے کاغذ کو حیرت سے دیکھا پھر کاغذ چوکی دار سے لے کر اسے پڑھا۔

"نعمان ٹیرس اسی سڑک پر کچھ آگے ہے جناب۔"

تنویر نے سکون کی گہری سانس لی "بہت بہت شکریہ" اس نے کہا پھر وہ بلڈنگ سے نکل آیا۔

اپنی کار میں پہنچ کر تنویر نے وہ چار نام اور نمبر کاغذ پر نوٹ کیے جنہیں اس نے پوسٹ باکس کا جائزہ لیتے ہوئے ذہن نشین کیا تھا۔ چاروں نام عورتوں کے تھے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھما کر رضوان ٹیرس کی طرف لے گیا۔ اس نے گاڑی آہستگی سے بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ میں موڑی۔ وہاں ہر فلیٹ کے لیے پارکنگ کی علیحدہ جگہ تھی۔ ان چاروں خواتین کی کاریں بھی موجود تھیں۔ اس نے ان کی گاڑیوں کے نمبر اور ماڈل نوٹ کیے پھر وہ گاڑی باہر نکال لایا۔

سنوبال ہوٹل پہنچا تو وہ بے حد مطمئن تھا۔ ابتدائی کام بہت اچھا ہوا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے میں حمید اور نیاز کی آمد کا منتظر تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا منصوبہ کامیابی سے ہم کنار ہوگا۔ مقروض لوگوں سے قرض وصول کرنے کا وقت آپہنچا تھا!

○☆○

اگلی صبح تنویر نے اپنی گاڑی ایسی جگہ پارک کی جہاں سے وہ رضوان ٹیرس کے پارکنگ لاٹ پر نظر رکھ سکتا تھا۔

پونے آٹھ بجے ایک دُبلی پتلی مُعمر عورت لال رنگ کی ہُنڈا سوک میں نمودار ہوئی۔ گزشتہ روز کی حاصل کردہ معلومات کی بنیاد پر تنویر کہہ سکتا تھا کہ وہ 16C میں رہنے والی مسز خان ہے۔

دس منٹ بعد ایک خوب صورت یوریشین عورت سبز رنگ کی فاکس ویگن لے کر نکلی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ مس ہیلن مارشل تھی اور فلیٹ نمبر ۲۹C میں رہتی تھی جو نفیس جامی کے فلیٹ سے عین دو منزل اوپر تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے مس میری اسٹیفن باہر آئی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ عمر زیادہ ہونے کے باوجود اس کے پُرکشش ہونے میں کلام نہیں تھا۔ وہ سفید شیراڈ میں باہر آئی تھی۔

چوتھی عورت کے نکلنے کے بعد تنویر ایک قریبی ریسٹورنٹ میں ناشتے کے لیے چلا گیا پھر اس نے ایک گُل فروش سے گُل دستہ خریدا۔ گُل دستے سے منسلک کارڈ پر اس نے لکھا...'کاش تم میری محبت کا جواب محبت سے دے سکو۔ تمہارا سچا چاہنے والا'

تین بجے تک صرف سبز فاکس ویگن واپس آئی تھی جبکہ تنویر سفید شیراڈ کی موجودگی کی امید کر رہا تھا' بہرحال اس سے بھی کام چل جائے گا' وہ بڑبڑایا۔

سوا تین بجے نیاز کوریئر سروس والوں کی سی سفید وردی پہنے گُلدستہ ہاتھ میں لیے رضوان ٹیرس کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے بلڈنگ کے چوکی دار کو بتایا کہ اسے یہ پھول فلیٹ نمبر 29C میں مس ہیلن مارشل کو پہنچانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ دربان نے انٹرکام پر مس ہیلن سے رابطہ کر کے اسے گُل دستے کے متعلق بتایا۔ مس ہیلن کے لہجے میں اُلجھن تھی تاہم اس نے دربان کو ہدایت کی کہ وہ پھول لانے والے کو اوپر آنے دے۔

چنانچہ نیاز بغل میں گُل دستہ دبائے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

گُل دستہ دیکھ کر ہیلن اتنی خوش ہوئی کہ نیاز کو دس روپے ٹپ عنایت کردی۔ گمنام عاشق نے اسے جذباتی کر دیا تھا۔

نیچے لابی میں آنے سے پہلے نیاز ستائیسویں منزل پر ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس نے نفیس جامی کے فلیٹ کی پوزیشن اچھی طرح ذہن نشین کر لی تھی۔

○☆○

اگلی صبح نفیس جامی اپنے فلیٹ میں اپنی بیوی شبنم کے ساتھ

ناشتا کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اخبار بھی پڑھ رہا تھا۔ اس کی بیوی شبنم کی عمر ۳۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ پُرکشش اور حوصلہ مند عورت تھی۔

نفیس نے ناشتا ختم کیا اور اخبار کا وہ صفحہ کھولا جس میں "آج کے ستارے" نامی کالم ہوتا تھا۔ اس میں نجوم کی رو سے بتایا جاتا تھا کہ کس کا دن کیسا گزرے گا۔ اسے احساس تھا کہ اس جیسے عملی آدمی کے لیے یہ ہفتہ کیسا رہے گا' پڑھنا احمقانہ سی بات ہے لیکن اب اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ یہ بھی تھا کہ اس میں اچھی ہی باتیں پڑھنے کو ملتی تھیں اور وہ پُرامید ہو جاتا تھا جبکہ پورے اخبار میں مایوس کن خبروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

"آج ایک پرانے واقف کار سے مدد ملے گی" اس نے بہ آواز بلند پڑھا "ایک مستقل نوعیت کا تکلیف دہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

شبنم اس سے بڑھ کر حقیقت پسند تھی۔ اس نے پیش گوئیوں کو سُنا اور نظرانداز کر دیا۔ وہ خبروں والا صفحہ پڑھ رہی تھی "میں اکثر سوچتی ہوں کہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے" وہ بولی "گیٹ وے اسکینڈل میں ملوث بیشترافراد یا تو سزا سے بچ نکلے یا انہیں بہت معمولی سزائیں سنائی گئیں۔"

"لوگ جانتے ہیں کہ یہاں دُہرا معیار چلتا ہے۔ ناپسند کرنے کے باوجود وہ اسے ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں' اس لیے کہ اکثریت ان معاملات میں ملوث نہیں۔ وہ خود کو محض تماشائی سمجھتی ہے۔"

"کوڑے کے ڈھیر سے نکلنے والے بڑے لوگ...."

"اخبار میں مراسلہ لکھ بھیجو" نفیس نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم عوام کو ردِعمل پر اکسانا تو نہیں چاہیں گے" شبنم مسکرائی۔

"میں تو انفرادی اور خفتہ ردِعمل کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

لیکن شبنم اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ ٹہلتی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی اور باہر جھانکنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس نے پلٹ کر پوچھا "رحمانی کے ہاں پارٹی میں جانا ہے؟"

"ہاں' میں نے وعدہ کر لیا تھا اس سے۔"

"تو مجھے جوتے خریدنے ہوں گے۔"

"ضرور خریدو۔"

"بس تو میں شاپنگ کرنے جارہی ہوں" شبنم نے کہا اور لباس تبدیل کرنے کی غرض سے بیڈ روم میں چلی گئی۔

نفیس نے اخبار دوبارہ اٹھالیا اور اداریہ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ دس منٹ بعد شبنم تیار ہو کر بیڈ روم سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں پرس تھا "کچھ منگوانا ہو تو بتادو" اس نے نفیس سے کہا۔

نفیس نے اخبار سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور نفی میں سہلادیا۔

شبنم کے جانے کے بعد نفیس نے اداریہ پڑھ کر اخبار ایک طرف رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے شیو بنانا اور نہا کر کپڑے بدلنا تھے۔ بیڈ روم میں جا کر اس نے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھیلائے اور خود باتھ روم میں چلا گیا۔

○☆○

حمید نے شبنم نفیس کو باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا۔ ٹیکسی کے جاتے ہی حمید فون بوتھ کی طرف بڑھا۔ اندر جا کر اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد وہ باہر نکلا اور رضوان ٹیرس سے کچھ دور ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے بلڈنگ کے داخلی دروازے پر نظر رکھ سکے۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو پھر وہ دُکان کے شوکیس میں رکھے جوتے دیکھنے لگا۔

رضوان ٹیرس کے چوکی دار نے اخبار سے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اسے وہی دُبلا پتلا ڈیلیوری بوائے نظر آیا جو گزشتہ روز بھی آیا تھا۔ اس بار بھی اس کے ہاتھ میں گلدستہ تھا۔ "یہ گلدستہ فلیٹ نمبر 29C کی مس ہیلن مارشل کے لیے ہے۔" نیاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم کل بھی آئے تھے نا؟" چوکی دار نے پوچھا۔

نیاز کا خیال تھا کہ چوکی دار مس ہیلن کے متعلق کچھ سنسنی خیز انکشافات کرے گا لیکن وہ خاموشی سے انٹرکام کی طرف بڑھ گیا۔ مس ہیلن سے بات کرنے کے بعد اس نے نیاز کو اوپر جانے کا اشارہ کیا۔

نیاز کو گلدستہ مس ہیلن تک پہنچانے میں بمشکل پانچ منٹ لگے۔ مس ہیلن آج بھی اتنا ہی تھرل محسوس کر رہی تھی۔ اس نے پھر نیاز کو دس روپے ٹپ دی۔ نیاز نے اس کا شکریہ ادا کیا اور لفٹ کی طرف چل دیا۔ لفٹ میں بیٹھ کر اس نے ستائیسویں منزل کا بٹن دبادیا۔

وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ فلیٹوں کے دروازوں کے قفل کس قسم کے ہیں.... اور وہ تیار ہو کر آیا تھا۔ راہداری سنسان تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا اور فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ دیوار سے ٹک کر سُن گُن لیتا رہا۔ اس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا اور ساکت جسم کسی بھی وقت حرکت میں آنے کے لیے تیار تھا۔

چند ہی لمحوں میں اسے پانی گرنے کی آواز سنائی دی اور سمت کا اندازہ بھی ہو گیا۔ وہ آواز کی طرف چل دیا۔ بیڈ روم کے اندر والے باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ نیاز نے بڑے سکون سے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے جوتے اور موزے اتارے۔ اس کے بعد یونیفارم اتاری اور صرف بنیان اور انڈرویئر میں باتھ روم میں داخل ہو گیا۔

نفیس کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا اور وہ پتھر کے بُت کی طرح ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ صابن کی ٹکی اس

کے سیدھے ہاتھ میں تھی۔

نیاز نے بڑی مہارت سے اپنی ٹانگ سحرزدہ نفیس کے گھٹنے کے پیچھے رکھی۔ پھر اس نے ہتھیلی سے اس کے سینے پر دباؤ ڈال کر اس کے جسم کو لیور کی سی پوزیشن میں رکھا۔ نفیس کے سر کا رخ باتھ ٹب کی دیوار کی طرف تھا۔ اس کی رفتارِ عمل اتنی تیز تھی کہ نفیس کچھ بھی نہ کرسکا۔ نیاز نے اس کا سر تھام کر اسے ناقابلِ یقین تیزی سے باتھ ٹب کے کنارے سے ٹکرادیا۔ کھوپڑی ٹوٹنے کی آواز بے حد واضح تھی۔

باتھ ٹب کا پانی گلابی رنگت اختیار کرنے لگا۔ نیاز باتھ روم سے نکل آیا۔ باہر آکر اس نے ہر وہ چیز صاف کی جہاں اس کے نشاناتِ انگشت کی موجودگی کا امکان تھا پھر اس نے یونیفارم پہنی اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کرتے ہوئے باہر آگیا۔



سابق سیکریٹری امورِ داخلہ صابر ملک اپنی اسٹڈی میں اکیلا بیٹھا رات کی خبریں دیکھ رہا تھا۔ وہ نفیس جامی کی موت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن کا ایک حصہ ملازمہ کی آہٹوں کی طرف لگا ہوا تھا جو ادھر اُدھر پھر رہی تھی۔

صابر ملک پستہ قامت آدمی تھا۔ اس کے اندر مٹاپے کا زبردست رجحان موجود تھا۔ ذرا احتیاط میں کمی کرتا تو اس کا پیٹ نکل آتا۔ اس کے نقوش پتلے تھے لیکن گوشت کی تہ کی وجہ سے موٹے لگنے لگے تھے۔ اس کی عمر پچاس سال تھی اور اب وہ پوری طرح ہیلتھ فوڈز پر اور ڈائٹ پروگرام پر انحصار کررہا تھا۔ وہ صرف براؤن بریڈ کھاتا، چینی کی جگہ مصنوعی مٹھاس والی گولیاں استعمال کرتا اور ہفتے میں دوبار کم از کم تین میل تک جوگنگ کرتا۔ اس کے باوجود اس کا وزن بڑھا ہوا تھا۔

نیوز کاسٹر نے جیسے ہی نفیس جامی کا نام لیا، وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

عین اسی وقت ملازمہ نے برابر والے کمرے میں کارپٹ کلینر آن کردیا۔ ٹی وی سے تصویر غائب ہوگئی۔ بس رنگین اُفقی دھاریاں تھرک رہی تھیں۔

”نوراں!“ اس نے چیخ کر ملازمہ کو آواز دی۔

لیکن کارپٹ کلینر کے شور میں اس کی آواز بوڑھی ملازمہ تک نہ پہنچ سکی۔

دوسری بار صابر اور زور سے چلّایا۔ وہ اسٹڈی سے نکل آیا تھا۔ اس بار ملازمہ چونکی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور کارپٹ کلینر کا سوئچ آف کردیا۔

”میں ٹی وی پر ایک خاص چیز دیکھنا چاہتا ہوں“ صابر نے لہجے کو نرم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”ویکیوم کلینر کی وجہ سے تصویر بھی خراب ہورہی ہے اور آواز میں بھی گڑبڑ ہورہی ہے۔ تم

ہم رکاب

ایک آدمی نے شراب خانے میں چلّاتے ہوئے سب کو دعوت دی ”جب میں پیوں تو سب لوگ میرا ساتھ دیں“ جب اس نے گلاس ختم کرلیا تو دوبارہ چلّایا ”جب میں دوسرا گلاس پیوں تو ہر آدمی دوسرا گلاس پیے“ ہر شخص نے شکریے کے ساتھ دوسرا گلاس بھی لے لیا۔ جب اس شخص نے دوسرا گلاس ختم کیا تو جیب سے دو ڈالر نکالے اور کاؤنٹر پر رکھتا ہوا چلّایا ”اور جب میں ادائیگی کروں تو سب لوگ ادائیگی کریں!“

ذرا دیر انتظار کرلو“ یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔

ٹی وی اسکرین پر ایک خاتون ایک مخصوص مکھن کی خوبیاں بیان کررہی تھیں۔

نوراں اس کے پیچھے اسٹڈی میں چلی آئی تھی۔ اس نے ایک نظر ٹی وی اسکرین کو اور پھر صابر کو دیکھا ”مکھن آپ تو کھاتے نہیں اور مکھن میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں صاحب“ اس نے معترضانہ انداز میں کہا۔

”کیا؟“ صابر نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔

”میں کہہ رہی ہوں، آپ تو....“

صابر اس کی پوری بات سنے بغیر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا کیونکہ اسکرین پر خاتونِ خانہ کے بجائے نیوز ریڈر کا عکس ابھر آیا تھا۔

صابر نے نفیس کی موت کی خبر ریڈیو پر سُنی تھی۔ لاش اتنی دیر میں دریافت ہوئی تھی کہ شام کے اخباروں میں بھی خبر نہیں چھپ سکی تھی۔ صابر اس موت کے سلسلے میں تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔

لاش نفیس کی بیوہ شبنم نے دریافت کی تھی۔ وہ شاپنگ کرنے نکلی تھی اور دوپہر کا کھانا اس نے اپنی سہیلی کے گھر کھایا تھا۔ ایک بجے اس نے نفیس جامی کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ وہ دیر سے گھر آئے گی لیکن ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔ شبنم نے سوچا، نفیس کہیں باہر گیا ہوگا۔ ساڑھے تین بجے وہ گھر واپس آئی تو باتھ روم میں نفیس کی لاش نظر آئی۔ میڈیکل ایگزامنر نے موت کے وقت کا تعین صبح نو بجے کیا تھا۔ یعنی شبنم کے گھر سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد۔ قوی امکان اس بات کا تھا کہ نہاتے ہوئے نفیس جامی کا پیر پھسلا ہوگا اور اس کا سر باتھ ٹب کے کنارے سے ٹکرایا ہوگا۔ وہ ایک ضرب

ہی مہلک ثابت ہوئی تھی۔
"اب تم صفائی کر سکتی ہو" صابر نے نوراں کو پکارا۔
"آپ کی تو نفیس صاحب سے بہت دوستی تھی" نوراں دروازے میں اکڑی ہوئی تھی۔
"ہاں ایک زمانے میں ہم بہت قریب رہے تھے۔"
"بہت دکھ ہوا ان کی موت کا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی" نوراں نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے ویکیوم کلینر کی آواز سنائی دینے لگی۔
نوراں کے جانے کے بعد صابر نے ٹی وی آف کردیا پھر وہ اپنی میز پر جا بیٹھا۔ اس نے مقصود کا نمبر ڈائل کیا۔
مقصود، محمود شامی کے عہد صدارت میں ایوانِ صدر کا ڈائریکٹر آپریشنز رہا تھا۔ وہ دارالحکومت میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ ہر وقت مسکرانے کا عادی تھا اور مسکراتے مسکراتے ہی کسی کو بھی بہت بڑا نقصان پہنچا سکتا تھا.... بلکہ پہنچاتا رہا تھا۔
صابر کی طرح مقصود بھی تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ صابر کی بیوی مر چکی تھی جبکہ مقصود نے چار سال پہلے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ وہ ایک عام سے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ وہ ان دنوں ملکی سیاست کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کتاب ایک بار پھر خوش قسمتی کو اس پر ملتفت کر دے گی۔
"مقصود اسپیکنگ" بیل بجنے پر اس نے ریسیور اٹھا کر جواب دیا۔
"مقصود، میں صابر بول رہا ہوں۔ کیسے ہو بھائی؟ کتاب کیسی جارہی ہے؟"
"پریشان کر رہی ہے۔ کم بخت بیشتر کردار میری مرضی کے مطابق نہیں چل رہے ہیں" مقصود کا انداز ایسا تھا جیسے حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہمیشہ اس کی مرضی کے مطابق عمل کرتے رہے ہوں، اور یہ سچ بھی تھا۔ وہ لوگوں کو اپنے اشاروں پر نچانا جانتا تھا۔
"تم نے نفیس کے متعلق سنا؟" صابر نے پوچھا۔
"ہاں افسوس ہوا سن کر..... لیکن بہت زیادہ بھی نہیں۔ یاد ہے، ہماری کشتی میں پہلا سوراخ اسی نے کیا تھا۔ بہر حال میں نے تعزیتی پیغام بھیج دیا ہے۔"
صابر نے اپنا اگلا سوال بہت محتاط انداز میں ترتیب دیا "اس کی موت کی نوعیت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"
"اس طرح کے حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں" مقصود کے لہجے میں بے پروائی تھی۔
صابر نے بے چینی سے پہلو بدلا "تم نے کبھی سوچا کہ شامی کے دورِ صدارت میں جو کچھ ہوا، اس پر کوئی طاقت ور ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔"
"ردِ عمل تو ہوا تھا۔ تمہارا اشارہ عوامی ردِ عمل کی طرف تو نہیں؟"
"ہاں، عوام نے کوئی چیخ و پکار نہیں کی، لوگ مشتعل نہیں ہوئے، انہوں نے مظاہرے نہیں کیے، جلوس نہیں نکالے۔"
"میں نے سوچا تھا اس سلسلے میں اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ جانتے ہیں کہ اگر وہ ہماری جگہ ہوتے تو انہوں نے بھی وہی کچھ کیا ہوتا جو ہم نے کیا۔ تو لوگوں نے یہ بات سمجھ لی اور بے پروائی سے اپنے کاموں میں لگے رہے۔"
"لیکن اس اقلیت کے بارے میں کیا خیال ہے جو کسی بھی وجہ سے وہ سب کچھ بھول جانے پر آمادہ نہیں ہے" صابر نے کہا "ایسے لوگ اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔"
دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر ریسیور پر مقصود کی آواز ابھری "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ نفیس کو قتل کیا گیا ہے؟"
"نہیں.... لیکن میں اس امکان پر غور کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے، میں اس تمام عرصے میں غیر شعوری طور پر اس بات سے خوف زدہ رہا ہوں۔ یاد کرو، اس عرصے میں ہمارے متعلق اخبارات میں کیا کچھ چھپا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر مباحثے ہوتے رہے۔ کروڑوں افراد میں چند ایسے بھی ہوں گے جو سر پھرے ہوں، جن کی انگلی ٹریگر دبانے کو بے تاب ہو۔"
"لیکن نفیس کو شوٹ نہیں کیا گیا۔ وہ باتھ روم میں پاؤں پھسل جانے سے گرا تھا۔ اور مرنا تو سبھی کو ہے۔"
"فرض کرو، نفیس کو کسی پیشہ ور قاتل نے قتل کیا ہو اور اس انداز میں کیا ہو کہ حادثہ معلوم ہو۔ جو کچھ ہوا، اس سے ہمارے کچھ پرانے ساتھیوں کو بھی تو تکلیف پہنچی تھی۔"
"تم شاکر کے متعلق تو نہیں سوچ رہے ہو؟"
"شاکر کیا، تنویر الزماں بھی ہے۔ کچھ تاجوری بھی تو ہیں۔"
"انہیں جو تکلیف پہنچی تو اس لیے کہ ہماری طرح وہ بھی ملوّث تھے...... اور جہاں تک تاجوریوں کا تعلق ہے تو وہ بے چارے تو محض سپاہی تھے۔"
"تنویر اور شاکر کے ریکارڈز سے تم واقف ہو۔ تنویر کے متعلق سنا ہے کہ وہ جنونی ہے۔ کاز کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔"
"میں جانتا ہوں لیکن میرا خیال ہے، لوگ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال نفیس کی موت حادثہ تھی اور حادثہ کسی کو بھی پیش آسکتا ہے... کسی بھی وقت۔"
"مجھے تو کسی معمولی سی حیرت کا ہدف بننا بھی کبھی اچھا نہیں لگا" صابر نے کہا۔
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم حیرت سے محفوظ تو نہیں ہوگئے۔ اچھا شاکر اور تنویر کے متعلق سوچو ذرا۔ بیوی کی موت کے

بعد سے شاکر بہت نرم خو اور متحمل مزاج ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ لزارس سے وابستہ ہے۔ تنویر ویسے ہی وفاداری کے معاملے میں انتہا پسند ہے اور اس وقت اسے سب سے زیادہ مستقبل کی فکر ہوگی۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ نفیس کی موت کا تعلق لزارس سے ہو۔"

"یہ تقریباً ناممکن ہے اور پھر نفیس، لزارس میں شامل نہیں تھا۔"

"میرا خیال ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو" صابر کے لہجے میں اب بھی بے یقینی تھی "لیکن عوام کے ذہنوں میں تو ہم سب زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ خیر یہ بتاؤ، نفیس کی تدفین میں شرکت کروگے؟"

"غیر ضروری ہوگا۔ میں فون پر تعزیت کرچکا ہوں، اتنا کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اپنے تصور کو بے لگام نہ ہونے دو" مقصود نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں اس بات کا خیال رکھوں گا مگر تم بھی اپنا خیال رکھنا۔"

ریسیور رکھنے کے بعد صابر کو احساس ہوا کہ اس کا آخری جملہ کس قدر مہمل تھا۔ وہ مقصود کو اپنا خیال رکھنے کی تلقین کررہا تھا یعنی اس کا تصور.... اندر کا خوف بدستور مصروفِ کار ہے۔

صابر خاموش بیٹھا اس وقت کو یاد کرتا رہا جب اس نے نفیس کی موت کی خبر سُنی تھی۔ شام پانچ بجے والی خبروں میں۔ اس کی موت کی خبر سُنتے ہی خوف اس کے وجود میں رینگنے، سرسرانے لگا تھا۔ ایسا خوف جس کی موجودگی سے اس نے خود کو باخبر رکھا تھا۔ برسوں پہلے تاجور کے فارن آفس میں سروس کے دوران یہی اس کی بقا کا راز تھا۔ اپنے خوف سے بے خبر رہنا، اسے تسلیم نہ کرنا۔ وہ ابتدا ہی سے اس کام کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کا دل کمزور تھا اور اعصابی کشیدگی اس کے لیے ایک نارمل چیز تھی۔ اگر وہ فیلڈ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کررہا ہوتا تو اب تک کبھی کا مرچکا ہوتا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ریک پر رکھا ہوا اسموکنگ پائپ اٹھالیا۔ پائپ کو بھرنے اور سُلگانے کا روایتی سُست رفتار عمل اسے پُرسکون کردیتا تھا۔ کسی زمانے میں وہ یومیہ ساٹھ سگریٹ پیتا تھا۔ پھر اس نے سگریٹ چھوڑی اور پائپ شروع کردیا۔ پائپ کے لیے وہ بہت ہلکا تمباکو استعمال کرتا تھا جس میں نکوٹین کی مقدار بہت کم ہوتی تھی۔

پائپ سُلگا کر اس نے چند ہلکے کش لیے اور بالکنی میں چلا آیا۔ وہاں کھڑا ہو کر وہ روشن شہر کو دیکھتا رہا۔ جگمگاتا ہوا وہ شہر اتنی بلندی سے بہت خوب صورت لگتا تھا۔ اس نے سوچا، نیچے چلتے پھرتے ہزاروں لوگوں میں اگر کسی کو میری جستجو ہو تو اس بالکنی میں کھڑا میں کس قدر غیر محفوظ ہوں۔ محفوظ تو ویسے کوئی بھی نہیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ میں مشہور بھی ہوں، پریس نے مجھے بدنام بھی بہت کیا ہے اور لوگوں کو یہ احساس بھی ہے کہ اس ملک میں انصاف کا دُہرا معیار رائج ہے۔ تو ایسے میں یہ ناممکن بھی نہیں کہ نیچے کوئی قاتل موجود ہو جس کا ہدف میں ہوں۔

O☆O

قاتل ... موت جن کے ہم رکاب ہوتی تھی، ایک چھوٹے سے خوب صورت شہر میں آتے تھے، تھوڑا عرصہ رُکتے تھے اور جان لینے کے فن میں اور طاق ہو کر واپس جاتے تھے۔ وہاں انٹیلی جنس والوں کا خاص تربیتی مرکز تھا۔ وہاں قتل کے سلسلے میں تمام ہُنر سکھائے جاتے تھے۔ تنویر الزماں 1975ء میں تربیت کی غرض سے وہاں بھیجا گیا تھا۔ گلوریا ہمنز وہاں انسٹرکٹر تھی۔ وہ نسلاً انگریز تھی جو روس میں پلی بڑھی تھی۔

گلوریا خوب صورت، دراز قامت عورت تھی۔ عمر چھبیس ستائیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ پانچ سال سے خداداد کی انٹیلی جنس کے لیے کام کررہی تھی۔ روسی زبان سے بھی واقف تھی۔ کہا جاتا کہ وہ بے حد خطرناک عورت ہے۔

تنویر پہلی نظر میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا!

تنویر نے پیش قدمی کی، گلوریا نے حوصلہ افزائی کی، دونوں کے درمیان تعلقات قائم ہو گئے۔ یہ انہیں بہت بعد میں پتا چلا کہ انٹیلی جنس والے خود انہیں یکجا کرنا چاہتے تھے۔ وہاں تربیت کے دوران

تنویر نے کئی غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ اس کی ایک ساکھ بن گئی۔

وہیں تنویر کی شاکر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ شاکر وہاں ایک اہم عہدے پر کام کر رہا تھا۔ ایک طرح سے وہ وہاں انچارج تھا۔

تنویر کو جیسے گلوریا سے محبت ہوگئی تھی، ویسے ہی شاکر سے نفرت ہوئی تھی۔ اس کی ماتحتی میں تنویر نے ایک ایسے مشن کے لیے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں، جسے خودکشی کا مترادف ہی کہا جاسکتا تھا۔ اسی کی بنیاد پر اس کی یہ ساکھ بنی کہ.... تنویر جنونی آدمی ہے۔ اپنے مقصد کے لیے جان دینے سے بھی نہیں ڈرتا۔ وہ مشن عین موقعے پر کینسل ہوگیا تھا اور تنویر کو بہت افسوس ہوا تھا۔

پھر ایک دن گلوریا نے تنویر کو بتایا "میرا تبادلہ محراب نگر ہوگیا ہے۔"

تنویر اداس ہوگیا۔ وہ اس تعلق کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بے یقینی سے بھری پَل پَل رنگ بدلتی زندگی میں گلوریا سے اس کا تعلق استقلال اور ٹھہراؤ کی علامت تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ گلوریا سے محبت کرتا ہے اور اس کی کمی محسوس کرے گا۔

گلوریا چلی گئی اور دو ماہ بعد تنویر کو پتا چلا کہ گلوریا نے شاکر سے شادی کرلی ہے۔

وہ وقت تنویر کے لیے بہت سخت تھا۔ اس کی ذہنی ابتری کی وجہ سے اسے فیلڈ ورک سے ہٹا کر آفس میں دفتری کاموں پر لگادیا گیا۔ اس عرصے میں دوبار اس نے خودکشی کی کوشش کی لیکن خود ہی ارادہ بدل دیا۔ وہ خود بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ واقعی خودکشی کرنا چاہتا تھا یا نہیں مگر اسے یہ احساس ضرور تھا کہ اس عرصے میں اس نے احمقانہ حرکتیں کی ہیں۔ وہ معقولیت سے دور ہوگیا تھا لیکن وہ ایسا آدمی تھا جو معقولیت سے زیادہ عرصہ دور نہیں رہ سکتا تھا۔

پھر ایک دن ایسا آیا جب غمِ جاناں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ وہ گلوریا کو نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ اس کی محبت ترک بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن اس نے اس محبت کو ذہن کے ایک گوشے میں.... ایک کوٹھری میں دھکیل کر کوٹھری کا دروازہ مقفل کردیا تھا۔ جس بلا کو وہ ختم نہیں کرسکا، اسے اس نے زندہ دفن کردیا۔

اس کے بعد وہ دوبارہ فیلڈ ورک میں آگیا.... کارنامے انجام دینے کے لیے!

چار سال بعد اس نے فوزیہ سے شادی کرلی۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ شادی گلوریا کی یاد کو بالکل ختم کردے گی۔ برسوں وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ گلوریا کی محبت سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوگیا ہے لیکن جب گلوریا کی مُڑی تُڑی لاش پہاڑی سڑک کے نیچے کھائی میں ٹوٹی پھوٹی کار میں پائی گئی تو اسے پتا چلا کہ وہ گلوریا کو نہیں بھول سکا تھا۔

○☆○

اویس جاوید نے کئی پیشے تبدیل کیے تھے۔ انٹیلی جنس چھوڑنے کے بعد اس نے عملی سیاست میں قدم رکھا لیکن سرمائے کی کمی کی وجہ سے سیاست کا کاروبار چمک نہیں سکا پھر وہ ایڈورٹائزنگ کی فیلڈ میں آگیا۔ اس کے بعد صدر محمود شامی نے اسے اپنا اپائنٹ منٹ سیکریٹری مقرر کرلیا۔

محمود شامی کے استعفے کے بعد وہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے کمیٹی کے ساتھ تعاون کیا لیکن اس سے زیادہ تعاون اپنے ساتھ کیا۔ مفاد پرستوں کی روایت کے مطابق اس نے بھی سارے الزامات ایک ایسے شخص کے کھاتے میں ڈال دیے جس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ خود سزا سے صاف بچ نکلا۔

اس بحران سے نکلنے کے بعد وہ جاسوسی ناول نگار بن گیا۔ انٹیلی جنس کا تجربہ بھی اس کے کام آیا اور تعلقات تو کام آتے ہی ہیں۔

اس وقت وہ آبشار ہوٹل میں منعقد ہونے والے کرائم رائٹرز کونشن میں شریک تھا۔ حالانکہ ابھی تک اس کا صرف ایک ناول شائع ہوا تھا "سرکاری چور"۔ سرکاری چور کا پس منظر گیٹ وے اسکینڈل تھا۔ اس ناول نے اسے اپنی صلاحیتوں کا احساس دلا دیا تھا۔ لکھنے کے معاملے میں اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ ان دنوں وہ ایک اور پلاٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کونشن سے واپس جاتے ہی دوسرا ناول شروع کردے گا۔

آبشار کے امپیریل روم میں مشہور مسٹری رائٹرز موجود تھے۔ ان کے پرستار ان سے سوال کر رہے تھے... باتیں کر رہے تھے۔ اویس کوکا کولا کی بوتل ہاتھ میں لیے اسٹرا سے سپ کر رہا تھا۔ وہ کونشن سے بہت محظوظ ہوا تھا۔ اسے زندگی میں اپنا یہ نیا رول بھی بہت پسند آیا تھا۔ مسٹری رائٹرز دوسرے رائٹرز سے اس اعتبار سے مختلف تھے کہ وہ زیادہ خوش مزاج تھے۔ ان کے انداز میں بناوٹ نہیں تھی۔

اویس جاوید کا ناول "سرکاری چور" کوئی بہت اچھا ناول نہیں تھا لیکن وہ مقبول بہرحال ہوا تھا۔ اس کی بنیاد ایک حقیقت پر تھی۔ اس کی اشاعت کا وقت بھی بہت عمدہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اس وقت اس کا چوتھا ایڈیشن بک اسٹالز پر موجود تھا۔ تعلقات کی وجہ سے اسے پبلشر بھی بہت اچھا مل گیا تھا۔ پبلشر کی ساکھ بھی بہت اہم ہوتی ہے۔

"اویس صاحب، پلیز..."

اویس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک مُعمّر خاتون "سرکاری چور" کی کاپی اور ایک خوب صورت قلم اس کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کتاب ہاتھ میں لی، قلم لیا اور بڑی روانی سے کتاب کے پہلے صفحے پر آٹوگراف دے دیا۔

"مجھے امید ہے' اس کتاب سے محظوظ ہوئی ہوں گی آپ" اس نے خاتون کو کتاب واپس دیتے ہوئے کہا۔
"جی ہاں" خاتون نے جواب دیا "کردار اتنے حقیقی تھے کہ بس۔"
خاتون چلی گئی' اویس بیٹھا مسکراتا رہا۔ اسے آٹوگراف دینا بہت اچھا لگتا تھا۔ اسے مسٹری رائٹرز کی .... پرستاروں کی کمپنی اچھی لگتی تھی۔
اسی وقت ایک اناؤنسمنٹ ہوا۔ کونشن کے منتظمین میں سے ایک اعلان کررہا تھا "اب آدھے گھنٹے تک چھٹی منزل پر واقع پرل ہال میں ملک کے مشہور مسٹری رائٹرز اپنی کتابوں پر دستخط کریں گے۔"
اویس نے پروگرام کارڈ پر نظر ڈالی۔ پھر اسے یاد آیا کہ آٹوگراف کی اس تقریب میں اسے بھی شریک ہونا ہے۔ وہ اٹھا اور لفٹ کی طرف چل دیا۔ راستے میں کئی پرستار اس کی طرف بڑھے لیکن اس نے انہیں نظرانداز کردیا۔
جہاں فون بوتھ کی قطار تھی' وہاں سے گزرتے ہوئے اسے ایک بوتھ میں ایک ایسا شخص نظر آیا جو اپنے نقوش سے تاجوری لگ رہا تھا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔
وہ شخص اس کے کمرے کا ایکسٹینشن نمبر ڈائل کررہا تھا۔ یہ یقین حاصل کرنے کے لیے کہ کمرے میں کوئی موجود نہیں۔
آدھا گھنٹا گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دستخط کرتے کرتے اویس کے ہاتھ دُکھ گئے۔ اسے خوشی تھی کہ اب ایک گھنٹا آرام کا ہوگا۔ ایک گھنٹے بعد نیچے گولڈن ہال میں شرلاک ہومز کی ایک مسٹری فلم دکھائی جانا تھی۔ اس کے بعد رات کا کھانا' پھر سوال وجواب کا سیشن اور تقریریں۔ سوال وجواب کے سیشن میں اسے اپنے اگلے سیاسی تھرلر کے بارے میں شرکا کے سوالوں کے جواب دینے تھے۔
وہ جانتا تھا کہ یہ سب تھکا دینے والے مرحلے ہیں۔ اس اعتبار سے آرام کا یہ ایک گھنٹا بہت بڑی نعمت تھا۔
وہ اٹھا اور منتظمین سے ہاتھ ملائے۔ تمام وقت وہ مسکراتا رہا تھا۔ پھر وہ آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔
پانچ منٹ بعد اس کا ایجنٹ کمال پرل ہال میں داخل ہوا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے اویس کہیں نظر نہیں آیا "اویس کو دیکھا ہے آپ نے؟" اس نے ایک جانے پہچانے مسٹری رائٹر سے پوچھا۔
"ابھی تو یہیں تھا وہ۔ شاید نیچے چلا گیا' یا ممکن ہے' اپنے کمرے میں ہو۔"
کمال نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہال سے نکل آیا۔ اس کے پاس اویس کے لیے ایک خوش خبری تھی۔ ٹی وی کا ایک پروڈیوسر اویس کے ناول کو فلمانا چاہتا تھا۔ ٹی وی والے اس کے لیے بھاری معاوضہ دینے کو آمادہ تھے۔ اس کے علاوہ فلم والوں کی ایک پیشکش بھی تھی۔
لفٹ کے پاس کھڑے ہوکر کمال سوچتا اور اُلجھتا رہا۔ وہ فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ نیچے لابی کا رُخ کرے یا بارھویں منزل کے اس کمرے کا جہاں اویس مقیم تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ جو لفٹ بھی پہلے آئے گی وہ اس میں بیٹھ جائے گا۔ اب اوپر جانے والی لفٹ آئے یا نیچے جانے والی' اس نے دونوں بٹن دبا دیے۔

○☆○

اویس نے اپنے کمرے کے دروازے میں چابی لگائی' دروازہ کھولا اور چھوٹے سے داخلی ہال میں قدم رکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مسٹری ناولوں میں ہونے والے جرائم حقیقی دنیا میں ہونے والے جرائم سے کتنے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ گزشتہ تین دن سے مسلسل یہ بات سوچ رہا تھا۔ کونشن میں شریک بیشتر لوگوں کے نزدیک قتل ایک ایسی بے لوث چیز ہوتی ہے جو اگاتھا کرسٹی کے ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ یا وہ پولیس کی انکوائری ہوتی ہے جو ایک ارتقائی عمل کے تحت بالآخر ایک منطقی نتیجے تک پہنچ جاتی ہے۔
'شاید اسی لیے اسے فکشن کہا جاتا ہے۔' اس نے سوچا۔
وہ بیڈ پر جا بیٹھا۔۔۔ اور اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ پچھلے چند برسوں میں وہ خود کو تھکا تھکا اور بوڑھا محسوس کرنے لگا تھا۔ اکثر اسے عہد جوانی کے پچھتاوے ستاتے۔ 'اگر نیچے موجود لوگوں کو معلوم ہو کہ میں کیا کچھ کرتا رہا ہوں...' اس نے سوچا' 'تو وہ....'
اس نے ایک انگڑائی لے کر بیڈ سے کمر ٹکائی اور آنکھیں موند لیں۔ 'خدا کا شکر ہے کہ یہ بات کچھ ہی لوگ جانتے ہیں۔'
مگر وہ آرام نہیں کرسکا۔ کوئی ناقابل فہم چیز اس کے ذہن میں رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اور وہ چبھن اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار بھی نہیں تھی۔
اس نے آنکھیں کھول دیں۔
بیڈ کے قریب کھڑکی کے پردے پوری طرح سرکے ہوئے تھے

ایک بوڑھی عورت نیند نہ آنے کے مرض میں مبتلا تھی۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہوکر وہ ایک ہپناٹسٹ کے پاس گئی۔ وہ بے چارہ بھی کوئی دو گھنٹے اسے "آپ سو رہی ہیں' آپ کو نیند آرہی ہے۔" وغیرہ وغیرہ کہتا رہا مگر بات نہیں بنی۔ بالآخر اس نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں خاتون کہ میں آپ کو سُلانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔"
اس پر وہ عورت بولی۔ "خیر..... تم بالکل ناکام بھی نہیں رہے' کم از کم میری ٹانگیں سو گئی ہیں۔"

اور سہ پہر کی دھوپ کو اندر آنے سے روک رہے تھے۔ اسے یاد تھا کہ اس نے پردوں کو کس حد تک کھلا چھوڑا تھا۔ ہوٹل کا صفائی کرنے والا صبح کے وقت صفائی کر گیا تھا۔ دوبارہ وہ آتا بھی نہیں تھا۔

اسے ہوا کی مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک ثانئے میں اسے قوسی شکل میں حرکت کرتا ہوا ایک ہاتھ.... اور ایک سنجیدہ تاجوری چہرہ نظر آیا جو نہ جانے کیوں جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک چاقو تھا۔

تکلیف نے اس کی سانس توڑ دی۔ وہ بستر پر گرا۔ وہ تکلیف اُسے ایسی لگی جیسی دو سال پہلے دل کے دورے کے دوران ہوئی تھی۔ اسے آنکھوں کو چُندھیا دینے والی روشنی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا اور پھر تکلیف کا احساس بھی نہیں رہا۔ وہ بے وزنی کی سی کیفیت میں خود کو ہوا میں تیرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

آنکھوں کو چُندھیا دینے والی روشنی سرخ ہوئی.... پھر گہری سرخ اور پھر سیاہ ہو گئی۔

اویس جاوید نے فوراً ہی دم توڑ دیا۔ چیخ جو اس کے ہونٹوں پر ہوا کے بلبلے کی طرح مچلی تھی، باہر نہیں آ سکی۔

حمید نے چاقو سے چند اور وار کیے.... اناڑی پن سے۔ تاکہ وہ کسی مشتعل اور اناڑی شخص کا کام لگے۔ چاقو سستا سا عام قسم کا تھا جو کسی بھی دُکان سے کوئی بھی خرید سکتا تھا۔ چاقو اس نے بیڈ کے نیچے پھینک دیا۔ پھر اپنے ربر کے دستانے بھی اتار کر چاقو کے ساتھ ڈال دیے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

حمید ساکت کھڑا بیڈ کے گدّے کو اویس کے خون سے سرخ ہوتے دیکھتا رہا۔

"اویس؟" ایک اور دستک کے بعد کسی نے پکارا "میں ہوں کمال۔"

حمید بدستور ساکت کھڑا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والے کے پاس چابی نہیں ہے اور وہ دروازہ نہیں کھول سکے گا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس صورت حال سے گھبرا جاتا اور ملحقہ کمرے میں باتھ روم کے راستے داخل ہونے کی کوشش کرتا.... اس اُمید پر کہ دوسرا کمرا خالی ہوگا اور وہ وہاں سے فرار ہو سکے گا۔ حمید نے بھی اس امکان پر غور کیا لیکن اسے فوراً ہی مسترد بھی کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ باہر صرف ایک آدمی ہے اور اگر ٹکراؤ ہوا تو وہ اسے بہ آسانی سنبھال سکے گا۔

ایک منٹ بڑی سست رفتاری سے گزرا۔ حمید کھڑا ایک ایک سیکنڈ گنتا رہا۔ خون اب بیڈ سے ٹپک کر نیچے قالین میں جذب ہو رہا تھا۔

دروازے پر اس دوران کوئی دستک نہیں ہوئی۔ کوئی آہٹ بھی نہیں سنائی دی۔ شاید دستک دینے والا واپس چلا گیا تھا۔

حمید نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک برآمد کی۔ وہ اس نے صبح ہی ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے کاسمیٹکس کاؤنٹر سے خریدی تھی۔ لپ اسٹک سے اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر لکھا.... فاشسٹوں کے لیے موت۔ فاشسٹوں کی ہجے اس نے دانستہ غلط لکھی تھی۔

لپ اسٹک کو جیب میں رکھنے کے بعد اس نے ہر وہ جگہ صاف کی جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات رہ جانے کا امکان تھا۔ پھر وہ کمرے سے نکل آیا۔

لفٹ میں اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے جو نچلی منزلوں سے لفٹ میں سوار ہوئے تھے۔ لفٹ نیچے پہنچی دروازہ کھلا، پانچ چھ افراد بہت جلدی میں لفٹ میں گھسے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "انہوں نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں گے۔"

"وہ وہاں نہیں ہے۔ میں چیک کر چکا ہوں" ایک شخص بولا۔

حمید کے خیال میں یہ آواز وہ سن چکا تھا۔ دستک دینے کے بعد اسی شخص نے اویس کو پکارا تھا اور اس شخص کا نام یقیناً کمال تھا "مجھے ٹی وی والوں کے اس اگریمنٹ پر اس سے دستخط کرانے ہیں۔"

حمید لفٹ سے نکل آیا۔



تنویر نے اپنا مکان فروخت کر دیا تھا اور اسی روز چھوٹے سے ایک اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوا تھا، اب وہ مستقبل کی طرف سے بے فکر تھا۔

ٹھیک دس بجے رات، فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ تنویر نے ریسیور اٹھایا مگر دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

وہ سمجھ گیا کہ حمید کامیاب ہو گیا ہے۔

"جانے کون تھا" اس نے فوزیہ سے کہا "پہلے ہی ریسیور رکھ چکا تھا۔"

وہ دونوں دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔



اس رات صابر ملک کلب سے دیر سے گھر واپس آ رہا تھا۔ اس کی وجہ تھی کلب کا شطرنج کا ٹورنامنٹ جس میں وہ بھی حصہ لے رہا تھا۔ کار کے ریڈیو پر گیارہ بجے کی خبروں میں اس نے اویس جاوید کے قتل کی خبر سنی۔

قتل! اس بار شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑ گئی، پیٹ میں گرہیں سی پڑ گئیں۔ اس نے گاڑی سائڈ میں لگا کر روک دی پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ تھامے ساکت وصامت بیٹھا رہا۔ اس نے کار کا انجن بھی بند نہیں کیا تھا۔

"چاقو کے کئی وار کیے گئے...."

نیوز ریڈر کی آواز اس کی ساعت میں گونج رہی تھی۔ اسے اپنا دماغ سُن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اویس جاوید زندگی سے ایسا بھرپور آدمی تھا کہ اس کی موت کا تصور کرنا بھی محال معلوم ہوتا تھا اور پھر موت بھی کیا، قتل!

صابر نے خود کار انداز میں ریڈیو آف کردیا اور کار آگے بڑھادی۔ اس بار غیر شعوری طور پر وہ زیادہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کررہا تھا۔ اچانک ایک چوراہے پر اسے سگنل کی زرد روشنی کا احساس ہوا۔ سڑک پار کرنے والا ایک راہ گیر بال بال بچا۔ راہ گیر نے پلٹ کر اسے ایک گالی دی مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے اسٹڈی کا رخ کیا اور مقصود کا نمبر ڈائل کیا۔ چھ گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے ریسیور اٹھایا گیا۔ مقصود کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔ وہ یقیناً سوتے سے اٹھا تھا۔

”مقصود، میں صابر بول رہا ہوں“ صابر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”بھائی، اتنی رات کو یہ کرم فرمائی کیوں؟“ مقصود نے لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی۔

”میں نے ابھی ابھی اویس جاوید کی موت کی خبر سنی ہے۔ اسے قتل کردیا گیا۔“

کم از کم دس سیکنڈ خاموشی رہی پھر مقصود کی صاف جاگتی آواز ریسیور پر ابھری ”کب؟ کہاں؟ کیسے؟ اور کس نے قتل کیا؟“

”کس نے اور کیوں کا تو ابھی پتا نہیں لیکن اسے آج کسی وقت مہر آباد کے آبشار ہوٹل میں اس کے کمرے میں قتل کیا گیا۔ چاقو کے پے در پے وار۔۔۔“

”مہر آباد میں وہ کیا کررہا تھا؟“

صابر، مقصود کے سکون کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا ”وہ مسٹری رائٹرز کے کنونشن میں شرکت کررہا تھا“ اس نے بتایا۔

”اب تو اس کی کتاب اور بکے گی۔“

”میرا خیال ہے اس کے قاتل نے یہ سوچ کر اسے قتل نہیں کیا ہوگا۔“

”پہلے نفیس جامی اور اب آٹھ دن بعد اویس جاوید“ مقصود بڑبڑایا ”یہ اتفاق تو نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ہو بھی سکتا ہے۔ لیکن اویس کسی حادثے کا شکار ہوا ہوتا تو میں زیادہ پریشان ہوتا۔ مہر آباد میں تو آئے دن قتل ہوتے رہتے ہیں۔“

”لیکن آئے دن قتل ہونے والے ایوانِ صدر کے سابق ملازمین نہیں ہوتے“ صابر نے اعتراض اٹھایا۔

”قتل کا کوئی محرک؟ رقم تو نہیں لوٹی گئی؟“

”خبر میں ایسی کوئی بات نہیں تھی“ صابر اس دوران اپنا پائپ بھرتا رہا تھا۔ پائپ سلگا کر اس نے کہا ”ہم اس امکان کو نظرانداز نہیں کرسکتے کہ اس کا تعلق ترارس سے ہو سکتا ہے۔“

”بالکل نہیں کرسکتے“ مقصود نے جواب دیا ”بلکہ ہم کسی بھی امکان کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ نہ ہی ہمیں ٹھوس حقائق کے بغیر نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی کرنی چاہیے۔ صبح تک ہمیں اس قتل کی تفصیلات معلوم ہوسکیں گی۔“

صابر اپنا خوف لہجے سے دور نہیں رکھ سکا ”یہ تو ٹھیک ہے لیکن ان دو مسلسل اموات کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ اتفاق ہے تو یہ بھی ہے کہ ہمیں ایسے اتفاقات کو قبول نہ کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ میرا خیال ہے، تمہیں یا مجھے ظہور سے بات کرنی چاہیے۔“

”ٹھیک ہے، پہلے قتل کی تفصیلات معلوم ہوجائیں پھر تم ظہور سے بات کرلینا۔ مجھے بھی بتادینا کہ کیا بات ہوئی۔“

صابر نے ریسیور رکھنے کے بعد پائپ کے ہلکے ہلکے کش لیے۔ اس کے لیے یہ بات باعثِ طمانیت تھی کہ مقصود کو بھی اس قتل سے پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جو خود کو ذرا سی بات پر گھبرا جانے والا سمجھتا تھا، درست نہیں تھا۔ وہ خواہ مخواہ خود کو تشویش کا مریض سمجھتا تھا۔

وہ اسٹڈی سے نکلا اور نشست گاہ میں آرام کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے پیٹ میں اب تک برف جیسی ٹھنڈی گرہیں حرکت کررہی تھیں لیکن وہ اسے خوف تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس کے نزدیک بقا اسی میں تھی کہ خوف کو قبول نہ کیا جائے۔

وہ سوچ رہا تھا۔ کاش ابھی صبح ہوجائے اور میں ظہور کو فون کرلوں۔



تنویر اور فوزیہ کا معمول تھا کہ وہ ٹی وی پر صبح کی خبریں ضرور دیکھتے تھے۔ تنویر باتھ روم میں کپڑے بدل رہا تھا کہ اس نے اویس کے قتل کی خبر سنی۔ وہ جلدی سے باہر آگیا اور بیڈ پر بیٹھ کر ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہوگیا۔

نیوز ریڈر بے حد غیر ذاتی اور غیر جذباتی انداز میں قتل کی تفصیلات بیان کررہا تھا ”اور خون میں نہائی ہوئی لاش ہوٹل کے کمرے میں پائی گئی۔ آلۂ قتل چاقو تھا جو بیڈ کے نیچے پڑا ملا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر لپ اسٹک سے۔۔۔ فاشسٹوں کے لیے موت۔۔۔ لکھ دیا گیا تھا۔ پولیس ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی ہے اور نہ ہی انہیں کسی پر شک ہے۔ تاہم آلۂ قتل کے علاوہ قاتل کے دستانے جائے واردات پر پائے گئے ہیں۔ اس سے تفتیش کی گاڑی آگے بڑھنے کا امکان ہے۔۔۔“

خبر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ قاتل نے آئینے پر فاشٹ کو فاشسٹ لکھا تھا۔ شاید پولیس اس بات کو اہم سمجھتے ہوئے چھپا رہی تھی۔ تنویر سوچ رہا تھا کہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ نووارد مسٹری رائٹر اویس جاوید کو مسٹری رائٹرز کے کنونشن میں، ملک کے نامور مسٹری رائٹرز

کی موجودگی میں قتل کیا گیا ہے۔ مسٹری کو فکشن سمجھنے والوں کے لیے ایک چیلنج... یا نئے ناول کے لیے ایک پاور فل پلاٹ۔

نیوز ریڈر بتا رہا تھا کہ کچھ رائٹرز سے انٹرویو کیا گیا۔ پھر اسکرین پر ایک رائٹر نظر آیا۔ وہ سنسنی خیز لہجے میں کہہ رہا تھا "میرے خیال میں قاتل اویس جاوید کے اوپر والے کمرے کی بالکنی سے جو کہ خالی تھا، رسّی کے ذریعے اتر کر اویس کے کمرے میں داخل ہوا ہوگا۔"

تنویر جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے ٹی وی دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اویس کے قتل کے لیے بہت مناسب مقام منتخب کیا گیا تھا۔ پولیس تفتیش شروع کرے گی تو درجنوں اندازے قائم کرے گی جن میں احمقانہ بھی ہوں گے اور نہایت معقول بھی کہ قتل کس نے کیسے اور کیوں کیا۔ اور لگے بندھے اصولوں کے تحت تفتیش کرنے والے امکانات کے سمندر میں بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتے نظر آئیں گے۔ اور ان میں کوئی امکان حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوگا۔ پھر امکانات کے بطن سے مزید امکانات جنم لیں گے...

اور یہ فیصلہ بھی مناسب اور عقل مندانہ تھا کہ اویس جاوید کی موت قتل ہی نظر آئے۔ یوں اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ نفیس اور اویس کی اموات کو کسی بھی طور پر ایک دوسرے سے جوڑا جائے۔

فوزیہ بھی بڑی توجہ سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"یہ توقع نہ رکھنا کہ میں اس پر اظہارِ افسوس کروں گا" تنویر نے اس سے کہا "روایت ہے کہ مرنے والوں کو برا نہ کہا جائے۔ لیکن اویس اپنی ابتدا سے انتہا تک نہایت خبیث آدمی تھا۔"

فوزیہ نے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دی "آج ناشتا باہر کریں گے" وہ بولی۔



محمود شامی دس بجے تک ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اب وہ ظہور کی معمول والی کال کا منتظر تھا۔ دیواری کیبنٹ کے خفیہ خانے میں رکھا ہوا فون اس کے سامنے میز پر رکھا تھا۔ محمود فون کو یوں گھور رہا تھا جیسے اس سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔

باہر لان میں گھاس کاٹنے والی مشین چلائی جا رہی تھی۔ اس کی مشینی آواز اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔

ٹھیک بارہ بجے سفید انسٹرومنٹ میں لائٹ جلنے بجھنے لگی۔ اس انسٹرومنٹ میں گھنٹی نہیں بجتی تھی۔

محمود شامی نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ وہ دوسری طرف سے کسی کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔

"ہیلو؟"

"ہیلو ظہور۔"

"میرا خیال ہے، آپ نے خبر سن لی ہوگی۔"

"اویس جاوید کی؟ ہاں۔ افسوس ہوا سن کر" وہ کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ اسے واقعی افسوس ہوا تھا۔ وہ اویس کو پسند کرتا تھا "اور وزارتِ عظمیٰ کی کیا پوزیشن ہے؟ امیدواروں کی مقبولیت میں کوئی کمی بیشی؟"

"نہیں، صورتِ حال بدستور ہے۔"

"بہرحال، نظر رکھنا۔ صورتِ حال بدستور ہونے کی اپنی ایک اہمیت ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں، میں نظر رکھے ہوئے ہوں۔ پارٹی کے اندر اہم لوگوں سے میرا رابطہ ہے۔"

محمود شامی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ظہور کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ظہور کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے۔

بالآخر ظہور کی دبی دبی آواز ریسیور پر ابھری۔ "صبح صابر ملک نے مجھے فون کیا تھا... بہت سویرے۔"

"اویس کے سلسلے میں۔"

"جی ہاں۔ صابر نے رات ریڈیو پر اویس کے قتل کی خبر سنی پھر اس کے اور مقصود کے درمیان گفتگو ہوئی۔ وہ پریشان ہیں... خاص کر صابر۔ ان کا خیال ہے کہ نفیس اور اویس کی موت کے درمیان کوئی تعلق ہے۔"

"یہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا" محمود شامی نے کہا "لیکن اس کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں نظر آئی مجھے۔"

"دونوں کی موت کے درمیان بظاہر کوئی چیز مشترک نہیں۔ اب اسی کو اس شک کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔"

"تمہیں ان معاملات کی سمجھ ہے۔ تم بتاؤ، کیا تمہیں شک ہے کہ دونوں موتوں کے درمیان کوئی تعلق ہے؟"

ظہور صرف ایک لمحے کے لیے ہچکچایا "لفظ شک بہت بھاری معلوم ہوتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ایک ہفتے کے فرق سے ہونے والی ان دو اموات کو اتفاق کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے جبکہ دونوں افراد کی موت قدرتی نہیں تھی۔ ہمیں اویس کی موت کی تفتیشی کارروائی پر نظر رکھنی ہوگی۔ میں نے اپنے ایک آدمی کو سمجھا دیا ہے۔ وہ اویس کے دوست کی حیثیت سے پولیس سے رابطہ رکھے گا۔"

"فی الوقت پولیس کا کیا خیال ہے؟"

"کوئی خیال نہیں۔ ان کے سامنے امکانات قطار لگائے کھڑے ہیں۔ ممکن ہے، قاتل کوئی نقب زن رہا ہو جو اویس کی اچانک واپسی سے گھبرا گیا ہو۔ یہ سیاسی قتل بھی ہو سکتا ہے۔ دشمنی بھی سبب ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے، یہ کسی پیشہ ور قاتل کا کام ہو۔ ممکن ہے، قاتل اناڑی ہو۔ میرا خیال ہے اگر قاتل نے خود سامنے آکر اعترافِ جرم نہیں کیا تو یہ ان جرائم میں سے ہے جو کبھی حل نہیں ہوتے۔"

"کوئی نہ کوئی سراغ تو بہرحال ملا ہوگا" محمود شامی نے خیال آرائی کی۔

"یہی تو رونا ہے کہ سراغ ہی سراغ ہیں' امکانات ہی امکانات ہیں لیکن کارآمد کوئی نہیں۔"

"تو ہم تفتیش پر نظر رکھنے کے سوا کیا کرسکتے ہیں" محمود شامی نے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اس سلسلے میں ظہور اس سے کیا توقع کررہا ہے۔

"صابر اور مقصود اپنے تحفظ کے سلسلے میں یقین دہانی چاہتے ہیں۔"

"باڈی گارڈز چاہتے ہیں وہ؟"

"انہوں نے کہا تو نہیں۔ اور میرے خیال میں ابھی یہ بہت قبل از وقت ہے۔"

"بس تو انہیں میری طرف سے بتادینا کہ وہ محفوظ ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

ظہور نے موضوع بدل دیا "سلیم پور کے پارٹی الیکشن کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم اگلی کال پرسوں اپنے مخصوص وقت پر کروگے۔ اور ہاں.... صابر' مقصود اور دوسرے لوگوں کو بتادینا کہ میں ان کے تحفظ کا ہر ممکن خیال رکھوں گا۔"

"او کے سر۔"

محمود شامی نے انسٹرومنٹ کیبنٹ کے خلا میں چھپادیا۔ پھر وہ پیٹھ پر ہاتھ باندھے ٹہلنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ اپنی میز کے قریب ٹھہر گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بڑے معاملات تو پوری طرح اس کے قابو میں ہیں لیکن کچھ چھوٹے اور غیراہم معاملات اس کے ہاتھوں سے پھسلے جارہے ہیں۔ ماضی میں بھی اکثر ایسا ہوتا رہا تھا۔ بظاہر غیراہم معاملات اس کے قابو سے باہر ہوتے ہی اہمیت اختیار کرگئے تھے اور خطرناک ثابت ہوئے تھے۔

ایک تو رضیہ بھی مسئلہ بن گئی تھی۔ اس کا رویّہ اب اس کے وجود میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا تھا۔ وہ ثمینہ سے ملنے گئی تھی۔ رضیہ سمجھتی تھی کہ وہ اسے بے خبر رکھ کر ملک بھر میں گھومتی پھرتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ ثمینہ نے کافی عرصے سے فون نہیں کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں رضیہ اس کی چہیتی بیٹی کو اس کے خلاف بھڑکا تو نہیں رہی ہے۔ اپنے چار بچوں میں سابق صدر کو سب سے زیادہ اپنی یہی بیٹی پیاری تھی۔ محمود شامی کبھی یہ بات ظاہر نہیں کرسکتا تھا لیکن رضیہ شاید یہ بات جان گئی تھی۔ بیویاں شوہروں کی کمزوریوں سے واقف ہو ہی جاتی ہیں۔ اور برگشتہ ہوجائیں تو ان معلومات سے استفادہ بھی کرتی ہیں۔

محمود شامی اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر اس نے ایک چابی کی مدد سے میز کی سب سے نچلی دراز کھولی اور شراب کی ایک بوتل اور ایک جام نکالا۔ جام میں شراب انڈیلنے کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ پیتا بھی ہے۔ اسی لیے وہ شراب چھپا کر رکھتا تھا اور صرف تنہائی میں پیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سیاست میں ایسی ایک کمزوری انسانوں کو تباہ کردیتی ہے' خواہ وہ کتنے ہی سچے' کتنے ہی اہل ہوں۔

دو جام پینے کے بعد اس نے جام دھویا اور بوتل اور جام کو دوبارہ دراز میں مقفل کردیا۔

پھر اس نے ایک فائل اٹھائی اور اس کے مندرجات پڑھنے لگا۔ اس فائل میں وہ سوالات تھے جو بی بی سی کے ٹی وی انٹرویو میں اس سے کیے جانے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بہت تھوڑے لوگ اس کے جوابات پر یقین کریں گے لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ اب تک ایسی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

وہ بڑی توجہ سے سوالات پڑھتا رہا۔ اسے بہت محتاط رہ کر جوابات دینے تھے۔ میڈیا کے گدھ ابھی تک اس کی مُردہ سیاست کے ڈھانچے پر منڈلا رہے تھے۔

لیکن محمود شامی اپنی توجہ سوالوں پر مرکوز نہیں کرپا رہا تھا۔ ٹائپ شدہ حروف اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتے اور دھندلا جاتے۔ اس کی نظریں بار بار اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتیں۔

وہ سوچنے لگا کہ مقصود اور صابر کے تحفظ کے سلسلے میں کیا کیا جائے۔ امکان تو یہی تھا کہ انہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں لیکن انہیں کچھ ہوجائے' یہ بہرحال اس کے مفاد میں نہیں تھا۔ صورت حال نازک تھی۔ ذرا سی تبدیلی بھی تباہ کن ثابت ہوسکتی تھی۔

باہر گھاس کاٹنے والی مشین کی آواز کچھ زیادہ ہی بلند محسوس ہونے لگی۔ وہ جھنجلا گیا۔ ایک تو ویسے ہی ذہنی یکسوئی حاصل نہیں ہورہی تھی' اس پر وہ منحوس آواز! اس نے جھٹکے سے انٹرکام کا بٹن دبادیا "یہ گھاس کاٹنے کا سلسلہ کب تک چلتا رہے گا! رکواؤ اسے" وہ انٹرکام پر غرایا۔

ایک منٹ کے اندر اندر مشین بند ہوگئی لیکن اسے احساس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا ہے جو اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس نے دوبارہ نچلی دراز کھولی اور بوتل نکال لی۔ اس بار اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔

○☆○

محمود شامی اپنے دفتر کی کھڑکی میں کھڑا نیلی مرسیڈیز کو گیٹ پر سیکیورٹی کے مراحل سے گزرتے دیکھ رہا تھا۔ اسے توقع تھی کہ پچھلی سیٹ پر رضیہ بیٹھی ہوگی لیکن کار میں سیکرٹ سروس کے ڈرائیور کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ ۸۸ء کے ماڈل کی مرسیڈیز تھی۔ محمود شامی سوچ رہا تھا کہ ملک بھر میں اس ماڈل اور اس رنگ کی کتنی گاڑیاں ہوں گی؟ محافظ نے ڈرائیور کو بہت غور سے دیکھا اور گاڑی کی نمبرپلیٹ پر تو بالکل بھی توجہ نہیں دی۔ یعنی نیلے رنگ کی کوئی بھی مرسیڈیز قصرِ جمہوریت میں بڑی آسانی سے داخل ہوسکتی

ہے۔

عین ممکن تھا کہ صابر ملک کا خوف برحق ہو، نفیس اور اویس کی اموات ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہوں۔ اگر ایسا ہے تو اس زنجیر کی اور کڑیاں بھی ہوں گی جو باری باری زنجیر میں شامل ہوتی رہیں گی۔

وہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا، ٹیلی فون کا ایک بٹن دبا کر اس نے سیکرٹ سروس کے حفاظتی دستے کے چیف نصیر کو طلب کیا۔ ایک منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی "اندر آجاؤ" محمود شامی نے پکارا۔

نصیر دُبلا پتلا چاق وچوبند آدمی تھا۔ اس کی شخصیت ایسی تھی کہ اسے دیکھ کر تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ محمود شامی کا اشارہ پاکروہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

محمود شامی نے دونوں ہاتھ میز پر پھیلا دیے اور انہیں بغور دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھایا اور عام سے لہجے میں کہا "میرا خیال ہے، حفاظتی انتظامات کو کچھ اور سخت ہونا چاہیے۔"

"ایسا ہو سکتا ہے جناب" نصیر نے کہا "میں حفاظتی انتظامات میں اضافہ کر سکتا ہوں۔"

"اضافے کی تو نوبت نہیں آئی ہے ابھی، میں صرف سختی کی بات کر رہا ہوں۔ گارڈز کو اور چوکنا اور محتاط رہنے کی ہدایت کر دو۔ وقت بہت خراب ہے" یہ کہتے ہوئے محمود شامی اپنے دفتر کی کھڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کھڑکی میں بُلٹ پروف شیشہ لگوانے کی ضرورت نہیں۔ کھڑکی کے سامنے لان ہے اور اندرونی گیٹ والی تنگ سڑک۔ لان ڈھلوانی ہے اور جہاں لان ختم ہوتا ہے، وہاں سے آہنی جنگلا شروع ہو جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی گن مین کھڑکی سے اسے نشانہ نہیں بنا سکتا۔ اول تو کوئی شخص اس نیت سے لان تک پہنچ ہی نہیں سکتا اور پھر کھڑکی تو وہ بیشتر وقت کھلی رکھتا ہے۔ ایسے میں بُلٹ پروف شیشہ کیا کرے گا۔

اس احساس نے اسے چونکا دیا کہ وہ بے ربط انداز میں سوچ رہا ہے۔

"یہ نفیس جامی اور اویس جاوید والا معاملہ ہے سر؟"

نصیر کے اس سوال نے محمود شامی کو اور بُری طرح چونکا دیا "میں دراصل ہر امکان پر نظر رکھنے کا قائل ہوں" اس نے سنبھل کر کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نصیر نے بھی ان دونوں اموات کو ملا کر بیان کیا ہے۔ نصیر جیسے لوگ بہت تیز حس رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی جبلت بہت توانا ہوتی ہے۔

"ٹھیک ہے جناب۔ میں اپنے آدمیوں کو سمجھا دوں گا۔ اس کے علاوہ الیکٹرونک آلات کی فریکوئنسی بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔"

"میرے ذہن میں بھی یہی کچھ تھا۔ ان دنوں سیاسی سرگرمیاں عروج پر ہیں اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کچھ بھی ہوتا رہے جناب، ہم ہر طرح سے تیار رہیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تمہاری کارکردگی بے مثال ہے۔ میں نے تو احتیاطاً مزید چوکنا رہنے کی ہدایت دی ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ بہتری کی گنجائش ہر صورت میں رہتی ہے۔"

محمود شامی نے دل ہی دل میں نصیر کے آخری جملے کو سراہا۔ اس کا یہی انداز تو تحفظ کا احساس بڑھا دیتا تھا "کل سہ پہر ایک شخص مجھ سے ملنے آرہا ہے۔ وہ ایک پرانی سفید کرولا میں ہوگا۔ یہ ہے اس کی گاڑی کا نمبر" محمود شامی نے کاغذ کا ایک پُرزہ اس کی طرف بڑھایا "اسے گیٹ سے گزرنے دینا اور مجھ تک پہنچنے کے سلسلے میں ہدایات دے دینا۔"

"بہتر جناب" نصیر نے کاغذ کا پُرزہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

محمود شامی اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ملاقات اختتام کو پہنچی "اور جو تبدیلیاں کرو، مجھے ان سے مطلع کر دینا۔"

"ٹھیک ہے جناب" نصیر بھی اٹھ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ پلٹا "اگر مستقبل میں آپ کو معمولی سا شک بھی ہو کہ کوئی خطرہ منڈلا سکتا ہے تو آپ مجھے جلد از جلد بتا دیجئے گا۔ میرے لیے آسانی رہے گی۔"

"ضرور۔"



اگلی سہ پہر واجد ٹھیک وقت پر قصرِ جمہوریت پہنچا۔ محمود شامی نے راہداریوں کی بُھول بُھلیوں سے گزرنے میں دانستہ طور پر اس کی مدد نہیں کی۔ اس کے باوجود واجد نے اس کے دفتر تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔

محمود شامی نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

واجد اوسط قد کا طاقتور آدمی تھا۔ وہ ساکت بیٹھتا تب بھی اس کے جسم سے توانائی پھوٹتی محسوس ہوتی "آپ تو بہت ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں جناب۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور متجسس نظروں سے سابق صدر کو دیکھتا رہا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے کیوں طلب کیا گیا ہے۔

ذرا دیر بعد اسے معلوم ہو گیا....



"کل مجھے روانہ ہونا ہے۔ ایک ضروری کام ہے" تنویر نے فوزیہ سے کہا۔

فوزیہ کوئی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔ اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

"کافی رات ہو گئی ہے، سوؤ گی نہیں؟"

"بس... آتی ہوں" فوزیہ نے ڈائجسٹ سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

تنویر اٹھنے لگا مگر پھر بیٹھ گیا "میری روانگی دوپہر تک ہوگی۔"

"ٹھیک ہے" فوزیہ نے ڈائجسٹ کا صفحہ پلٹا "میں سوچ رہی ہوں کچھ فرنیچر خرید لیا جائے۔ یہ فرنیچر فلیٹ کے اعتبار سے مناسب نہیں۔"

"تو خرید لو۔ تمہارے اکاؤنٹ میں کافی رقم موجود ہے۔"

"تم کب واپس آؤ گے؟"

"ایک ہفتہ تو لگے گا" تنویر نے کہا "تم جانتی ہو' میں بلا ضرورت ایک منٹ بھی گھر سے دور نہیں رہتا۔"

فوزیہ نے ڈائجسٹ بند کر کے میز پر رکھ دیا "جانتی ہوں۔ میں تمہیں گاڑی میں ائرپورٹ چھوڑ آؤں گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔"

فوزیہ نے ڈائجسٹ دوبارہ اٹھالیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ تنویر اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا۔

بستر پر تنہا لیٹا وہ اپنے اور فوزیہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا پیشہ رازداری کا متقاضی تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اور فوزیہ اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ اب اس پیشے سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی پتا چلا تھا کہ یہ اب اس کا انداز زندگی بن چکا ہے۔ رازداری کی دیوار اُن کے درمیان اب بھی حائل تھی۔ پچھلے برسوں میں انہوں نے ضرورتاً اپنے لیے ایک خول بنالیا تھا۔ ایک ان کہا ضابطہ مقرر کرلیا تھا مگر اب وہ خول چبھنے لگا تھا۔ پہلے ان کہی باتیں ان کی روز مرہ زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی تھیں مگر اب ان کی باہمی گفتگو میں' جو مختصر ہوتی تھی' لہجے کاٹ دار ہو گئے تھے۔

"میں فوزیہ کے ساتھ ظلم کررہا ہوں" وہ بڑبڑایا۔

فوزیہ سونے کے لیے آئی تو تنویر سو چکا تھا۔

اگلی صبح اس نے فوزیہ سے کہا کہ گاڑی میں اسے ائرپورٹ چھوڑ آئے۔ وہاں سے وہ کرشن گڑھ کے لیے پرواز کرگیا۔ اس نے فرضی نام سے ٹکٹ لیا تھا۔

کرشن گڑھ ائرپورٹ سے اس نے ایک کار کرائے پر لی۔ جلترنگ کے علاقے میں ایک موٹیل اسے اپنے لیے موزوں نظر آیا۔ اس نے وہاں کمرا لے لیا۔ کمرا بہت سستا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں مہنگے ہوٹل بکثرت تھے۔ ردِّعمل کے طور پر موٹیل میں قیام کرنے والوں کا رش رہتا تھا۔

تنویر نے کرایہ پیشگی ادا کیا۔ کاؤنٹر کلرک نے اسے کمرا نمبر ۳۴ کی چابی دے دی۔ کمرے میں سامان رکھنے کے بعد وہ باہر آگیا۔ ہائی وے پر ایک ریسٹورنٹ میں اس نے کھانا کھایا۔ واپسی میں وہ اخبار خریدتا ہوا آیا۔

اپنے بیڈ پر پاؤں پھیلا کر لیٹتے ہوئے اس نے اخبار پڑھا۔ پھر اس نے اپنی معمول کی ایکسرسائز کی۔ شام کو نہا دھو کر کپڑے بدل کر وہ پھر باہر نکلا۔ کھانا کھا کر وہ پیدل ہی موٹیل تک آیا اور آتے ہی سو گیا۔

وہ الارم لگا کے سویا تھا۔ سات بجے الارم کی آواز نے اسے جگا دیا۔ کچھ دیر وہ آنکھیں کھولے لیٹا رہا۔ یہاں تک کہ سُستی دور ہوگئی۔ اس نے اٹھ کر اپنے سوٹ کیس سے چمڑے کا ایک چپٹا کیس نکالا جو سائز میں انگریزی کے کسی پیپر بیک ناول کے برابر تھا۔ وہ اس کیس کو اپنی شیونگ کٹ کے ساتھ باتھ روم میں لے گیا۔

شیو کرنے کے بعد اس نے چمڑے کے اس کیس کو کھولا اور اپنے شخصیت تبدیل کرنے کے فن کے عملی مظاہرے میں مصروف ہوگیا۔ اس نے بالوں کا اسٹائل تبدیل کیا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تخلیق کیے' جس کی وجہ سے چہرے کی لکیریں زیادہ گہری اور نمایاں نظر آنے لگیں۔

اب وہ اپنی عمر سے بڑا لگ رہا تھا۔

تنویر کو نقلی داڑھی مونچھوں اور ایسے ہی دوسرے لوازمات کی مدد سے حلیہ بدلنے سے چڑ تھی۔ ایک تو ایسا حلیہ تربیت یافتہ آنکھوں کو قدرتی نہیں لگتا تھا۔ دوسرے یہ امکان بہرحال رہتا تھا کہ داڑھی یا مونچھ کا کوئی حصہ کسی بھی وقت جھڑ جائے یا اپنی جگہ چھوڑ دے۔ وہ خود حلیہ اس انداز میں تبدیل کرتا تھا کہ اصل شخصیت سے بہت دور کی مشابہت محسوس ہو۔

اس نے ایک اور چشمہ منتخب کرکے لگایا اور طمانیت سے سہلایا۔ اس چشمے کے فریم نے رخساروں کی ہڈیوں اور ناک کی بناوٹ کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس بات پر خود بھی اکثر حیران ہوتا تھا کہ چہرے کی بعض لکیروں اور اُبھاروں میں معمولی سی تبدیلی سے بھی شخصیت کیسے بدل کر رہ جاتی ہے اور ان چھوٹی چھوٹی لیکن دور رس تبدیلیوں کے معاملے میں اس کی مہارت کسی ماہر ترین پلاسٹک سرجن سے کم نہیں تھی۔

موٹیل کے کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے اچھی طرح چیک کیا کہ وہ کچھ چھوڑ کر تو نہیں جارہا ہے۔ اس نے اپنا سوٹ کیس لاک کیا اور اسے لے کر اپنی کار کی طرف چل دیا۔ اس روز گھٹا کچھ زیادہ تھی۔ دھوپ ابھی پوری طرح نہیں نکلی تھی۔

کچھ دیر کی ڈرائیو کے بعد اس نے رک کر ایک ریسٹورنٹ میں ناشتا کیا پھر وہ ہائی وے پر نکل آیا۔ کار اب کوہستان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے سرسبز جنگلات تھے۔ ایک طرف ڈھلوان پر اور دوسری طرف پہاڑ پر۔ شکار کے شائقین کا وہ پسندیدہ علاقہ تھا۔

تنویر الزماں بھی شکار کی غرض سے نکلا تھا!

○☆○

صابر ملک گزشتہ روز اپنے کوہستان والے کاٹیج میں پہنچا تھا۔ اس کاٹیج کی طرف اس کا آنا کم ہی ہوتا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آیا تھا' کسی کڑے وقت میں آیا تھا' جب اسے تنہائی اور سکون کی ضرورت ہوتی تھی۔

کاٹیج چھوٹا مگر بے حد خوب صورت تھا۔ اندر کی آرائش دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کوئی پہاڑی کاٹیج ہے۔ کچن سبز ٹائلوں والا تھا۔ وہاں جدید دور کی ہر سہولت موجود تھی۔ گیس کے چولہے

تھے، کیبنٹس تھیں، ریفریجریٹر تھا۔ سنک کے اوپر ایک کھڑکی تھی جس سے وہ بل کھاتی پگڈنڈی نظر آتی تھی جو کاٹیج کی طرف آتی تھی۔ پگڈنڈی سوالیہ نشان کی شکل کی تھی۔ بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں گیس کے آتش دان تھے۔ ڈرائنگ روم میں دیواری شیلف تھے جو کتابوں، فشنگ اور ہنٹنگ کی یادگاروں سے سجے تھے۔ بیڈ روم میں ایک ڈریسر اور دو ڈبل بیڈ تھے۔ ڈرائنگ روم بھی آراستہ وپیراستہ تھا۔

صابر ملک بہت پُرسکون نیند سویا۔ صبح اٹھ کر اس نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہاں قیام کے دوران جوگنگ کو معمول بنالے گا۔ وزن کم کرنے کی مہم یہاں کچھ کامیاب رہتی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا یہاں آنے کا فیصلہ درست ترین ہے۔ کسی خطرے کا سامنا کرنا جبکہ وہ غیر ضروری ہو، کوئی عقل مندی کی بات نہیں۔

باہر کوئی گلہری پتّوں کے درمیان بھاگی اور کوئی پرندہ چہچہایا۔ صابر نے فیصلہ کیا کہ سامنے والے پورچ میں کرسی ڈال کر بیٹھا جائے۔ وہاں سے سامنے جنگل کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔

صبح کا آغاز کُہر اور بادلوں سے ہوا تھا مگر اب ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔ اس نے اپنی لانسر پورچ کی ایک سائڈ میں کھڑی کی تھی۔ کار کے بونٹ پر اسے لومڑی کے پنجوں کے نشان نظر آئے لیکن اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ فضا اتنی پُرسکون تھی کہ وہ خود بھی پُرسکون ہوگیا۔ یہ ہمیشہ ہوتا تھا۔ وہ کیسی ہی اعصابی کشیدگی لے کر آتا، یہاں وہ ہمیشہ ڈھل جاتی تھی۔

اس نے چائے کا مگ کرسی کے ہتھے پر رکھا، کرسی سے ٹیک لگائی اور دونوں ٹانگیں پھیلا کر پورچ کی ریلنگ پر رکھ دیں۔ نفیس اور اولیس کی اموات، ظہور اور مقصود سے پریشان کن گفتگو اور وہ خوف جو اسے راتوں کو بے وقت جگا دیتا تھا۔ یہ سب کچھ اب بہت غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ سامنے دیو دار کے درختوں کے آسمان سے باتیں کرتے جھنڈ سے زیادہ حقیقی دنیا میں کوئی چیز نہیں تھی۔ اور وہ مغرب کی طرف صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی سرسبز پہاڑی....

اور وہ بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان!

اس خوب صورت صبح نے صابر ملک کے وجود میں نئی توانائیاں جگادیں۔ وہ خود کو جوان محسوس کرنے لگا۔ چائے ختم کرکے وہ کاٹیج میں گیا، ٹریک سوٹ اور جاگنگ شوز پہنے اور باہر آگیا۔ جس راستے پر اسے جاگنگ کرنی تھی، وہ اس کے لیے جانا پہچانا تھا۔ پگڈنڈی سے نیچے کی طرف پھر جنوب کی سمت ایک تنگ، کچے راستے پر جو سرسبز گھنے جنگلوں کے درمیان ڈھلوان سے ہوتا ہوا ایک چھوٹے چشمے تک جاتا تھا۔ وہ اچھا راستہ تھا جو مشینی انداز میں جاگنگ کا تاثر زائل کردیتا تھا۔ اکثر اسے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کتنا فاصلہ طے کرچکا ہے یا یہ کہ اس کی سانس اُکھڑ رہی ہے۔

صابر کو جاگنگ کے لیے تیار ہونے میں صرف چند منٹ لگے۔

باہر نکلنے سے پہلے وہ کچن میں گیا اور دیواری کیبنٹس کھول کر ان کا جائزہ لیا۔ شیلف پر غذاؤں کے چند ڈبے تھے، کچھ ان میں ڈرائی فروٹ کے تھے اور کچھ مختلف ذائقوں کے سوپ۔ اس نے ایک کاغذ پر ان چیزوں کی فہرست بنادی جن کی ضرورت تھی۔ پھر اس نے اس فہرست کو کاؤنٹر پر نمک دان سے دبادیا اور باہر نکل آیا۔

اس نے کاٹیج کو لاک کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی!

اگر اسے اس بات کا شک بھی ہوگیا ہوتا کہ اس نے یہاں آنے کا فیصلہ ایک دن کی تاخیر سے کیا ہے تو اس نے اتنی بے پروائی نہ برتی ہوتی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ تنویر اسے اپنا آئندہ ہدف بناچکا ہے۔ اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ حمید اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

حمید نے ابتدا ہی سے اس کا تعاقب کیا تھا اور اب وہ کاٹیج کی لوکیشن سے پوری طرح واقف ہوچکا تھا۔ گزشتہ روز اس نے فون پر تنویر سے بات کی تھی اور کاٹیج کی لوکیشن اچھی طرح سمجھادی تھی۔ تنویر نے اسے انتظار کرنے کی ہدایت دی تھی۔

صابر نے دو میل جاگنگ کی مگر وہ واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھ کمر پر تھے۔ وہ جاگنگ کے معاملے میں بہت محتاط رہتا تھا۔ دل اس کا پرانا مسئلہ تھا اور ڈاکٹر نے جاگنگ کا مشورہ دیتے ہوئے اسے محتاط رہنے کی ہدایت کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر اعتدال سے کام لیا جائے تو جاگنگ اس کی سب سے اچھی دوا ہے۔

کاٹیج میں داخل ہوکر صابر نے تولیے سے اپنا چہرہ پونچھا جو پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ اس کی سانس نارمل نہیں تھی، وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ذرا دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھلی تو ایک عجیب آواز کی وجہ سے۔ وہ چونک کر اٹھا، سیدھا ہوا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے ذہن پر زور دیا کہ آواز کس طرف سے آئی ہے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ آواز چھت پر سے آئی تھی اور پنجوں کے کھُجانے کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ شاید چھت پر کوئی گلہری دوڑی ہوگی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اسے احساس ہوا کہ اسے اس طرح نہیں سونا چاہیے تھا۔ اس کی کمر اکڑ گئی تھی اور ٹریک سوٹ کی الاسٹک والی آستینوں نے اس کے دورانِ خون کو روک دیا تھا۔ اس نے اپنے سُن بائیں ہاتھ کو جھٹکے دے کر دورانِ خون بحال کیا لیکن اسے یہ احساس بھی ہوگیا کہ اب اگر وہ بیٹھا رہا تو اس کا دل اٹھنے کو نہیں چاہے گا۔

وہ باتھ روم میں گھُس گیا۔ نہانے سے اس کی طبیعت کافی سنبھل گئی۔ اس نے پرانی جینز کے ساتھ اونی قمیص پہنی اور کچن میں جاکر ضروری اشیا کی فہرست اٹھالی۔ اس میں اس نے پائپ کے تمباکو کا اضافہ کیا۔ فہرست جینز کی ہپ پاکٹ میں رکھ کر وہ باہر نکلا اور اپنی کار کی طرف چل دیا۔

کچے راستے پر گاڑی اپنے پیچھے گرد وغبار کا طوفان اٹھاتی چل

رہی تھی۔ کچے راستے سے گزر کر وہ ہائی وے پر پہنچا۔ اب کار کا رُخ جلترنگ کی طرف تھا۔

بالآخر اس نے جلترنگ کے مین بازار میں گاڑی پارک کی۔ وہاں جدید طرز کے شاپنگ سینٹرز تھے۔ کبھی یہ علاقہ گرمیوں کے دوران تفریح کے لیے آنے والوں کی توجہ کا مرکز ہونے کے ناتے مشہور تھا مگر اب اس نے کافی ترقی کرلی تھی۔ سیزن کے بزنس پر سارا سال گزارنے والے اب اپنے پیروں پر جم کر کھڑے ہوگئے تھے۔

صابر نے ایک سُپر مارکیٹ کا رخ کیا۔ اندر اسے ایک چھوٹی سی ٹرالی دے دی گئی۔ وہ اسے لے کر مختلف سیکشنوں میں پھرتا رہا اور اپنی فہرست کے آئٹم جمع کرتا رہا۔ دو سیکشنوں کے درمیانی راستے پر ٹرالی دھکیلتے ہوئے بیکری سیکشن میں اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ نقوش سے وہ کوئی تاجوری لگتا تھا۔ اس کے کندھے بہت چوڑے اور آنکھیں مغربی ملکوں کے لوگوں کی طرح نیلی تھیں۔

وہ صابر کو جانا پہچانا لگا۔

وہ شخص بیکری سیکشن سے ہٹ گیا تھا۔ صابر ملک کو یقین تھا کہ اس نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ شاید دوسری نظر دیکھنے کا موقع مل جاتا تو اسے یہ بھی یاد آجاتا کہ کہاں دیکھا ہے۔ اس نے پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھا مگر وہ شخص نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ اچانک وہ گہرا سکون جو کوہستان آتے ہی اس کے اندر اُتر گیا تھا، معدوم ہوگیا۔ اس کے پیٹ میں خوف اور تشویش کی جانی پہچانی گرہیں پڑنے لگیں۔

لیکن اسے یہ بات ناقابل یقین لگ رہی تھی کہ کوئی اس کے پیچھے یہاں تک آئے گا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں ہے۔۔۔ کم ازکم ایسے کسی شخص کو تو معلوم نہیں ہوسکتا تھا جس سے اسے خوف ہو۔ مقصود کو اس نے ضرور بتایا تھا کہ ایمرجنسی میں وہ اس سے کہاں رابطہ کرسکتا ہے۔ وہ بھی کاٹیج کے قریب ایک پیٹرول پمپ کا فون نمبر تھا۔ کاٹیج میں تو فون بھی نہیں تھا۔

وہ چیک آؤٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ ادائیگی کرنے کے بعد وہ اپنی خریدی ہوئی اشیا دو بڑے شاپنگ بیگ میں بھر کر اپنی کار کی طرف چلا۔ دوبار اس نے پلٹ کر دیکھا کہ شاید اسی تاجوری کی ایک اور جھلک نظر آئے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے شاپنگ بیگ کار کی ڈکی میں رکھ دیے۔

اس نے سوچا، مجھے وہم ہوا ہوگا۔ اس کے باوجود وہ براہِ راست کاٹیج جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ چنانچہ وہ جلترنگ کے تفریحی مرکز کی طرف چل دیا۔ وہاں اس نے ایک خالی جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی پھر پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ سڑکوں پر بہت رش تھا۔ فٹ پاتھ بھی راہ گیروں سے بھرے ہوئے تھے۔

وہ ایک اسٹور کے شوکیس میں جیولری دیکھنے کے لیے رکا۔ اس نے ظاہر یہ کیا کہ جیسے اسٹور میں داخل ہونے والا ہے۔ پھر وہ یوں پلٹا جیسے اچانک ہی ارادہ بدل دیا ہو۔ ایک لمحے کو اسے وہی تاجوری نظر آیا پھر وہ پلٹا اور دُکان کے ساتھ والی گلی میں غائب ہوگیا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اس پر وہم کا گمان کیا جاسکتا تھا۔

○☆○

حمید جانتا تھا کہ صرف پل بھر کے لیے سہی لیکن صابر ملک نے اسے دوبارہ دیکھا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صابر کوئی اناڑی آدمی نہیں۔ اگر وہ محتاط ہو اور اسے تعاقب کا شبہ ہو تو اس کا تعاقب کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ فاصلہ بڑھا کر تعاقب جاری رکھا جائے۔

حمید بہت احتیاط سے اس گلی سے نکلا جس نے صابر ملک کے اچانک پلٹ کر دیکھنے پر اسے پناہ دی تھی۔ صابر ملک کافی آگے جاچکا تھا۔ اب اس کے قدم پہلے سے زیادہ تیز تھے اور رخ اسی طرف تھا جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ حمید بھی تیز چلنے لگا۔

صابر ملک اگلی سڑک پر مُڑ گیا۔ مُڑتے ہوئے اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ حمید اس موڑ پر پہنچا تو صابر ملک تقریباً اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اب وہ تیز نہیں چل رہا تھا بلکہ بھاگ رہا تھا۔ حمید کے مُڑتے ہی وہ داہنی جانب مُڑا اور غائب ہوگیا۔ حمید داہنی جانب مُڑنے والی پہلی گلی میں مُڑ گیا۔ اس نے ٹیکنیک بدلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ متوازی گلی میں وہ بھی تیز رفتاری دکھا سکتا تھا۔

لیکن وہ گلی سے نکلا تو صابر ملک ندارد تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس طرف آنے کے بجائے واپس پلٹ گیا تھا۔ حمید پلٹ کر اسی طرف بھاگا جہاں سے آیا تھا۔ وہاں پہنچا تو صابر ملک اسے بہت دور نظر آیا۔

حمید نے اپنے قدم اور تیز کردیے۔ اسے احساس تھا کہ اس کی سانس پھول رہی ہے۔ صابر ملک نے پلٹ کر دیکھا... اور شاید اسے دیکھ بھی لیا۔

بائیں جانب مُڑتے ہوئے صابر نے سڑک پار کی۔ حمید وہاں پہنچا تو صابر نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ حمید نے سڑک پار کی تو وہ اسے جاتا نظر آیا۔ شکار اور شکاری کے درمیان فاصلہ خاصا کم ہوچکا تھا۔

وہ سڑک بہت مصروف تھی۔ اس پر ٹریفک زیادہ تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے صابر سائڈ کی عمارتوں سے لگ کر چل رہا تھا، جیسے وہ اسے پناہ دے دیں گی۔ وہ اپنے متعاقب سے اچھا خاصا آگے تھا۔ اگر اسے یقینی طور پر معلوم ہوتا کہ اس کا متعاقب کون ہے تو...

اور حمید کو یقین تھا کہ صابر ملک اسے پہچان گیا ہے۔ اس صورت حال میں اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ تیزی سے... تیز رفتاری سے عمل کرے۔ متبادل لائحہ عمل کی تنویر منظوری دے چکا تھا۔

ٹائر چیخے.... ایک گاڑی نے ہارن بجایا۔ کارنر پر صابر نے سرخ روشنی کے باوجود سڑک پار کرلی تھی۔ پھر وہ بھاگنے لگا۔ حمید اس کی سمت سمجھنے کے لیے فٹ پاتھ سے اُترا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ صابر کہیں مُڑ تو نہیں رہا ہے۔ اسے سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی کہ متبادل ایکشن پر عمل سے پہلے وہ فون پر کسی سے رابطہ نہ کرلے، اس کے متعلق نہ بتادے۔ وہ اس مفروضے کے تحت کام کررہا تھا کہ صابر اسے پہچان چکا ہے۔

تیز رفتار کار کا بمپر حمید کی پنڈلیوں سے ٹکرایا۔ حمید اُلٹ کر گرا... اور کار کے راستے میں گرا۔ کار ایک عورت ڈرائیو کررہی تھی، جس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ عورت گھبرا گئی تھی۔ وہ بریک بھی نہ لگا سکی۔ کار کافی دور جاکر رکی.... اور وہ حمید کے جسم پر سے گزر کر آئی تھی۔ ڈرائیو کرنے والی عورت اب اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پیچھے دیکھ رہے تھے۔

○☆○

صابر ملک بھاگتے بھاگتے رُکا اور ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوگیا۔ وہ خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ تو یقین سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے پیچھے آنے والا شخص وہی تھا جسے اس نے سُپر مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں تھا کہ یہ سب کچھ محض اس کا وہم ہو۔

وہ ٹائیوں کے ریک کے پاس کھڑا ٹائیاں دیکھنے کی اداکاری کرتا رہا۔ درحقیقت اس کی نظر اسٹور کے داخلی دروازے پر تھی۔

گاہک بڑی تعداد میں آجارہے تھے۔ ان میں صابر کو ایک پادری نظر آیا۔ ابتدائی زندگی میں صابر ملک پکا کیتھولک کرسچین رہا تھا۔ اب برسوں سے اس نے کسی چرچ میں قدم بھی نہیں رکھا تھا لیکن اس وقت اس کے دل میں پادری کے پاس جاکر اس سے بات کرنے کی خواہش ابھری لیکن اس نے اس پر عمل نہیں کیا۔ وہ کن انکھیوں سے پادری کو کھلونوں والے سیکشن میں جاتے دیکھتا رہا۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ اس دوران اس کا جسم پسینے میں نہا چکا تھا۔ تعاقب کرنے والا اندر نہیں آیا۔ شاید وہ باہر اس کا منتظر تھا۔

صابر نے یہ سوچا تو ضرور لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ممکن نہیں۔ اسٹور کا عقبی دروازہ بھی تھا۔ متعاقب کے لیے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ اس کا شکار کس دروازے سے نکلے گا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کے پیچھے اسٹور میں داخل ہوکر اس پر نظر رکھے بشرطیکہ وہ تجربے کار ہو اور تعاقب کی فنی باریکیوں سے واقف ہو۔

بشرطیکہ کوئی متعاقب ہو!

وہ عقبی دروازے سے نکلا اور چوکنے انداز میں نارمل رفتار سے اس طرف چلنے لگا جہاں اس نے کار پارک کی تھی۔

○☆○

حمید نے فون نہیں کیا تھا!

تنویر اپنے موٹیل کے کمرے میں بیٹھا برگر کھارہا تھا کہ اس نے ریڈیو پر وہ خبر سنی۔ وہ ایک شخص جو چہرے مہرے سے تاجر سا لگتا تھا، آج سہ پہر ایک کار کے نیچے آکر ہلاک ہوگیا۔ لاش کی شناخت نہیں ہوسکی ہے۔ متوفی فٹ پاتھ سے نیچے اترا تھا کہ ایک کار کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ موقعے پر ہی جاں بحق ہوگیا۔ اس کی جیبوں سے ایسی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی جو اس کی شناخت میں مدد دیتی۔ کوئی شخص اس سلسلے میں کسی قسم کی معلومات فراہم کرسکتا ہو تو اسے چاہیے کہ جلد از جلد جلترنگ پولیس سے رابطہ کرے۔ آج مصر میں....

تنویر نے ریڈیو آف کردیا، اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ہاتھ میں ادھ کھایا برگر تھامے ہوئے ہے لیکن اب اس کی بھوک اُڑ چکی تھی۔ اس نے برگر کو ڈریسر پر رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال طوفانی رفتار سے گردش کررہا تھا.... حمید مرگیا.... حمید اب اس دنیا میں نہیں....

کیا صابر ملک نے کسی طرح....؟ لیکن نہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ صابر ملک پروفیشنل تھا لیکن حمید اس سے بڑھ کر پروفیشنل تھا۔ اور پھر امکان تو یہی تھا کہ صابر کو علم بھی نہیں ہوگا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔

اس کا مطلب تھا کہ یہ محض ایک عام سا حادثہ تھا لیکن صابر ملک بھی کسی نہ کسی طور پر اس میں ملوث ہوگا اور اگر نہیں بھی تھا تو اب مقامی اخبارات میں یا ٹی وی پر حمید کی تصویر بہرحال دیکھ لے گا۔

تنویر نے دونوں ہاتھ پیٹ پر باندھ لیے۔ اسے اپنے پیٹ میں ایک بھاری پتھر کا سا بوجھ محسوس ہورہا تھا۔ حمید کی موت کا ذمے دار وہ تھا۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اہم بات یہ تھی کہ حمید اس کا دوست تھا۔ یہ احساس تو اسے اب ہوا تھا کہ اس نے اپنے مزاج کے خلاف حمید سے دوستی کچھ زیادہ ہی بڑھالی تھی۔

تنویر نے قمیص پتلون کے اندر کرتے ہوئے سوچا، حمید اصولوں اور ضابطوں سے خوب واقف تھا، اس نے جیکٹ کندھے پر ڈالی اور باہر نکل آیا۔

○☆○

صابر کی نظریں تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتی ہوئی سڑک پر جمی تھیں پھر وہ سڑک سے مُڑا اور کاٹیج کی طرف جانے والے کچے راستے پر گاڑی دوڑانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اخبار والوں نے ان لوگوں کے کیے دھرے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، کسی حد تک تو درست ہوگا۔ محمود شاہی، شاکر، ظہور.... کون جانے وہ اندر سے بدمعاش ہوں اور انہیں خود بھی اس بات کا علم نہ ہو۔ بُرائیوں کی اس دنیا میں بُرائی کی پہچان تو بہت مشکل ہوگئی ہے۔

اس نے ایکسیلریٹر پر دباؤ کم کیا اور اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ اب راستے میں موڑ بہت زیادہ تھے۔ ایک طرف سے سرسبز پہاڑیاں تھیں اور دوسری طرف صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ڈھلانیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے کاٹیج کا رخ کرکے درست فیصلہ کیا ہے' یہاں وہ محفوظ ہے۔

اس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور چند لمحے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا گردوپیش کی سکون میں لپٹی ہوئی خوب صورتی کو آنکھوں کے راستے اندر اُتارتا رہا پھر وہ کار سے اترا' ڈکی کھول کر اس نے سامان کے تھیلے نکالے اور انہیں اندر لے گیا۔

سامان سلیقے سے رکھنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں گیا' اپنے لیے ایک جام بنایا اور صوفے پر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ آج جو کچھ ہوا' وہ اس کے اندر کے خوف کا کرشمہ تھا..... اور بے جا بھی نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ اس نے سُپر مارکیٹ میں ایک شخص کو دیکھا' جو اسے جانا پہچانا لگا۔ یہ بھی طے ہے کہ اپنے نقوش سے وہ شخص تاجوری لگتا تھا..... اور گیٹ وے والے معاملے میں کچھ تاجوری بھی ملوث تھے۔ بس وہیں سے شاید اس کا تصور بے لگام ہو گیا۔ وہ پریشان اور خوف زدہ ہو گیا۔

اس نے جام خالی کرکے رکھا۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ بے چین ہو رہا ہے۔ وہ اٹھا اور کمرے میں ٹہلتا رہا پھر اس نے اپنے لیے ایک اور جام بنایا لیکن پینے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ جام یونہی رکھا رہا۔ اس نے اسے چُھوا بھی نہیں۔

وہ ٹہلتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ سنک کے اوپر والی کھڑکی سے اس نے پگڈنڈی کو دیکھا۔ شام ہو رہی تھی۔ سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ اس نے ایک سیب اٹھایا اور کاٹنے کی زحمت کیے بغیر اس میں دانت گاڑ دیے۔ سیب کھاتے ہوئے وہ پگڈنڈی کو دیکھ رہا تھا' جو اس علاقے کے سکون کی علامت تھی۔ دھیمی ہوا چلنے لگی تھی۔ درختوں کے صرف اوپر کے پتے ہل رہے تھے۔ اس نے سیب کا بچا کُھچا حصہ ٹوکری میں پھینکا اور فیصلہ کیا کہ رہی سہی اعصابی کشیدگی کا علاج جاگنگ ہے۔

اس نے اپنا ٹریک سوٹ اور جاگنگ شوز پہنے اور کاٹیج کے عقبی دروازے سے نکل آیا۔ ابتدا میں اس نے چہل قدمی کے ذریعے ہاتھ پاؤں کھولے۔ چند سوفٹ کا فاصلہ چل کر طے کرنے کے بعد اس نے جاگنگ شروع کر دی۔

ایک میل کی جاگنگ کے نتیجے میں اس کی سانسیں بھاری ہو گئیں۔ اپنے جاگنگ شوز کی مخصوص اور مستقل چاپ اس پر خود تنویمی کیفیت طاری کرنے لگی۔ اب وہ چڑھائی طے کر رہا تھا جو کاٹیج کے عقبی حصے کی طرف جاتی تھی۔ اپنی رانیں اسے بوجھل محسوس ہونے لگیں۔ کاٹیج وہاں سے ڈیڑھ میل دور تھا۔ اس نے اپنی رفتار میں کچھ کمی کی اور سانسوں کو ہموار رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس وقت جنگل میں دوڑ رہا تھا۔

اچانک وہ جنگل سے نکل آیا۔ اب سامنے سرسبز میدانی علاقہ تھا' جو پہاڑی کی جڑ میں واقع تھا۔ ہوا جیسے رک گئی تھی۔ ڈوبتا سورج حیرت انگیز طور پر گرمی برسانے لگا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے کناروں پر پسینہ پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جاگنگ موقوف کیے بغیر بازو سے پسینہ صاف کیا۔ اس دوران اس نے بے ساختہ سر گھمایا...

ایک لمحے کو اپنی ایک جانب ایستادہ درختوں کے درمیان اسے حرکت کا احساس ہوا۔

اب وہ ہر قدم پر پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدموں کا ردھم ٹوٹ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے کسی کو دیکھا ہے۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اگر کوئی واقعی اس کا پیچھا کر رہا ہے تو درختوں کا جھنڈ ختم ہوتے ہی سامنے آئے گا۔

درختوں کے عقب سے ایک شخص نمودار ہوا۔ صابر ملک کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔ وہ شخص آدھی آستین کی قمیص اور ہلکی پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ جانا پہچانا آدمی تھا۔ اس کی رفتار صابر سے کچھ تیز تھی اور بھاگنے کے انداز میں قدرتی بہاؤ تھا۔ وہ جسمانی طور پر اے ون کنڈیشن میں تھا۔

صابر نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ وہ ہر قدم پر پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر اس نے اپنے متعاقب کا چہرہ دیکھ لیا' وہ تنویر تھا..... تنویر الزماں!

نفیس اور اویس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا' اس کے بارے میں صابر کے ذہن میں اگر کچھ شبہات تھے تو وہ اس لمحے دُھل گئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ سُپر مارکیٹ والا واقعہ وہم نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر دہشت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنی رفتار اور بڑھانے کی کوشش کی۔ اسے اپنی اُکھڑتی ہوئی سانسوں کا بھی خیال نہ رہا۔ کاٹیج اب بھی ایک میل دور تھا۔

دیر تک صابر نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ اپنی رفتار برقرار رکھے ہوئے تھا اور اپنی درد سے چیختی چیختی پنڈلیوں کو نظرانداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر قدم پر درد بڑھ رہا تھا۔ رانیں دُکھ رہی تھیں۔

ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ان کا درمیانی فاصلہ پہلے کے مقابلے میں آدھا رہ گیا تھا جبکہ تنویر کی سانسیں ابھی ہموار تھیں۔ اسے دوڑنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا انداز میکانیکی تھا اور ہر اٹھتا قدم ایک دھمکی تھا۔

صابر کو اپنے قدم سُست پڑتے محسوس ہوئے۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے کوئی ہتھوڑا پوری قوت سے سینے کی دیوار سے ٹکرا رہا ہو۔ وہ بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ اس کے قدم بار بار لڑکھڑاتے۔ اُکھڑتی سانسیں کھڑکھڑاہٹ کی آواز بلند کرتیں۔

تنویر اور قریب آ گیا تھا۔

اور وہاں کوئی نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اسے اپنا دل دھاکے سے پھٹتا محسوس ہوتا۔ اور ہر دھاکے کے ساتھ سینے میں بائیں جانب اذیت کی ایک مہیب موج اٹھتی۔ کندھے دُکھتے اور درد اس کے بائیں بازو میں دوڑ جاتا۔ اسے اپنے پیچھے تنویر کے نپے تلے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی۔

دائیں جانب اسے اپنے کاٹیج کی چھت نظر آئی۔ اس نے سختی سے دانت پر دانت جمائے اور خدا سے دعا کی کہ وہ اسے وہاں تک پہنچنے کی طاقت عطا فرمائے۔

اور ایک لمحے کو اسے اپنے وجود میں طاقت کا چشمہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ اس نے پانچ چھ لمبے لمبے ڈگ بھرے۔ پھر اچانک سینے کے درد نے آہنی پنجوں کی طرح اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے اپنا دَم گھٹتا محسوس ہوا۔ درد ایک دھاردار چاقو تھا جو بائیں بازو سے گزر کر اس کے سینے میں اُتر گیا۔ وہ اپنے پاؤں اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ اس سے اٹھائے نہیں جا رہے تھے۔ سینے میں درد اپنی قوت اور حجم بڑھا رہا تھا، پھیل رہا تھا۔ اس کے جسم میں اذیت کی تند لہریں دوڑ رہی تھیں۔ یہ احساس اسے دہشت میں مبتلا کر گیا کہ وہ اب دوڑ نہیں رہا ہے۔ اس کی زبان پر مٹی کا ذائقہ تھا۔ درد اور اذیت نے اس کے جسم کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اور اب دھیرے دھیرے اس کے وجود کو نگل رہی تھی۔

○☆○

تنویر گہری سانسیں لے رہا تھا۔ وہ نیچے گرتے ہوئے صابر کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے احساس تھا کہ صابر پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ صابر کی ایک ٹانگ مُڑی ہوئی تھی اور دوسری ٹانگ کے نیچے دب گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور تنویر کی طرف نگراں تھیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تنویر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کے ہونٹوں سے اپنا کان لگا دیا۔

"فادر..." صابر کی آواز واضح تھی "...معافی..."

تنویر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی پینٹ پر سے مٹی جھاڑی۔

"لزارس..." صابر کی آواز اس بار بلند تھی۔

لزارس وہ شخص تھا جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مرنے کے بعد جِلایا تھا۔ تنویر کو یہ احساس بھی ہوا کہ صابر اسے پادری سمجھ رہا ہے۔

صابر نے کچھ اور کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ بس پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ وہ یقینی طور پر معافی مانگ رہا تھا۔ پھر اچانک وہ ساکت ہو گئے... جیسے فلم کا کوئی منظر انسٹل کر دیا گیا ہو۔ ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنیں اس کی زندگی کی روشنی سے محروم آنکھوں کو چوم رہی تھیں۔

تنویر جنگل کی طرف واپس چل دیا جہاں اس نے اپنی کار پارک کی تھی۔ صابر ملک کو کم از کم اس سے معافی نہیں مل سکتی تھی۔

اسے اپنی کار تک پہنچنے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہ اسٹیئرنگ کے پیچھے بیٹھا سوچتا رہا۔ اسے اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی محسوس ہو رہی تھیں لیکن یہ تصور بھی اس کے لیے محال تھا کہ اسے صابر ملک پر رحم آیا تھا۔

اسے اپنے قید کے دن یاد آ رہے تھے۔ جیل کی کوٹھری میں وہ اکثر گلوریا کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

اس نے اخبار میں گلوریا کی موت کے بارے میں پڑھا تھا۔ اس کی گاڑی ایک کھڈ میں گر گئی تھی پھر گاڑی میں آگ بھی لگ گئی تھی۔ جلی ہوئی لاش کی شناخت میں خاصی دیر لگی تھی۔ گاڑی کے اسپیئر ٹائر کمپارٹمنٹ میں سے تیس لاکھ روپے کی بھاری رقم ملی تھی۔ کار کا وہ حصہ جلنے سے رہ گیا تھا لیکن وہ رقم ایک مُعما بن کر رہ گئی تھی۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حادثہ کیسے ہوا اور گیٹ وے تحقیقاتی کمیٹی یقینی طور پر یہ بات ثابت نہیں کر سکی کہ وہ رقم کہاں سے آئی تھی۔ ثبوت کا نہ ہونا اپنی جگہ لیکن یہ بات سب جانتے تھے کہ یہ تیس لاکھ اس پانچ کروڑ کا حصہ تھے جو تنویر اور اس کے ساتھیوں کو گیٹ وے بینک میں سینیٹر بشیر کے ڈیپازٹ باکس میں سے ملے تھے اور یہ بھی طے تھا کہ وہ جائز رقم نہیں تھی۔

تنویر نے ہدایت کے مطابق وہ رقم مقصود کے حوالے کر دی تھی۔

تحقیقات کے نتیجے میں ثابت ہو گیا کہ وہ رقم محمود شامی کے الیکشن کے لیے استعمال ہونا تھی۔ ڈیپازٹ باکس کھولے جانے سے دو دن پہلے سینیٹر بشیر کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ بالکل محفوظ رقم تھی جس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اسے کیسے اور کہاں خرچ کیا جائے۔

نفیس نے گواہی دیتے ہوئے کہا تھا ... اچانک اور غیر متوقع طور پر رقم ہمارے ہاتھ میں تھی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کریں۔ اور وہ ایک مرے ہوئے آدمی کی رقم تھی جو نہ اس کا دعویٰ کر سکتا تھا اور نہ کوئی وضاحت.....

اتنی بڑی رقم نشان ضرور چھوڑتی ہے اور نشانات ایوانِ صدر کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

محمود شامی کے استعفے سے بہت سے سوالات تشنۂ جواب رہ گئے تھے۔ تنویر کو یقین تھا کہ گلوریا کی موت فطری نہیں۔ اسے انتظامیہ کے حکم پر ٹھکانے لگایا گیا ہوگا بلکہ ممکن ہے، اس کی منظوری خود شاکر نے دی ہو۔ گلوریا بہت اچھی ڈرائیور تھی اور وہ راستہ اتنا خطرناک بھی نہیں تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ گلوریا تیس لاکھ روپے کیوں لیے پھر رہی تھی۔ ویسے وہ موقع پرست تو تھی۔ کیا پتا، رقم لے کر نکل رہی ہو۔ ممکن ہے، شاکر کے پاس لے جا رہی ہو۔

بہرحال کچھ بھی ہوا ہو' اہم بات یہ تھی کہ گاورپا شاک کر مرچکی تھی۔

○☆○

"صابر ملک کا انتقال ہوگیا" فوزیہ نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں شام کا اخبار تھا جو چند منٹ پہلے اخبار والا دے کر گیا تھا۔

تنویر نے کتاب سے نظریں اٹھاکر مصنوعی حیرت سے اسے دیکھا "کیسے؟"

"ہارٹ اٹیک" فوزیہ نے کہا اور خبر پڑھنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثر سے پتا چلتا تھا کہ موت کا سبب قدرتی ہونا اس کے لیے سکون کا باعث ثابت ہوا تھا۔

"ہم میں سے تین رخصت ہوگئے اور وہ بھی اتنے تھوڑے سے وقت میں" تنویر نے کہا' ہم میں سے کہہ کر اس نے فوزیہ کے شکوک کو مزید دھونے کی کوشش کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ فوزیہ خود بھی ان شکوک سے پیچھا چھڑانے کو کتنی بے چین ہے۔ پچھلے برسوں میں تنویر نے اس کام میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ وہ اسے خود فریبی میں مبتلا رکھتا تھا اور اس کے ضمیر پر بوجھ نہیں ہوتا تھا۔

فوزیہ نے اخبار فولڈ کیا اور اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ صابر کی موت کی خبر پہلے صفحے پر تھی۔ تنویر اس سے اخبار مانگنے میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

فوزیہ خاموش بیٹھی اخبار پڑھتی رہی۔ باقی تفصیل درمیانی صفحے میں تھی۔ اس نے درمیانی صفحہ کھول لیا تھا۔

"تم پڑھ لو تو مجھے بھی دے دینا۔" تنویر نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں عدم دلچسپی بھی مخدوش ہوگی۔

"اسے دل کا عارضہ لاحق تھا" فوزیہ نے کہا۔

"تب تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں' اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔"

"ہاں.... ترپین سال۔"

"یہ وہ عمر ہوتی ہے جب آدمی اتنا فٹ نہیں ہوتا جتنا خود کو سمجھتا ہے" تنویر نے کہا۔

"اور اس پر پچھلے برسوں کی سختیاں۔ وہ اپنے کوہستان والے کاٹیج میں تعطیلات منا رہا تھا۔"

"اکیلا؟"

"ہاں۔"

"یہ اور برا ہوا۔ کوئی ساتھ ہوتا تو اسے طبی امداد میسر آجاتی۔"

"اخبار کے مطابق سب کچھ بہت اچانک اور تیزی سے ہوا۔ وہ اپنے کاٹیج میں تھا۔"

تنویر نے کتاب کا صفحہ پلٹا۔ اسے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ کوئی ردعمل ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا۔

فوزیہ نے اخبار تہ کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ فکرمند نظر آرہا تھا۔ وہ ان علامات سے خوب واقف تھی۔ اس نے اخبار تنویر کے سامنے رکھا اور خود کچن میں چلی گئی۔ تنویر نے اخبار فوراً ہی نہیں اٹھایا۔ وہ بہت محتاط تھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ فوزیہ کچن میں مصروف ہوگئی ہے تو اس نے اخبار اٹھایا۔

فوزیہ نے ٹھیک ہی پڑھا تھا!

ہائیکنگ کرنے والے دو لڑکوں نے جو بھٹک گئے تھے' راستہ معلوم کرنے کے لیے کاٹیج کے دروازے پر دستک دی تھی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو انہوں نے کھڑکی سے جھانکا۔ انہیں صابر ملک کی لاش ڈرائنگ روم کے وسط میں پڑی نظر آئی مگر انہوں نے سوچا' ممکن ہے وہ سو رہا ہو یا نشے میں ہو۔ بہرحال وہ دل پر بوجھ محسوس کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پولیس سے رابطہ کرلیا۔

وہ کوئی پروف کی غلطی یا معلومات کا اختلاف نہیں تھا۔ یہ بات طے تھی کہ صابر ملک کی لاش اس کے کاٹیج میں پائی گئی۔

تنویر نے اخبار فولڈ کرکے اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اور اخبار بھی پڑھنے ہوں گے۔ اگرچہ یہ بات یقینی تھی کہ ہر اخبار میں یہ خبر یونہی چھپی ہوگی۔ بہرحال احتیاطاً ڈبل چیک کرنا ضروری تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ صابر کی لاش کاٹیج کے اندر کیسے پہنچی؟ اس کا کیا مطلب ہوا؟ خود تنویر نے اتنے مرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تھا کہ اس کے دھوکا کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صابر کاٹیج جانے والے راستے پر گرا تھا اور اس کے سامنے ہی مرگیا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس میں اتنی زندگی رہ گئی ہو کہ وہ اپنے قدموں پر چل کر کاٹیج تک جا پہنچا ہو۔

اب حمید کی موت کے بارے میں بھی شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ یہ طے تھا کہ جلد ہی اس کی لاش کی شناخت ہوجائے گی۔ اس کے بعد مزید سوالات سر اٹھائیں گے۔ کیا اس کی موت میں کسی اور کھلاڑی کا ہاتھ تھا؟ لیکن تنویر نے فوراً ہی اس خیال کو مسترد کردیا۔ اس نے ٹی وی پر نیوز کوریج دیکھی تھی۔ جس خاتون کی کار سے حمید ٹکرایا تھا' وہ خاتون اور اس کے دونوں بچے شاک کی جس حالت میں تھے' وہ دکھاوا نہیں ہوسکتا تھا اور ہر گواہ کا کہنا تھا کہ حادثے کا ذمے دار خود متوفی تھا۔ وہ بے حد اچانک .... بہت جلدی میں فٹ پاتھ سے سڑک پر اترا تھا۔

تنویر کے ذہن میں ایک سرد سا محتاط پن جڑ پکڑ رہا تھا۔ اس کی حسیات تیز ہورہی تھیں۔ اس نئی صورت حال نے نئے خطرات کو جنم دیا تھا۔

○☆○

واجد' محمود شامی کے ساتھ ساحل پر چہل قدمی کررہا تھا۔ دور افق پر ایک بحری جہاز کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ ان کے سروں پر سے شور مچاتی ہوئی مرغابیاں گزریں' جیسے انہیں مطلع کررہی ہوں کہ بارش ہونے والی ہے۔ بعض اوقات ساحل پر دم توڑنے والی موجیں محمود شامی کے پیروں تک پہنچ جاتی تھیں۔

واجد بیزار ہوگیا تھا اور دُعا کر رہا تھا کہ محمود شامی تھک جائے اور... قصر کی طرف واپس چل دے۔

"میں تمہارے عمل کی تائید نہیں کر سکتا" محمود شامی نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"میں تو اس کی تلاش میں نکلا بھی نہیں" واجد نے جواب دیا "لیکن کچن کے کاؤنٹر پر اس کا کھانا تیار رکھا تھا‘ اس کی کار باہر کھڑی تھی اور وہاں کسی اور گاڑی کے ٹائروں کے نشانات موجود نہیں تھے۔ میں نے سوچا‘ وہ کہیں قریب ہی ہوگا۔"

"اور جب تم نے اسے تلاش کیا تو وہ مر چکا تھا..... کاٹیج کی پچھلی پگڈنڈی پر؟"

تیز ہوا کے جھونکے نے واجد کے جسم میں تھرتھری سی جگا دی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے "مجھے یقین تھا کہ اس کی موت طبعی نہیں ہے۔ میں علامات خوب پہچانتا ہوں۔ ہارٹ اٹیک کسی پر تھوپا بھی جا سکتا ہے اور اس کے طریقے بھی بے شمار ہیں۔"

محمود شامی ساحل کی بھیگی ریت کو گھورنے لگا۔ "لاش کے قریب قدموں کے نشانات بھی تھے؟"

"نہیں‘ لیکن اتنی سخت زمین پر قدموں کے نشان محفوظ نہیں رہتے۔ میں نے لاش کو کاٹیج میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میری تھیوری یہ تھی کہ صابر ملک کا قتل کیا گیا ہے۔ لاش کاٹیج میں پائی گئی تو قاتل گھبراہٹ میں ضرور مبتلا ہوگا۔ وہ سوچے گا کہ شاید صابر ملک مرتے مرتے ذرا دیر کو جی اٹھا ہوگا اور اس میں اتنی طاقت آگئی ہوگی کہ وہ کاٹیج تک پہنچ گیا اور فرض کرلیں کہ قاتل چند منٹ بعد واپس آیا اور لاش غائب ملی تو وہ یہی سوچے گا..... تاکہ صابر مرا نہیں ہے۔ وہ اپنا کام مکمل کرنے کاٹیج آئے گا اور وہاں میں اس کا منتظر ہوں گا۔ یہ ایک ایسا امکان تھا جسے میں نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔"

"اور اب قاتل کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس معاملے میں پولیس کے علاوہ بھی کوئی ملوث ہے..... اور یہ کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے" محمود شامی نے اعتراض کیا۔

"بشرطیکہ صابر ملک کی موت قتل ہو۔"

"اسے قتل کیا گیا ہے۔ میرا وجدان بتاتا ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے وجدان پر بھروسہ کیا ہے۔"

واجد اس پر بھرپور تبصرہ کر سکتا تھا لیکن اس نے عقل مندی کی کہ نہیں کیا "دو گھنٹے بعد وہ لڑکے آگئے اور دروازہ پیٹنے لگے" اس نے اپنی بات جاری رکھی "پھر انہوں نے کھڑکی سے جھانکا۔ میں اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ چپکے سے کاٹیج سے نکل لوں۔"

وہ دونوں رک گئے۔ سامنے ایک جنگلا تھا۔ وہ سمندر تک چلا گیا تھا اور اس بات کی علامت تھا کہ سابق صدر کا ذاتی ساحل یہیں تک ہے۔

وہ واپس چل دیے۔ ہوا اور تیز ہوگئی تھی۔ واجد کو سردی لگ رہی تھی۔

"بہرحال‘ معاملات جس طرح چل رہے تھے‘ انہیں ویسے ہی چلنے دیا جائے" محمود شامی نے کہا "اور مجھے مخصوص اوقات میں فون پر رپورٹ دو۔ مجھے ضرورت پڑی تو تم سے رابطہ کرلوں گا۔ میرے پاس تمہارے کئی فون نمبر ہیں۔"

"بہتر جناب‘ اور اگر آپ سیکیورٹی کے انتظامات اور سخت کروالیں تو بہتر ہوگا۔"

"یہ تو میں جس حد تک ضروری سمجھتا تھا‘ پہلے ہی کر چکا ہوں۔"

واجد نے اس بار حفاظتی تدابیر کو بطورِ خاص چیک کیا تھا۔ اچھے انتظامات کیے گئے تھے لیکن وہ جس شخص کا پیچھا کر رہا تھا‘ وہ یقینی طور پر پروفیشنل تھا اور کسی پروفیشنل کے لیے اس حفاظتی دیوار میں رخنے تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ سابق صدر کے مزاج سے واقف تھا۔ اس سے براہِ راست اختلاف کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔

"منطقی اعتبار سے قاتل کا آخری اور لازمی ہدف آپ ہیں" اس نے کن انکھیوں سے محمود شامی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ خطرہ میرے لیے کوئی نیا نہیں۔"

واجد یہ بات جانتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ معاملہ مختلف ہے۔ یہ خطرہ نیا تُلا اور ذاتی سطح کا تھا۔

"تم بھول گئے ہو کہ میں کس مقام پر تھا۔ کہاں بیٹھا تھا میں۔"

"نہیں جناب۔ مجھے یاد ہے لیکن آپ پر کبھی کوئی قاتلانہ حملہ تو نہیں ہوا تھا۔"

"یہ درست ہے" محمود شامی نے اعتراف کیا "انہوں نے مجھے لفظوں کے‘ افواہوں کے اور طنز کے ذریعے تباہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مُڑی تُڑی حقیقتوں کے خنجر گھونپنے کی کوشش کی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوگئے۔ یقین کرو‘ وہ جو کچھ میں نے جھیلا‘ اس خطرے سے کسی طور بھی کم نہیں تھا‘ جو ہمیں اس وقت لاحق ہے۔"

"جی ہاں جناب۔"

دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ نرم ریت پر ان کے قدموں کی آہٹ اور موجوں کے شور کے سوا کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔

واجد جانتا تھا کہ وہ محمود شامی کے حکم کی تعمیل کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ محمود شامی کے دورِ صدارت میں شاکر نے جو اس وقت انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر تھا‘ اس سے خفیہ نوعیت کے کچھ کام کرائے تھے۔ یہ بات کہ وہ کام غیر قانونی تھے‘ اس وقت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔

محمود شامی کی خاصا عرصہ پہلے اس وقت کے وزیرِ اعظم جبّار

افضل سے ٹھن گئی تھی۔ محمود شاہی نے قومی اسمبلی میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے حکمراں پارٹی کے اراکینِ اسمبلی کو توڑنا چاہا لیکن اپنی پارٹی پر جبار افضل کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک مقبول وزیراعظم تھا۔ عوامی سطح پر بھی وہ ایک مقبول سیاست داں تھا۔ اس کی وجہ اس کے عوامی بہبود کے منصوبے تھے۔ وہ پہلا وزیراعظم تھا جس نے بڑے خلوص سے عام لوگوں کو کچھ دینے کی.... ان کے کام آنے کی کوشش کی تھی۔

قومی اسمبلی میں محمود شاہی کے راستے کی دیوار کامران احمد تھا۔ اس کا ایوان میں بڑا اثر ورسوخ تھا۔ جب تک وہ وزیراعظم کے ساتھ تھا، وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ محمود شاہی نے اسے ہی ہدف بنالیا۔

سیاست دانوں کو عام لوگوں کی طرف سے محبت بھرے، نفرت بھرے اور دھمکی آمیز خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے خطوط اسپیکر کے ذریعے انٹیلی جنس والوں کو بھجوادیے جاتے ہیں۔ انٹیلی جنس خط لکھنے والوں پر نظر رکھتی ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے کہ ان میں سے کوئی صحیح معنوں میں خطرناک تو نہیں۔

ایسے خط کامران احمد کو بھی موصول ہوتے تھے۔ کچھ اس لیے بھی کہ وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھا۔ ایوان میں اس کی پُرمغز اور مدلل تقریروں کے سامنے حزبِ اختلاف والے بھی بے بس نظر آتے تھے۔

سلطانیہ کا ایک شخص مصور حسین باقاعدگی سے کامران احمد کو دھمکی آمیز خط لکھتا تھا۔ اس کے خطوط کی زبان بہت خراب ہوتی تھی اور یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر متوازن نہیں ہے۔

یہ وہ خاص پروجیکٹ تھا جو واجد کو سونپا گیا۔ شاکر نے مصور حسین کو ایک خاص مقصد کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ پروجیکٹ کا انچارج واجد تھا۔

مصور حسین کے خط روکے جانے لگے۔ واجد ان خطوط کو پڑھتا اور فون پر ان کے جواب دیتا۔ یہ گمنام کال وہ آدھی رات کے بعد کرتا، جب نیم پاگل مصور حسین پر نیند کا دباؤ ہوتا۔ ایک تو ایسے میں اس کا ذہن ہربات قبول کرنے پر آمادہ ہوتا، دوسرے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے ہرروز اس کی ذہنی کیفیت مزید ابتر ہوجاتی۔

دن میں مصور حسین اپنی دُکان پر ہوتا، وہ اکیلا آدمی تھا۔ واجد کئی بار اس کے گھر میں داخل ہوا اور اس کی ڈائریاں پڑھیں۔ یوں وہ اس کے مزاج اور اس کی نفسیات سے اور واقف ہوگیا۔ رات کو فون پر وہ اس کے گھر کے، اس کی ڈائریوں کے حوالے دیتا۔ مصور حسین نے ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے بلکہ چند فون کالز کے بعد تو اس کے بگڑے ہوئے ذہن نے واجد کی آواز کو اپنے اندر کی آواز تسلیم کرلیا۔ ضمیر کی آواز۔

اس پروجیکٹ کا مقصد مصور حسین کو اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے پر اکسانا تھا جو وہ کامران احمد کو دیتا تھا.... یعنی قتل کردینے کی دھمکی۔ واجد فون پر اسے اکساتا رہتا.... غیرت دلاتا رہتا۔

پروجیکٹ کامیاب ثابت ہوا۔ کامران احمد سلطانیہ آیا تو مصور حسین نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ بعد میں اس نے اپنے اندر کی آواز اور خدا کی نشانیوں کے متعلق بتایا۔ اس نے بتایا کہ اس نے خدا کے حکم کے مطابق کام کیا ہے۔ یہ خیال کسی کو بھی نہیں آیا کہ مصور حسین کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت استعمال کیا گیا ہے۔

مصور حسین کی چلائی ہوئی پہلی گولی تو چُوک گئی تھی۔ دوسری گولی سے بچنے کے لیے کامران احمد گھوما تو وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پیوست ہوگئی۔ کامران مرا تو نہیں لیکن عمر بھر کے لیے معذور ہوگیا اور ذہنی طور پر بھی متاثر ہوا۔ اس کا سیاسی کیریر جو بہت تابناک تھا، اچانک ہی ختم ہوگیا۔

اگلا بڑا کام جو واجد کو سونپا گیا، وہ گلوریا شاکر سے متعلق تھا۔ سنسان سڑک پر اپنی گاڑی سے سائڈ مار کر گلوریا کی گاڑی کو کھائی میں دھکیلنا دشوار ثابت نہیں ہوا پھر اس نے گاڑی کو آگ لگانے کا سامان بھی کیا لیکن یہ غلطی کہ اس نے اسپیئر ٹائر کمپارٹمنٹ چیک نہیں کیا، غلطی ناقابلِ معافی تھی۔ اس کی پاداش میں اسے مستقل طور پر نظرانداز کردیا گیا۔ اس کے بعد اب اسے محمود شاہی کی خدمت کا موقع ملا تھا۔

واجد نے گلوریا شاکر کے معاملے میں ہونٹ سی لیے، اس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اس کی عقل مندی تھی۔ گلوریا کی موت کا حکم خود شاکر نے جاری کیا تھا۔ گلوریا اس سے جھگڑا کرنے کے بعد تیس لاکھ کی رقم اور چند اہم راز لے بھاگی تھی۔

محمود شاہی کو یہ بات معلوم تھی۔ اپنے عہدِ صدارت میں محمود شاہی کسی بات سے بے خبر نہیں رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہوا تو تمہیں انعام ملے گا" محمود شاہی نے اچانک پوچھا۔

"جانتا ہوں جناب اور سراہتا بھی ہوں" واجد نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ سزا اور انعام محمود شاہی کے فلسفۂ سیاست کے اہم ستون ہیں۔

وہ قصر کی حدود میں داخل ہوگئے۔ محمود شاہی نے واجد سے اندر آنے کو نہیں کہا۔ انہوں نے مصافحہ کیا پھر واجد اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ سفید کرولا کی باڈی میں بائیں جانب ایک بڑا ڈینٹ تھا جسے واجد نے کبھی ٹھیک کرانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر واجد کو احساس ہوا کہ سابق صدر اسے دیکھ رہا ہے۔ واجد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھادی۔

○☆○

فنگر پرنٹس کی مدد سے حمید کی لاش کی شناخت ہوگئی تھی۔ اخبارات نے اس کی موت کو صابر ملک کی موت سے مربوط کر کے خوب افسانہ طرازیاں کی تھیں۔ یہ کوئی نہیں جان سکا کہ حمید جلترنگ میں کیا کر رہا تھا۔ یہ بات تو اس کی بیوی کو بھی معلوم نہیں تھی۔

لیکن تنویر، شاہدہ کو جانتا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ شاہدہ جتنی بے خبری ظاہر کر رہی ہے، اتنی بے خبر نہیں ہے۔ وہ ایسی ہی عورت تھی کہ شوہر کی موت بھی اس کا شوہر سے رشتۂ وفاداری منقطع نہیں کر سکی تھی۔ وہ ہر قدم پر یہ سوچتی تھی کہ اس موقع پر حمید اس سے کیا توقع کرتا.... اور اسی کے مطابق عمل کرتی تھی۔

تنویر کے لیے شاہدہ کی خاموشی بہت اہم تھی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جا کر اس سے ملے۔

اگلے روز دوپہر کے بعد وہ حمید کے فلیٹ پہنچا۔ وہ پرانی چار منزلہ بلڈنگ تھی۔ زینے بے حد تنگ اور گندے تھے۔ لگتا تھا، برسوں سے رنگ و روغن بھی نہیں ہوا تھا۔ نیچے ایک فلیٹ میں ایک میاں بیوی بڑے زور و شور سے لڑ رہے تھے۔

تنویر نے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ سزا کاٹنے کے بعد حمید اتنے خراب حالات میں رہ رہا تھا۔ دنیا نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا لیکن دیا کچھ بھی نہیں تھا۔

شاہدہ نے دروازہ کھولا۔ تنویر نے پہلے اسے فون کر دیا تھا، اس لیے اس کی آمد اس کے لیے خلاف توقع نہیں تھی۔ اس کے انداز میں تنویر کے لیے اگر دوستی نہیں تھی تو عناد بھی نہیں تھا

"اندر آجائیے" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

فلیٹ اندر سے ایسا ہی تھا، جیسی تنویر کو توقع تھی حالانکہ آرائش کے ذریعے اسے گوارا بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

شاہدہ نے تنویر کو بوسیدہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے باوقار انداز میں دونوں ہاتھ گود میں رکھ لیے "آپ شاید تعزیت کے لیے آئے ہیں۔"

"ہاں شاہدہ" تنویر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"ایک بات اور بھی ہے میری بہن" تنویر بولا۔

"مجھے یقین تھا کہ کوئی اور بات بھی ہوگی۔"

تنویر نے اس کا کاٹ دار جملہ نظر انداز کر دیا "حمید میرے لیے کام کر رہا تھا... موت سے پہلے۔"

"ظاہر ہے...."

"لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی موت کا اس کام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ محض ایک حادثہ تھا۔"

شاہدہ نے نفی میں سر ہلایا "وہ محض حادثہ نہیں تھا۔ سب کچھ اس لیے ہوا کہ میرا شوہر بے وقوف تھا.... آپ کی طرح۔"

"بہت کچھ ایسا ہے جو تم نہیں جانتیں .... اور میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتی، اس لیے کہ مجھے پروا نہیں اس کی۔ میں اسے اہم نہیں سمجھتی۔" اس نے کرسی سے ٹیک لگالی اور سرگوشیانہ لہجے میں بولی "میں حمید سے محبت کرتی تھی، اب بھی کرتی ہوں" کوئی اور عورت ہوتی تو اتنا کہہ کر رو پڑتی لیکن شاہدہ کو آنسوؤں کا اظہار ناپسند تھا۔

"حمید جو کچھ کر رہا تھا، تم اسے غیر اہم کیوں سمجھتی ہو شاہدہ؟"

"اس لیے کہ وہ بے معنی ہے۔ آخر میں سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ کچھ بھی نہیں بدلتا۔"

"تم غلطی پر ہو شاہدہ۔ فرق تو پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہوگا..... مگر صرف تم جیسے، حمید جیسے لوگوں کے لیے۔"

تنویر نے بے چینی سے پہلو بدلا "تمہارے نزدیک بنیادی اہمیت کس چیز کی ہے؟"

"افراد کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی۔ اس لیے کہ نظام بدلنے کی ناکام کوشش میں انسان انہیں بھی گنوا دیتا ہے۔"

تنویر اٹھ کر کھلی کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے اس نے تین منزل نیچے جھانکا۔ "یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں جن کی تم بات کرتی ہو، خوش گوار لیکن احمقانہ خواب ہیں۔ یہ تمہیں تصویر کا دوسرا رخ نہیں دیکھنے دیتیں۔ دیکھو.... ہر انسان اچھی.... پُر آسائش زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن وہ لوگ ایسا نہیں ہونے دیتے۔"

"میرا آسائش کا تصور مختلف ہے۔ اور میرے نزدیک "وہ لوگ" آپ ہیں۔"

تنویر نے پلٹ کر اسے دیکھا "میرا خیال ہے، تم اس سلسلے میں کافی سوچتی رہی ہو۔"

"اور کیا کرتی۔ میرا شوہر احمق تھا، احمقوں کی جنت میں رہتا تھا۔ مجھے ایک بات بتائیے۔ آپ ایک مقصد کے تحت کام کر رہے تھے۔ آپ اس ملک کی تقدیر بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حاصل کیا ہوا؟ کچھ بدلا؟ سوائے اس کے کہ حمید دو سال اور آپ چار سال جیل میں گزار آئے۔ آپ نے آئیڈیلزم کے نام پر بڑے شوق سے اپنا استحصال کرایا کہ نہیں؟"

تنویر واپس آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ عجیب سا اضمحلال محسوس کر رہا تھا۔ شاہدہ کی بات سچی تھی۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ شاہدہ اور حمید کے درمیان ایسی گفتگو اکثر ہوتی ہوگی۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ کیوں آئے ہیں؟" شاہدہ نے اچانک کہا۔

"یقین نہیں آتا" تنویر بولا "ویسے اسے یقین تھا کہ شاہدہ نے

غلط نہیں کہا ہے۔ وہ اس کے وجدان کا پہلے ہی سے قائل تھا۔
"آپ کو اپنے تحفظ کے لیے میری خاموشی کی ضرورت ہے؟"

"بالکل درست۔ اب بتاؤ، مجھے یہ مل سکتی ہے؟"

"یقیناً ملے گی۔"

تنویر نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکا "اگر یہ سب کچھ بے معنی ہے تو تم زبان بند رکھنے کا وعدہ کیوں کر رہی ہو؟"

"اس لیے کہ حمید زندہ ہوتا تو مجھ سے یہی چاہتا۔ اور میرے لیے اس کی یادیں بہت محترم ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ میں جانتی ہوں، اس کی موت کے تم اتنے ذمے دار نہیں جتنا وہ خود تھا" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر بولی "اور میں جانتی ہی کتنا ہوں۔ یہی کہ تم اور وہ کسی معاملے میں باہم ملوث تھے۔ اس سے آگے میں کچھ کہوں تو وہ محض قیاس آرائی ہوگی۔"

"میں نہیں چاہتا کہ کسی کو اس بات کا علم ہو کہ میں نے رہائی کے بعد حمید سے رابطہ کیا تھا۔"

"بے فکر رہیے۔ کم از کم مجھ سے انہیں یہ بات معلوم نہیں ہو سکے گی۔"

یہ بھی کمال کی بات تھی کہ تنویر اس کی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر سکتا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی راست گو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا "شاہدہ بہن، یقین کرو، مجھے بہت دکھ ہوا حمید کی موت سے۔ میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں...."

پہلی بار شاہدہ کی آنکھوں میں نمی چمکی "مجھے یقین ہے آپ کی بات پر۔"

"بس تو اب میں چلتا ہوں۔"

شاہدہ نے بڑی اداسی سے سر کو تفہیمی جنبش دی، جیسے وہ اس کے لفظوں کو اس سے بہتر طور پر سمجھتی ہو۔

تنویر دروازے کے پاس پہنچ کر پلٹا "حمید خوش قسمت تھا کہ اسے تم جیسی بیوی ملی" اس نے کہا "تم دونوں ہی خوش قسمت تھے۔"

"ہر شخص خوش قسمت بھی ہوتا ہے اور بے وقوف بھی۔"

"تمہارا فلسفہ عجیب ہے مگر ممکن ہے درست ہی ہو۔"

شاہدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تنویر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نچلی منزل کے فلیٹ میں خانگی جنگ نہ صرف جاری تھی بلکہ اور زور پکڑ گئی تھی۔ نیچے پہنچ کر تنویر نے سکون کی سانس لی۔

لیکن نیچے پہنچنے کے بعد اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ شاہدہ کے پاس واپس چلا جائے اور اس کے پاس مزید کچھ دیر بیٹھے۔ اس کی موجودگی، اس کے فلسفۂ زندگی کی سادگی اور اس پر اس کا یقین اور اس کا ادراک اس کے لیے بے حد سکون بخش تھا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کیونکہ کسی کو بھی ایسے لوگوں کی کمپنی اچھی نہیں لگتی جو اس سے نظریاتی اختلاف رکھتے ہوں لیکن تنویر کو شاہدہ کے پاس بیٹھ کر وہ طمانیت حاصل ہوئی تھی، جو ایک بچے کو ماں کی قربت سے ملتی ہے۔

اس نے اس خواہش کو ذہن سے جھٹکا، سڑک پار کی اور ریکو کی طرف چل دیا۔ یہ وہ ریسٹورنٹ تھا، جہاں جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ حمید سے پہلی بار ملا تھا۔

ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھانے والوں کا رش تھا۔ تنویر کو بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے چائے منگوالی۔ برابر والی میز پر ایک موٹا آدمی اپنے ساتھی کو ایک کانٹریکٹ کے بارے میں بتا رہا تھا جس پر اس کی زندگی اور موت کا انحصار تھا۔ موٹے شخص کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی لشکارے مار رہی تھی۔

تنویر چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے شاہدہ سے اپنی گفتگو کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ شاہدہ کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس نہ کرے لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ شاہدہ کے انداز... سے اس کے لیے اتنی ہی ہمدردی ظاہر ہو رہی تھی۔

ریسٹورنٹ میں چھوٹا رنگین ٹی وی چل رہا تھا۔ پروگرام روکا گیا اور ایک اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ملک کی مقبول ترین سیاسی پارٹی 'پبلک لیگ' کے سلیم پور کے کارکنوں نے وزارتِ عظمیٰ کے لیے شاہد انور کا انتخاب کیا ہے۔

صدر محمود شامی نے صدارت سے استعفیٰ دیتے ہوئے جو آرڈیننس جاری کیے تھے، انہیں اگلی قومی اسمبلی نے باقاعدہ آئینی ترمیم کی شکل میں منظور کر لیا تھا۔ اس ترمیم کے تحت یہ پہلا انتخاب ہونے والا تھا۔ اور یہ اس کا ابتدائی مرحلہ چل رہا تھا۔ ملک کے ہر اہم شہر سے پبلک لیگ کے کارکنوں کا فیصلہ سامنے آنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا کہ اگر پبلک لیگ الیکشن کے بعد حکومت بنانے کی پوزیشن میں آئی تو وزیر اعظم کون ہوگا؟

○☆○

جس وقت تنویر ریکو ریسٹورنٹ میں چائے پی رہا تھا، چھدرے بالوں والا ایک شخص شاہدہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اڑتے ہوئے بالوں کی وجہ سے اس کی پیشانی بہت کشادہ لگ رہی تھی۔ اس شخص کا نام حارث تھا۔

حارث کی عمر اگرچہ چالیس سے تجاوز کر چکی تھی، اس کا پیٹ بھی قدرے باہر نکل آیا تھا لیکن چہرے سے وہ تیس سے زائد ہرگز نہیں لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی ملائمت او معصومیت تھی۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔

شاہدہ نے دروازہ کھولا۔ حارث مسکرایا "آپ بیگم حم ہیں؟"

شاہدہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"میرا نام حارث ہے۔ میرا تعلق محکمۂ خفیہ سے ہے" حارث نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا "آپ کے شوہر کی موت کا افسوس ہوا۔"

"تم حمید کو جانتے تھے؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ اندر آنے کو نہیں کہیں گی؟"

"ضرور۔ تشریف لائیے" شاہدہ نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا لیکن اس کے انداز میں واضح ہچکچاہٹ تھی۔

حارث اندر داخل ہوا۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ مچلی اور وہ بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ اس میں نسوانیت اور دل کشی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو ایک پل میں بدل کر رکھ دیتی تھی۔

شاہدہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر اس نے انکار کر دیا "میں نے آپ کو کھانا کھاتے میں ڈسٹرب کیا ہے؟"

"نہیں۔ میں کھانا کھا چکی ہوں۔ برتن سمیٹنے والی تھی کہ تم آگئے" شاہدہ نے مروتاً جھوٹ بولا پھر وہ برتن اٹھا کر کچن میں لے گئی۔ واپس آئی تو حارث اسی طرح ایک کرسی کے پیچھے کھڑا تھا.... کرسی کی پشت گاہ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے۔

شاہدہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں آپ سے آپ کے مرحوم شوہر کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں" حارث نے کہا۔

"کیوں؟"

"ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ جلترنگ میں کیا کر رہے تھے؟"

"لیکن کس لیے؟"

حارث ہنسنے لگا "لگتا ہے، جواب مجھے ہی دینا پڑیں گے۔ آپ کو شاید سوال کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"حارث صاحب، جواب میرے پاس ہے ہی نہیں" شاہدہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ حمید صاحب آپ کو یہ بتائے بغیر کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں، جلترنگ چلے گئے تھے؟"

شاہدہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ یہ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ حمید اسے کبھی کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ معلومات ان دونوں کے لیے ہی خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں لیکن اب اسے خویر الزماں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ حمید تو ہر فکر سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

"جیل سے رہا ہونے کے بعد آپ کے شوہر کیا کرتے رہے؟"

"دو کراٹے سینٹر تھے، جہاں وہ لڑکوں کو مارشل آرٹس کی تربیت دیتے تھے۔"

"لیکن ایک ماہ پہلے انہوں نے دونوں ملازمتیں چھوڑ دی تھیں۔ تو کیا وہ ملازمت کی تلاش میں تھے؟"

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے جاب چھوڑ دی تھی۔ ویسے بھی شعبۂ مال ان کا تھا۔ میں کبھی دخل نہیں دیتی تھی اس میں۔"

"اوہ۔ اچھا، ایک ہفتے کے لیے جلترنگ جانے سے پہلے بھی وہ آپ کو بتائے بغیر غائب ہوئے تھے؟"

"وہ وقتاً فوقتاً چلے جاتے تھے۔ یہ ان کا اسٹائل تھا۔ اور انہیں آخری بار گئے ایک ہفتہ نہیں ہوا تھا۔"

"ہاں۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ تین چار دن ہوئے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔"

"کتنے دن؟"

"تین دن۔"

"ٹھیک۔ اور انہوں نے کرشن گڑھ تک فضائی سفر کیا تھا؟"

"اچھا۔ مجھے تو معلوم نہیں۔"

"حیرت ہے۔ آپ کو نہیں معلوم۔"

"میں سو کر اٹھی تو وہ جا چکے تھے۔ ان کا رقعہ موجود تھا۔"

"رقعے میں کیا لکھا تھا؟"

"یہی کہ وہ جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے۔"

"آپ کے شوہر بہت زیادہ رازداری کے قائل تھے۔"

"اس کے لیے آپ انہیں الزام نہیں دے سکتے۔ جانتے ہیں، اخبار والوں نے ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ مصیبت آئی تو بڑے لوگوں نے جو اُن سے کام لیتے تھے، سب کچھ ان پر ڈال دیا۔ انہیں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانا پڑیں۔ ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا....."

"دھوکا!"

"ہاں۔ وہ یہی محسوس کرتے تھے۔"

حارث سوچ میں پڑ گیا۔ لگتا یہی تھا کہ وہ عورت کچھ نہیں جانتی لیکن اس کا پیشہ ہی ایسا تھا کہ وہ یقین نہیں کر سکتا تھا "آپ کے شوہر کس حد تک تلخ تھے؟"

"تلخ؟ میں نہیں سمجھتی کہ ایسا تھا۔ وہ ہر معاملے کو ایک خاص نکتۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا اپنا ایک فلسفہ تھا جینے کا۔"

"یہ انسان کے لیے ایک بڑا اثاثہ ہوتا ہے۔"

"کبھی ایک بڑی رکاوٹ بھی ثابت ہوتا ہے" شاہدہ نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں، اس کا انحصار خود آدمی پر ہے" حارث نے پہلو بدلا "آپ جانتی ہیں نا کہ میں کیوں یہ سب کچھ پوچھ رہا ہوں؟ سابقہ حکومت کے عہد میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین کی اموات کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ آپ کے شوہر کے ان لوگوں سے تعلقات بھی رہے تھے۔"

"ہاں.... مگر برسوں پہلے۔ بعد میں تو کسی نے انہیں کبھی پوچھا بھی نہیں کہ کس حال میں ہو۔"

"آپ جانتی ہیں نا، میں کن لوگوں کی بات کر رہا ہوں؟"

"جی ہاں' وہ جو گیٹ وے اسکینڈل میں ملوث تھے۔"

"ان میں سے چار افراد حال ہی میں مر چکے ہیں۔"

"آپ کے خیال میں یہ اتفاق نہیں ہے؟"

"سچ یہ ہے کہ میں نہیں جانتا۔ میرا خیال تھا' آپ سے کچھ معلومات حاصل ہوں گی تو کوئی رائے قائم کی جا سکے گی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میری بے خبری کی وجہ سے آپ اندھیرے میں رہ گئے۔"

"روشنی تو ہو ہی جائے گی بیگم حمید۔"

"یہ ہے رجائی نکتۂ نظر۔"

"آپ کو کوئی اہم بات یاد آئے تو مجھے اس نمبر پر رنگ کر لیجئے گا" حارث نے اس کی طرف کارڈ بڑھایا "تب میری رجائیت بے جواز نہیں رہے گی۔"

شاہدہ نے کارڈ کو ایک نظر دیکھا اور میز پر رکھ دیا۔ وہ حارث کے ساتھ دروازے تک گئی۔

"آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ" حارث کا چہرہ پھر مسکراہٹ سے جگمگا اٹھا۔

اسے رخصت کر کے شاہدہ کھڑکی کی طرف چلی آئی۔ اس نے حارث کو چھوٹی سبز کار میں بیٹھتے دیکھا۔ کچھ دیر وہ بیٹھا کچھ پڑھتا رہا پھر اس نے گاڑی آگے بڑھادی' اگرچہ اس نے نظر اٹھا کر کھڑکی کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن شاہدہ کو احساس تھا کہ وہ اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

اس نے سوچا کہ تنویر کو فون کر کے حارث کی آمد کے بارے میں بتا دے مگر پھر اس نے فیصلہ کیا کہ یہ غیر ضروری ہے۔ حمید مر چکا ہے لہٰذا اس کھیل سے اب اس کا اور حمید کا کوئی تعلق نہیں۔

اس نے ٹی وی آن کر دیا۔ سکندر آباد کے انتخابی نتائج کا اعلان ہو رہا تھا۔ اس نے ٹی وی آف کر دیا۔ اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

○☆○

سکندر آباد میں وہ جیت چکا تھا۔ مستقبل کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس کی نامزدگی اب تقریباً یقینی تھی۔ اسے اب صرف ایک شہر کی تائید درکار تھی جبکہ فیصلہ سنانے والے چار شہر ابھی باقی تھے۔

وہ حیات ریجنسی ہوٹل کے آرام دہ سوئٹ میں بیٹھا ان اخباری نمائندوں کو فاتحانہ مسکراہٹ سے نواز رہا تھا جنہیں خصوصی طور پر سوئٹ میں داخلے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کی بیوی زرینہ اس کے برابر بیٹھی تھی۔ اس کی ۲۱ سالہ بیٹی عائشہ اور ۱۴ سالہ بیٹا وہاب بھی کمرے میں موجود تھے۔ وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی پر سکندر آباد کے انتخابی نتائج کا تفصیلی اعلان کیا جا رہا تھا۔ وہ سب بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

شاہد انور کو ڈر تھا کہ بچے جوشِ جذبات میں کوئی نعرۂ فتح بلند نہ کر دیں۔ عوام کو ایسی کم ظرفی اچھی نہیں لگتی۔ شاہد کو اپنے پبلک امیج کی بڑی فکر رہتی تھی۔

زرینہ انور وزارت عظمیٰ کے امیدوار کی آئیڈیل بیوی تھی۔ وہ ذہین' خوش لباس' خوش اطوار اور حد درجہ باوقار عورت تھی۔ اس نے خود کو پبلک کی توقعات کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ وہ جیسی نظر آنے کی بھرپور کوشش کرتی تھی' درحقیقت ویسی ہی تھی۔ نیوز میڈیا نے بہت پہلے یہ بات محسوس کر لی تھی چنانچہ وہ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

"آپ کا اگلا معرکہ سہراب پور میں ہوگا؟" ایک اخباری نمائندے نے شاہد انور سے پوچھا۔

شاہد انور کی مسکراہٹ اور کشادہ ہو گئی "جی ہاں۔ ہماری اگلی منزل سہراب پور ہے" اس نے جواب دیا۔ سب جانتے تھے کہ عین ممکن ہے کہ سہراب پور ہی میں اس کی نامزدگی پکی ہو جائے۔

شاہد انور سولہ سال سے ملکی سیاست میں تھا لیکن عملی سیاست بھی اس کے چہرے کی معصومیت کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ اس کے بال گرنے لگے تھے اور کنپٹیوں پر چاندی جھلکنے لگی تھی لیکن چہرے سے وہ اب بھی نوعمر لڑکا لگتا تھا اور اس کا جوش اور ولولہ بھی نوجوانوں کا سا تھا' اسی لیے اس کے ووٹرز اسے شدت سے چاہتے تھے۔

اپنی بیوی زرینہ کے برعکس شاہد کی شخصیت اس کے پبلک امیج سے بالکل مختلف تھی۔ درحقیقت اب وہ اتنا پُرجوش نہیں تھا' جتنا ظاہر کرتا تھا۔ وہ بہت تلے قدم اٹھاتا تھا۔ دماغ ٹھنڈا رکھ کے خوب حساب کتاب لگا کے کوئی فیصلہ کرتا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سیاست میں بقا اسی صورت میں ممکن ہے۔

عملی سیاست میں اس کی کارکردگی کا ریکارڈ بے حد شاندار تھا۔ اس نے بڑے کڑے وقت میں بنیادی حقوق کے لیے آواز بلند کی تھی۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی سہی تھیں لیکن اپنے اس کردار کی وجہ سے پارٹی میں اس کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔ وہ اسمبلی کی کئی کمیٹیوں کا ممبر رہا۔ اس کی دیانت داری کو ہر مقام پر سراہا گیا۔ قانون سازی میں بھی وہ پیش پیش رہا۔ اس نے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔ کئی قانونی بل نہ صرف پیش کیے بلکہ ان کے لیے مؤثر لابی انگ بھی کی۔ وہ اپوزیشن میں بھی رہا اور حزبِ اقتدار میں بھی مگر مخالف گروپ میں بھی ہمیشہ اس کی عزت رہی۔ وہ سابق صدر محمود شامی کے حامیوں میں سے تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ محمود شامی کی حمایت اس کا سیاسی مستقبل تاریک کر دے گی تو وہ محمود شامی کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔

کمرے میں فون کی گھنٹی وقفے وقفے سے مسلسل بج رہی تھی۔ شاہد انور کی انتخابی مہم کا انچارج نوید مبارک باد کی کالیں وصول کر رہا تھا۔ وہ بھی بہت خوش تھا کیونکہ شاہد کی کامیابی اس کی کامیابی تھی۔

نوید ریسیور کریڈل پر رکھ کر شاہد کی طرف آیا "اب کچھ دیر فون آپ ریسیو کرلیں۔ میں تھک گیا ہوں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ضرور' کیوں نہیں" شاہد بھی مسکرادیا۔ وہ اٹھ کر فون کے پاس رکھی آرام کرسی پر آبیٹھا' فوراً ہی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "یس... شاہد انورا سپیکنگ..."

وہ بڑی خوش اخلاقی سے' پُروقار انداز میں کالز ریسیو کرتا رہا۔ فاتح خوش مزاج ہو ہی جاتے ہیں۔ اخلاق اور مزاج کی آزمائش تو شکست کے لمحوں میں ہی ہوتی ہے۔

○☆○

حیات ریجنسی سے کچھ فاصلے پر رائل ہوٹل تھا۔ رائل ہوٹل کے سوئٹ میں وزارت عظمٰی کے دوسرے حریف عمر نصیر کا کیمپ تھا۔ وہاں کی فضا بجھی بجھی سی تھی۔ عمر نصیر کے ساتھی شکست کی حقیقت قبول کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

اس کمرے میں انتخابی نتائج سے سب سے زیادہ بے فکر اگر کوئی تھا تو وہ خود عمر نصیر تھا۔ وہ دُبلا پتلا طویل القامت آدمی تھا۔ اس کی شخصیت بے حد پُروقار تھی۔ اور وہ وقار اس نے لبادے کی طرح اوڑھا ہوا نہیں تھا۔ اس پُروقار شخص کے بہت اندر کہیں گہرائی میں ایک توانا خواہش شعلے کی طرح روشن تھی جس کی تکمیل کے لیے اس نے گزشتہ بیس برس میں اپنی ہر خواہش ترک کردی تھی لیکن اب لگتا تھا کہ وہ اپنی منزل کھوچکا ہے۔ اگر اس کا وقار محض ایک خول ہوتا تو اب تک چٹخ گیا ہوتا کیونکہ اب ایسا لگتا تھا کہ اس کا حریف شاہد انورا انتخابی جنگ جیت چکا ہے۔

یہ اس کی شخصیت اور اس کے خلوص کا کمال ہی تھا کہ اس وقت بھی اس کا کمرا اس کے پرستاروں سے .... اس کے مخلص کارکنوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ خود کھڑکی کے پاس کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائٹنگ پیڈ تھا جس پر وہ کچھ لکھ رہا تھا۔

اس نے پیڈ کا اوپری صفحہ پھاڑ کر علیحدہ کیا' پین بند کرکے اپنی جیب میں رکھا اور اپنے ایک کارکن کو اشارے سے بلایا "منور... میں چاہتا ہوں کہ یہ ٹیلی گرام شاہد انور کو جلد از جلد بھجوادو۔"

منور نے کاغذ ہاتھ میں لیا اور ٹیلی گرام کا مضمون پڑھا۔

ڈیئر شاہد انور'

اس چوٹی کی طرف ایک اور کامیاب قدم بڑھانے پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کرو جسے سر کرنے کی میں بھی کوشش کررہا ہوں لیکن دوست' چوٹی بہرحال ابھی سر نہیں ہوئی ہے۔

تمہارا دوست عمر نصیر۔

"یہ تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے منور؟" عمر نے خوش دلی سے کہا "تمہیں میری بات یاد نہیں یا اس پر یقین نہیں؟"

کمرے میں موجود لوگ ان کی طرف چلے آئے "کون سی بات جناب؟" منور نے پوچھا۔

"میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ اس ملک میں جاگیردار بھی حکومت کرچکے اور صنعت کار بھی لیکن ملک کی تقدیر متوسط طبقے کا کوئی فرد ہی بدلے گا' جو خود بھی پریشان اور بدحال اکثریت میں سے ہوگا۔"

"ہمیں یاد ہے جناب" کئی آوازیں ابھریں۔

عمر نصیر کو یاد تھا' اس نے یہ بات ایک اخباری نمائندے سے بھی کہی تھی۔ جواباً صحافی نے طنزاً کہا تھا "ملک کی تقدیر تو شاید نہ بدل سکے لیکن وہ شخص اپنی پشتوں تک کی تقدیر ضرور بدل دے گا۔" اس پر عمر نے کہا تھا "جب ملک کے عوام اتنے باشعور ہوجائیں گے کہ اپنے لیے نمائندے دولت مند اقلیت کے بجائے غریب اکثریت میں سے منتخب کریں تو یقین کرو' اس وقت تک انہیں سچے اور مخلص سیاست دانوں کی شناخت بھی ہوچکی ہوگی۔" صحافی حیران ہوگیا۔ اس کی حیرت بھی بجا تھی لیکن یہ عمر نصیر کا وقار تھا' جس نے اس سے صحافی کی توقع کے برعکس جواب دلوایا تھا۔ ورنہ فطری جواب تو یہ تھا کہ مجھے اپنی اور اپنی آنے والی نسلوں کی تقدیر بدلنی ہوتی تو ان بیس برسوں میں کئی بار بدل سکتا تھا۔ وہ صحافی جو اس کے مخالفین میں سے تھا' اس لمحے سے اس کا حامی بن گیا تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے کہا تھا "عمر صاحب' یہاں اقلیت بہت طاقت ور اور بااختیار ہے۔ وہ اتنی بڑی تبدیلی کبھی نہیں آنے دے گی۔" اس پر عمر نے کہا تھا "جب تبدیلی آنی ہوگی تو اسے کوئی نہیں روک سکے گا۔ اور میں اس خود غرضانہ خواہش پر شرمسار ہرگز نہیں ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس اعزاز سے مجھے سرفراز فرمائے۔"

اب اس کی وہ خود غرضانہ خواہش یاس میں ڈھلنے والی تھی مگر وہ اداس نہیں تھا۔

"سنو دوستو' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں" اس نے اپنے کارکنوں سے کہا "میں اب بھی پُراعتماد ہوں تو اس کا بھی کوئی سبب ہوگا۔"

منور فون کی طرف چلا گیا۔ اتنی دیر میں کئی اخباری نمائندے اندر آگئے۔ ایک نمائندے نے عمر سے پوچھا "آپ نے اپنے حریف سے رابطہ کیا؟"

"میرا مبارک باد کا تار چند گھنٹوں میں شاہد تک پہنچ جائے گا" عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب آپ کے خیال میں صورت حال کیا ہے؟" ایک اور اخبار نویس نے پوچھا۔

"کیسی صورت حال؟ کون سی صورت حال؟"

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ ایک اور اخبار نویس نے سنجیدگی سے کہا "عمر صاحب' کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا کاز شکست کھا گیا ہے؟"

وہ وہی اخبار نویس تھا جو کبھی اس کا مخالف تھا اور اب اس کا

گرویدہ تھا۔ عمر نے کہا "نہیں رئیس! ایک تو یہ کہ ابھی ہمارے پاس آخری جنگ کی گنجائش ہے' دوسرے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جب تبدیلی آنی ہوگی تو آکر رہے گی اور ضروری نہیں کہ اس تبدیلی کا ہیرو میں ہی ہوں۔"

"اب سہراب پور میں آپ کے امکانات کیسے ہیں؟"

عمر پُراعتماد انداز میں مسکرایا "بے حد روشن۔"

"آپ اپنی حکمتِ عملی میں.... اپنی اپروچ میں کوئی تبدیلی کریں گے؟"

"نہیں۔ میں تو بیس سال سے ایک ہی راستے پر چل رہا ہوں' اسے ترک تو نہیں کر سکتا۔"

سوالوں کا سلسلہ دس منٹ تک جاری رہا۔ عمر نصیر خوش مزاجی سے' کھلے دل سے' اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں جواب دیتا رہا۔ صحافی اس کے اعتماد اور ٹھہراؤ سے بہت متاثر تھے۔ وہ اس سے متفق ہو رہے تھے کہ انتخابی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی.... جاری ہے۔



نیاز' تنویر کے گھر کے قریب والے پارک میں تنویر سے ملا۔ وہ اپنے مخصوص پُراعتماد انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پارک میں کچھ بچے درختوں کے گرد کھیل رہے تھے۔ کچھ جھولوں سے لٹک رہے تھے' پھسلنیوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ کچھ بچے اینٹوں کی ایک پکی دیوار کے ایک طرف مارم پٹی کھیل رہے تھے۔ ان میں سرخ قمیص پہنے ایک بہت تیز لڑکا بہت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو بڑی مہارت سے ہر بار بچاتا تھا اور گیند دیوار سے ٹکرا کر مارنے والے لڑکے کے پاس واپس چلی جاتی تھی۔ وہ ٹینس کی ایک پرانی اور دبی ہوئی گیند تھی۔ دیوار سے ٹکراتی تھی تو بہت زور کی آواز پیدا ہوتی تھی۔

نیاز لمبی جیکٹ اور سیاہ پینٹ پہنے ہوئے تھا' آنکھوں پر ایسا دھوپ کا چشمہ تھا جس کے شیشے دھوپ میں مختلف زاویے سے مختلف رنگ منعکس کرتے ہیں۔ اس نے صبح تنویر کے گھر فون کیا تھا اور فوزیہ کو اپنا وہ فرضی نام بتایا تھا جس سے تنویر بھی واقف تھا۔

نیاز نے اونچے درختوں کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور بولا "سلطانیہ میں کوئی میرے متعلق پوچھ گچھ کرتا پھر رہا ہے۔"

ٹینس کی گیند دیوار سے ٹکرائی۔ گیند سے بچنے والا لڑکا ہنسا۔ اس کی ہنسی میں موسیقیت تھی۔

"کس طرح؟" تنویر نے پوچھا۔

"میرے دوستوں سے' ملنے والوں سے اور میرے سالے سے۔"

"کس حیثیت سے؟"

"یہی تو بات ہے۔ وہ صرف ایک شناخت رکھتا ہے.... کرنسی نوٹ۔"

گیند پھر دیوار سے ٹکرائی.... ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔

"کچھ معلومات حاصل ہوئیں اسے؟" تنویر نے پوچھا۔

نیاز نے چشمہ اُتارا اور مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا "کوئی کچھ جانتا ہی نہیں تو اسے کیا بتائے گا۔"

ہوا کا جھونکا آیا۔ درختوں کے پتے شور مچانے لگے۔ وہ دونوں سائڈ میں پڑی لکڑی کی ایک بینچ کی طرف بڑھ گئے۔ بینچ پشت گاہ سے محروم تھی لہٰذا وہ دونوں آگے کی طرف جھک کر بیٹھ گئے "اس شخص کا حلیہ معلوم کیا تم نے؟" تنویر نے پوچھا۔

"عام سا حلیہ بتایا گیا ہے۔ بھاری جسم' سیاہ بال' براؤن آنکھیں' شستہ لہجہ" اتنا کہہ کر نیاز مسکرایا جیسے کوئی لطیفہ سنایا ہو "تم تو جانتے ہی ہو باس کہ حلیے کس حد تک درستی کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔"

تنویر یہ بات خوب سمجھتا تھا' اس نے دیکھا تھا کہ دو اشخاص ایک ہی شخص کا حلیہ بیان کریں تو وہ شاذ و نادر ہی ایک جیسا ہوتا ہے۔ تاہم موہوم سا حلیہ بھی بعض اوقات نمایاں جسمانی خصوصیات کو سامنے لاتا ہے۔ اس شخص کے چہرے پر کوئی ایسی نشانی نہیں ہوگی جو دیکھنے والوں کو یاد رہتی۔ وہ عام سا آدمی تھا.... یعنی کوئی بھی ہو سکتا تھا۔

گیند اس بار گولی کی سی رفتار سے دیوار پر پڑی۔ اس بار لڑکا بال بال بچا تھا۔ اس کی ہنسی نہیں سنائی دی۔ شاید گیند کے دیوار سے ٹکرانے کی آواز نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ ایڑیوں کے بل گھوما۔ اب وہ دوسرے لڑکے کے روبرو تھا جو گیند دوبارہ مارنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا رہا تھا۔

"اگلا پروگرام ملتوی نہ کر دیں باس؟" نیاز نے کہا۔

تنویر نیچے زمین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا "ہم بہت محتاط رہے ہیں۔ ہم نے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا ہے۔"

"ممکن ہے' اس شخص کو ثبوت کی تلاش ہی نہ ہو" نیاز بولا۔

"وہ جو کوئی بھی ہے اور جس کسی کی بھی نمائندگی کر رہا ہے' اس کے لیے یقین حاصل کرنا تو بہرحال ضروری ہوگا اور اس میں وقت لگے گا۔ اس دوران ہم آگے بڑھ چکے ہوں گے۔"

نیاز نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چشمہ دوبارہ لگایا "تو اگلی ملاقات طے شدہ وقت پر ہوگی؟"

"ہاں" تنویر بھی اٹھ کھڑا ہوا "بہرحال کوئی خاص بات ہو تو مجھے ضرور مطلع کر دینا۔ اب ہمیں اور زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔"

"یہ شخص شاید پہلے سے ہی...."

"ہاں" تنویر نے اس کی بات کاٹ دی "صابر ملک کی لاش مختلف مقام پر پائی جانے کا ذمے دار یہی شخص ہوگا۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ صابر کو موت کی طرف دھکیلا گیا تھا یا اس کی موت قدرتی تھی۔ میرا خیال ہے' اس شخص نے صابر کی لاش کو چارے

کے طور پر استعمال کیا تھا۔"

"تمہارے خیال میں حمید کو بھی اسی نے قتل کیا ہے؟" نیاز نے نامعلوم شخص کو گالی دیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے، حمید نے جلد بازی میں یہ بات نظرانداز کردی تھی کہ سڑک پر ٹریفک بہت زیادہ ہے۔ شاید وہ اس وقت صابر کا پیچھا کررہا ہوگا۔ ممکن ہے، صابر نے اسے دیکھ لیا ہو اور اسے جھٹکنے کی کوشش کررہا ہو۔ بہرکیف حمید اپنی بے پروائی کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔"

نیاز کا منہ بن گیا تاہم اس نے سر کو اثباتی جنبش دی، جیسے تنویر سے متفق ہو۔

"اور ایک بات سن لو نیاز۔ تم میرے پابند نہیں ہو۔ جس وقت جی چاہے، پیچھے ہٹ سکتے ہو۔ یہ بات میں نے ابتدا میں ہی واضح کردی تھی۔"

"جیتے جی تو یہ ممکن نہیں کہ میں تمہیں تنہا چھوڑ دوں" نیاز نے کہا "اگر تم نے اس کام کا بیڑہ نہ اٹھایا ہوتا تو میں خود یہ کام کرتا۔ اپنے طور پر یا حمید سے مل کر۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تمہاری رہائی کا منتظر تھا۔"

تنویر مسکرادیا۔ اس نے نیاز سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "محتاط رہنا۔"

"تم بھی۔ تم بہت اہم ہو۔"

تنویر اسے پارک کے گیٹ کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ نیاز کو چلتے دیکھ کر اسے ہمیشہ اس بلی کا خیال آتا تھا جو دبے قدموں چوہے کے پیچھے بڑھ رہی ہو۔

تنویر دوبارہ بینچ پر بیٹھ گیا۔ نیاز نے اسے جو کچھ بتایا تھا، وہ اس پر غور کررہا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ کوئی نہ صرف اسے تلاش کرنے کی غرض سے بلکہ اس کو ترتیب وار انتقام سے روکنے کے لیے اس کا پیچھا کررہا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، قانون سے پہلے اس تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں قتل کا بوجھ کم کرنے کے لیے وہ قانون کے سامنے وہ معلومات نہ اُگل دے جو پچھلی بار اس نے اپنے سینے میں دفن رکھی تھیں۔ گیٹ وے کے دوسرے شرکا کو اس کی یقینی خاموشی درکار تھی۔

تنویر سوچ رہا تھا کہ اگر اس کا یہ ان جانا حریف اس جیسا ہی تجربہ کار ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے لیے میدان تنگ ہونے والا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ اس کے خلاف کچھ ثابت کیا جاسکے گا۔

تنویر کو ایک عجیب سی آواز اور پھر تکلیف بھری چیخ سنائی دی، اس نے سر گھما کر دیکھا۔ سرخ قمیص والا لڑکا دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھامے، جھکا ہوا تھا۔ ٹینس کی گیند اس کی پسلیوں اور پیٹ کے مقامِ اتصال پر لگی تھی۔ اب وہ لڑکا ہنس رہا تھا جو گیند مار رہا تھا۔

تنویر اٹھا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔

○☆○

یہ اسی دن کی بات ہے۔ واجد کی سفید کرولا آدم پور جانے والی نیم پختہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے واجد دل ہی دل میں اپنی کھٹارا گاڑی کو کوس رہا تھا۔ کار گہری ڈھلان میں اُتری پھر اُبھری تو اسے درختوں کا جھنڈ اور وہاں کھڑی ہوئی خاصی بڑی تعداد میں کاریں نظر آئیں۔

اس نے اپنی کار جھنڈ کے قریب ایک کار کے ساتھ لگادی۔ باہر آکر اس نے دروازہ مقفل کردیا۔

سامنے ایک پگڈنڈی تھی جس پر بہت سارے لوگ جاتے نظر آئے۔ وہ سب میلے میں جارہے تھے۔ واجد بھی اس پگڈنڈی پر چل دیا۔

آدم پور کا میلہ بہت مشہور تھا۔ میلے کی جان کتوں کی فائٹ تھی جس میں لاکھوں کی شرطیں لگتیں اور لوگوں کا جوش و خروش دیدنی ہوتا۔ میلے میں آنے والے زیادہ تر لوگوں کے لیے کتوں کی فائٹ ہی وجہ کشش تھی۔

واجد کو نہ میلوں ٹھیلوں سے کوئی دلچسپی تھی، نہ کتوں کی فائٹ سے۔ وہ تو ایک شخص کی تلاش میں آیا تھا۔ پیر بخش کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ملک میں موجود ہو.... کہیں بھی ہو، آدم پور کا میلہ کبھی مس نہیں کرتا۔

پگڈنڈی کے اختتام پر ایک بہت بڑا میدان تھا۔ میلہ اپنے شباب پر تھا۔ طرح طرح کے کھیل تماشے ہورہے تھے۔ ایک طرف ناچ گانا ہورہا تھا۔ شوقین لوگ بڑھکیں مارتے اور پیسے لٹاتے۔ مختلف اسٹال بھی لگائے گئے تھے۔ وہاں عورتیں بھی بڑی تعداد میں تھیں۔

لیکن واجد کو جس مقام میں دلچسپی تھی، وہاں عورتیں نہیں تھیں۔ سب سے زیادہ ہجوم وہیں تھا۔ سیکڑوں افراد ایک بہت بڑا دائرہ بنائے کھڑے تھے۔

واجد نے پہلے پورے میلے کا چکر لگایا۔ پیر بخش اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ کتوں کی فائٹ کے رنگ کی طرف چل دیا۔

خاصے بڑے دائرے میں ایک بڑا مربع قطعۂ زمین تھا جو لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس قطعے میں دو کناروں پر دو بورڈ تھے۔ درمیانی جگہ پر میلی کچیلی خون کے دھبوں بھری کینوس کی شیٹ بچھی تھی۔ وہ درحقیقت کتوں کا رنگ تھا۔

کھیل شروع ہونے والا تھا۔ شوروغل اور تحرک، دونوں میں نمایاں کمی ہوگئی تھی۔ دبی دبی آوازوں میں بڑی بڑی شرطیں لگائی جارہی تھیں۔

دونوں بورڈز پر دو کتے اور ان کے ہینڈلرز موجود تھے۔ کتے ایک خاص نسل کے تھے جنہیں پٹ بل کہا جاتا ہے۔ وہ متوسط جسامت کے چھوٹے بالوں والے کتے تھے، جن کا سینہ بہت کشادہ، جسم کا پچھلا حصہ بہت پتلا اور جبڑے بے حد طاقتور تھے۔ وہ خاص

لڑا کا کُتے تھے۔

جو کُتا واجد سے نزدیک تر تھا' اس کا نام شیر دل تھا۔ اس کے کان ندارد تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ کسی پچھلی لڑائی میں کسی حریف نے اسی بُری طرح چبائے ہوں گے کہ ان کی محض علامات ہی رہ گئی تھیں۔ اس کا مالک دُبلا پتلا' نرم آنکھوں والا اس علاقے کا رئیس علی باقر تھا۔ شیر دل کو تربیت اس نے خود دی تھی۔ وہ شیر دل کو گردن سے پکڑے ہوئے تھا۔ شیر دل اپنے حریف پر ٹوٹ پڑنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

دوسرا کُتا سیاہ و سفید پٹ بل تھا۔ اس کا نام بے جگر تھا۔ اس کا مالک اور ہینڈلر نور پور کا زمین دار رحمت علی تھا۔

دونوں کُتے بہترین تربیت یافتہ تھے۔ دونوں اب تک کوئی لڑائی نہیں ہارے تھے۔ اس فائٹ پر لاکھوں کی شرطیں ہی نہیں' علاقوں کی ساکھ اور مالکوں کی عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

فائٹ شروع ہونے والی تھی۔ لوگ دم سادھ کر بیٹھ گئے تھے۔

واجد اِدھر اُدھر دیکھتا رہا مگر پیر بخش اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

ریفری کے اشارے پر دونوں کُتوں کو چھوڑ دیا گیا..... رنگ کے عین وسط میں وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرے' اٹھے اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کے جسم میں دانت گاڑ دیے۔ وہ نہ غرائے تھے' نہ انہوں نے چیخیں نکالی تھیں۔ اس لیے کہ وہ عام کُتے نہیں تھے۔

بے جگر کی گردن پر شیر دل کی گرفت مضبوط ہوئی تو تماشائی پُرجوش ہو گئے۔ دونوں زور آزمائی کر رہے تھے۔ بے جگر نے سنبھل کر مضبوطی سے زمین پر پاؤں جمائے اور شیر دل کی پشت میں دانت گاڑنے کی کوشش کی۔ اب دونوں دائرے کی شکل میں گھوم رہے تھے اور مناسب موقعے کی تلاش میں تھے۔ ان کے حلق سے گھٹی گھٹی غراہٹیں نکل رہی تھیں جو رِنگ میں گردش کر رہی تھیں۔

شیر دل نے یکبارگی بے جگر کی گردن کو جھنجھوڑ ڈالا۔ خون کے قطرے اچھلے اور تماشائیوں کے درمیان گرے مگر دونوں کُتے ایک دوسرے کے جبڑے کی گرفت سے آزاد بھی ہو گئے۔ بے جگر موقع ملتے ہی شیر دل پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کی اگلی ٹانگوں کے درمیان واقع سینے کا ابھرا ہوا حصہ گرفت میں لے رہا تھا۔

"اب کے کام لگ گیا تمہارا" رحمت خوشی سے چلّایا "اب بیلچہ لے آؤ اپنے کُتے کو دفن کرنے کے لیے۔"

"تم اپنے لاڈلے کی فکر کرو" علی باقر بولا لیکن وہ فکر مند نظر آ رہا تھا۔

شیر دل کے حلق سے رونے کی سی آواز نکلی۔ اس نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا۔ اس کے سامنے والے حصے میں خاصا بڑا سرخ خلا نمودار ہو گیا۔ جہاں پہلے سینہ ابھرا ہوا تھا' اب وہاں غار سا پیدا ہو گیا تھا۔

ریفری کے اشارے پر دونوں مالک اپنے اپنے کُتے کو پکڑ کر بورڈ پر لے گئے۔

علی باقر شیر دل کے کان سے ہونٹ لگائے یوں سرگوشیاں کر رہا تھا جیسے کُتا سب کچھ سمجھ رہا ہو۔ وہ اسے دونوں ہاتھوں سے تھامے اس پر جھکا ہوا تھا۔ دوسرے کارنر کی بھی یہی صورت حال تھی۔

ریفری نے اشارہ کیا تو دونوں کُتوں کو آزاد کر دیا گیا۔

دونوں کُتے ایک بار پھر پوری قوت سے ٹکرائے۔ ابھی تک دونوں کے اندر فائٹ کا جذبہ برائے نام بھی کم نہیں ہوا تھا۔ واجد کے پیچھے کھڑا ایک شخص چیخ چیخ کر جانے کیا کہے جا رہا تھا۔ لوگ نروس ہو رہے تھے۔

ہڈیوں سے دانتوں کے ٹکرانے کی آواز بے حد اعصاب شکن تھی!

اس بار شیر دل زیادہ کامیاب نظر آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ بے جگر کا لہولہان سر اس کے جبڑے کی گرفت میں تھا۔ بے جگر اوپر آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

لیکن کُتے کے لیے جو بدترین زخم ہوتا ہے یعنی سینے کا' وہ شیر دل ابتدا ہی میں کھا چکا تھا۔ کوئی اور کُتا ہوتا تو لڑائی اسی وقت ختم ہو گئی ہوتی۔

آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اس دوران پانچ وقفے ہوئے۔ کینوس پر اب خون ہی خون تھا جس کی وجہ سے کُتے بار بار پھسل رہے تھے۔ شیر دل کے سینے کا زخم اب رنگ لا رہا تھا۔ اس کا اگلا بایاں پنجہ بے کار ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ سے اسے خود کو متوازن رکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور یہ دشواری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں شیر دل کا دوسرا پنجہ بھی بے کار ہو گیا۔ بے جگر نے اس کی تھوتھنی بھی جھنجھوڑ ڈالی تھی جس کے نتیجے میں ایک آنکھ بھی بند ہو گئی تھی۔ بے جگر کا حال بھی اچھا نہیں تھا۔ اس کا سر بری طرح زخمی تھا مگر وہ مشینی انداز میں حملے کیے جا رہا تھا۔ وہ شیر دل کے سینے پر وار کیے جا رہا تھا۔

ریفری کے اشارے پر دونوں کُتوں کو الگ کر دیا گیا۔ دونوں غیر معمولی قوتِ ارادی اور استقلال کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ریفری نے پھر اشارہ کیا.....

لیکن اب شیر دل پیٹ کے بل گھسٹ رہا تھا۔ اور وہ بھی اس کے لیے آسان کام نہیں تھا۔ تاہم وہ ایک بہادر جنگجو کی طرح لڑتے ہوئے مرنا چاہتا تھا' اسی لیے وہ گھسٹ کر رِنگ میں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا پورا سینہ زخم بن چکا تھا۔ کینوس پر خون کی لکیر کھنچ رہی تھی۔

علی باقر نے اشارہ کیا کہ فائٹ ختم ہو گئی ہے۔ وہ شیر دل سے لپٹ گیا تھا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر کچھ آوازیں ابھریں۔ کسی میں جھنجلاہٹ تھی' کسی میں افسوس اور کسی میں مایوسی۔ واجد بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ لڑنے والوں کے لیے زندگی

سے کہیں زیادہ اہم لڑائی ہوتی ہے۔

بعد میں چھوٹی فائٹس ہوئیں مگر واجد باہر نکل آیا۔ وہاں علی باقر شیردل کو کمبل پر لٹائے اس کی دوا دارو کر رہا تھا۔

"یہ بچ جائے گا نا؟" واجد نے علی باقر سے پوچھا۔

"مشکل ہے" علی باقر نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

"بہت افسوس ہوا..."

"مجھے اسے پہلے ہی روک دینا چاہیے تھا۔"

واجد گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا "پیر بخش کو جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

علی باقر کتے کے سینے کے کھلے زخم پر کوئی سفوف چھڑک رہا تھا "اسے کون نہیں جانتا؟"

"وہ نظر نہیں آیا؟"

"ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔"

واجد بیٹھا اسے کتے کے دوائیں لگاتے دیکھتا رہا۔ وہ جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا، معلوم کر چکا تھا۔ محمود شامی کے دور میں صفائی کے تین یونٹ تھے انٹیلی جنس میں جو مختلف نوعیت کے کام کرتے تھے۔ ایک یونٹ کا سربراہ پیر بخش تھا۔ ان میں سے صرف ایک یونٹ احتساب کرنے والوں کی نظر میں آسکا تھا... اور وہ بھی گیٹ وے اسکینڈل کی وجہ سے۔ تینوں یونٹ ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔ محمود شامی کے استعفے کے بعد تحقیقاتی کمیشن بٹھائے گئے، چھان بین شروع ہوئی۔ تب بھی صرف تنویر الزماں کا یونٹ ہی سامنے آسکا۔ تحقیقات کرنے والوں کو اندازہ نہیں تھا کہ قالینوں کے نیچے کتنی گندگی موجود ہے۔ یا وہ جانتے تھے تو انہوں نے بدبو کی خوفناکی کا اندازہ کرتے ہوئے قالین اٹھانے سے دانستہ گریز کیا تھا۔ واجد کو معلوم تھا کہ پیر بخش کا یونٹ جو کچھ کرتا رہا تھا، اس کے سامنے تنویر والے یونٹ کی کارکردگی کچھ بھی نہیں تھی۔

اب واجد کو معلوم ہو چکا تھا کہ پیر بخش ملک میں موجود ہی نہیں "پیر بخش کب سے نہیں ہے یہاں؟" اس نے علی باقر سے پوچھا۔

علی کچھ دیر سوچتا رہا جیسے حساب لگا رہا ہو پھر بولا "چار مہینے سے زیادہ ہو گئے۔"

اس کا مطلب تھا کہ اموات کا سلسلہ شروع ہوا تو پیر بخش اس سے پہلے ہی باہر جا چکا تھا۔ اس نے فہرست پوری طرح چیک کرلی تھی۔ تین افراد کو چھوڑ کر اس فہرست کا ہر شخص کسی ایک موت کے وقت کہیں اور موجود پایا گیا تھا۔ صرف تین افراد ایسے تھے جو ہر موت کے وقت وہیں موجود تھے۔ تنویر، حمید اور نیاز۔ واجد جانتا تھا کہ دونوں تاجوری تنویر کے کس حد تک وفادار ہیں۔ پھر حمید حادثے میں اسی روز اسی علاقے میں مارا گیا تھا، جہاں صابر ملک کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس کے بعد تو شک کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

واجد کو یقین ہو گیا تھا کہ تنویر الزماں ہی اس کا مطلوبہ آدمی ہے۔

مشکوک افراد کی فہرست میں تنویر سب سے زیادہ خطرناک آدمی تھا۔ واجد اس کے ریکارڈ سے واقف تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کے لیے کوئی کام ناممکن نہیں۔ گیٹ وے کا معاملہ بگڑنے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ایک فوجی آفیسر قطعاً بے وقت بینک کے پاس سے گزرا اور اسے گڑبڑ کا احساس ہو گیا۔ اس نے جو ہنگامہ مچایا، اسے روکنا ناممکن تھا۔ ایکشن لینا پڑا... اور بے حد تیز رفتاری سے لینا پڑا۔ ایسے میں یہ تنویر کا ہی کمال تھا کہ صرف ایک کے سوا وہ اپنے تمام آدمیوں کو چھاپا پڑنے سے پہلے ہی بینک سے نکال لے گیا تھا۔ یہی نہیں، وہ جس کام کے لیے آئے تھے، وہ کام بھی کر گئے تھے۔

○☆○

"افسوس... کوئی صورت نہیں" علی باقر بڑبڑایا۔ اس نے چمڑے کا ایک کیس کھول کر اس میں سے ایک بڑی ہائپوڈرمک سرنج نکالی۔ سرنج میں دودھیا گلابی محلول بھرنے کے بعد اس نے شیردل کے انجکشن لگایا۔ کتے کا جھٹکے لیتا جسم فوراً ہی ساکت ہو گیا۔

"افسوس...." واجد نے پلٹ کر دیکھا، وہ بے جگر کا مالک رحمت تھا "یہ نہ ہوا ہوتا تو تم اسے دوسرے کتوں کی تربیت کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔"

"اسے جتنا لڑنا چاہیے تھا وہ اس سے زیادہ لڑا" علی نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"بے شک" رحمت نے تائید کی "اگر ایسا دل اور ایسی بے جگری کسی انسان کو مل جائے تو کیا ہو؟"

واجد واپس چل دیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھا، اسے اسٹارٹ کیا اور یوٹرن لے کر رفتار بڑھا دی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اس کتے شیردل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اس کی تڑپ، رنگ کی طرف بڑھنے کی ان تھک اور اذیت ناک کوشش یاد آئی۔ وہ جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا... موت تک۔ موت سے پہلے شکست تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔

اور رحمت کا وہ جملہ.... "اگر ایسا دل اور ایسی بے جگری کسی انسان کو مل جائے تو کیا ہو؟"

یہ جملہ یاد کرتے ہی واجد کو خیال آیا کہ وہ تنویر الزماں سے کبھی نہیں ملا ہے۔

○☆○

تنویر بستر پر لیٹا تھا۔ فوزیہ بھی جاگ رہی تھی۔ تنویر خاموشی سے صورت حال کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ فوزیہ جانتی ہے.... جانتی ہے کہ وہ ان اموات میں کسی نہ کسی طور پر ملوث ضرور ہے لیکن اس نے اس موضوع پر گفتگو نہیں چھیڑی تھی۔ لیکن فوزیہ یہ تو نہیں جان سکتی تھی کہ صورت حال بدل چکی

ہے۔ اب وہ سرکاری مشین کا پُرزہ نہیں کہ قانون اس کی پشت پر ہو۔ قانون تو اب اسے گرفت میں لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہ اسے صرف قانون سے خطرہ ہو۔ اب تو میدان میں ایک شکاری اور بھی اُتر آیا تھا۔ اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ شکاری اہلیت اور خطرناکی کے اعتبار سے کم از کم اس کا ہم پلہ ضرور ہوگا۔ ایک قاتل جو ایک قاتل کا پیچھا کررہا تھا۔ ایک شکاری جو ایک اور ماہر شکاری کو شکار کرنا چاہتا تھا۔

"میں کچھ عرصے کے لیے جارہا ہوں" تنویر نے اچانک ہی کہا۔

"ٹھیک ہے" اس کے پہلو کی طرف سے فوزیہ کی آواز ابھری۔

"یہ گیٹ وے میں ملوث لوگوں کی اموات.... یہ اتفاق سے بڑھ کر ہے۔ ہے نا؟"

"مجھے یقین تھا اس بات کا" فوزیہ نے یوں کہا جیسے کسی فلم کے پلاٹ پر تبادلۂ خیال کررہی ہو۔ شاید وہ اس قسم کے معاملات کو محض ایک سنسنی خیز فلم ہی سمجھتی تھی۔ حقیقت سمجھتی ہوتی تو اب تک اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہوتا۔

"ہمیں حقائق کا سامنا کرنا ہوگا" تنویر نے گمبھیر لہجے میں کہا "ممکن ہے' قاتلوں کی ممکنہ فہرست میں.... مشکوک افراد میں میرا نام بھی ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤں۔"

فوزیہ خاموش لیٹی کچھ سوچتی رہی' بولی کچھ نہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں تم محفوظ رہو۔ اپنی حفاظت کا خیال رکھو' کہیں چلی جاؤ۔"

"میں یہیں رہوں گی۔ یہ سوچنے کا کوئی جواز نہیں کہ مجھے کوئی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔"

پہلے تو فوزیہ کے جواب نے تنویر کو چونکا دیا پھر اس کی سمجھ میں مطلب آیا۔ ابھی تک قتل کی کسی واردات میں بھی کسی بیوی کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی "ٹھیک کہتی ہو" اس نے کہا "ہاں.... تم یہاں محفوظ ہی رہوگی۔"

فوزیہ اٹھ بیٹھی۔ ایک انگڑائی لے کر وہ بستر سے اُتری "کافی؟" اس نے پوچھا۔

تنویر نے اثبات میں سرہلادیا۔ فوزیہ باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ پانچ منٹ بعد وہ کچن میں تھی۔ تنویر نے تکیہ مسہری کے سرہانے کھڑا کرکے ٹکایا اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچن سے وقتاً فوقتاً فوزیہ کی نقل وحرکت کی آواز آرہی تھی۔ اس سے قطع نظر وہ ایک خاموش صبح تھی۔

تنویر جانتا تھا کہ فوزیہ نے اس کی بات پر پوری طرح یقین نہیں کیا ہے لیکن قبول کرلیا ہے۔ یہ اس میں ایک عجیب وصف تھا۔

فوزیہ چھوٹی ٹرے پر کافی کی دو پیالیاں رکھے بیڈ روم میں واپس آئی۔ صبح کا اخبار اس کی بغل میں دبا تھا۔ اس نے تنویر کی طرف پیالی بڑھائی اور پھر اخبار اس کے قریب تہ کرکے گرادیا۔ تنویر بڑی احتیاط سے سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ فوزیہ نے بڑھ کر ٹی وی آن کردیا۔

ٹی وی پر موسم کا حال بتایا جارہا تھا۔ تنویر نے اسے نظرانداز کیا اور اخبار کھول لیا۔ پہلے صفحے پر محمود شاہی کا چٹپٹا انٹرویو تھا جو بی بی سی سے گزشتہ رات ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔ انٹرویو ہیرالڈ فین نے لیا تھا۔ تنویر بڑی دلچسپی سے اسے پڑھنے لگا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ میں نے درست طرز عمل اختیار کیا۔" محمود شاہی نے کہا تھا "میرے متعلق چھان بین کی جاتی تو کوئی فرق نہ پڑتا بلکہ میرے لیے تو بہتر ہوتا کیونکہ میں ہر انکوائری سے بے داغ نکلتا لیکن ملک ایک بہت بڑے بحران سے دوچار ہوجاتا۔"

انٹرویو کا مکمل متن صفحہ نمبر چار پر تھا۔

فوزیہ اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ نہارہی ہے۔ تنویر نے کافی کی پیالی خالی کی اور اخبار اپنے سامنے پھیلا کر صفحہ نمبر چار کھول لیا۔

ہیرالڈ فین کے بعض چبھتے ہوئے سوالات کے جو جوابات محمود شاہی نے دیے تھے' اس سے انہی کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس کے عہدِ صدارت میں جو قابلِ اعتراض سرگرمیاں ہوئیں' اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ ان سے بے خبر تھا۔ تاہم اس نے یہ کہہ کر ان سرگرمیوں کا دفاع کیا کہ وہ ضروری تھیں۔ صرف ضروری نہیں' ملک وقوم کی بہتری کے لیے بہت اہم بھی تھیں۔ اس نے کہا کہ تاریخ اسے اچھے لفظوں میں یاد رکھے گی۔ "بعض موقعوں پر جہاں تیز رفتاری ضروری ہو اور مقصد نیک ہو' وہاں صدر کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ کسی قانون کی کیا تشریح کرتا ہے" اس نے کہا "اگر کوئی اس کا یہ مطلب لے کہ صدر خود کو قانون سے بالاتر بنارہا ہے تو اسے یہ سمجھنے دو۔"

انٹرویو کے ایک حصے نے جہاں محمود شاہی کا بیان بے حد مُبہم تھا' تنویر کی توجہ کھینچ لی۔

ہیرالڈ فین: صدر کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے بعد آپ کو بھی قصرِ جمہوریت کی تنہائی ناقابلِ برداشت تو نہیں لگتی؟

محمود شاہی: کبھی کبھی تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ لگتا ہے' جیسے میں یہ تنہائی میں جلائے جانے کا منتظر ہوں لیکن میں خود کو اپنی ڈاک میں' اپنے نجی معاملات میں مصروف رکھتا ہوں۔ یہ بات نہیں کہ مجھے بھلادیا گیا ہے۔ ایسا ہوتا تو آپ اس وقت میرا انٹرویو نہ لے رہے ہوتے۔

ہیرالڈ فین: آپ کہتے ہیں کہ آپ کو بھلایا نہیں گیا لیکن کس انداز میں آپ کو یاد رکھا گیا ہے' اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

تنویر کے خیال میں ہیرالڈ فین ایک بے حد اہم نکتے کو سمجھ ہی

نہیں سکا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ یہودی تھا۔ یا شاید اس لیے کہ محمود شامی کو خاص طور پر مغربی صحافیوں کو انٹرویو دیتے ہوئے بائبل کے حوالے دینے کا خبط تھا اور شاید محمود شامی کی اس بات کا مطلب وہی شخص سمجھ سکتا تھا جو صابر ملک کے آخری لمحوں میں اس کے قریب موجود تھا جسے صابر ملک نے غلطی سے پادری سمجھ لیا تھا۔

تنویر جانتا تھا' بیتھانی وہ شہر تھا' جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے مُردہ لزارس کو جلایا تھا۔

اور کوہستان میں دم توڑتے ہوئے صابر ملک نے اپنی دانست میں ایک پادری سے مغفرت کی دعا کی التجا کرتے ہوئے جو آخری لفظ زبان سے ادا کیا تھا' وہ لزارس تھا۔

اب تنویر یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ یہ کوئی اتفاق ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شامی کے مُنہ سے وہ بات غیر شعوری طور پر نکل گئی ہوگی۔

تنویر کو احساس ہوا کہ وہ اخبار پڑھتے ہوئے کچھ زیادہ ہی زور دے رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں اس کی گردن دُکھ گئی تھی۔ اس نے اخبار ایک طرف رکھا اور تکیے پر سر ٹکا کر نیم دراز ہوگیا۔ چھت کو دیکھتے ہوئے اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ انداز عجیب تھا۔ اسے خوشی تھی کہ فوزیہ ابھی باتھ روم میں ہی ہے اور اس کی ہنسی نہیں سُن سکتی۔

لزارس!

ممکن ہے' اس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ اور ممکن ہے' اس کا کوئی مطلب ہو... حیران کردینے والا!

○☆○

گھنٹی پانچ بار بج چکی تھی۔ فوزیہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو اسے وہ مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا "میرا نام حارث ہے بیگم زماں۔ میں محکمۂ خفیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ زماں صاحب موجود ہیں؟"

"جی نہیں" فوزیہ نے کہا اور یہ درست تھا۔ تنویر اپنے کہنے کے مطابق سہ پہر کو رخصت ہوچکا تھا۔

حارث بدستور مسکراتا رہا۔ راہداری میں پتنگے بہت تھے اور وہ اس پر منڈلا رہے تھے۔ کچھ پتنگے اندر بھی داخل ہوگئے تھے اور فوزیہ کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی "میں اندر آسکتا ہوں؟" حارث نے فوزیہ سے پوچھا۔

فوزیہ نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا' راہداری کی لائٹ آف کی اور دروازہ بند کرلیا۔

"اگر آپ کے شوہر موجود نہیں تو پھر میں آپ سے کچھ سوالات کروں گا۔"

"مجھے اپنا شناختی کارڈ دوبارہ دکھائیں" فوزیہ بولی۔

حارث نے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور شناختی کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔ فوزیہ نے کارڈ کا جائزہ لیا۔ لگتا تو وہ اصلی ہی تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اصلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوسکتا تھا کہ حارث محکمۂ خفیہ کا ایجنٹ نہیں لیکن محکمے کے لوگ اس کی پشت پناہی کررہے ہیں۔ اس نے شناختی کارڈ اسے واپس کردیا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

حارث نے ڈرائنگ روم کی آرائش کو غور سے دیکھا "بہت خوب صورت گھر ہے آپ کا" اس نے تبصرہ کیا۔

"پلیز... آپ تشریف رکھیں۔"

حارث ایک کرسی پر بیٹھ گیا "اب یہ بتائیں کہ آپ کے شوہر کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کتنی دیر ہوئی انہیں گئے؟"

"سہ پہر کو گئے تھے" فوزیہ بلا جھجک سچ بول رہی تھی۔

"آپ ان سے رابطہ کرسکتی ہیں؟"

"نہیں۔ میرے پاس نہ ان کا پتا ہے' نہ کوئی فون نمبر۔"

پھر وہی جگمگاتی ہوئی مسکراہٹ "لگتا ہے' یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بیگم زماں' آپ کے شوہر میرے ہم پیشہ ہیں۔ میں بھی اپنی بیوی کو ایسی کوئی بات نہیں بتاتا جس سے وہ کسی خطرے میں پڑے۔"

فوزیہ مینٹل کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف تھے۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں "خطرے کی بات تو خیر نہیں ہوگی حارث صاحب۔ تنویر کے کام نے اسے رازداری کا عادی بنادیا ہے اور میرے خیال میں اس کی معقول وجہ بھی ہے۔"

"اسپائی اور ایجنٹس کے متعلق کتنے ناول چھپ چکے ہیں مگر میرے خیال میں کسی نے ایجنٹوں کی بیویوں کی طرف بالکل توجہ نہیں دی ہے۔ حالانکہ داد کی اصل حق دار تو وہی ہوتی ہیں۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں" فوزیہ نے کہا۔ وہ اس کا مقصد نہیں سمجھ پارہی تھی۔

"اگر میں آپ کے شوہر کی جگہ ہوتا تو اپنی حفاظت کے لیے فکر مند ہوتا۔ دیکھیں نا... گیٹ وے اسکینڈل والوں کی اموات کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ کبھی انہوں نے آپ سے اس امکان پر بات کی کہ ممکن ہے' وہ بھی قاتل کی فہرست میں موجود ہوں یا آپ..."

"میرا خیال ہے' ان میں ایک قدرتی موت بھی ہے اور ایک حادثہ تھا۔"

"یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا۔ اور پھر میں تو خود کو زماں صاحب کی جگہ رکھ کر تصور کررہا ہوں۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو مجھے پریشانی ضرور لاحق ہوتی۔"

"تنویر کبھی کبھی بہت پریشان لگتے ہیں۔"

"تو اس بار وہ اسی وجہ سے تو غائب نہیں ہوئے؟" حارث نے پوچھا۔

"ممکن ہے یہی بات ہو لیکن مجھے معلوم نہیں۔"

"انہوں نے آپ سے گیٹ وے اموات کے متعلق بات کی تھی؟"

"مجھے یاد نہیں۔ اخبار پڑھ کر ممکن ہے انہوں نے کوئی تبصرہ کیا ہو۔"

"انہوں نے ان اموات کو ایک دوسرے سے منسلک کیا؟"

"وہ بھی آپ کی طرح ہیں مسٹر حارث .... محض سوچنے والے۔"

"یہاں تو سوچنے کی گنجائش اتنی ہے کہ...."

"مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

"اور مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر زماں صاحب آپ سے رابطہ کریں تو مجھے اس نمبر پر رنگ کر دیجئے گا" اس نے فوزیہ کی طرف کارڈ بڑھایا "ضرورت پڑی تو ہم ان کی حفاظت کا بندوبست بھی کر سکیں گے۔"

"مجھے خوشی ہوگی" فوزیہ نے کہا اور اسے چھوڑنے دروازے تک گئی "میں تنویر کو بتا دوں گی کہ آپ آئے تھے۔"

"ضرور۔ میں شکرگزار رہوں گا" حارث نے کہا اور باہر آ گیا۔

وہ باہر اپنی کار میں کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ اسے یقین تھا کہ فوزیہ تنویر اپنے فلیٹ کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہی ہوگی۔ اسے سوچنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ویسے اسے یقین تھا کہ فوزیہ غلط نہیں کہہ رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم ہوگا کہ تنویر کہاں ہے۔

○☆○

تنویر اور نیاز فلاح چوک پر اس بیس منزلہ عمارت کے سامنے کھڑے تھے، جس کے ایک فلیٹ میں مقصود رہتا تھا۔ گیٹ وے میں ملوث دوسرے لوگوں کے برعکس مقصود پیسے کے اعتبار سے کامیاب نہیں رہا تھا۔ وہ ایک پرانی بلڈنگ تھی جس کا نام بیلمونٹ ٹاورز تھا۔ نیچے پارکنگ لاٹ تھا، جہاں مکینوں کے لیے کار پارک کرنے کی جگہ تھی۔

نیاز نے سڑک پار کی اور بیلمونٹ ٹاورز میں داخل ہو گیا۔

دس منٹ بعد تنویر نے سڑک پار کی اور عمارت کی لابی میں داخل ہوا۔ وہ لفٹ کی طرف گیا۔ بٹن دبانے کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ وہاں اکیلا ہی تھا۔ ماربل کے فرش پر جا بجا جوتے سے رگڑ کر بجھائی جانے والی سگریٹوں کے نشانات تھے۔

لفٹ نیچے آ رہی تھی۔ اب وہ دوسری منزل پر تھی۔ دوسری لفٹ بھی نیچے آ رہی تھی لیکن وہ چودھویں منزل پر رک گئی۔

لفٹ نیچے پہنچی۔ دروازہ کھلا، لفٹ سے ایک خاتون چھوٹا سا کتا لیے نکلیں۔ انہوں نے تنویر کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ تنویر لفٹ میں داخل ہوا۔ دروازہ بند ہوا تو اس نے سترھویں منزل کا بٹن دبا دیا۔

سترھویں منزل پر 17E اپارٹمنٹ میں مقصود رہتا تھا۔

مقصود گھر پر موجود نہیں تھا۔ نیاز کو اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ تنویر نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا۔ تنویر اندر داخل ہوا۔ نیاز نے فوراً ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اپارٹمنٹ چھوٹا سا تھا۔ فرنیچر جدید طرز کا اور مہنگا تھا۔ وہ مقصود کے اچھے دنوں کی یادگار تھا۔ دیوار کے ساتھ لکھنے کی میز تھی۔ اس کے مقابل دیوار میں کھڑکی تھی، جس سے دارالحکومت کا خوب صورت منظر دکھائی دیتا تھا۔ دیواروں پر کچھ پینٹنگز آویزاں تھیں۔ وہیں ایک صوفہ پڑا تھا۔ صوفے کے بائیں جانب ایک بڑا بک کیس تھا جس میں کتابیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ وہیں سے تنویر کو بیڈ روم نظر آ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کی طرح وہ بھی صاف ستھرا تھا۔

تنویر نے فلیٹ کی تلاشی لینے کے متعلق سوچا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مقصود کب واپس آئے گا اور مقصود آ جاتا تو یہ ضروری ہو جاتا کہ وقت ضائع کیے بغیر معاملات خوش اسلوبی سے نمٹائے جائیں۔ یہ بھی ضروری تھا کہ فلیٹ میں بے ترتیبی نہ ہو۔

نیاز خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بے حد پُرسکون نظر آ رہا تھا لیکن وہ چوکنا بھی تھا۔ اس کے کان دروازے میں لگائی جانے والی چابی کی آواز کے منتظر تھے۔ تنویر نے میز کے پاس جا کر دراز کی تلاشی لی۔ درازوں میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔

وہ میز سے ہٹا اور کھڑکی کے پاس جا کر نیچے سڑک کو دیکھنے لگا۔ مقصد مقصود کو دیکھنا نہیں، بس وقت گزاری تھا۔ اسے یقین تھا کہ مقصود بیسمنٹ میں گاڑی پارک کرے گا اور لفٹ میں بیٹھ کر اوپر آئے گا۔

تیز ہوا کھڑکی سے ٹکرائی۔ پھر کھڑکی کے شیشے سے بوندیں ٹکرائیں۔ تنویر نے پردے کھینچ دیے۔

لوہے پر لوہے کی رگڑ کی آواز سنائی دی تو نیاز اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اور تنویر تیزی سے صوفے کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ دروازے سے انہیں نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ آوازوں سے انہوں نے محسوس کیا کہ مقصود اندر آیا ہے اور اس نے دروازہ دوبارہ مقفل کر لیا ہے۔

مقصود چابی جیب میں ڈالتے ہوئے اندر آیا۔ اس نے ان دونوں کو نہیں دیکھا۔ وہ کچن کی طرف گیا۔ سامان سے بھرا ہوا شاپنگ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"مقصود!" تنویر نے دھیمی آواز میں اسے پکارا۔

مقصود اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اس کی کمر یوں خم ہوئی، جیسے کسی نے اس پر وار کیا ہو۔ شاپنگ بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور فرش پر گر کر پھٹ گیا۔ مقصود نے پلٹ کر ان دونوں کو دیکھا تو اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔

تنویر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں خاصا بدل گیا تھا۔ سر پر بال اتنے گھنے نہیں تھے اور عمر زیادہ لگنے لگی

تھی۔

"خدا کی پناہ!" بالآخر مقصود کے منہ سے نکلا۔

"بیٹھ جاؤ" تنویر نے کہا۔

نیاز اور تنویر بڑھے اور اس کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ مقصود صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں کھڑے رہے۔

تنویر نے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر دیا۔ اچانک ہونے والی روشنی نے مقصود کو چونکا دیا۔ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پہلے تنویر کو اور پھر نیاز کو دیکھا۔ تنویر، مقصود کے اس جھٹکے سے سنبھلنے کا منتظر تھا۔

مقصود کے ہاتھ لرز رہے تھے لیکن اس کی سانسیں نارمل تھیں "کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے خوف زدہ لہجے میں تنویر سے پوچھا۔

تنویر نے جواب نہیں دیا۔

"تم... تم نے ان لوگوں کو قتل کیا....؟" مقصود کی آواز اب بھی لرز رہی تھی۔

"ہم لزارس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں" تنویر نے کہا۔

"لزارس؟"

نیاز نے جیب سے نیا تیز دھار والا اُسترا نکالا اور اسے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں لے آیا۔ روشنی میں اُسترے کی دھار کی چمک بہت خوف ناک لگ رہی تھی۔

"میرا دوست اُسترے کے استعمال کا ماہر ہے" تنویر نے کہا "یہ تمہارے انگوٹھے کے نیچے سے بڑی صفائی سے گوشت نکال لے گا۔ ایسے کہ تمہارے ناخن کو موڑا جا سکے گا۔ پھر مزید گوشت نکالا جاتا رہے گا۔ ناخن مزید جھکایا جا سکے گا۔ جب تک تمہاری زبان نہیں کھلے گی، یہی ہوتا رہے گا۔ یہ تو ایک ناخن کی بات ہے، دس ناخن تو ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور دس پیروں میں۔"

مقصود کا جسم لرزتا رہا۔ نیاز اُسترا لیے ویسے ہی کھڑا تھا۔ مقصود کو احساس ہوا کہ وہ لوگ سیریس ہیں۔

"لزارس" تنویر نے اسے یاد دلایا۔

مقصود نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ نیاز مسکرانے لگا "میں سب کچھ تو نہیں جانتا" مقصود نے کہا "لیکن جتنا جانتا ہوں، بتا دوں گا" اس نے اچانک یوں جھرجھری لی جیسے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا ہو "یہ چکر برسوں پہلے شروع ہوا تھا.... ایوان صدر میں۔ جب مخالفین کی فہرست تیار کی گئی تھی۔ وہ فہرست شاکر نے مرتب کی تھی۔ وہی اس تحقیقاتی کام کا انچارج تھا۔ اس تحقیقاتی کام کے دوران اسے بعض بہت کام کی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ خاص طور پر صوبائی اسمبلی کے ایک رکن کے متعلق حاصل ہونے والی معلومات تو بہت ہی دلچسپ تھیں۔ وہ رکن دشمنوں کی فہرست میں تو شامل نہیں تھا۔ وہ معلومات شاکر نے شامی کو منتقل کر دیں۔"

نیاز اُسترے سے اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن کو نکیلا بنا رہا تھا۔

"معلومات کے متعلق بتاؤ" تنویر نے کہا۔

"اس رکن اسمبلی کی ایک شادی اور بھی ہوئی تھی" مقصود نے جلدی سے کہا "اس شادی کے بارے میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے چند ہی لوگ واقف ہیں اور کسی کو نہیں معلوم یہ بات۔ بہت پرانی بات ہے یہ۔ اس وقت وہ رکن سیاست کی الف بے بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ شادی کے صرف ایک ماہ بعد اس کی دُلہن کوٹھے سے گر کے مر گئی، پوسٹ مارٹم ایک ایسے ڈاکٹر نے کیا تھا جس کے ان لوگوں سے گھریلو تعلقات تھے۔ ڈاکٹر اب مر چکا ہے۔ ڈاکٹر نے جھوٹا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کیا تھا۔

"شاکر کے ہاتھ ڈاکٹر کے خلاف کچھ مواد لگ گیا تھا۔ اس نے اس کا بیان ٹیپ کر لیا۔"

"جھوٹے ڈیتھ سرٹیفکیٹ سے کیا مراد ہے تمہاری؟" تنویر نے پوچھا۔

"حقیقت یہ تھی کہ لڑکی کو گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کی موت گرنے کے نتیجے میں گردن ٹوٹنے سے واقع نہیں ہوئی تھی۔ شاکر کے پاس ڈاکٹر کا بیان موجود ہے کہ اس نے جھوٹا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کیا تھا۔ اس بیان کے زور پر قتل کا کیس اوپن ہو سکتا ہے۔ وہ رکن یقینی طور پر مارا جائے گا۔"

"تو اب اس رکن کو بلیک میل کیا جا رہا ہے؟"

"یوں کہو کہ ایک لحاظ سے اب وہ گھوڑا ہے جس کی لگامیں محمود شامی کے ہاتھوں میں ہیں۔ محمود شامی اس کا مالک ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہی تو لزارس ہے۔ اب وہ رکنِ صوبائی اسمبلی وزارتِ عظمیٰ کا امیدوار ہے۔ محمود شامی اور اس کا حلقہ اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں" مقصود نے کہا "محمود شامی سیاسی طور پر مر چکا ہے۔ وزارتِ عظمیٰ کا وہ امیدوار اسے سیاسی طور پر دوبارہ زندہ کر دے گا۔"

تنویر خاموش رہا۔ نیاز مسکرانے لگا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس خاموشی میں بارش کے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرانے کی آواز بے حد واضح تھی۔

"پہلے والے تمام حربے پھر آزمائے جا رہے ہیں" مقصود نے کہا "گمنام خطوط، بے بنیاد خبریں، اندر کی معلومات کی اشاعت، جعلی کاغذات، سرمایہ داروں کے عطیات ... سب کچھ وہی کا وہی ہے۔ البتہ اس بار وہ لوگ بہت محتاط ہیں.... اور زیادہ محفوظ بھی۔ انہوں نے یاد رکھا ہے کہ پچھلی بار غلطیاں کہاں ہوئی تھیں۔ اس بار عوام پہلے سے بھی زیادہ بے خبر ہیں۔ خطرہ کوئی نہیں اور اقتدار دوبارہ انہی کو ملنے والا ہے۔ ایسا اقتدار جس میں جواب دہی کسی اور کو کرنا ہوگی۔"

مقصود اب پُرسکون ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ جیسے وہ معلومات اس کے سینے پر کسی بوجھ کی طرح رکھی رہی ہوں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ تنویر

اب ہر زیادتی کو بھول جائے گا... اسے معاف کردے گا۔ یہ سوچ کر کہ اب وہ پہلے سے بڑھ کر صاحبِ اقتدار ہونے والے ہیں۔ ڈوبتے کو تو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔

تنویر، مقصود کے پاس سے ہٹا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ بارش اور ہوا کے کھڑکی سے ٹکرانے کی آواز کسی تیز رفتار دریا کے بہاؤ کی آواز سے مشابہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ معاملات اور پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ اس نے غلاظت کی بدترین دلدل میں قدم رکھ دیا ہے۔

وہ پلٹا، واپس آیا اور مقصود کو گھورنے لگا۔ نیاز اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔

"محمود شامی اس شخص کو منتخب کرانے کے لیے اپنے تمام وسائل استعمال کرے گا" مقصود نے کہا۔

تنویر اس کے اور قریب ہوگیا "وہ امیدوار ہے کون؟ مجھے اس کا نام بتاؤ۔"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"اس کی پشت پناہی کیوں کی جارہی ہے؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔"

نیاز بولا "یہ شخص پاگل ہوگیا ہے۔"

"خدا کی قسم، مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں نے تمہیں بتادیا۔ اس سے زیادہ مجھے نہیں معلوم" مقصود گڑگڑایا۔ وہ اس بچے کی طرح بدن چرا رہا تھا جو پٹائی کے امکان سے خوف زدہ ہو "چند خاص آدمیوں کے سوا یہ باتیں کسی کو معلوم نہیں۔ خدا کے لیے.... سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ تو محمود شامی کا خاص اسٹائل ہے۔ ہر شخص کو ہر بات معلوم نہیں ہوتی۔ متعلقہ افراد کو بھی پوری معلومات کہاں حاصل ہوتی ہیں۔ تم تو ہمارے ساتھ رہے ہو۔ جانتے ہو یہ بات۔ تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

تنویر کو یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ جتنا جانتا تھا، بتا چکا ہے۔ محمود شامی غیر ضروری طور پر کسی کو بھی معلومات سے مسلح کرنے کا قائل نہیں تھا۔ "یہ بتاؤ، تمہارا اندازہ کیا ہے؟ وزارتِ عظمیٰ کا وہ امیدوار کون ہوسکتا ہے؟" اس نے اصرار کیا۔

"ایسے اندازے کا کیا فائدہ، جس کی کوئی بنیاد نہ ہو" مقصود نے کہا۔

"پھر بھی۔"

"میرے جیسا اندازہ تو تم بھی لگا سکتے ہو۔ سچ مچ.... میں اندازہ نہیں لگا سکتا" مقصود پھر گڑگڑانے لگا "اور پھر میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔ تم مجھے قتل کرنے ہی آئے ہو۔ ہے نا؟ تم ہی نے دوسروں کو بھی قتل کیا..." وہ یوں جھک کر بیٹھ گیا جیسے سزائے موت کا کوئی مجرم جلاد کے سامنے سر جھکا دے۔

"یہ تو تمہارا کہنا ہے کہ دوسروں کو ہم نے قتل کیا ہے" تنویر نے کہا "ہم تو صرف معلومات چاہتے ہیں.... لیکن سیدھی سچی معلومات۔"

"وہ میں نے۔ تمہیں دے دیں" مقصود کے لہجے میں تھکن تھی۔ وہ تن بہ تقدیر ہوگیا تھا۔

تنویر نے سر کی جنبش سے نیاز کو اشارہ کیا۔ نیاز نے جیب سے نائلون کی وہ ڈوری نکال لی جس میں پھندا پہلے سے بنا ہوا تھا۔

مقصود نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اسی وقت اطلاعی گھنٹی بجی... تین بار!

نیاز نے جلدی سے ڈوری دوبارہ جیب میں ڈال لی۔

مقصود صوفے سے اتنی تیزی سے اٹھا کہ تنویر اور نیاز حرکت بھی نہ کرسکے۔ جب تک دونوں نے اس کی طرف ایک قدم بڑھایا، وہ دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ایک بوڑھی عورت بے تکلفی سے اندر چلی آئی۔ تنویر اور نیاز اسے بس ہیولے سے نظر آئے۔ اس نے چشمے کے پیچھے پلکیں جھپکا کر مقصود کو دیکھا "خیریت تو ہے مقصود صاحب!"

"جی ہاں بیگم ناز۔ آیئے... اندر آجایئے" مقصود نے جھک کر کہا۔ وہ پہلے کبھی کسی کو دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہوا تھا۔ ویسے اس وقت تو کوئی بھی آجاتا تو اسے اچھا ہی لگتا "یہ میرے دوست ہیں۔ ابھی جانے کے لیے اٹھے ہی تھے کہ آپ آگئیں۔"

بیگم ناز اندر چلی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں نوٹ بک "میں نے آپ کو گھر آتے دیکھ لیا تھا۔ میں آپ کی منتظر تھی" وہ بولیں "آپ تو جانتے ہی ہیں، میں نظام کے بچوں کے لیے امداد جمع کررہی ہوں۔"

"کون نظام؟"

بیگم ناز نے ملامت بھری نظروں سے مقصود کو دیکھا "اسی بلڈنگ میں رہتا تھا۔ کل اس کا انتقال ہوگیا۔"

"اوہ... یاد آیا۔ ہاں.... میں حاضر ہوں" یہ کہہ کر مقصود نے بٹوہ نکالا اور بٹوے میں سے سو کا ایک نوٹ۔ لیکن اس نے نوٹ بیگم ناز کی طرف نہیں بڑھایا "نظام چوتھی منزل پر رہتا تھا" اس نے تنویر اور نیاز کو بتایا "کینسر تھا بے چارے کو۔ خیر.... پھر ملیں گے تنویر.... اور نیاز۔"

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ ان دونوں کے رخصت ہوئے بغیر وہ بیگم ناز کو نوٹ نہیں دے گا۔

"خدا کرے، کینسر کا علاج جلد ہی دریافت ہوجائے۔ اچھا خدا حافظ۔ خدا حافظ بیگم صاحبہ" یہ کہہ کر تنویر نے نیاز کا ہاتھ تھاما اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

لفٹ میں دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں، نیاز فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا خیال ہے، وہ پولیس کو فون کرے گا؟" چند لمحے بعد نیاز نے پوچھا۔

"نہیں کرسکتا۔ ورنہ لزارس کا راز خطرے میں پڑجائے گا" تنویر نے جواب دیا "ہمارے متعلق صرف ان لوگوں کو معلوم

ہوسکے گا جو لزارس سے متعلق ہیں۔ اور ہاں... اس شخص کو بھی بتایا جائے گا جسے ہمارے پیچھے لگایا گیا ہے۔"

"واپس چلیں؟"

"نہیں، خاتون کو رخصت کرتے ہی وہ فون کرے گا" تنویر کے لہجے میں برہمی تھی۔

نویں منزل پر لفٹ میں دو افراد اور سوار ہوئے۔ نیچے پہنچنے تک خاموشی رہی۔

باہر بارش ہورہی تھی "ہمیں اسے چھوڑنا نہیں چاہیے تھا" نیاز نے کہا۔

"خاتون کی مداخلت کے باوجود؟" تنویر نے پوچھا۔

نیاز نے اثبات میں سرہلایا۔

"مقصود نے اس کے سامنے خاص طور پر ہمارے نام لیے تھے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے، خاتون کسی کے سامنے ہمارے نام نہیں دُہرا سکتی تھی۔"

تنویر نے اسے بڑے غور سے دیکھا "ہم غلط کام کرتے تھے تو یہ ذہن میں رکھتے تھے کہ اچھے مقصد کے لیے کررہے ہیں، اس میں لوگوں کی فلاح ہے" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا "لیکن ہم غلطی پر تھے۔ اب ہم اس کی تلافی کررہے ہیں۔ کام یہ بھی غلط ہے لیکن ہم عام لوگوں کو بہتری کی خاطر کررہے ہیں۔ تو ہم کسی عام شہری کی جان کیسے لے سکتے ہیں۔"

"کسی بڑے مقصد کے لیے عام لوگوں کو قربان کیا جاسکتا ہے" نیاز نے کہا "اب وہ عورت زندہ رہے گی۔ وہ خبیث مقصود بھی زندہ رہے گا اور وہ سب کو بتادے گا۔ ہمارا کام اور مشکل ہوجائے گا۔ ہمیں اب کھلی جنگ لڑنی پڑے گی۔"

"یہ تو وہی پرانا فلسفہ ہے محمود شامی والا۔ مقصد بڑا اور عام انسانوں کی جانیں حقیر۔ مگر میں اب اس سے تائب ہوچکا ہوں۔ میں جان بوجھ کر بالارادہ کسی معصوم شہری کی جان نہیں لے سکتا۔ اور مشکل سے کیا ڈرنا۔ ہم تو سر سے کفن باندھ کر نکلے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ میں اپنی خود غرضی پر شرمندہ ہوں" نیاز نے بڑے خلوص سے کہا۔

"تم بے فکر رہو، میں معاملات چیک کرکے تمہیں تمہارے موبائل فون کروں گا۔ اب تم جاؤ۔"

نیاز کو رخصت کرکے تنویر اس طرف بڑھ گیا، جہاں اس نے اپنی کار پارک کی تھی۔ اس نے کوٹ کے کالر اوپر کرلیے۔ ہوا بہت تیز اور سرد تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جس مداخلت نے مقصود کو بچایا ہے، وہ بہت بے تکی تھی... اور عجیب بھی۔ موت نے مداخلت کرکے مقصود کی زندگی بچائی تھی۔ مگر وقتی طور پر!

☆☆☆

"مجھے یقین ہے کہ میں بس قسمت ہی سے زندہ ہوں" مقصود نے کہا "وہ مجھے ختم کرنے ہی کے ارادے سے آئے تھے۔"

"تو پھر انہیں لزارس کے بارے میں کیوں بتایا تم نے؟ تمہیں تو مرنا ہی تھا" ظہور نے کہا۔

مقصود کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ظہور سنجیدہ ہے یا مذاق کررہا ہے "تم جانتے ہو، وہ کسی کی بھی زبان کھلوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"یہ ناخنوں والی ترکیب ہے بہت خطرناک" ظہور نے اعتراف کیا۔ "میرے تو سُن کر ہی رونگٹے کھڑے ہوگئے۔"

یہ گفتگو ظہور کے چالیسویں منزل کے لگژری اپارٹمنٹ میں ہورہی تھی۔ وہاں بالکنی سے پورا شہر دیکھا جاسکتا تھا۔ برابر والے کمرے میں دو باڈی گارڈز موجود تھے۔ وہ واجد کے وفادار تھے۔ وہی انہیں لایا تھا۔ اپارٹمنٹ میں بڑی مہارت سے الارم سسٹم نصب کیا گیا تھا۔ اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کی کیسی ہی کوشش کی جاتی، ابتدائی مرحلے میں ہی الارم بجنے لگتا۔

"خود اپنے لیے تو تم معمولی سے خطرے کو بھی نظرانداز نہیں کرتے" مقصود نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اب تو میرے جیل جانے میں ایک ہفتہ بھی نہیں رہا ہے" ظہور بولا "میں نے سوچا، گھر پر بھی قید رہ کر دیکھ لیا جائے۔ زندہ رہنا آزادی سے زیادہ اہم ہے" وہ شیشے کے سلائیڈنگ ڈور کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دروازہ بالکنی میں کھلتا تھا۔ وہ چند لمحے باہر دیکھتا رہا "یہ جگہ محفوظ ہے لیکن کون جانے، نیچے پارک میں کیا کیا ہوتا ہے۔"

ظہور دراز قامت اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ روشن بالکنی کے پیش منظر میں وہ اور جسیم لگ رہا تھا۔ اس نے سائیڈ پاکٹ سے پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھرنے لگا۔ مقصود نے پائپ کے فوائد ظہور سے سمجھے تھے۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ تنویر انتقامی کارروائی کرتا پھر رہا ہے" ظہور نے پلٹ کر مقصود کو دیکھتے ہوئے کہا "وہی اتنا بے وقوف ہے کہ خود کو مظلوم آئیڈیلسٹ سمجھ سکتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دنیا معقولیت کی بھی ہے۔"

مقصود بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا "بہرکیف میں تو گزشتہ رات کے بعد اسے کمتر نہیں سمجھ سکتا" اس نے کہا "میں تحفظ طلب کررہا ہوں۔"

ظہور نے پائپ کا کش لیا اور کچھ سوچتا رہا پھر بولا "بات ناقابل فہم نہیں۔"

"تم محمود شامی سے میرے لیے بات کروگے؟"

"ضرور کروں گا لیکن پہلے تم عارضی طور پر روپوش کیوں نہیں ہوجاتے؟"

"صابر ملک کی طرح؟"

ظہور نے ایک اور کش لیا اور سر کو تفہیمی جنبش دی کہ وہ اس کا نکتۂ نظر سمجھ رہا ہے۔

مقصود ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے لزارس کے امیدوار کے بارے میں معلوم ہوتا یا منصوبے کی جزئیات سے پوری طرح واقف ہوتا.... ظہور کی طرح تو مجھے یوں تحفظ کی بھیک نہ مانگنا پڑتی۔ ظہور محفوظ رہے گا' یہاں بھی اور جیل میں بھی۔ اور الیکشن کے بعد اس کی سزا بھی معاف ہو جائے گی۔

"میں تمہیں ایک بات بتادوں" ظہور نے اچانک کہا "ہم نے اس سلسلے میں پروفیشنل کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں.... خاصے عرصے سے۔"

"یعنی تنویر کے پیچھے کسی کو لگادیا گیا ہے؟"

"تنویر کے پیچھے تو نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پہلے ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہمارا دشمن تنویر ہے۔ ہاں اب تنویر ہمارا ہدف ہوگا۔ صورت حال خود ہی سنور جائے گی۔"

یہ جملہ۔ "صورت حال خود ہی بہتر ہو جائے گی' سُدھر جائے گی یا سنور جائے گی...' ظہور کا پسندیدہ جملہ تھا اور یہ وہ لوگوں سے اس وقت کہتا تھا جب اس کا خود بہتری کی کوشش کرنے کا بالکل ارادہ نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں ایک بار اس کے ایک ماتحت نے چیخ کر جواب دیا تھا.... 'جاؤ.... خود کو سُدھارو جاکر۔'

"ہم دونوں ہی تنویر سے ذاتی طور پر واقف ہیں" مقصود نے کہا۔ "وہ آئیڈیلسٹ نہیں' مذہبی جنونی بھی ہے۔ وہ رُکنے والا نہیں۔ اسے تو روکنا پڑے گا۔"

"ہاں۔ اب تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کہ اپنا مشن جاری رکھے" ظہور بولا "میں متین کو.... اپنے ایک باڈی گارڈ کو تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ وہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا آئے گا۔ اس کے بعد میری تجویز یہ ہے کہ تم بند ہو کر بیٹھ جاؤ۔ نکلو تو ایسے کہ بہت لوگوں کے درمیان رہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ اب تنویر تمہارے گھر کا رخ کرے گا مگر تم بہرحال محتاط رہو۔ کوئی پستول بھی ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں۔"

ظہور بیس سال پیچھے چلا گیا جب وہ ایجنسی کا سرگرم ڈپٹی ڈائریکٹر ہوا کرتا تھا۔ "تو ایسا کرو بغیر لائسنس کا کوئی پستول یا ماؤزر خرید لو۔ گھر کے دروازوں اور کھڑکیوں پر ڈوری سے کچن کے برتن باندھ دو...."

"یہ تمام احتیاطی تدابیر میں بھی جانتا ہوں" مقصود نے چڑ کر کہا "اور تنویر بھی ان سے واقف ہے۔"

"اس کے باوجود یہ اب بھی مؤثر ہیں۔ میں محمود شامی سے بات کر کے کل تمہیں فون کروں گا۔"

یہ اشارہ تھا کہ ملاقات ختم ہوئی۔ مقصود اٹھ کھڑا ہوا "شکریہ ظہور۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے لیے جو کچھ بھی کر سکتے ہو' ضرور کرو گے۔"

ظہور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں اس کے دونوں باڈی گارڈز بیٹھے تھے۔ وہ دونوں اوسط قدوقامت کے تھے۔ ان کے لباس کے نیچے غیر فطری ابھار بتا رہے تھے کہ وہ مسلح ہیں۔ دونوں تاجوری معلوم ہوتے تھے۔ جو بیٹھا ہوا تھا' وہ مقصود کو جانا پہچانا لگا۔

"متین!" ظہور نے بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا "تم مقصود صاحب کو ان کے گھر چھوڑ آؤ.... حفاظت سے۔"

متین اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی قمیص کے بٹن بند کیے۔ وہ محمود شامی کے عہد میں واجد کے یونٹ میں اس کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اس کے بعد بھی دونوں کا تعلق نہیں ٹوٹا تھا۔ واجد نے ہی اسے ظہور کی حفاظت کی ذمے داری سونپی تھی۔

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا" ظہور نے مقصود کو یقین دلایا۔

مقصود نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور متین کے ساتھ باہر نکل آیا۔



مقصود کے جانے کے بعد ظہور اپنی اسٹڈی میں گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ محمود شامی سے صرف طے شدہ وقت پر ہی بات کی جاسکتی تھی اور اس میں ابھی چھ گھنٹے باقی تھے۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے ٹیلی فون اپنی طرف کھینچا اور شاکر کا نمبر ڈائل کیا۔ ساتھ ہی اس نے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر دیا۔ اس میں جلنے والی نیون ٹیوب فون کے اردگرد کام کرنے والے کسی بھی مائیکرو ٹرانسمیٹر کو بے کار کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

"ظہور بول رہا ہوں" شاکر کی آواز سننے کے بعد اس نے ماؤتھ پیس میں کہا "شکار سے متعلق ایک اہم بات سامنے آئی ہے۔"

"معموں میں بات نہیں کرو" دوسری طرف سے شاکر نے کہا "تمہارے فون کو محفوظ بنادیا گیا ہے۔"

"مقصود آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ رات تنویر الزماں اس کے گھر پہنچا اور اس سے لزارس کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا خوبرو تاجوری بھی تھا۔ وہ دونوں مقصود کو قتل کرنے والے تھے مگر مقصود کی ایک پڑوسن آدھمکی۔ یوں اس کی جان بچ گئی۔"

"مقصود نے انہیں لزارس کے بارے میں کیا بتایا؟"

"جو کچھ جانتا تھا' سب بتادیا۔"

شاکر چند لمحے خاموش رہا "تنویر کی زبان سے شاید پھسل گیا ہو کہ اسے لزارس کے بارے میں کہاں سے معلوم ہوا؟"

"تم جانتے ہو' تنویر کی زبان پھسلے گی تو کیا' گھلوائی بھی نہیں جاسکتی۔"

"مقصود اب کہاں ہے؟"

"میں نے اسے حفاظتی تدابیر سمجھا کر متین کے ساتھ گھر واپس بھیج دیا ہے۔"

"کیا وہ بہت خوف زدہ ہے؟"

"ہاں، لیکن بے فکر رہو، وہ ٹوٹے گا نہیں۔"

"تنویر کے ساتھ نیاز ہوگا" شاکر نے خیال آرائی کی۔

ظہور کے لیے وہ نام جانا پہچانا تھا۔ نام سنتے ہی اسے نیاز کا چہرہ بھی یاد آگیا۔ نیاز گیٹ وے اسکینڈل میں ملوث ان لوگوں میں سے تھا جن پر جرم ثابت ہوا اور سزا بھی سنائی گئی۔

"میں صاحب سے بات کروں گا" شاکر نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

ظہور نے ریسیور کریڈل پر رکھا۔ اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا پائپ بجھ چکا تھا۔ اس نے اسے دوبارہ سلگا لیا۔ وہ بیتے ہوئے دنوں کو یاد کررہا تھا جو کس قدر خطرات میں گزرے تھے۔

اور تنویر الزماں کوئی کم خطرناک حریف نہیں تھا!

○☆○

حارث دکان کے باہر کھڑا بنارس کے اکیلے ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی شخص گزشتہ آدھے گھنٹے سے دکان میں گھسا بنارس سے بات کررہا تھا۔ وہ خوف زدہ معلوم ہوتا تھا۔ بعید از امکان نہیں تھا کہ چوری کا مال فروخت کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ حارث کو بہرحال بنارس کی غیر قانونی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بالآخر وہ شخص کاغذ کا ایک بڑا تھیلا لیے باہر آیا جبکہ دکان میں جاتے وقت وہ خالی ہاتھ تھا۔

حارث نے دونوں طرف دیکھا، سڑک پار کی اور بنارس کی دکان میں داخل ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ دھکیلا، دکان میں گھنٹی بجنے لگی۔

بنارس چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ نقوش ایسے تھے کہ لگتا تھا، ہر شخص سے ناراض ہے۔ چہرے کا تاثر زبانِ حال سے کہتا معلوم ہوتا تھا، 'دنیا بہت کمینی جگہ ہے۔ مگر میں بھی اس سے نمٹنا خوب جانتا ہوں....' شاید وہ محسوس بھی یہی کرتا تھا۔

اس نے حارث کو متوقع نظروں سے دیکھا اور ایک زبردست چھینک کو جھٹکایا۔

"نزلہ ہورہا ہے؟" حارث نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

بنارس نے نفی میں سر ہلایا "کوئی الرجی ہے" اس نے کہا پھر پوچھا "کچھ خریدنا ہے یا بیچنا ہے؟"

"نہ خریدنا ہے، نہ بیچنا ہے۔ تمہارے بہنوئی نیاز کے متعلق کچھ پوچھنا ہے۔"

"تم پولیس والے ہو؟"

"نہیں۔ مجھے تو بس نیاز سے مل کر کچھ بات کرنی ہے۔"

بنارس ہنسا اور اس نے کندھے جھٹک دیے "تب تو تم غلط مقام پر آئے ہو۔ میری نیاز سے بنتی ہی نہیں۔ ویسے نیاز سے بات کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی تمہیں؟"

"ذرا سچی بات بتاؤں" حارث نے کہا "وہ میرا مقروض ہے۔"

"آؤ دونوں مل کر ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر خوب روئیں۔ بھائی، وہ تو میرا بھی مقروض ہے" بنارس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ بلکہ اس کے انداز... سے لگتا تھا کہ وہ نیاز کو باربار قرض بھی دیتا رہا ہے اور اس کے قرض خواہوں کے دکھڑے سننا بھی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔

"یہ بتادو کہ وہ کہاں مل سکے گا" حارث نے کہا۔

بنارس نے نفی میں سر ہلایا اور بڑی تندہی سے اپنا کان کھجانے لگا "تم نے نجمہ سے معلوم کیا؟"

"اس کی بیوی سے؟"

"ہاں.... میری بدنصیب بہن!" بنارس نے درد بھرے لہجے میں کہا "خدا نے مجھے دماغ بہت اچھا دیا اور میری بہن کو صورت بہت اچھی دی لیکن قسمت ہم دونوں ہی کو اچھی نہیں ملی۔"

"اسے بھی نہیں معلوم کہ نیاز کہاں ہوگا" حارث نے اسے مطلع کیا۔

"اس میں بھی حیرت کی کوئی بات نہیں اور جو شخص اپنی بیوی کو نہ بتائے کہ وہ کہاں جارہا ہے، وہ سالے کو کیا بتائے گا۔ تین ہفتے ہوگئے سالے کو بھاگے ہوئے...."

"سالے کو نہیں، بہنوئی کو" حارث نے تصحیح کی "اور تین ہفتے؟"

"ہاں۔ تین ہفتے۔ اس دوران شاید دوبار فون کیا ہوگا اس نے۔ عجیب آدمی ہے۔ میرا مشورہ مانو تو اپنی رقم کے سلسلے میں تم بھی وہی کرو جو میں کرچکا ہوں۔"

"کیا کروں؟"

"صبر کرلو" بنارس نے کہا۔ پھر جلدی سے بولا "تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اس پر رقم کی وصولی کے لیے کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالنا۔ وہ بہت غصہ ور ہے اور غصے میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔ میں تو اپنی رقم پر صبر کرچکا ہوں۔"

پھر گھنٹی بجی۔ حارث نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر جیب سے کارڈ نکال کر بنارس کی طرف بڑھایا "وہ آجائے تو اس نمبر پر فون کرکے مجھے بتادینا۔ میں بڑی سیاست سے کام کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے، اسے تمہاری رقم ادا کرنے پر بھی منالوں۔"

بنارس فکرمند نظر آنے لگا "بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا...."

"کہ میں اس پر سختی کروں؟" حارث نے پوچھا۔

"ہاں جی۔"

حارث مسکرایا "تم بالکل فکر نہ کرو۔ تمہارے بہنوئی کو مجھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

"میں دراصل نیاز کے لیے نہیں، اپنی بہن کے لیے پریشان ہوں" بنارس نے کہا اور دکان میں آنے والے گاہک کی طرف

متوجہ ہو گیا "جی فرمائیے۔"

"شکریہ بھئی بنارس صاحب" حارث نے کہا اور دُکان سے نکل آیا۔

وہ ابھی تک کچھ بھی نہیں کرپایا تھا۔ ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوتی۔ مگر اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاملات اچانک ہی ناقابل یقین تیز رفتاری سے چل پڑتے ہیں۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ ابھی اسے چند گھنٹے گزارنا تھے۔ چنانچہ وہ ایک ہوٹل کے ٹھنڈے لاؤنج میں جا بیٹھا۔ کولڈ ڈرنک طلب کرنے کے بعد وہ سوچنے لگا۔ سوچنے کے لیے یہ آئیڈیل ماحول تھا۔ ایسے میں اس کا دماغ خوب کام کرتا تھا۔

یہ کیس ایک زاویے سے بے حد دلچسپ تھا۔ اس میں متوقع شکار تعداد کے اعتبار سے کافی زیادہ تھے۔ قاتل جب بھی کسی کو شکار کرتا تو اپنی آئندہ کی سرگرمیوں کے میدان کو کچھ سکیڑ لیتا یعنی ہر کامیابی کے ساتھ قاتل کے گرفت میں آنے کا امکان بڑھ جاتا تھا۔

کامیابی ہی ناکامی کے لیے راہ ہموار کرتی ہے!

حارث سوچ رہا تھا کہ بنارس اتنا بے خبر نہیں، جتنا ظاہر کر رہا تھا۔



ظہور کو جتنا پسینہ آرہا تھا، اتنا صرف موٹوں ہی کو آسکتا ہے۔ کسی دُبلے آدمی کو اتنا پسینہ آتا تو وہ تحلیل ہی ہو چکا ہوتا۔

ائرکنڈیشننگ یونٹ جو پانچ منزل اوپر نصب تھا، گزشتہ رات خراب ہو گیا تھا۔ مکینک بلائے گئے تھے مگر وہ ابھی تک آئے نہیں تھے۔

بیئر کی چوتھی بوتل صاف کرنے کے بعد وہ صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جیل میں کیا حشر ہو گا مگر نہیں.... وہ سابق اٹارنی جنرل تھا۔ اس کے ساتھ گھٹیا مجرموں کا سا سلوک تو نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے اے کلاس ملنا تھی۔ یہ طے تھا کہ جیل کی کوٹھری میں ائرکنڈیشنر بھی لگا دیا جائے گا۔

'تو پھر جیل ہی کیوں نہ چلا جائے۔' اس نے سوچا۔ 'اگر میں اپنی سزا کاٹنے کے لیے مقررہ وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تو اخبار نویسوں کو کیسا شاک لگے گا۔ لیکن نہیں.... ان لوگوں کو شاک کہاں لگتا ہے۔ انہیں تو کسی بات پر بھی حیرت نہیں ہوتی۔'

ظہور نے شاکر سے گفتگو کے بعد شاہی سے بات کی تھی لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ یعنی منصور کو بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ بس یہی بتایا جاسکتا تھا کہ محمود شاہی نے یقین دہانی کرائی ہے کہ اس کے تحفظ کا ہر ممکن خیال رکھا جائے گا۔

اسے یاد آیا کہ آج شاہی اور شاکر کی ملاقات طے ہے۔

میز پر رکھا تھرمامیٹر بتا رہا تھا کہ کمرے کا درجۂ حرارت ۸۶ درجہ فارن ہائٹ ہے۔ ظہور نے شکر ادا کیا کہ ہائیڈرومیٹر موجود نہیں ورنہ ہوا میں نمی کا تناسب جان کر وہ اور کڑھتا۔ مسئلہ صرف گرمی کا نہیں تھا۔ شدید حبس بھی تھا۔

چھوٹی آستینوں کی قمیص پسینے میں بھیگنے کے بعد اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر اور غصہ آرہا تھا کہ اس کے باڈی گارڈز کو گرمی کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ خود اس کے جسم پر پسینہ کیڑے مکوڑوں کی طرح جابجا رینگتا، سرسراتا پھر رہا تھا۔ اس نے بیئر کی پانچویں بوتل کھول لی۔ پھر فون اپنے سامنے کھسکایا اور بلڈنگ کی انتظامیہ کا نمبر ملایا۔

"ائرکنڈیشننگ یونٹ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا ہے" اس نے شکایت کی۔

"تحمل سے کام لیں جناب، ہو جائے گا۔"

"کب ہو جائے گا آخر؟" وہ دہاڑا "یہ میرا پانچواں فون ہے اور پانچوں بار مجھے لفظ بہ لفظ یہی جواب ملا ہے۔ تم آدمی ہو کہ کمپیوٹر" اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

وہ پھر صوفے پر دراز ہو گیا۔ اس نے پائپ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر فوراً ہی ارادہ بدل دیا۔ اتنی گرمی میں پائپ سُلگانا.... کچھ بھی سُلگانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ اٹھا اور بک شیلف کی طرف بڑھا کہ مطالعے ہی میں وقت گزاری کرے مگر جن کتابوں پر اس کی نظریں جمیں، وہ بھی گرمی کا احساس دلانے والی تھیں.... دانتے کی جہنم اور بال کی ایک گرم رات کی بات....

ظہور اب رات کے انتظار میں تڑپ رہا تھا۔ سورج غروب ہو گا تو درجۂ حرارت کم ہو گا۔

پہلے وہ دونوں باڈی گارڈز کے ساتھ گھر سے نکلا تھا اور ایک ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا تھا۔ لیکن وہاں اسے سکون نہیں ملا۔ خطرے کا احساس اسے رہ رہ کر ستا رہا تھا۔ اس سے ٹھیک طرح کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ اس نے سوچا، ایسے خطرناک آرام سے محفوظ بے آرامی بھلی۔ وہ اپارٹمنٹ واپس آگیا تھا۔

مگر وہ دوپہر سے پہلے کی بات تھی۔ تب گرمی اتنی نہیں تھی۔

اس نے فریج کھول کر بیئر کی ایک بوتل نکالی۔ اس بار اس نے بیئر گلاس میں انڈیلی۔ پھر اس میں ٹرے کے تمام آئس کیوب بھی ڈال دیے۔ 'اب شاید بیئر واقعی کچھ ٹھنڈک پہنچا سکے گی۔' اُس نے سوچا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ بیئر کو اس طرح پینا خلافِ اصول ہے۔

اس نے ایک گھونٹ میں آدھی بیئر حلق سے اتار لی۔ پھر بیٹھا غور کرتا رہا کہ جسم کے اندر گرمی کی اذیت میں کچھ کمی ہوئی ہے یا نہیں؟

بالکنی کے شیشے کے دروازے سے اس نے پودوں کے پتّوں کو ہلتے دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہوا چل رہی تھی۔ وہ بیئر کا گلاس ہاتھ میں لیے اٹھا، سلائڈنگ ڈور کو دھکیلا اور بالکنی میں چلا گیا۔

بالکنی میں سایہ تھا۔ وہ کمرے کے مقابلے میں کافی خنک معلوم ہو رہی تھی۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس کی پسینے میں تر قمیص سے ٹکرایا

تو اسے بے اندازہ سکون کا احساس ہوا۔ اس نے بیئر کا ایک گھونٹ لیا اور جھک کر نیچے پارک کا منظر دیکھنے لگا۔ سرسبز منظر سکون اور ٹھنڈک کا احساس دلا رہا تھا۔ اسے دو کبوتر.... بالکل سفید کبوتر اُڑتے ہوئے، اپنی طرف آتے نظر آئے۔ پھر وہ نچلی کسی منزل کی کھڑکی پر جا بیٹھے۔ اس نے بیئر کے ساتھ ایک آئس کیوب بھی منہ میں لے لیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ اسے چبانے لگا۔

نرم کناروں والی تیز رفتار گولی اس کے سینے سے ٹکرائی۔ سینے کی موٹی ہڈی کو توڑنے کے دوران گولی بھی ٹوٹی۔ آدھی گولی اوپر کی طرف اٹھی اور گلے کو اندر سے پھاڑتی ہوئی باہر نکلی۔ دوسری نصف نے اس کے دل کے بائیں جانب والے خانے کو اُدھیڑا اور اس کی پیٹھ میں بہت بڑا خلا چھوڑتی ہوئی نکلی۔

سلائڈنگ ڈور کا شیشہ بلٹ پروف تھا۔ اس پر سرخ اور دودھیا دائرے کا نشان بن گیا۔

ظہور لڑکھڑایا۔ اس کی بے جان ٹانگوں میں جیسے پہیے لگ گئے تھے۔ اس کی جان یوں واضح طور پر نکل رہی تھی کہ اسے پینٹ کیا جا سکتا تھا۔

وہ بالکنی کی ریلنگ سے ٹکرا کر آگے خلا میں گرا تو پہلے ہی مر چکا تھا۔ چالیس منزل نیچے سڑک پر تو بس اسے پھٹ جانا تھا۔ وہ گولی سے نہ مر گیا ہوتا تو وہ بڑی اذیت ناک موت ہوتی۔

○☆○

"مجھے امید نہیں تھی کہ آپ دوبارہ یہاں آئیں گے" شاہدہ نے کہا۔

تنویر نے اندر آنے کے بعد اسے بہت غور سے دیکھا۔ حمید ہمیشہ کہتا تھا کہ شاہدہ کی چھٹی حس بہت تیز ہے اور تنویر بھی یہ بات تسلیم کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کسی نہ کسی طرح شاہدہ کو ظہور کی موت کا علم ہو چکا ہے اور شاید اب اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا ہے کہ مرنے سے پہلے اس کا شوہر کس کام میں مصروف رہا تھا۔ شاید وہ اپنے شوہر کے بارے میں اس کے اندازے سے بڑھ کر جانتی تھی اور اب تنویر سوچ رہا تھا۔ یہ اور جانے کیا کچھ جانتی ہوگی؟

"میں اکثر غیر متوقع کام کرتا ہوں" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ایسا تو نہیں ہے۔ خیر یہ بتائیں، یہاں کیوں آئے ہیں؟"

اس کے لہجے میں تجسس کے سوا بھی کچھ تھا.... رحم سے ملتی جلتی کوئی چیز۔ تنویر آگے بڑھا۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر وہ اس کی طرف مڑا۔ "تم سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا میرے لیے" اس نے کہا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ میری پچھلی آمد کے بعد اب تک کوئی قابلِ ذکر بات ہوئی ہے؟"

"آپ فون بھی کر سکتے تھے" شاہدہ نے کہا۔ پھر خود ہی بولی "لیکن ان کھلونوں پر آپ اعتبار ہی کب کرتے ہیں۔"

"اور اس کی معقول وجہ بھی ہے۔"

"بہرحال آپ نے یہاں آ کر زیادہ بڑا خطرہ مول لیا۔ آپ نے اپنا ایک اصول خود توڑ دیا۔"

تنویر جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے "یہ بات کیوں کہی تم نے؟"

"آپ اس کی وجہ بھی جانتے ہیں" شاہدہ نے جواب دینے سے پہلو تہی کی "اور آپ خطرے سے بھی واقف ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"چھوڑیں۔ کوئی اتنی اہم بات بھی نہیں۔"

"دیکھو شاہدہ.... کسی کی پروا کرنا ہر شخص کی ضرورت ہوتا ہے۔"

"آپ بھی کسی کی فکر کرتے ہیں؟ یا آپ کو کسی کی فکر کرنے کے لیے کسی جواز کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"دونوں میں بہت.... معمولی سا فرق ہے۔"

"مگر بہرحال فرق ہے" شاہدہ نے کہا اور اس کی طرف بڑھ آئی "حمید بھی تمہاری ہی طرح تھا۔ بلکہ ایسا بنا دیا گیا تھا۔ سیاسی لوگوں نے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے اس کے ذہن میں طرح طرح کے فلسفے ٹھونس دیے تھے۔ وہ انہیں کا زبنا بیٹھا تھا۔"

"تم غلطی پر ہو شاہدہ۔"

"جی نہیں۔"

نیچے والے فلیٹ میں کوئی مرد چیخ کر گالیاں بک رہا تھا۔ سڑک پر کوئی ہارن بجا۔ کوئی چلایا۔ تنویر صوفے پر بیٹھ گیا جیسے اچانک ہی تھک گیا ہو۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں آیا ہی کیوں۔ شاید لاشعوری طور پر وہ جانتا تھا کہ اس نے اور حمید نے خود کو پیچیدہ اور لایعنی قسم کے ذاتی چیلنجز میں الجھا لیا ہے۔ انہیں اپنے اپنے منطقی انجام کو پہنچ جانا ہے اور ان کی زندگی کی باگیں اب بھی محمود شامی کے ہاتھ میں ہیں۔

"پچھلی بار آپ کے جاتے ہی حارث نامی ایک شخص یہاں آیا تھا" شاہدہ نے اسے چونکا دیا۔ "کہتا تھا، محکمۂ خفیہ میں ہوں۔"

"تمہارے خیال میں وہ درست دعویٰ کر رہا تھا؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ ویسے اس نے شناختی کارڈ دکھایا تھا، وہ حمید کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"دیکھنے میں کیسا لگتا تھا؟"

"چھوٹا قد، نیلی چمکیلی آنکھیں، کشادہ پیشانی، نکیلی ٹھوڑی۔ عمر چالیس کے قریب ہوگی۔ پیٹ قدرے نکلا ہوا تھا۔ ہاتھ لمبے لمبے۔ انگلیاں نکوٹین زدہ۔ مسکراہٹ ایسی خوبصورت کہ پل بھر میں اس کی شخصیت بدل کر رکھ دیتی تھی۔"

اس نے اتنا تفصیلی حلیہ بتایا تھا کہ تنویر مسکرا دیا۔ وہ اس کی قوتِ مشاہدہ کا قائل ہو گیا۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ جو شخص نیاز کے متعلق معلومات کرتا پھر رہا تھا، یہ وہی شخص ہو۔ اس نے پانی میں جو کنکر اچھالے تھے، انہوں نے اس کی توقع سے زیادہ

دائرے... بھنور بنائے تھے، اس لیے کہ پانی اس کی توقع سے بہت زیادہ گہرا تھا۔ وہ... وہ تو لزارس سے بھی بے خبر تھا۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اردگرد نامعلوم اور بھاری چیزیں حرکت کر رہی ہیں۔ شاید اسی لیے وہ یہاں آیا تھا... شاہدہ حمید کے پاس۔ یہ فلیٹ وہ جگہ تھی جو اسے اس فریب میں مبتلا کرتی تھی کہ وہ وقت اور بے رحم حالات کی سختی بڑھاتی ہوئی گرفت سے آزاد ہو گیا ہے۔

اسے احساس ہوا کہ اس کا نچلا ہونٹ داہنی جانب سے پھڑک رہا ہے۔

شاہدہ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ کچن کی طرف سے ایک جانی پہچانی بُو اٹھ رہی تھی شاید کوئی چیز... ہانڈی جل رہی تھی۔ شاہدہ نے اس بُو کو نظرانداز کر دیا اور اس صوفے کی طرف چلی آئی، جس پر وہ بیٹھا تھا۔

"میں جہاں سے آئی ہوں۔ یعنی تاجور سے... وہاں ایک مقام ایسا ہے جہاں سمندر فرشی ساحل سے ٹکراتا ہے۔ ساحل کی وجہ سے سمندر بھی سُست پڑ جاتا ہے" شاہدہ خواب ناک لہجے میں کہہ رہی تھی "مچھیرے اپنی چھوٹی کشتیوں میں وہاں سے سمندر میں اترنا چاہیں تو لہریں انہیں ساحل پر واپس لا پھینکتی ہیں۔ جب تک وہ سخت جدوجہد نہ کریں، کشتی سمندر میں نہیں لے جا پاتے لیکن جب وہ نیچے والی موجوں کے پار ایک خاص مقام تک پہنچ جائیں تو ان کے پاس واپسی کا امکان نہیں رہتا۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ آگے ہی آگے بڑھتے جائیں" اس نے توقف کیا، ایک گہری سانس لی اور بولی "آپ اس مقام سے گزر چکے ہیں میرے بھائی۔"

"میں جانتا ہوں" تنویر نے کہا۔ اس کی آواز ٹوٹنے لگی تھی۔ اس نے کوشش کر کے خود کو سنبھالا۔ آواز میں بس خفیف سی لرزش جھلک سکی "اسی لیے تو میں یہاں آیا تھا بہن، اور اسی لیے تو مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

شاہدہ نے اس کے رخسار پر اپنے سرد ہاتھ کا دباؤ ڈالا اور اس کا رخسار اپنے کندھے پر ٹکا لیا "بھائی... تم بالکل میرے حمید کی طرح ہو" وہ اس کے بالوں کو انگلیوں سے تھپتھپا رہی تھی "تم کبھی ہار نہیں مانو گے" اس کی آنکھوں میں محبت سی چمکی۔ اس نے جھک کر تنویر کی پیشانی چوم لی "اب جاؤ میرے بھائی۔ الوداع... فی امان اللہ۔"



واجد سوچ رہا تھا کہ اب بس ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔ تنویر کو مرنا ہوگا... اور یہ کام جتنی جلدی ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ اس نے سوچا ضرور لیکن وہ یہ بات بلند آواز میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ البتہ سابق صدر کے کمرے کی فضا میں یہ خیال رچا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

واجد اور شاکر بڑی میز کے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ محمود شامی ٹہل رہا تھا۔

"بنیادی سوال تو یہ ہے کہ اسے معلوم کیسے ہوا یہ راز؟" اس نے رک کر کہا۔ لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

شاکر نے اس سوال کو نظرانداز کر دیا "تنویر سے ہم اور کیا امید کر سکتے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ تھا تو انتہا پسند تھا۔ ہمارے خلاف ہوا تو بھی انتہا پسند ہے۔ اس کے دماغ میں تو ٹیڑھ ابتدا ہی سے تھی۔"

"ہم اس سے نمٹ سکتے ہیں" واجد بولا۔

"ہاں... ہاں..." شامی پھر ٹہلنے لگا "ہمیں اس سے جلد از جلد اور فیصلہ کن انداز میں نمٹ لینا چاہیے" وہ رکا اور واجد کی طرف مُڑا "تم اب مجھے دن میں دوبار پروگریس رپورٹ دو گے" پھر وہ شاکر سے مخاطب ہو گیا "اور میں اب لزارس سے متعلق مکمل اسٹریٹجی سے آگاہ رہنا چاہتا ہوں۔ اب ہمارے سامنے وقت کا مسئلہ ہے۔"

شاکر نے ہاتھ سے سہلا کر بالوں کو ٹھیک کیا اور سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ بہت سنجیدگی سے خوف کو محمود شامی کے چہرے کے نقوش پر اثرانداز ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ممکنہ طور پر محمود شامی سے پہلے اس کی باری آنی ہے۔

یہ کوئی خوش آئند خیال نہیں تھا!

محمود شامی نے ٹہلنا موقوف کیا اور اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کی مضطرب انگلیاں میز پر طبلہ بجانے لگیں۔ وہ آواز بتدریج بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ خود اسے اس بات کا احساس ہو گیا۔ اس نے انگلیوں کو روک دیا "تمہیں مزید مدد کی ضرورت ہے؟" اس نے واجد سے پوچھا۔

"مزید مدد ملی تو حال اس کچن کا سا ہوگا، جہاں ان گنت باورچی ہوں" واجد نے کہا "تنویر سے نمٹنے کے لیے ہمیں بہت احتیاط اور رازداری سے کام لینا ہوگا۔ میرے پاس جو آدمی ہیں، وہ میرے لیے قابلِ اعتبار ہیں۔"

"اعتبار تو کر سکتے ہو، یہ بتاؤ، انہیں کنٹرول بھی کر سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تنویر اب تک ترتیب صعودی سے کام لے رہا ہے" شاکر نے کہا "اس کا ہر مقتول پچھلے مقتول سے زیادہ اہم، اختیارات اور اپنی پوزیشن کے لحاظ سے بڑا ہوتا ہے۔ مقصود کو وہ ایک بار مس کر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ مقصود پر پلٹے گا یا نہیں؟"

"میرا خیال ہے، پلٹے گا" واجد بولا "وہ تنویر کے لیے نامکمل کام ہے... اور پروفیشنل لوگوں کو نامکمل کام اچھے نہیں لگتے۔ تنویر تو ویسے بھی بہت منتقم مزاج آدمی ہے، وہ مقصود کو آخر کے لیے نہیں چھوڑے گا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے سویٹ ڈش کے بعد کے لیے دہی بڑے بچا کر رکھے جائیں۔"

"تم آدمی ہو یا باورچی؟" محمود شامی نے چڑ کر کہا اور انگلیوں

سے میز پر طبلہ بجانے لگا۔

"بہرحال میں اس سے متفق ہوں" شاکر نے کہا "تنویر خود کو آلۂ انصاف سمجھتا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مقصود اس کا اگلا شکار ہوگا۔"

"تنویر ہمیں نہیں ملتا تو نہ ملے۔ ہم اس کے مقصود پر جھپٹنے کا انتظار کریں گے" واجد بولا۔

محمود شامی نے ہونٹ سکیڑے۔ لفظ 'چارا' اس کے ہونٹوں پر تھرکا مگر اس نے اسے ادا نہیں کیا۔ اس نے کہا "تم لوگ اپنے اپنے کام میں طاق ہو" پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا "مقصود کو کوئی گزند نہیں پہنچنی چاہیے۔"

"ایسا نہیں ہوگا" شاکر نے کہا۔

لیکن واجد اس معاملے میں اتنا پُریقین نہیں تھا۔ مدِمقابل تنویرالزماں جیسا ہو تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایک پروفیشنل کی حیثیت سے وہ تنویر کی بڑی قدر کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب تنویر چوکنا ہو گیا ہے تو اس تک پہنچنا اور مشکل ہو گیا ہے۔ اسی لیے واجد مقصود پر انحصار کر رہا تھا۔ اور پھر مسئلہ وقت کا بھی تھا۔ تنویر کسی کے سامنے زبان کھول بیٹھتا..... لزارس کا تذکرہ کر دیتا تو... اب سہراب پور کا مرحلۂ انتخاب سر پر تھا۔ پورا کھیل خراب ہو سکتا تھا۔

محمود شامی اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ یقینی طور پر خوف زدہ تھا۔ اس کے جسم کی اینٹھن اس بات کی گواہ تھی۔ اس کے عضلات تنے ہوئے تھے "تم نے سب سے قیمتی لفظ جو استعمال کیا ہے' وہ رازداری ہے" اس نے واجد سے کہا "سب کی بہتری اسی میں ہے کہ تنویر کو مزید معلومات حاصل نہ ہو پائیں" وہ ان دونوں کی طرف مڑا۔ اس کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔ "انہوں نے ہماری راہ میں جائز' ناجائز ہر طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں لیکن ہم ہر رکاوٹ پھلانگ آئے۔ یہ رکاوٹ بھی ہمیں نہیں روک سکے گی۔"

واجد سوچ رہا تھا' یہ رکاوٹ سے مراد تنویر ہے یا گیٹ دے کی طرف اشارہ ہے مگر اس نے یہ بات پوچھی نہیں۔

"کسی بھی سلسلے میں بات کرنی ہو یا کسی بات کی وضاحت درکار ہو تو تم دونوں کسی بھی وقت یہاں آ سکتے ہو" محمود شامی کہہ رہا تھا "پہلے فون کر لینا۔ میں سیکرٹ سروس والوں سے تمہیں کلیئرنس دلا دوں گا۔ اس وقت آپریشن نازک ترین مرحلے میں ہے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد سب آسان ہوگا لیکن آپس کی غلط فہمیوں سے ہمیں بچنا ہوگا۔ فی الوقت ہم کسی غلطی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" وہ مسکرایا "اب میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا"

اس نے سر سے اشارہ کیا کہ میٹنگ برخواست ہوئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر ایک خط پڑھنے لگا۔

شاکر اور واجد دروازے کی طرف چل دیئے۔ وہ باہر نکلے' جہاں ان کی کاریں کھڑی تھیں۔ شاکر نے واجد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ واجد نے سر گھما کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا "یہاں لفظوں کے ہیر پھیر کی ضرورت نہیں" شاکر نے کہا "تنویر تمہارے ہتھے چڑھ جائے تو اسے ختم کر دو..... ہر قیمت پر۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ کسی اور کے ہاتھوں میں جائے... خاص طور پر قانون کے۔"

"مقصود کو کتنا کچھ بتا سکتا ہوں میں؟"

"اسے کچھ بھی نہ بتاؤ۔ بس تحفظ فراہم کرو اسے۔ اگر اسے تحفظ فراہم نہ کیا گیا تو اس سے تنویر شبہات میں مبتلا ہوگا لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا دردِ سر مقصود نہیں' تنویر ہے۔"

"میں اپنی ترجیحات سے واقف ہوں" واجد نے کہا۔

شاکر اپنی مرسڈیز میں بیٹھ گیا۔ جتنی دیر میں واجد اپنی کرولا میں بیٹھا' مرسڈیز گیٹ کی طرف بڑھ چکی تھی۔ واجد کی نظریں مرسڈیز کا تعاقب کرتی رہیں۔ گارڈ نے بٹن دبا کر گیٹ کھولا اور الوداعی انداز میں ہاتھ لہرانے لگا۔

واجد سوچ رہا تھا' دنیا میں کوئی شخص ایسا بھی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو' اس نے سر جھٹکا' یہ تو ممکن ہی نہیں۔ کوئی بھی قیامت تک نہیں جی سکتا۔



واجد نے اپنی گاڑی میں ایونیو کا ایک اور چکر لگایا۔ بیلمونٹ ٹاورز کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کار کی رفتار کم کر دی۔ وہ پوری بلڈنگ کو اچھی طرح چیک کر چکا تھا۔ اس نے مقصود کے فلیٹ کا بھی جائزہ لیا تھا۔ اب وہ عمارت کے گرد و پیش میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے گاڑی سائڈ میں کی اور رفتار مزید کم کر دی۔

بیلمونٹ ٹاورز کے عین سامنے ایک میڈیکل اسٹور تھا جو چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ کچھ پیچھے اسی طرف ایک ریسٹورنٹ تھا۔ پھر ریگل شو شائن پارلر تھا جو کافی عرصے سے بند تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ کھلنے والا تھا۔ اس کے لیے بورڈز تیار کیے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں یا تو اپارٹمنٹ بلڈنگز تھیں یا دفاتر۔ کارنر پر ایک اور ریسٹورنٹ تھا۔ واجد نے بند دکان کا پتا نوٹ کیا اور گاڑی کو دوبارہ ٹریفک کے دھارے میں شامل کر دیا۔

اگلے کارنر پر اس نے گاڑی پارک کی اور پیدل بیلمونٹ ٹاورز کی طرف چل دیا۔ لابی میں پبلک فون موجود تھے۔ وہاں اس نے دو کالیں کیں۔ پھر وہ لفٹ کی طرف چل دیا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا۔ واجد نے اندر جا کرے اوالا بٹن دبا دیا۔

متین اور قادر..... وہی دونوں تاجوری جو ظہور کے باڈی گارڈز کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے تھے' اپارٹمنٹ نمبر 17E میں مقصود کے پاس موجود تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں کھڑے تھے۔ مقصود اسی صوفے پر بیٹھا تھا' جہاں بیٹھ کر اس نے تنویر اور نیاز کے سوالوں کے جواب دیے تھے۔

دروازہ متین نے کھولا۔ پھر دروازہ بند کر کے وہ وہیں کھڑا رہا۔

"مقصود صاحب' آپ صرف ہماری ہدایات پر عمل کریں' محفوظ رہیں گے اور جب تنویر پکڑا جائے گا تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا" واجد نے کہا۔

مقصود بہت پریشان نظر آرہا تھا۔ اس کا چہرہ مُتا ہوا اور بے رنگ ہورہا تھا۔ وہ پرنٹڈ شرٹ اور سیاہ پتلون پہنے تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں سیدھے ہاتھ سے قمیص کی آستین مروڑے جارہا تھا "خدا کی پناہ..." وہ لرزتی آواز میں بولا "میں نے ظہور کے متعلق سنا تو..."

"ظہور صاحب نے ہدایات پر عمل نہیں کیا تھا" واجد نے کہا "ورنہ وہ زندہ ہوتے۔ انہیں سمجھایا گیا تھا کہ بالکنی سے دور رہیں۔"

قادر اثبات میں سرہلا رہا تھا۔ متین کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ اب بھی دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

"تمہارا خیال ہے' تنویر واقعی یہاں آئے گا؟" مقصود نے پوچھا۔ لہجہ بتاتا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب نفی میں سننا چاہتا ہے۔

واجد نے کہا "مجھے اس میں شک ہے لیکن آپ نے تحفظ طلب کیا تھا' وہ آپ کو فراہم کردیا گیا۔ اور جہاں تک احتیاط کا تعلق ہے تو احتیاط کرنے سے کوئی نقصان تو ہوتا نہیں ہے۔ اور وہ آپ کی طرف سے ہم کریں گے۔ آپ اپنے معمول کے مطابق رہتے رہیں' جیسے کوئی خاص بات نہیں۔ متین اور قادر آپ کے ساتھ رہیں گے۔"

"محمود شامی تک میرا شکریہ پہنچا سکتے ہو؟" مقصود نے پوچھا۔

"کیوں نہیں' پہنچادوں گا۔"

مقصود نے اپنی آستین کا پیچھا چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا "میری دعا ہے کہ اس جھنجٹ سے جلد از جلد جان چھوٹ جائے" اس نے ایک سرد آہ بھری اور پھر واجد کو دیکھا "تم تنویر کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"جتنا جاننا ضروری ہے' جانتا ہوں۔"

"کیا وہ اتنا ہی خطرناک ہے جتنا اس کا ریکارڈ ظاہر کرتا ہے؟"

"شاید وہ اس سے زیادہ خطرناک ہے لیکن میں کسی بھی اعتبار سے اس سے کم نہیں ہوں۔"

الفاظ سنجیدگی سے ادا کیے گئے تھے۔ مقصود کو انہوں نے نیا اعتماد بخشا۔ وہ قدرے پُرسکون ہوگیا۔

"اور یہ ضروری نہیں کہ آپ یہاں قید رہیں" واجد نے کہا "آپ کے محافظ ہر جگہ آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

"لیکن یہاں زیادہ محفوظ نہیں رہوں گا میں؟"

"ضروری نہیں۔ دیکھیں .... تنویر آپ کا تعاقب کرے گا تو نظر میں آجائے گا۔ یہاں تو اسے سہولت ہے... معلوم ہے کہ آپ یہاں ہیں۔ اگر ظہور صاحب باہر ہوتے .... لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے تو اس وقت زندہ ہوتے۔"

مقصود پھر پریشان ہوگیا۔

"یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تو نہیں چلے گا" واجد نے مسکراتے ہوئے کہا "ایک ہفتہ... زیادہ سے زیادہ دو ہفتے۔"

مقصود نے میکانیکی انداز میں سر کو تفہیمی جنبش دی لیکن انداز سے لگتا تھا کہ اسے اس بات پر یقین نہیں۔

"متین یہاں کمرے میں آپ کے ساتھ ہوگا۔ قادر نیچے لابی میں ہوگا۔ آپ کو ان کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوگا لیکن یہ موجود ہوں گے" واجد نے تسلی دینے والے انداز میں مقصود کا بازو تھپتھپایا۔ پھر اس نے قادر کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

مقصود انہیں رخصت کرنے دروازے تک آیا۔

واجد اور قادر لفٹ میں بیٹھ کر نیچے آگئے۔ قادر لابی میں کھڑا ہو کر سگریٹ پینے لگا۔ واجد باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قادر جو کہ چین اسموکر ہے' بیلمونٹ ٹاورز کی لابی کے فرش پر سگریٹ بجھانے کے نشانات میں قابل قدر اضافہ کرے گا۔

باہر آنے کے بعد واجد بیلمونٹ ٹاورز کے انڈر گراؤنڈ گیراج کے سامنے سے گزرا۔ مقصود کی کار اپنی مخصوص جگہ کھڑی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تنویر' مقصود پر دوسرا حملہ اتنی جلدی تو نہیں کرسکتا۔ اسے یہ احساس بھی ہوگا کہ اس بار اس کے ہدف کو ہر ممکن تحفظ فراہم کیا گیا ہے' ہر احتیاطی تدبیر آزمائی گئی ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی ممکن تھا کہ یہ اتنا بڑا چیلنج تنویر کو اور بھڑکا دے۔ تنویر ایسا عیار اور خطرناک پروفیشنل تھا جو تمام احتیاطی تدابیر سے الٹا فائدہ بھی حاصل کرسکتا تھا۔

واجد کو ایک ایڈوانٹیج حاصل تھا۔ وہ تنویر کو جتنا سمجھ سکتا تھا' محمود شامی اور شاکر نہیں سمجھ سکتے تھے۔ تنویر کے نزدیک مقصود ایک ایسا قرض نہیں تھا جسے چکانا ضروری ہو۔ اس کے نزدیک وہ ایک ادھورا کام تھا اور کوئی پروفیشنل کسی کام کو ادھورا چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ اسے پہلی فرصت میں نمٹایا جاتا ہے۔

اور واجد ایک بات جانتا تھا جو تنویر نہیں جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب آدمی مسلسل قتل کرے تو اس کے اندر کیسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اور وہ تبدیلیاں دل پر اور دماغ کے تاریک گوشوں پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں۔ واجد جانتا تھا کہ ان تبدیلیوں سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔ تنویر نہیں جانتا تھا۔

واجد کار میں بیٹھا' انجن اسٹارٹ کیا اور کار آگے بڑھادی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ واپس آنے میں جانے کتنی دیر لگے گی۔

وہ ایک گھنٹے کے اندر واپس آگیا۔ پلاسٹک کے شاپنگ بیگ میں چار برگر رکھے تھے۔ کافی کا تھرماس تھا اور ایک چابی [illegible] نے چابی سنسان رنگل شوشائن پارلر کے تالے میں لگائی' [illegible] کے بعد اس نے دروازے کو کندھے سے زور ڈال کر دھکیلا۔ دروازہ بالآخر کھل گیا۔

اندر گرد بہت تھی۔ نیم تاریکی میں اسے چھوٹا سا ایک پلیٹ فارم نظر آیا۔ پلیٹ فارم پر چند کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف گتے کے بکسوں کا ڈھیر تھا۔ چھوٹی سی شوونڈو میلی ہورہی تھی۔ لگتا تھا کہ دُکان بند کرتے وقت اس پر صابن مَلا گیا ہے۔

اس نے ہتھیلی سے رگڑ رگڑ کر شیشہ صاف کیا۔ پھر اس نے وہاں ایک کرسی لاکر رکھی اور اس پر بیٹھ کر بیلمونٹ ٹاورز کی لابی کی طرف دیکھنے لگا۔ نگرانی کرنے کے لیے وہ مناسب ترین جگہ تھی۔

○☆○

کارنر والے ریسٹورنٹ میں تقریباً ہر وقت مقبول گانے بجتے رہتے تھے لیکن آواز اتنی نہیں ہوتی تھی کہ گراں گزرے۔ تاہم وہاں بیٹھ کر سکون سے کچھ سوچنا ممکنات میں سے نہیں تھا۔

حارث وہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کرسی کا زاویہ بدل کر اپنی ضرورت کے مطابق کرلیا تھا۔ وہ بہت پُرسکون بیٹھا تھا۔ انداز سے لگتا تھا کہ کسی کا انتظار کررہا ہے۔

جہاں وہ بیٹھا تھا' وہاں سے صرف بیلمونٹ ٹاورز کا گیٹ نظر آتا تھا لیکن بلڈنگ کے انڈر گراؤنڈ گیراج کا ایک دروازہ پوری طرح نظر آرہا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ ریسٹورنٹ بند ہونے تک وہ یہاں بیٹھے گا۔ اس کے بعد اپنی کار میں بیٹھ کر نگرانی کرے گا۔ یہاں بیٹھنے میں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ بیلمونٹ ٹاورز کے فلیٹ نمبر 17E کی روشن کھڑکی اسے صاف نظر آرہی تھی۔

○☆○

اس نے جام خالی کرکے ہولڈر میں لگادیا۔ موسم کی وجہ سے یا ائرپاکٹ کی وجہ سے جہاز ڈولتا تب بھی وہ گلاس ہرگز نہ گرتا۔ وہ ہولڈر خاص طور پر نصب کیا گیا تھا۔

یہ بوئنگ ۷۰۷ ویلکوسٹ انڈسٹریز کی ملکیت تھا اور اسے انتخابی مہم کے لیے عاریتاً دیا گیا تھا۔ وہ خود اس کمپنی کا خاصا بڑا اور اہم حصے دار تھا۔ ابتدا ہی سے اس نے اپنی دولت کے لیے کوئی عذر پیش نہیں کیا تھا۔ یہ طے ہے کہ اس نے غربت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن اب وہ ملک کے امیر ترین لوگوں میں سے تھا۔ اور دولت کوئی بری چیز نہیں تھی' نہ وہ اپنے دولت مند ہونے پر شرمندہ تھا۔ بلکہ اس نے تو یہ دیکھا تھا کہ دولت ووٹوں کو بری طرح کھینچتی ہے۔

وہ جہاز میں اپنے پرائیویٹ کمپارٹمنٹ میں بیٹھا تھا۔ اس میں ایک صوفہ سیٹ تھا۔ چھوٹا سا ایک بار تھا۔ صوفہ بوقتِ ضرورت ایک لیور دبانے پر بیڈ میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ ایک چھوٹی میز اور ایک ریوالونگ چیئر بھی تھی۔

کسی ائرپاکٹ کی وجہ سے جہاز اچانک نیچے گیا تو اس کے سامنے رکھی ٹرے میں موجود نیلے رنگ کے کیپسول اِدھراُدھر لڑھکنے لگے۔ وہ سیکوباربیٹل کے کیپسول تھے۔ کبھی نیند مسئلہ بنتی تو وہ یہ کیپسول لیتا۔ زیادہ کیپسول بیک وقت کھائے جاتے تو مہلک ثابت ہوتا۔

اور اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک جام کے ساتھ یہ تمام کیپسول حلق سے اتارلے۔

دو گھنٹے سے اس کی عجیب کیفیت تھی۔ اس کا دماغ تنگ کرنے والے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ خود کو ایک بند بوتل میں قید پتنگے کے طرح محسوس کررہا تھا جو بوتل سے نکلنے کی کوشش میں ہلکان ہورہا ہو لیکن بوتل کا ڈھکنا صرف محمود شامی کھول سکتا تھا۔ وہی اسے آزاد کرسکتا تھا۔

محمود شامی نے وعدے کے مطابق اس کے لیے بہت کچھ کیا تھا.... سب کچھ! اثرورسوخ' دولت اور راستے میں آنے والوں کے لیے بدبختی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی اس پوزیشن میں آجائے گا۔ اس دوران اس کے دو حریف ٹھکانے لگائے جاچکے تھے اور اب وہ پبلک لیگ میں ٹاپ کا آدمی تھا۔

محمود شامی وعدے کا پکا ثابت ہوا تھا!

اسے محمود شامی کی دھمکیوں پر بھی کبھی شبہ نہیں رہا تھا۔ محمود شامی جو کچھ کہتا تھا' کرکے دکھاتا تھا۔ اس کے پاس جو معلومات تھیں' وہ وزارتِ عظمٰی کے نمبر ایک امیدوار کو پھانسی کے تختے پر پہنچاسکتی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ محمود شامی ضرورت پڑنے پر ان معلومات کو بڑی سفاکی سے بے دریغ استعمال کرے گا۔

ابتدا میں تو مسئلے کا حل بہت آسان تھا.... محمود شامی سے تعاون! سیاست میں کوئی شخص پوری طرح آزاد نہیں ہوتا۔ کسی سے تعاون کرنا پڑتا ہے' کسی کا دباؤ قبول کرنا پڑتا ہے لیکن گزشتہ سات ماہ میں اسے احساس ہوا تھا کہ محمود شامی نے تو اس کی روح تک خرید لی ہے۔ اب وہ انسان نہیں رہ گیا.... محض ایک کٹھ پتلی ہے' جسے مداری کے اشاروں پر ناچنا ہے۔

اس نے جس طرف مڑنے کی' جدھر بڑھنے کی کوشش کی' اس کے سامنے ایک ناقابلِ تسخیر دیوار کھڑی ہوگئی۔ صرف ایک راستہ صاف نظر آتا تھا اور وہ راستہ وہ تھا جو محمود شامی نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔

مگر اب اسے ایک اور احساس ستانے لگا تھا۔ اصولاً تو اسے یہ احساس پہلے ہی ہوجانا چاہیے تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ محمود شامی اب نارمل انسان نہیں' وہ پاگل ہوگیا ہے' ہوش مند نہیں رہا' دیوانہ......جنونی ہوگیا ہے۔

وہ سامنے رکھے ہوئے کیپسولوں کو تکتا رہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کیپسول اٹھایا اور اسے اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔

مگر پھر اس نے کیپسول دوبارہ ٹرے پر رکھ دیا۔

وہ اپنی انگلی سے پیشانی کو تھپتھپاتا رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ شاید وہ دعا مانگ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور تمام کیپسول ایک

ایک کر کے شیشی میں رکھ دیے۔ شیشی پر کیپ لگانے کے بعد اس نے اپنے لیے ایک جام بنایا۔ جام سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے وہ کھڑکی سے باہر ہوا میں تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مجھ میں یہ کیپسول کھانے کی جرأت نہیں تو کیا میں مشکلات میں گھری قوم کے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے کام کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔

وہ بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ تنہا بھی تھا اور خوف زدہ بھی' ہر لمحہ اس کی خوف زدگی میں اضافہ کر رہا تھا۔



تنویر نے دارالحکومت کے میجسٹک ہوٹل میں کمرا لے رکھا تھا۔ وہ پرانے طرز کی بوسیدہ سی عمارت تھی جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کسی بھی وقت گر سکتی ہے۔ اندر بھی وہی حال تھا۔ پرانے طرز کی لابی تھی۔ کمرا بھی بس گزارے کے لائق تھا۔

کبھی کبھی تنویر پچھتاتا کہ اسے کسی بہتر ہوٹل میں کمرا لینا چاہیے تھا لیکن ایک طرف تو وہ مہنگے اور آرام دہ ہوٹلوں کو اپنی عادت نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے اور آدمی اپنی عادتوں کی وجہ سے بہ آسانی پکڑا جاتا ہے۔ دوسرے میجسٹک ہوٹل اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے مناسب ترین تھا۔

وہ جانتا تھا کہ عنقریب یہی کمرا اس کے لیے بہت اچھی پناہ گاہ بن جائے گا۔ کون سوچ سکتا ہے کہ وہ ایسے کسی کمرے میں رہ رہا ہوگا لیکن فی الوقت تو اسے اس کمرے سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ بس وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

وہ کمرے سے نکلا۔ دروازہ لاک کرنے کے بعد اس نے ماچس کی کاغذی دیا سلائی دروازے کی نچلی درز میں پھنسا دی۔ یوں کوئی اس کی غیر موجودگی میں کمرے میں داخل ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا۔ اس سے فرق کچھ نہیں پڑتا تھا' اگر کوئی اسے تلاش کر لیتا تو ظاہر ہے کہ وہ کوئی پروفیشنل ہی ہوتا اور وہ کمرے میں یونہی داخل نہیں ہوتا۔ پہلے دیا سلائی قسم کی کوئی چیز چیک کرتا لیکن یہ احتیاط اس کی فطرتِ ثانیہ تھی۔

ہوٹل کے باہر کارنر پر ایک اسٹال تھا۔ وہاں سے اس نے صبح کا اخبار خریدا۔ اخبار بغل میں دبا کر وہ ناصر اسٹریٹ کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے ایک بدحال آدمی ملا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر رکا اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا چاہتا تھا لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے تو خود مدد کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ کچھ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تنویر کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آیا۔

کچھ فاصلے پر ایک صاف ستھرا ریسٹورنٹ تھا۔ تنویر وہاں چلا گیا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے کافی کا آرڈر دیا۔ کافی بہت اچھی تھی۔ چند گھونٹ لینے کے بعد تنویر نے اخبار کھولا اور میز پر پھیلا لیا۔

اخبار والے اب پچھلی حکومت کے چار اہم اراکین کے قتل کے سلسلے میں واضح طور پر اس کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ بس اتنا تھا کہ انہوں نے کھل کر اس کا نام نہیں لیا تھا۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ سابق صدر محمود شاہی نے اضافی تحفظ کا مطالبہ کیا تھا۔ سیکرٹ سروس والے پہلے ہی اسے تحفظ فراہم کر رہے تھے۔

ایک لحاظ سے تنویر کو خوشی ہوئی کہ سب کچھ کھل کر سامنے آگیا ہے۔ اب نرگس اور فوزیہ' محمود شاہی کی دستبرد سے محفوظ رہیں گی۔ اب اس کی بیوی اور بچی کو کچھ ہوا تو اخبار والے بھی براہِ راست محمود شاہی کو ذمے دار ٹھہرائیں گے۔ تفتیش ہوگی اور اس میں لزارس بھی سامنے آسکتا ہے۔ محمود شاہی ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہے گا۔

فی الوقت محمود شاہی کی طرح تنویر بھی یہی چاہتا تھا کہ کوئی خاص بات نہ ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محمود شاہی پولیس کی تحویل میں چلا جائے یا اخباری نمائندوں میں گھرا رہے۔ اس طرح اس کا کام اور مشکل ہو جاتا۔

تنویر نے کافی کا گھونٹ لیا۔ پہلے صفحے پر زیادہ کوریج وزارتِ عظمیٰ کے پبلک لیگ کی طرف سے امیدوار کو دی گئی تھی۔

"بے نا مذاق؟"

تنویر نے چونک کر دیکھا۔ ہوٹل کا مالک اس سے مخاطب تھا۔ وہ اخبار کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ تنویر کاؤنٹر کے بالکل قریب والی میز پر بیٹھا تھا۔

"بھئی کوئی بھی وزیرِ اعظم بنے۔ ہم لوگ تو اپنے اپنے کام کرتے رہیں گے" ریسٹورنٹ کے مالک نے مزید کہا "ہمارے مسائل تو حل ہونے سے رہے۔ یہی سیاست ہے۔ ووٹ سمیٹو' اپنا اُلّو سیدھا کرو اور ووٹرز کو بھی اُلّو سمجھ کر سیدھا کر دو' ڈنڈے کے زور سے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ" تنویر نے مختصراً کہا۔

"یہ سیاست داں سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ نہ ہوں تو اسمبلی میں پہنچ ہی نہیں سکتے۔"

"جی ہاں" تنویر نے اخبار فولڈ کر لیا۔

"اب محمود شاہی کو ہی لو" ریسٹورنٹ کا مالک سیاست جھاڑنے پر تلا ہوا تھا "وہ ان لوگوں سے بدتر نہیں تھا۔ بس ان جیسا ہی تھا۔ ہاں بے وقوف زیادہ تھا' اسی لیے پکڑا گیا مگر اب کیا ہوگا؟ بے ایمانوں کا ایک اور ٹولہ آجائے گا۔ انتخاب میں ہم چاہیں تو بدمعاشوں کا نیا ٹولہ لے آئیں ورنہ پرانا ٹولہ تو ہے ہی۔ کھیل تو ایک ہی ہے۔ ہم ووٹوں کے زور سے کھلاڑی بدل دیتے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

ایک گاہک بل دینے آیا تو ریسٹورنٹ کا مالک اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تنویر اخبار پڑھنے کی اداکاری کرنے لگا۔ درحقیقت وہ

یہ سوچ رہا تھا کہ قصرِ جمہوریت کے حفاظتی انتظامات میں کس قسم کا اضافہ ہوا ہوگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ قبل از وقت پریشان ہو رہا ہے۔ محمود شامی مستقبل کا ہدف ہے، حال کا نہیں۔ حال کا مسئلہ بھی کچھ کم اُلجھا ہوا نہیں تھا۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں، میں ووٹ دوں گا؟" ریسٹورنٹ کا مالک پھر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"جی نہیں۔"

"میں ووٹ نہیں دوں گا۔ میں جان چکا ہوں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

تنویر کو الفاظ جانے پہچانے لگے۔ پھر اسے یاد آیا کہ شاہدہ نے یہی بات کہی تھی مگر غصے سے نہیں۔ سادگی سے ..... جیسے کوئی بڑی سچائی بیان کی ہو۔

"یہ وہ گرہ ہے، جسے کوئی نہیں کھول سکتا" ریسٹورنٹ کے مالک نے کہا۔

تنویر نے کافی کے پیسے ادا کیے اور ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔ چلتے ہوئے وہ باربار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد اسے نیاز سے ملاقات کرنی تھی لیکن ابھی وہ ہوٹل واپس جانے کے موڈ میں بھی نہیں تھا۔

وہ یونہی پیدل چلتا رہا۔ بازاروں میں خریداروں کا ہجوم تھا۔ فٹ پاتھ پر چلنا بھی آسان نہیں تھا۔ آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو...

وہ چلتا رہا۔ کبھی کسی شوکیس کے سامنے رک کر وہ سجی ہوئی چیزوں کو دیکھتا۔ اسے اپنی بیٹی نرگس بہت یاد آرہی تھی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے نہیں گیا تھا۔ اور اب جا بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ چلتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ میجسٹک ہوٹل کے سامنے کھڑا ہے۔

دنیا گول ہے!

○☆○

واجد ریگل شو شائن پارلر میں وقت گزارتے گزارتے عاجز آچکا تھا۔ وہاں کی سیلن سے اس کی طبیعت بگڑنے لگی تھی۔ طرح طرح کی بدبوئیں الگ ستاتیں۔ ان میں بوٹ پالش کی بو بھی ہوتی۔ ایک بار گتے کے بکسوں کی طرف سے عجیب سی آواز نے اسے چونکا دیا۔ پھر اس نے سوچا، کوئی چوہا ہوگا۔

اس وقت سائے لمبے ہو رہے تھے اور شام کا جھٹ پٹا اُتر رہا تھا۔ سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا، بیلمونٹ ٹاورز میں داخل ہوئی۔ وہ بیوہ تھی اور دوسری منزل کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ سامنے سے چند کاریں گزریں اور بیلمونٹ ٹاورز کی لابی کا منظر لمحاتی طور پر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا اور پھر سامنے آگیا۔ قادر بدستور لابی میں موجود تھا۔ بیلمونٹ ٹاورز کے گیراج سے سرخ فورڈ برآمد ہوئی۔

واجد کو وہاں ڈیرا جمائے وہ تیسرا دن تھا اور اب وہ بے زار ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ان کا اندازہ غلط ہے تو اس وقت تنویر کیا کر رہا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ یہاں وقت برباد کرتے رہیں اور تنویر کہیں اور ہاتھ صاف کر جائے۔

فرش پر رکھے ہوئے واکی ٹاکی سے سگنل موصول ہوا۔ واجد نے ہاتھ بڑھا کر واکی ٹاکی اٹھالیا۔

دوسری طرف سے متین کی واضح آواز سنائی دی "ہم جارہے ہیں.... کار میں۔"

"ٹھیک ہے" واجد نے جواب دیا۔

وہ اٹھا اور اس نے واکی ٹاکی اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ اس نے اپنے کپڑے جھاڑے اور اپنے عقب میں دروازہ مقفل کرتے ہوئے پارلر سے نکل آیا۔ وہ سرسری انداز میں اپنی کار کی طرف بڑھا اور بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کردیا۔

کوئی تیس سیکنڈ کے اندر مقصود کی کار انڈر گراؤنڈ گیراج سے نکلی اور ٹریفک میں شامل ہوگئی۔ اس کے پیچھے سیاہ مورس تھی، جسے قادر ڈرائیو کر رہا تھا۔ پھر قادر نے ایک گاڑی کو اپنی اور مقصود کی کار کے درمیان آنے کا موقع دیا۔

دونوں کاروں کے کچھ آگے نکل جانے کے بعد واجد نے اپنی کرولا بھی آگے بڑھادی۔ اس نے اپنی گاڑی خاصی پیچھے رکھی تاکہ دونوں گاڑیوں پر نظر رکھ سکے۔ یہ کام اس لیے آسان تھا کہ اسے معلوم تھا کہ مقصود کہاں جارہا ہے۔ نیشنل ایونیو پر صنوبر ریسٹورنٹ تھا، مقصود وہاں رات کا کھانا کھاتا۔ یہ مسلسل تیسری رات تھی کہ وہ رات کا کھانا اسی ریسٹورنٹ میں کھانے والا تھا۔ واجد کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ سیکیورٹی کے نکتۂ نظر سے معمولات مخدوش ثابت ہوسکتے ہیں۔ تاہم اس نے یہ بات مقصود سے نہیں کہی تھی۔

سورج اب غروب ہو رہا تھا۔ واجد نے ہاتھ بڑھایا اور ہیڈ لائٹس کا سوئچ آن کردیا۔

اب وہ مصروف علاقے میں تھے۔ ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ اور فٹ پاتھ پر بھی بہت رش تھا۔ کچھ فاصلے پر سگنل کی وجہ سے ٹریفک رُکا۔ واجد کو قادر کی کار کا بمپر نظر آرہا تھا۔

کافی آگے.... بہروز اسٹریٹ پر واجد کو اس سیاہ پلائی ماؤتھ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے گزشتہ روز ریسٹورنٹ سے واپس آتے ہوئے اس کار کو مقصود کی کار کے پیچھے دیکھا تھا۔ واجد کو یقین تھا کہ یہ وہی کار ہے۔ ڈرائیور بھی وہی تھا۔

اس نے پلائی ماؤتھ کا نمبر ذہن نشین کرلیا۔

باقی تمام راستے واجد پلائی ماؤتھ کے پیچھے رہا۔ ٹریفک کے گڈ مڈ ہوجانے سے کئی بار پلائی ماؤتھ اور واجد کی کرولا قادر کی مورس سے آگے نکل گئیں۔

ریسٹورنٹ پہنچتے پہنچتے واجد کو یقین ہوگیا کہ سیاہ پلائی ماؤتھ کا

ڈرائیور مقصود کا پیچھا کر رہا ہے لیکن اسے اس کی اور قادر کی موجودگی کا علم نہیں۔

جس دوران مقصود ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہا تھا' پلائی ماؤتھ ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی رہی۔ واجد نے اپنی گاڑی خاصی پیچھے پارک کی تھی۔ پلائی ماؤتھ کا ڈرائیور گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔

پون گھنٹے بعد مقصود ریسٹورنٹ سے نکلا۔ قادر اس سے صرف ایک قدم پیچھے تھا۔ واجد نے اندازہ لگایا کہ وہ پلائی ماؤتھ کو مارک کر چکا ہے اور اب اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔

گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہوئے قادر نے اپنی مورس مقصود کی کار سے تقریباً ملائے رکھی۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد اس نے اسے آگے نکلنے دیا۔ چند لمحے بعد پلائی ماؤتھ بھی ان کے پیچھے چل دی۔

واجد نے اپنے واکی ٹاکی کا بٹن دبایا اور قادر سے کہا کہ واپسی کا روٹ بدلے پھر اس نے اپنی گاڑی پلائی ماؤتھ کے پیچھے لگا دی۔



آدھے گھنٹے بعد واجد' متین اور قادر بیلمونٹ ٹاورز کی لابی میں کھڑے تھے۔ مقصود اپنے اپارٹمنٹ میں محفوظ تھا۔

"اس نے جاتے اور آتے ہوئے مقصود کا تعاقب کیا" واجد نے بتایا "وہ کارنر والے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر گیراج کی نگرانی کرتا ہے۔"

متین کی آنکھوں سے تشویش جھلکنے لگی "اور کار؟"

"نمبر پلیٹ کی بنیاد پر میں نے تفتیش کی۔ کار کرائے پر لی گئی ہے۔"

قادر نے سگریٹ کے ٹوٹے سے ایک اور سگریٹ سلگائی اور ٹوٹا فرش پر جوتے سے رگڑتے ہوئے واجد کو غور سے دیکھا۔ "یہ تنویر کا آدمی تھا؟"

"ممکن ہے' لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ لگتا ہے' وہ بھی میری طرح صرف نگرانی کر رہا ہے۔ میں نے پہلے اسے نہیں دیکھا" واجد نے جواب دیا۔

تینوں کچھ دیر خاموش کھڑے سوچتے رہے۔ اس سلسلے میں کئی امکانات ان کے سامنے تھے کہ پلائی ماؤتھ والا کس کی نمائندگی کر رہا ہوگا لیکن ہر امکان پیچیدگیوں میں اضافہ کرنے والا تھا۔

"یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ مقصود کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتانا ہے" بالآخر واجد نے کہا۔

متین مسکرایا "بالکل نہیں۔ وہ تو پتا کھڑکنے سے بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ ہارٹ فیل ہو جائے گا اس کا یہ سن کر۔"

"معمولات جاری رہیں گے۔ بس اس نئے ستارے پر نظر رکھنا۔"

متین لفٹ کی طرف چل دیا اور واجد لابی سے باہر نکل آیا۔

○☆○

اگلی صبح مقصود ذرا دیر کے لیے کسی کام سے اپنے بینک گیا۔ پلائی ماؤتھ نے اس کا تعاقب کیا۔ واپس آنے کے بعد وہ اپنے قلعے یعنی کارنر والے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ جیسے اپنا فرض پورا کر چکا ہو۔

دن کا باقی حصہ مقصود نے اپنے اپارٹمنٹ میں گزارا۔ واجد رنگی شو شائن پارلر میں بیٹھا اپنے تھرماس سے انڈیل انڈیل کر کافی پیتا رہا۔ بے زاری کا علاج اسے کافی ہی لگ رہی تھی۔

شام کے قریب واجد نے باہر جھانکا۔ بوڑھی عورت بیلمونٹ ٹاورز میں داخل ہو رہی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگائے ایک شخص کھڑا راہ گیروں کو کوئی پمفلٹ تھما رہا تھا۔ واجد اسے پہلے بھی اسی جگہ دیکھ چکا تھا لہٰذا اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔

بلڈنگ کے سامنے ایک ٹیکسی رکی۔ اس میں سے ایک موٹی عورت گھنگریالے بالوں والی ایک لڑکی کے ساتھ اتری۔ عورت نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا۔ ٹیکسی چلی گئی۔ عورت اور لڑکی لابی میں چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی واجد کو گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہا پھر بات سمجھ میں آگئی۔

اس دوران پمفلٹ بانٹنے والا غائب ہو چکا تھا۔

واجد کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کی طرف لپکا لیکن پمفلٹ بانٹنے والا کہیں نظر نہیں آیا۔ عورت اور لڑکی کو ٹیکسی سے اتر کر لابی میں داخل ہونے میں بمشکل بیس سیکنڈ لگے ہوں گے اور اتنی دیر میں وہ غائب ہو گیا۔ اتنے کم وقت میں تو یہ ممکن نہیں تھا.... بشرطیکہ....

بشرطیکہ وہ بیلمونٹ ٹاورز کے دوسرے دروازے پر نہ چلا گیا ہو.... گیراج کے دروازے پر!

واجد اتنی تیزی سے اٹھا کہ کرسی الٹ گئی۔ وہ تیر کی طرح پارلر سے نکلا' بھاگ کر سڑک پار کی۔ پارکنگ کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی رفتار کم کر دی۔

انڈر گراؤنڈ گیراج بہت بڑا تھا۔ اس کے اوپر پوری بلڈنگ تھی۔ سیمنٹ کے بہت بھاری ستون اسے سہارا دیے ہوئے تھے۔ چھت سے زنجیروں کی مدد سے بلب لٹکائے گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر فیوز ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ روشنی بہت کم تھی۔ گیراج میں کوئی بیس کے قریب کاریں موجود تھیں۔

دروازے میں کھڑے ہو کر واجد نے اندر کی نیم تاریکی کو دیکھا۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ اندر داخل ہوا اور اس طرف بڑھا جہاں مقصود کی کار کھڑی ہوتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا' ممکن ہے پمفلٹ بانٹنے والا فوری حاجت سے مجبور ہو کر گیراج کی طرف لپکا ہو لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ پمفلٹ بانٹنا محض اس کے بہروپ کا ایک حصہ ہو۔ وہ یہاں یہ سوچ کر آیا ہو کہ مقصود اپنی کار کی طرف آئے تو اسے ٹھکانے لگا دے۔ گزشتہ تین دن سے مقصود اسی وقت باہر جا رہا تھا۔

گیراج میں خنکی تھی۔ فرش پر جا بجا پٹرول اور موبل آئل کے

دھبے تھے۔ گریس کی بُو بہت تیز تھی۔ اور کہیں سے فرش پر پانی بوند بوند گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ واجد دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا مگر پھر دیوار کے ساتھ منسلک آگ بجھانے والے آلات کی وجہ سے اسے دیوار سے ہٹنا پڑا۔

وہ مقصود کی کار سے پچاس فٹ دور تھا کہ اس نے کار کی چھت کے اوپر ایک سر ابھرتے دیکھا۔ کوئی کار کے پیچھے چھپ کر گیراج کی پوزیشن کا جائزہ لے رہا تھا۔ واجد اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ وہ جہاں کھڑا تھا' وہاں سائے بہت تھے۔ وہ خود بھی ان سایوں میں شامل معلوم ہو رہا ہوگا۔

اس نے بہت آہستگی سے سانس لی۔ اسے یقین تھا کہ اس شخص نے اسے نہیں دیکھا ہے۔

وہ شخص اب متحرک نظر آیا۔ واجد نے اپنی نگاہ پر زور دیا۔ وہ شخص اپنا کوٹ اتار رہا تھا۔

واجد اسے دیکھتا رہا' اس نے کوٹ اتارا اور کھلی کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر اسے کار کی سیٹ پر رکھ دیا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے مخالف سمت چل دیا۔ اس کا رخ گیراج کے بغلی دروازے کی طرف تھا۔ ایک لمحے کو اس کے وجود نے بغلی دروازے کے خلا کو بھر دیا۔ پھر وہ سڑک پر نکل گیا۔

واجد نے ایک لمحے توقف کیا پھر اس کے پیچھے چل دیا۔ اب اسے اپنے قدموں کی تیز آواز اور اس کی گونج کی پروا نہیں تھی۔

باہر آکر اس نے واکی ٹاکی پر متین یا قادر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن یا تو وہ ان کی رینج سے باہر تھے۔ یا کسی چیز نے ٹرانسمیشن کو جام کر دیا تھا۔

وہ شخص جلدی میں ہرگز نہیں تھا.... اور اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد بیلمونٹ ٹاورز کے انڈر گراؤنڈ گیراج میں دھماکا ہوا۔ مقصود کی کار دھماکے سے پھٹ گئی۔

دھماکے نے بلڈنگ کو ہلا ڈالا۔ داخلی دروازے پر نصب شیر کا مجسمہ دو ٹکڑے ہوگیا۔ نیچے گیراج ایک لمحے کو جگمگایا.... جیسے بجلی چمکی ہو۔ پھر گیراج کے دروازے سے گاڑھے سیاہ دھوئیں کے بڑے مرغولے باہر نکلتے دکھائی دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں میں شامل ہوتے گئے۔

ایک عورت دہشت سے چلائی...

بیلمونٹ ٹاورز کی لابی میں قادر کے اپنے پیروں تلے زمین پھٹتی محسوس ہوئی' اس نے بڑی کوشش سے خود کو گرنے سے روکا۔ سگریٹ کو نیچے پھینک کر جوتے سے مسلتے ہوئے وہ انڈر گراؤنڈ گیراج کی طرف لپکا۔ وہ زینوں پر بہت تیزی سے اترا۔ اس کا ایک ہاتھ ریلنگ پر تھا اور دوسرے میں پستول تھا۔

گیراج کا دروازہ کھلتے ہی اسے مقصود کی کار نظر آئی۔ کار کیا.... کار کی باقیات۔ وہ جل رہی تھی۔ بلکہ اب بہت تھوڑی بچی تھی جلنے سے۔ اس کا بونٹ مڑ چکا تھا اور ایک طرف جھول رہا تھا۔ ڈکی دھماکے سے کھل گئی تھی۔ دھماکے نے چھت کے ایک حصے کو بھی اڑا دیا تھا۔ گیراج سیاہ زہریلے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔

قادر جھک کر کار کی طرف بڑھنے لگا۔ گیراج میں دھماکے کے بعد سناٹا کچھ اور گہرا ہوگیا تھا۔

قادر کو وہاں چند ہیولے نظر آئے۔ کچھ ساکت کھڑے تھے اور کچھ کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قادر نے پستول جیب میں رکھا اور رومال نکال کر ناک سے لگالیا۔ اب وہ جلتی ہوئی کار کے خاصا قریب پہنچ گیا تھا۔ کار کی فرنٹ سیٹ پر اسے سیاہ گٹھری سی نظر آئی۔ گٹھری کے گرد آگ نے ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ تپش اتنی زیادہ تھی کہ قادر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔



دھماکے کی آواز سن کر اور گیراج کے دروازے سے دھواں نکلتے دیکھ کر حارث اٹھا اور تیزی سے ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔ گیراج میں داخل ہونے اور جلتی ہوئی کار کو دیکھنے سے پہلے ہی وہ جان چکا تھا کہ دھماکا کہاں ہوا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مقصود کھانا کھانے کے لیے نکلتا تھا۔

آگ جتنی شدید تھی' اتنی ہی مختصر ثابت ہوئی۔ حارث کار کے جلے ہوئے ڈھانچے کے قریب پہنچا تو شعلے دم توڑ چکے تھے۔ وہاں کئی افراد موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر بلڈنگ کے مکین تھے۔ وہ دائرے کی شکل میں کار کے پاس کھڑے تھے اور دھوئیں کے پار جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر جھلسی ہوئی نمبر پلیٹ موجود نہ ہوتی تو حارث یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مقصود کی کار ہے۔ کار قابلِ شناخت نہیں رہی تھی۔

کچھ تماشائی کار کے اور نزدیک ہوگئے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں تجسس بھی تھا۔ ایک شخص کار کی مڑی تڑی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔

کار کے عقبی حصے کے پاس کھڑا ایک شخص مستفسرانہ انداز میں بڑبڑایا "کوئی تھا تو نہیں کار میں؟"

جھانکنے والا گھبرا کر پیچھے ہٹ آیا۔

حارث کو یقین تھا کہ فضا میں جلے ہوئے گوشت کی بُو نہیں ہے' کار خالی رہی ہوگی۔

"خدا کا شکر ہے کار میں کوئی نہیں تھا" کھڑکی سے جھانکنے والے شخص نے اعلان کیا "شاید پیٹرول کی ٹنکی پھٹی ہے۔"

حارث کی نظر اس تاجوری شخص پر پڑی۔ وہ بری طرح دہلا ہوا تھا پھر وہ واپس جانے کے لیے پلٹا۔

"نہیں، ٹنکی نہیں ہو سکتی" کسی نے پورے وثوق سے کہا "پیٹرول کی ٹنکیاں خود بخود نہیں پھٹتیں۔"

"کار کس کی تھی؟"

"جس کی بھی ہو' اس کی خوش قسمتی میں شک نہیں۔"

○☆○

قادر، مقصود کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اس نے بے ہوش متین کو کاؤچ کے پاس پڑا دیکھا۔ اس کا بغلی اُبھار بتا رہا تھا کہ ریوالور بغلی ہولسٹر میں موجود ہے۔ اس کے سر کا گومڑا بھی بے حد نمایاں تھا۔

قادر کے منہ سے بے ساختہ تاجوری زبان میں گالیاں اُبل پڑیں۔

وہ متین کے پاس سے گزرتا ہوا بیڈ روم میں داخل ہوا۔

مقصود بستر کے سائڈ والے کونے میں پڑا تھا۔ اس کے دونوں گھٹنے اوپر تھے۔ لگتا تھا، وہ چھت کو گھور رہا ہے۔ اس کا ہاتھ ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ قادر قریب گیا تو اسے نظر آیا کہ مقصود کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اپنی شہ رگ کے سوراخ میں پھنسا ہوا ہے۔ خون بہنا اب موقوف ہو چکا تھا۔

قادر نے منہ پھیر لیا۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی پھر واکی ٹاکی پر واجد سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہیں ہوا۔

وہ کھڑکی کی طرف بڑھا۔ وہاں سے ریگل شوشائن پارلر نظر آتا تھا مگر اس وقت کچھ نظر آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک بہت خوش لباس اور خوبرو آدمی کو کارنر سے مڑتے دیکھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔

وہ نیاز تھا جس نے اپنا کام پوری مہارت، صفائی اور چابک دستی سے کیا تھا، وہ جائے واردات سے رخصت ہو رہا تھا۔

○☆○

تنویر اپنے میجسٹک ہوٹل والے کمرے میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں ٹانگیں کافی ٹیبل پر پھیلائی ہوئی تھیں۔ صوفے کے دوسرے کنارے پر دو میلے سے بھاری کشن رکھے تھے۔ ٹیبل لیمپ پر شیڈ کی موجودگی کی وجہ سے روشنی بہت ہی کم تھی۔ البتہ پرانے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کی روشنی زیادہ تھی۔

کوٹ کے ساتھ آتش گیر مادّہ مقصود کی کار میں رکھنے کے بعد وہ سیدھا یہاں آیا تھا۔ اس کی نیاز سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن رات کی خبروں سے اسے پتا چل گیا تھا کہ نیاز کامیاب ہوا اور مقصود مر چکا ہے۔

اس بار ہمیشہ کی طرح اسے طمانیت کا.... کچھ حاصل کرنے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

خبروں میں اب مشرق وسطیٰ کی امن کانفرنس کے بارے میں بتایا جا رہا تھا پھر صحرا میں پیش قدمی کرتے ہوئے ایک ٹینک کا شاٹ دکھایا گیا۔ تنویر آگے کو جھک کر بیٹھ گیا۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نیوز ریڈر کیا کہہ رہا ہے۔

وہ اس وقت ایک منقسم...... آدمی تھا۔ اس کے وجود کا ایک حصہ خود کو خبروں میں گم کر لینا چاہتا تھا تاکہ سنگین تر ہوتے ہوئے حقائق سے نظریں چرا سکے۔ وہ اپنی تنہائی سے... اپنے خوف سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی نرگس کو ایک نظر دیکھنا، اس سے باتیں کرنا اور اس کے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا چاہتا تھا۔ نرگس اسے شدت سے یاد آ رہی تھی لیکن دوسرا حصہ حقائق سے چمٹا ہوا تھا۔

جانے کیوں... لیکن یہ حقیقت تھی کہ مقصود کی موت کی خبر سن کر وہ بجھ گیا تھا اور... اور وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھا!

وقفہ ہوا۔ اسکرین پر دو بڈھے نمودار ہوئے۔ ایک قبض کی شکایت کر رہا تھا، دوسرے نے اس کا وہ مسئلہ حل کر دیا۔ مقبول ترین کی دو ٹکیاں...

تنویر نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹائیں....

تب اسے واجد نظر آیا!

واجد بہت خاموشی سے آیا تھا اور اب دروازے سے چند قدم اندر کھڑا تھا۔ اس کا جسم متوازن اور پُرسکون حالت میں تھا۔ وہ سُرمئی رین کوٹ پہنے ہوئے تھا جس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شاید وہ مسکرا رہا ہو لیکن روشنی کا زاویہ ایسا تھا کہ تنویر یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

"بہت اچھے کھلاڑی ہو تم" واجد نے کہا "اصولوں اور ضابطوں کے تحت چلتے ہو۔"

واجد بالکل ساکت تھا اور اس سکوت کی وجہ سے غیر حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔ اس بات نے تنویر کے خوف کو اور بڑھا دیا۔ تنویر، واجد کو جانتا تھا لیکن یہ موٹا اور بھاری بھرکم آدمی.... اس کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ واجد ہی ہے۔ وہ کچھ مختلف لگ رہا تھا۔ شاید عمر میں اضافے کی وجہ سے....

تنویر نے بھرپور کوشش سے اپنی حیرت پر... اپنے آپ پر قابو پایا۔ اس نے اعصابی کشیدگی کو قوت ارادی کے زور پر جھٹکا۔ وہ سمجھ گیا کہ ہیلمونٹ ٹاورز سے ہی وہ اسے اپنے پیچھے لگا کر لایا ہے۔

"یہی زندگی ہے" اس نے واجد کی بات کا جواب دیا "اصول اور ضابطے۔"

اس بار واجد یقینی طور پر مسکرایا تھا۔

"لیکن ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا" تنویر نے کہا "اصول اور ضابطے ہمیشہ کام آتے تو تم اس وقت یہاں موجود نہ ہوتے۔"

واجد نے اس کی بات سُنی ان سُنی کر دی "تم گزرے وقت کی دیوانگی کے اسیر ہو" اس نے کہا "تم پاگل ہو گئے ہو۔ فرض کر لو کہ تم جو کچھ کرنے کی کوشش کر رہے ہو، اس میں کامیاب ہو جاتے ہو.... ٹاپ کے آدمی کو بھی ختم کر دیتے ہو تو اس سے کیا ہوگا؟ تمہیں کیا حاصل ہوگا تنویر؟"

"مجھے ...؟ میری بیوی اور بچّی۔ ہم کہیں چلے جائیں گے، ڈھنگ سے زندگی گزاریں گے۔"

واجد مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسا لیکن اس کی نظریں

تنویر بڑبڑی ہوئی تھیں "ہاں... ممکن ہے۔ تم اپنا مشن پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ پچھلے دو ماہ میں تم بہت کچھ کر چکے ہو۔"

"شامی نے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں؟"

واجد اور آگے بڑھ آیا۔ ٹیبل لیمپ کے پاس تک۔ وہ تنویر اور کمرے کے دروازے کے درمیان حائل تھا "تمہیں بتاؤں.... یہ مقصود والا معاملہ ماسٹر پیس تھا۔ میں تمہاری عیاری کا قائل ہوگیا۔ تم نے دھیان ہٹانے کے لیے بم کو بڑی خوب صورت ٹائمنگ کے ساتھ استعمال کیا۔ عین اس وقت جب مقصود کھانا کھانے کے لیے نکلتا ہے۔"

تنویر خاموش رہا۔ ستائش کے جواب میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔

واجد ایک قدم اور بڑھ آیا "لیکن ایک بات تو بتاؤ۔ اگر مقصود کھانے کے لیے چند منٹ پہلے نکلنے کا فیصلہ کرلیتا تو..."

"دھماکے کے وقت مقصود کار میں ہوتا، تب بھی ٹھیک تھا" تنویر نے جواب دیا۔ وہ دونوں ہی پروفیسروں کی طرح گفتگو کر رہے تھے.... ایسے دو پروفیسر جن کے سامنے کوئی علمی مسئلہ الجھ گیا ہو۔ "نہیں تو فلیٹ میں مارا گیا۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ وہ بس اس صورت میں بچ سکتا تھا کہ دھماکے کے وقت اپنے فلیٹ اور گیراج کے درمیان کہیں ہوتا۔ یہ رسک تو حساب کتاب کے مطابق لینا ہی تھا۔"

"ظاہر ہے۔"

اسی وقت ٹی وی پر جنوبی افریقہ کی خانہ جنگی کی فلم دکھائی جانے لگی۔ شور بڑھ گیا لیکن واجد کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھکی۔

تنویر نے اندازہ لگایا کہ اس کی بچت کا واحد امکان غیر متوقع طور پر حرکت میں آنے میں ہے۔ سامنے واجد جیسا پروفیشنل تھا۔ لہٰذا اس امکان کی کامیابی کا امکان بھی بہت موہوم تھا۔ کاش.... واجد چند قدم اور آگے آجائے! اس صورت میں توجہ ہٹانے والی کسی حرکت کے نتیجے میں جو ایک ثانیے کی مہلت ملے گی، اس میں وہ واجد تک پہنچ سکتا ہے۔ واجد موٹا ہوگیا ہے لیکن اس کی برق رفتاری اب بھی وہی ہوگی۔ بہرحال ہتھیار نکالنے میں تو وقت لگتا ہے۔ واجد ابھی خالی ہاتھ تھا۔ تنویر نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی جملے کے ...یا لفظ کے درمیان حرکت میں آئے گا۔

یہ سوچ کر اس نے پہلو بدلا اور اپنے پیروں کی پوزیشن بہتر بنالی۔ اب وہ بوقتِ ضرورت تیزی سے حرکت کر سکتا تھا۔

واجد نے اندازہ لگالیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ "اس کی ضرورت نہیں" وہ بولا۔ اس نے رین کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ۴۵ کولٹ آٹومیٹک نکال لیا۔ وہ پھر مسکرایا۔ "سنو... میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ تمہیں قتل نہیں کروں گا۔"

خبروں میں وزارتِ عظمیٰ کا ایک امیدوار مختلف قومی مسائل کے متعلق بتا رہا تھا کہ وہ ان سے کیسے نمٹے گا۔

واجد نے نظریں ہٹائے بغیر ایک قدم سائڈ میں ہٹ کر ٹی وی آف کردیا۔ کمرے میں خاموشی چھاگئی۔

تنویر نے صوفے سے ٹیک لگالی۔ ریوالور کی نال کا رخ اس کی طرف نہیں تھا۔

"جانتے ہو، مجھے جو ہدایات دی گئی تھیں، میں نے ان پر عمل نہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟" واجد نے پوچھا۔

تنویر نے سر کو جنبش دی اور اپنا ہاتھ صوفے کی اوپری دیوار پر پھیلالیا۔ اس کی انگلیاں ایک کشن کی سلائی کو چھو رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ واجد جیسے لوگوں کا اندرونی نظام کس بنیاد پر کام کرتا ہے۔

"اس لیے کہ محمود شامی کام تو اب بھی کر رہا ہے مگر ہمارے اصولوں اور ضابطوں کے مطابق نہیں" تنویر نے کہا "حالانکہ کر سکتا ہے۔ وہ اصول اور ضابطے اس نے خود بنائے تھے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس نے کبھی اصولوں اور ضابطوں کے مطابق کام نہیں کیا۔"

"یہ درست ہے" واجد بولا "اور آدمی ایک بار اصولوں اور ضابطوں میں الجھ جائے تو پھر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ قانونِ ضرورت بن جاتے ہیں۔"

"یہی بات ہے" تنویر نے کہا "اس وقت تم اس پوزیشن میں ہو جس میں سات برس پہلے میں تھا۔ شامی نے مجھے دھوکا دیا۔ ویسے ہی وہ تمہیں بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ پروفیشنل نہیں، ایک خطرناک قسم کا امیچور ہے۔ وہ صرف اپنی ضرورت کے قانون کے تحت کام کرتا ہے" تنویر نے کشن تھام لیا "بہرحال، ایک بات...."

"میں جانتا ہوں" واجد نے کہا "شاکر... میں جانتا ہوں کہ تم جس شخص کے سب سے زیادہ مخالف ہو، وہ شاکر ہے لیکن اسے بھول جاؤ۔ اپنے آپ کو حاصل کرنے کے لیے بہت بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ تمہیں اسے چھوڑنا ہوگا۔"

"یعنی سب کچھ چھوڑ کر عفریت کا سر قلم کیا جائے؟ تجویز بری نہیں" باتوں کے دوران اس کے ہاتھ چلتے رہے تھے۔ داہنے ہاتھ سے اس نے کشن تھاما اور بائیں ہاتھ سے دو کشن کے درمیان رکھا ریوالور۔ پھر وہ داہنے ہاتھ والے کشن کو پوزیشن میں لے آیا تاکہ گولی کی آواز دب جائے۔ کشن کے پیچھے اس کے بائیں ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ واجد کے سینے کی طرف تھا۔

واجد نے نظر جھکائی تو یہ بدلی ہوئی پوزیشن نظر آئی۔ وہ کچھ حیران ہوا لیکن زیادہ نہیں۔ تنویر جیسے پروفیشنل کے سامنے حیرت کا کیا کام۔ ریوالور اسے نظر نہیں آیا لیکن وہ اس بلف کو چیلنج بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"اب ہم دونوں برابر کی پوزیشن میں ہیں" تنویر نے کہا "مجھے لزارس کے بارے میں بتاؤ۔"

کمرے میں خاموشی اور گہری ہوگئی۔ واجد کی سانسیں پُر شور

معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے کندھے جھٹک دیے "میں نے لارنس کے بارے میں سنا ہے لیکن جانتا بہت کم ہوں۔ میرا خیال ہے' بیٹھ جاؤں۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔"

○☆○

دو روز بعد رات نو بجے شدید بارش میں واجد کی سفید کرولا قصر جمہوریت کے جنوبی گیٹ پر پہنچی۔ آہنی جنگلے کے قریب پام کے بڑے درخت بارش اور ہوا کی وجہ سے نیچے جھکے آرہے تھے۔ طوفانی ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گاڑی پر بارش گرنے کی آواز شور میں اضافہ کر رہی تھی۔ گاڑی گارڈز کے کیبن کے سامنے رو کی گئی۔ کیبن کی دھندلائی ہوئی کھڑکیاں اندر روشنی کی وجہ سے زرد نظر آرہی تھیں۔ شیشوں سے سائے چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔

اسٹیئرنگ وھیل کے پیچھے تنویر بیٹھا تھا!

اس نے مونچھیں صاف کرلی تھیں۔ آنکھوں پر گہرے شیشوں کا چشمہ تھا۔ اس نے گہرے رین کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر گہرے ہیٹ تھا۔ واجد نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ اس گیٹ سے جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیکیورٹی میں اضافہ کردیا گیا تھا۔ واجد کو یقین تھا کہ جنوبی گیٹ والے گارڈز نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔

گارڈ کو کار کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ تنویر نے ہارن بجایا اور کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے کرلیا۔ اسی وقت ہوا کا تیز جھکڑ چلا۔ درخت دیر تک بڑبڑاتے رہے۔

گارڈ مسلح تھا۔ پہلو والے ہولسٹر میں سرکاری ریوالور موجود تھا۔ وہ پانی سے بھرے گڑھے سے بچ کر کار کی طرف آیا "کیسی رات ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

تنویر ہنس دیا "مچھلیوں کے لیے بے حد مناسب ہے" اس نے کہا اور واجد کے شناختی کاغذات گارڈ کی طرف بڑھا دیے۔

گارڈ بارش کی پروا کیے بغیر کاغذات کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ تنویر اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ گارڈ جوان آدمی تھا۔ اس کے انداز میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو تربیت سے زیادہ جبلت کے زیرِ اثر عمل کرتے ہیں.... اور درست سمت میں بڑھتے ہیں۔

گارڈ نے کاغذات واپس کیے اور کار کے عقبی حصے کی طرف گیا' جیسے نمبر پلیٹ چیک کر رہا ہو۔ عقبی کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے خود کار انداز میں عقبی سیٹ کی طرف دیکھا۔

تنویر اسے عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ گارڈ چند لمحے سر ایک طرف جھکائے کھڑا رہا جیسے کسی الجھن میں مبتلا ہو۔ پھر وہ عقب نما کی رینج سے نکل آیا۔ واپس آکر وہ کیبن میں گیا۔ اس نے کیبن کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اندر ایک اسٹول تھا اور ایک میز' جس پر کلوز سرکٹ ٹی وی رکھا تھا۔

سامنے گیٹ کھل گیا۔ تنویر نے گارڈ کو دیکھ کر ہاتھ لہرایا اور گاڑی کھلے گیٹ سے گزارلے گیا۔

بارش کی بوندیں اندر آئیں تو اسے احساس ہوا کہ اس نے کھڑکی کا شیشہ نہیں چڑھایا ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے شیشہ چڑھادیا۔ ونڈ شیلڈ کے وائپر مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

کار کے ساتھ ساتھ تنویر کی دھڑکنوں کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی۔ خوف کا تانبے جیسا ذائقہ وہ اپنی زبان پر محسوس کرسکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ خوب انجوائے کر رہا ہے۔

اس نے کار بائیں جانب موڑی۔ درخت کے نیچے اسے ایک سایہ سا نظر آیا جو سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔

تنویر نے سوچا' سیکیورٹی کے انتظامات کے سلسلے میں واجد نے مبالغہ آرائی ہرگز نہیں کی تھی۔

اب تنویر کو وہ بلڈنگ نظر آئی جو اس نے یا تو ٹی وی پر دیکھی تھی یا اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہاں آنے کا وہ اس کا پہلا موقع تھا۔ اس کی روشن کھڑکیاں چوکنا آنکھوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

آسمانی بجلی نے چند لمحوں کے لیے پورے منظر کو روشن کردیا۔ پھر اندھیرا ہوگیا۔

تنویر نے واجد کی ہدایت کے مطابق بلڈنگ کی سائڈ میں گاڑی پارک کی۔ انجن آف کرنے اور وائپرز کو بند کرنے کے بعد وہ چند لمحے کار ہی میں بیٹھا رہا۔ ایک سرد لہری اس کے اندر اتر گئی۔ وہ جہاں پہنچنا چاہتا تھا' پہنچ گیا تھا۔ مگر اب تک غلطی کی جو گنجائش اس کے لیے موجود تھی' ختم ہوگئی تھی۔ اب اس کے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

وہ کار سے اترا۔ بارش پوری قوت سے اس سے ٹکرائی۔ اس نے دائنے ہاتھ سے کوٹ تھاما جیسے اسے گرنے سے بچا رہا ہو۔ لیکن درحقیقت اس سے اپنا چہرہ چھپانا مقصود تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا' جہاں سیکرٹ سروس کا ایک ایجنٹ موجود تھا۔ ایجنٹ نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ سر جھکائے اندر داخل ہوگیا۔

اندر گہری خاموشی تھی!

تنویر' واجد کی ہدایات کے مطابق بڑھ رہا تھا۔ دو لیفٹ ٹرن' پھر ایک رائٹ ٹرن۔ اس نے چشمہ اتارا اور پھر ہیٹ اتار لیا۔ بالآخر وہ اس بھاری دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے مخصوص انداز میں دستک دی۔ دوبار آہستہ سے اور ایک بار زور سے۔ باہر بادل پھر گرجے....

محمود شامی نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا....

اگر اس کے ہونٹوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ تھی تو وہ فوراً ہی غائب ہوگئی تھی۔ اس کے عضلات تن گئے' چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی' رنگت پیلی پڑ گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے

ہٹا۔ لگتا تھا، وہ خود کو دہشت زدہ ہو کر اندھا دھند بھاگ کھڑے ہونے سے روک رہا ہے۔

تنویر نے کمرے میں داخل ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر کھڑکی پر پڑی۔ پھر میز، جس پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ وہیں سنہرے رنگ کا ایک خوب صورت قلم رکھا تھا۔

محمود شامی میز کے پیچھے چلا گیا تھا۔ وہ بے جان سے انداز میں اپنی کرسی پر ڈھے گیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ بالآخر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا ”مسٹر زماں، اس حیران کن آمد کا سبب کیا ہے؟“

تنویر نے رین کوٹ اتار کر کرسی کے ہتھے سے لٹکا دیا۔ اس سے پانی گر کر قالین میں جذب ہونے لگا۔

”میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تم جو کوئی بھی ہو، قانون سے بالاتر نہیں۔ تمہیں اپنے کیے کا حساب دینا ہے۔ جواب دہ تم اس وقت بھی تھے، جب اقتدار میں تھے... اور اب جبکہ تم اقتدار سے باہر ہو تو جواب دہی کا اصول تم پر اور سختی سے لاگو ہوتا ہے۔ میں اور واجد دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ تم پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

محمود شامی کے ہونٹوں پر نروس مسکراہٹ تھرکی ”کیا کیا ہے میں نے؟ میں سمجھا نہیں...“

”آپ نا سمجھ نہیں جناب صدر۔ نا سمجھ کوئی اور ہے۔“

اس آواز نے تنویر کو چونکا دیا۔ وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ وہ ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے سر گھمایا۔ دیواری الماری میں چھپا ہوا واجد باہر آ گیا تھا۔ اس کے کولٹ آٹومیٹک کا رخ تنویر کی طرف تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”اتنے حیران نظر نہ آؤ۔ یہ تاثر تم پر جچتا نہیں“ واجد نے تنویر سے کہا ”میں تو کل سے یہیں ہوں“ اس نے سر کی جنبش سے محمود شامی کی طرف اشارہ کیا ”اب لزارس سے مل لو۔ تمہارے تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔“

بجلی کا زبردست کڑاکا ہوا۔ طوفان اور زور پکڑ رہا تھا۔

اس بار جو خوف تنویر کو اپنے وجود میں... نامعلوم گہرائی میں مچلتا محسوس ہوا، وہ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ فیصلہ کن، مہلک خوف!

”ہمیں پریشانی اس بات کی تھی کہ تم آپریشن لزارس میں مداخلت کر رہے تھے“ محمود شامی نے کہا۔

”میں یہ جاننا چاہتا ہوں....“ تنویر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”... کہ لزارس کا امیدوار کون ہے؟“

بجلی پھر چمکی۔ محمود شامی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور مسکرایا۔ تنویر بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے درمیانی وقفے کو گنتی کے پیمانے پر پرکھ رہا تھا۔

”اگر معلومات طاقت ہوتی ہیں مسٹر زماں تو خفیہ نوعیت کی معلومات اس سے دس گنا طاقت ور ہوتی ہیں“ محمود شامی نے کہا ”تم کیونکہ یہ معلومات اپنے ساتھ باہر نہیں لے جاسکتے، اس لیے بتا رہا ہوں، ہمارا امیدوار شاہد انور ہے۔“

”لیکن اس کا تعلق تو مخالف پارٹی سے ہے۔“

”اس بات کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ اس سے تو ہمارے اقتدار کی اثر پذیری بڑھ جائے گی۔“

”اور وہ تقریباً منتخب ہو چکا ہے۔“

”ہاں.... یہ بات اہم ہے“ محمود شامی نے خوش ہو کر کہا ”اور یوں دیکھو تو اصل میں، میں تقریباً منتخب ہو چکا ہوں۔ وہ وزیراعظم بنے گا لیکن درحقیقت حکومت میں کروں گا۔ اصل قوت، اصل اقتدار میرے پاس ہوگا اور کسی کو یہ بات معلوم بھی نہیں ہوگی لہٰذا جواب دہی کا اصول مجھ پر لاگو نہیں ہوگا۔ میرے کچھ منصوبے ہیں۔ میرے دشمن مجھے نہیں روک سکتے۔ خواب دیکھنے والے کی طبیعت میں استقلال ہو تو خواب رائیگاں نہیں ہوتے، تعبیر میں بدل جاتے ہیں۔ بس خواب دیکھنے والے کو میری طرح حوصلہ مند ہونا چاہیے اور اپنی سوچ پر پوری قوت سے عمل کرنا چاہیے۔“

محمود شامی کی نظریں تنویر پر سے ہٹ گئیں۔ جیسے اس نے اسے مُردہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا ہو۔

”یاد رکھنا“ محمود شامی نے واجد سے کہا ”کسی نہ کسی طرح یہ تمام حفاظتی رکاوٹیں پھلانگ کے یہاں تک آ پہنچا تھا۔ سیکرٹ سروس والے تو یہی جانتے ہیں کہ سفید کرولا میں تم آئے تھے۔“

بادل پھر گرجے، بجلی پھر چمکی۔ تنویر درمیانی وقفے میں گنتی گنتا رہا۔

واجد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

اسی لمحے زبردست کڑاکا ہوا۔ پوری عمارت جیسے ہل کر رہ گئی۔

تنویر نے یہ سوچ کر کہ اس کے بعد بجلی چمکے گی اور غیر متوقع ہونے کی وجہ سے وہ دونوں حرکت نہیں کر سکیں گے اور اسے ایک بہت قیمتی ثانیے کی مہلت مل جائے گی، وہ بجلی کی سی تیزی سے کھڑکی کی طرف بھاگا۔ آگے پہنچ کر اس نے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف پھیلاتے ہوئے کھڑکی کی طرف جست لگائی۔ شیشہ ٹوٹنے کا جھٹکا بہت زبردست تھا۔

وہ ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں کی برسات میں نیچے گرا۔ بارش نے اس کا چہرہ دھلا دیا تھا لیکن اسے اس وقت احساس ہو گیا کہ اس کی ترکیب کارگر نہیں ہوئی۔ واجد جیسے تجربے کار پروفیشنل کو کسی ایسی چال سے شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔

وہ تین قدم بھاگ سکا تھا کہ اس کی پیٹھ میں دو ڈنک سے لگے۔ اس نے خود کو سسکتے اور اپنی گہری سانس کو ٹوٹتے سنا۔

لیکن وہ تاریکی میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

گولیوں کی مزید آوازیں سنائی دیں۔ پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپیں ابھریں۔

تنویر اور گہری تاریکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستہ ڈھلوانی تھا۔ پاؤں پھسل رہے تھے۔ اس کے قدموں میں تو ویسے بھی لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ جھکے جھکے بھاگ رہا تھا۔ اور درد کسی بھیانک عفریت کی طرح اسے اپنے دانتوں سے بھنبھوڑ رہا تھا۔ اس کی پرشور سانسیں اذیت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ واجد اب بھی اس کے پیچھے تھا۔ سیکرٹ سروس والے بھی تھے۔ تنویر کا رخ عقبی حصے کی طرف تھا' جہاں جنگلا کافی نیچے تھا۔

گولیاں اب بھی چلائی جارہی تھیں۔ تنویر کو یقین تھا کہ گولیاں واجد چلا رہا ہے۔ وہ اسے نکلنے کا موقع کیسے دے سکتا تھا جبکہ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ اس کی چلائی ہوئی گولیوں نے تنویر کو کس حد تک نقصان پہنچایا ہے؟

تنویر کو اپنے حلق میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ وہ دہشت زدہ ہوگیا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے خون تھوکا اور بھاگتا رہا۔ اس کے حلق میں پھر خون جمع ہو رہا تھا.... جیسے کوئی چشمہ پھوٹ نکلا ہو خون کا۔ اسے بچ نکلنے کی امید نہیں تھی۔ بس وہ یہ چاہتا تھا کہ اسے سیکرٹ سروس والے زندہ گرفتار کریں تاکہ وہ لزارس کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے' بتا سکے۔ اس نے مزید خون تھوکا۔ پھر چیخ کر متعاقبین کو بتانے کی کوشش کی کہ وہ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر رہا ہے لیکن اب اذیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ چیخنا ممکن نہیں تھا۔ وہ حلق سے آواز بھی نہیں نکال سکا۔

بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری اس پر غالب آرہی تھی' وہ اندھیرے میں لڑکھڑایا' گھٹنوں کے بل گرا' سنبھل کر اٹھا اور پھر ڈگمگایا۔ اب اسے ہر طرف خلا نظر آرہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور خلا میں گر گیا۔ اس کے گھٹنے میں بھی درد ہو رہا تھا۔ اذیت نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔

وہ نہیں دیکھ سکا کہ وہ ساحل کی طرف جانے والی چوبی سیڑھیوں سے الجھ کر گرا ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ساکت پڑا رہا۔

اسے احساس تھا کہ کچھ سائے بھاگتے ہوئے اس کی طرف آرہے ہیں۔ بارش اس کے چہرے پر' اس کی کھلی آنکھوں میں گر رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اسے آنکھیں بند کرنے کی خواہش بھی نہیں ہوئی۔

پھر اسے احساس ہوا کہ وہ سائے سیکرٹ سروس والے ہیں۔ واجد ان کے درمیان ہوگا بھی تو اب اسے بلا جواز شوٹ کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔

وہ لوگ اس کے گرد جمع ہوئے.... اس پر جھک گئے۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ ان کے ریوالوروں کا رخ اس کی طرف تھا۔

"بے چارہ!" ان میں سے ایک بڑبڑایا۔

"اے.... تم اندر کیسے آئے؟" دوسرے نے پوچھا "تم وہاں تک پہنچے کیسے؟ یہاں تو صدر صاحب کی اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مارتا۔"

تنویر نے سر اٹھایا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی۔ ان لفظوں کو ادا کرنے کے سخت جدوجہد کی' جنہیں وہ کسی غیر جانب دار سماعت تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔ اسے بے بسی کے ساتھ ایک عجیب سے احساس نے رلا دیا۔ آدمی برا کرنا ہے تو اس کے پاس کتنی طاقت ہوتی ہے اور جب وہ اچھا کرنا چاہے تو زبان بھی نہیں ہلا سکتا! کیسا ستم ہے کہ آدمی سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش رہے۔ اور جب بولنے کی شدید خواہش ہو تو گویائی ہی چھن جائے' ہائے....

اس کے سینے میں.... بہت اندر کوئی چیز دھماکے سے ٹوٹی اور منہ تازہ تازہ خون سے بھر گیا۔ اس نے فوزیہ کو پکارنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا۔

اب اس دہن سے الفاظ نہیں' صرف جیتا جاگتا خون نکل سکتا تھا!

"لو بھئی.... یہ تو گیا" کسی نے مایوسی سے کہا۔

وہ خاموش کھڑے اس کے قدموں کے ہذیانی نشان دیکھتے رہے' جن میں کوئی ترتیب نہیں تھی۔

○☆○

بیس منٹ کے اندر سب کچھ نمٹ گیا!

فوٹو گرافروں نے تصویریں لیں' ڈاکٹر نے آکر معائنہ کیا اور تنویر الزماں کی موت کا اعلان کر دیا۔ لاش ایمبولینس میں ڈال کر پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی گئی۔ پریس والے آئے لیکن انہیں باہر ہی روک دیا گیا۔ کچھ کسی امید پر گیٹ کے باہر کھڑے رہے' کچھ ایمبولینس کے پیچھے چلے گئے۔

محمود شامی اپنے کمرے میں میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ سیکیورٹی والوں کا چیف نصیر میز کے بائیں جانب بیٹھا تھا۔ وہ بہت پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ میز کی داہنی جانب واجد بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ پلاسٹک کی شیٹ لگا دی گئی تھی تاکہ بارش اندر نہ آنے پائے۔

نصیر معمول کے مطابق کارروائی کرتے ہوئے ان دونوں سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ سیکرٹ سروس کے بڑے افسر کچھ دیر بعد وہاں پہنچنے والے تھے۔

"اسے آفس میں میری موجودگی کا علم نہیں تھا" واجد کہہ رہا تھا "وہ یہاں گھسا اور شاید ریوالور نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے پستول نکال لیا۔ وہ گھبرا کر کھڑکی کی طرف لپکا۔ میں نے گولی چلا دی۔"

"وہ مسلح تھا" نصیر نے تصدیق کی۔ وہ اپنی ڈائری میں یہ سب نوٹ کر رہا تھا۔ محمود شامی نے اجازت دے دی تھی کہ پوری کارروائی ٹیپ کر لی جائے۔

"اس کی یہاں آمد کا مقصد واضح ہے۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں" محمود شامی نے کہا "میرا خیال ہے' جیل کی صعوبت ناک زندگی نے اس کا دماغ اُلٹ دیا تھا۔ میرے دوسرے سابق ساتھیوں کی موت کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ وہ ابتدا ہی سے .... کیا کہنا چاہیے.... ابنارمل تھا۔ میرا خیال ہے' یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ برسوں پہلے بھی میں نے یہی بات کہی تھی۔"

نصیر کی پینسل حرکت کرتی رہی۔ کیسٹ سب کچھ ریکارڈ کرتا رہا۔

بارش کا زور ٹوٹا.... پھر بارش رک ہی گئی۔ اتنا کچھ ہو چکا تھا تو اب کمرے میں سناٹا بہت گہرا لگ رہا تھا۔

"سنو...." محمود شامی نے آہستہ سے کہا۔ اس کے چہرے پر کشیدگی تھی۔ وہ سر ایک طرف جھکائے بہت غور سے کچھ سُن رہا تھا "مجھے ٹک ٹک کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ تم بھی سنو' مجھے یقین ہے...."

نصیر نے پینسل رکھ دی اور سماعت پر زور دیا۔ پھر اس نے پُرسکون ہو کر کرسی سے ٹیک لگالی "وہاں سے آواز آرہی ہے" اس نے پینسل سے اشارہ کیا "یہ آواز مسٹر واجد کے کوٹ میں سے آرہی ہے۔"

مسٹر واجد کا کوٹ!

واجد اور محمود شامی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر محمود شامی کے حلق سے خوف زدہ سی چیخ نکلی۔ وہ تینوں اٹھ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ کمرا ایک دھماکے کے ساتھ جگمگا اٹھا۔

دھماکے سے عمارت کا پورا غربی حصہ زمیں بوس ہو گیا تھا۔

آسمان پر درجنوں مرغابیاں چکرا رہی تھیں۔ وہ چیخ رہی تھیں۔ برہم بھی تھیں اور انہیں الجھن بھی تھی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

○☆○

وہ یقینی طور پر ایک فاتح کا کیمپ تھا!

شاہد انور اپنی میز پر بیٹھا تھا۔ سراب پور کی انتخابی جنگ کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اس کے آفس میں بڑی گہما گہمی تھی۔ فون کی گھنٹی وقفے وقفے سے بجتی اور کوئی کارکن کال ریسیو کرلیتا۔

لیکن اس وقت شاہد انور کو کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ ابھی تک محمود شامی کی موت کی خبر ہضم نہیں کرپایا تھا۔ اس کے باوجود وہ خود کو بے حد پُرامید' ہشاش بشاش اور ہلکا پُھلکا محسوس کررہا تھا۔

کیا واقعی ایسا ہو گیا ہے؟

یقین دہانی کے لیے اس نے مورننگ ٹائمز کے ضمیمے پر نظر ڈالی۔ شہ سرخی چیخ رہی تھی.... قصرِ جمہوریت میں دھماکا' سابق صدر محمود شامی جاں بحق...

وہ طاقت جو اسے اتنی بلندی تک لے آئی تھی' ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ آزاد تھا۔ قسمت نے اس پر بڑا کرم کیا تھا۔ اس نے سوچا' اب میں اس ملک کی اور ملک کے لوگوں کی تقدیر بدل دوں گا۔ قسمت نے مجھے کچھ کرنے کا کھلا موقع دیا ہے.... میں اسے ضائع نہیں کروں گا۔ میں خلوص سے کام کروں گا۔

میں لوگوں کے دل جیتوں گا.... ان پر راج کروں گا!

اس نے سامنے رکھا کاغذ قریب کھینچا اور وہ تقریر پڑھنے کی کوشش کی جو اسے اگلے روز پبلک لیگ کے اجلاس میں کرنا تھی لیکن اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی توجہ تقریر پر مرکوز نہیں کرپا رہا ہے۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دیوانہ وار قہقہے لگائے۔

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ پھر دروازہ کھول کر جھانکا "آپ کے لیے ایک کال ہے... ذاتی" کارکن نے بتایا "نام تو نہیں بتایا لیکن وہ صاحب کہتے ہیں' محمود شامی کی موت سے متعلق بہت ضروری بات کرنی ہے' بات کریں گے آپ؟"

شاہد نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"ٹھیک ہے' فور ون سکس پر ریسیو کریں" دروازہ بند ہو گیا۔

شاہد انور نے ریسیور اٹھایا "شاہد انور اسپیکنگ۔"

"میں شاکر بول رہا ہوں۔"

شاہد انور کے اندر کچھ ہونے لگا۔ "جی فرمایئے شاکر صاحب' میں کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟" اس نے لہجے کو سرسری رکھنے کی کوشش کی۔

"میں تم سے ذاتی طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ ایک بات کرنی ہے جو تمہارے سیاسی کیریئر کے لیے بہت اہم ہے۔ اس پر صرف تمہارے ہی نہیں' اس ملک کے مستقبل کا بھی انحصار ہے۔"

"میں.... میں.... میں..."

"یہ آپریشن لزارس ہے شاہد۔ محمود شامی کی موت سے کچھ بھی نہیں بدلا۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ شاہد انور کچھ دیر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے میز کی دراز کھول کر بہت سارے نیلے کیپسول نکال لیے۔ وہ خود کو ایک بار پھر زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کررہا تھا۔

کیپسول سامنے رکھے وہ بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کررہا تھا.... کیا مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں یہ تمام کیپسول حلق سے اتارلوں؟ اور نہیں ہے تو کیا جرأت اور حوصلے سے محروم مجھ جیسے آدمی کو اقتدار زیب دیتا ہے؟ کیا میں اس قابل ہوں کہ ملک و قوم کی قیادت کا بارِ گراں اٹھا سکوں....؟

وہ سوچتا رہا.... سوچتا رہا....!





علیم الحق حقی

دروازہ

ایک بد دُعا کے پُراسرار اثرات کا فسانہ۔
رقم کے لین دین سے شروع ہونے والے ایک تنازعے کا حیران کن انجام‘
جس میں کچھ لوگ متاعِ حیات گنوا بیٹھے۔
ایک بے ضرر دروازے کی کہانی‘ جس نے کئی لوگوں پر زندگی کا دروازہ بند کردیا۔

آدمی کے تخیل اور احساسِ جرم کے فساد انگیز ملاپ کا ماجرا

میں جانتا ہوں کہ اس داستان پر آپ کو یقین دلانا کہ یہ سچی ہے‘ اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اور یہ حقیقت کہ یونانی بڈھا ابھی زندہ ہے اور بد قسمت نوجوانوں کے بہت سے رشتے دار بھی ابھی زندہ ہیں‘ میری مشکلات میں اضافہ کررہی ہے۔ اس لیے کہ اس رکاوٹ کی وجہ سے نہ میں اس قصبے کا اصلی نام آپ کو بتا سکتا ہوں‘ جہاں یہ عجیب واقعات پیش آئے اور نہ ہی میں کرداروں کے اصلی نام لکھنے کی ہمت کرسکتا ہوں۔ میں بس اس قصبے کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں۔ وہ انگلستان کا ایک بڑا مضافاتی قصبہ ہے‘ جہاں ایک بے حد قدیم چرچ ہے۔ قصبے سے چند میل پیچھے ایک بڑا دریا سمندر میں گرتا ہے۔ سڑکوں کے اطراف جارجین طرز کے مکانات ہیں‘ جن کی بہت اچھی طرح نگہداشت کی گئی ہے۔ ان مکانات میں اب بھی دولت مند تاجر رہتے ہیں‘ جن کا تعلق پرانے شرفا کے گھرانوں سے ہے‘ یہی لوگ قصبے کا طبقۂ عالیہ ہیں۔

یہ خوب صورت مکان سڑکوں کے بالکل سامنے ہیں۔ ان کے دروازے ٹھیک سڑک کی جانب کھلتے ہیں۔ کسی مکان کے سامنے والے حصے میں باغیچہ نہیں۔ البتہ عقبی حصوں میں بڑے بڑے باغیچے ہیں‘ جو اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے ہیں۔ دیواروں کے ساتھ اندر کی جانب لوگوں نے

خوبانی، آڑو اور دیگر پھل دار درخت لگائے ہیں۔ مختصراً یہ سمجھ لیجیے کہ یہ انگلینڈ کا ایک پرانا اور متمول علاقہ ہے۔

یہ قصبہ اس لیے متمول ہے کہ کسی زمانے میں یہاں سے پورے یورپ کے لیے تجارتی ٹریفک چلتا تھا۔ کسی حد تک اب بھی چلتا ہے۔ جارجین طرز کے مکانوں میں رہنے والوں کے آبا و اجداد نے غیر ممالک سے تجارت کے ذریعے اتنی دولت کمائی کہ پشتوں تک کے لیے بے نیازی حاصل کرلی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کے مکینوں میں غیر ملکی بھی ایک اہم عنصر بن گئے۔ اِس داستان میں مس روز کو اور مجھے چھوڑ کر تمام اہم کردار غیر ملکی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ انگریز نہیں ہیں۔

سب سے پہلے میں یونانی کا تعارف کراؤں گا۔ اصل نام نہ پوچھیں۔ میں اسے جولیس کہوں گا۔ وہ اسی قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے دادا نے یہاں فرنیچر کی تجارت کے ذریعے قدم جمائے تھے۔ اس کے بیٹے نے فرنیچر کو ترک کرکے نہایت اعلیٰ درجے کے نوادرات کی دکان قائم کرلی۔ ان میں چاندی کی اشیا، تصویریں اور بیش قیمت جواہرات ہوتے تھے لیکن جولیس نے سب کچھ چھوڑ کر خود کو صرف جواہرات تک محدود کرلیا۔ اس کے گاہک اگرچہ زیادہ نہیں تھے لیکن اسے اس کی کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ اس لیے کہ اسے ورثے میں بے حساب دولت ملی تھی۔ میرے خیال میں وہ دکان بھی صرف اس لیے چلا رہا تھا کہ اسے جواہرات سے عشق تھا۔ وہ تعلیم یافتہ بھی تھا اور دنیا بھر کی سیاحت کرچکا تھا۔ خاص طور پر مشرقی ممالک کی۔ وہ کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس کی لائبریری بے حد شاندار تھی۔ اس میں پُراسرار علوم کے متعلق بڑی بڑی نادر کتابیں موجود تھیں۔

وہ غیر شادی شدہ تھا۔۔۔ یا شاید نہیں تھا۔ ایک بے حد خوب صورت لڑکی اینا اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کی بھتیجی ہے۔ لوگ اینا کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ درحقیقت اس کی بیٹی ہے لیکن غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے سب کے سامنے بیٹی نہیں کہہ سکتا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ درحقیقت اس کی محبوبہ ہے۔

جولیس کا بظاہر کوئی رشتے دار زندہ نہیں تھا۔ اینا چند سال پہلے اچانک ہی نمودار ہوئی تھی۔ اس وقت اُس کی عمر ۱۸ سال تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ ایسی خوب صورتی افسانوں ہی میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے چچا کے مقابلے میں کہیں زیادہ غیر ملکی۔۔۔ بلکہ غیر انگریز لگتی تھی۔

ان تینوں بدقسمت نوجوانوں میں دو تو ایسے تھے کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ وہ بے پروا، بے کار لیکن دولت مند تھے۔ ان کے پاس تیز رفتار موٹر کاریں تھیں۔ ان کے نام فوربس اور نیوسم سمجھ لیں۔ تیسرا چاڈوک تھا۔ اُس کے پاس جہاز تھے۔ تینوں بے فکرے کھُل کر پینے اور کھُل کھیلنے کے قائل تھے۔ قصبے والے ان سے خائف بھی رہتے تھے۔ مگر بعض معاملات میں ان پر فخر بھی کرتے تھے۔ فوربس کی ماں اطالوی تھی۔ اس کے والدین کا انتقال بہت پہلے ہوچکا تھا۔ نیوسم خون کے اعتبار سے آدھا سوئیڈش تھا۔

میں چاڈوک کے ہاں ملازم تھا۔ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اس کے خون میں آئرش خون کی آمیزش تھی، لگتا تھا، تینوں میں سب سے زیادہ وحشت اسی کے اندر ہے۔ سب سے زیادہ دولت مند بھی وہی تھا۔ قصبے کے ایک بڑے حصے کا وہ مالک تھا۔ لیکن اپنی زمین، جائداد کی دیکھ بھال میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسی لیے اُس نے مجھے ایک عمومی منتظم اور سیکریٹری کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا۔ ہمارے درمیان ابتدا ہی سے اچھے تعلقات قائم ہوگئے حالانکہ میں اُس کی وحشتوں اور تفریحات میں کبھی شریک نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے تمام معاملات مجھے سونپ دیے۔ اُس کے کاروبار کے علاوہ اُس کے گھر کا انتظام بھی میرے سپرد تھا۔ کھانوں کا آرڈر دینا، وائن کی خریداری، اس کی پارٹیوں کے تمام انتظامات بھی مجھے ہی کرنا ہوتے تھے۔ اس کے والدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ اپنے بہت بڑے گھر میں، جس کا بہت بڑا باغیچہ دریا تک پھیلا ہوا تھا، وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔

ہماری ملاقات آکسفورڈ میں ہوئی تھی۔ ہمارے ذوق مختلف تھے لیکن نہ جانے کیوں میں اُسے بھاگیا۔ اُسے واپس بلالیا گیا۔ جبکہ میں پڑھتا رہا۔ میں نے آکسفورڈ سے ڈگری لی لیکن مجھے ڈھنگ کی کوئی ملازمت نہیں ملی۔ کافی عرصے ہم ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ پھر اچانک ایک دن ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے ملازمت کی پیش کش کی۔ تنخواہ بہت معقول تھی۔ چنانچہ میں نے اُس کی پیش کش قبول کرلی۔

اِس داستان کا جو آغاز کا لمحہ ہے، اس وقت تک مجھے اس کی ملازمت میں دو سال ہوچکے تھے۔

آپ بھی جانتے ہوں گے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چار آدمی تاش کھیل رہے ہوں۔۔۔ ترپ چال۔ اور ان میں سے کسی کو کوئی فون ریسیو کرنے کے لیے یا کسی اور وجہ سے اٹھنا پڑجائے تو وہ اپنی جگہ کسی کو بھی بٹھادیتا ہے۔ بس اسے یہ

بتادیا جاتا ہے کہ ترپ کیا ہے۔ اسے ہاتھ کے متعلق بہت مبہم آئیڈیا ہوتا ہے۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ کس رنگ کی کتنی چالیں ہو چکی ہیں اور کس رنگ کی کیا پوزیشن ہے۔ بس وہ جیسے تیسے اندھا دُھند ہاتھ مکمل کردیتا ہے۔ اس داستان کے معاملے میں میری پوزیشن بھی بس ایسی ہی ہے' جیسے مجھے کسی کی جگہ ترپ چال کھیلنے کے لیے بٹھادیا گیا ہو۔ اصل واقعہ ہو چکا تھا اور مجھے تفصیل سے نہیں بتایا گیا تھا کہ کیا کچھ ہوا ہے۔ پوری بات مجھے کبھی بھی نہیں بتائی گئی۔ شاید اس لیے کہ چاڈوک اس معاملے میں شرمسار تھا اور اسی لیے کھل کر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے جو ڈائری دی' اُس میں بھی اس جرم کے متعلق کھل کر کچھ نہیں لکھا گیا۔ میں صرف اندازہ لگا سکتا ہوں اور میں بدترین اندازے قائم کرنے پر مجبور ہوں۔

☆ ☆ ☆

میں نے اِدھر اُدھر سے تصویری معمّے کے جو ٹکڑے ڈھونڈ ڈھانڈ کر جوڑے ہیں' ان سے کچھ یہ تصویر بنتی ہے۔ یہ میرا اندازہ ہے کہ سب کچھ یوں ہوا ہوگا۔

ستمبر کی ایک خوب صورت شام تینوں جوان کار میں بیٹھ کر تیس میل دور ایک سرائے میں کھانا کھانے گئے۔ انہوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور چھک کر پی۔ چاڈوک ہمیشہ اسی ایک حقیقت کو بار بار بیان کرتا رہا تھا کیونکہ بعد میں جو کچھ ہوا' اسی وجہ سے ہوا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا "ہم نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ ہم بہت نشے میں تھے۔"

اس روز بل ادا کرنے کی باری فوربس کی تھی۔ اس نے بل تو ادا کردیا لیکن ساتھ ہی پھٹ بھی پڑا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بالکل قلاش ہو چکا ہے۔ ہر اعتبار سے دیوالیا' اور وہ مسٹر جولیس سے بڑی بڑی رقمیں بطور قرض بھی لیتا رہا ہے۔ اس کے دونوں دوستوں کے لیے یہ بات نہایت حیرت انگیز تھی۔ وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ فوربس بھی انہی کی طرح دولت مند ہے اور انہیں یہ علم بھی نہیں تھا کہ یونانی مسٹر جولیس سود پر قرض بھی دیتا ہے۔ اب پتا چل رہا تھا کہ وہ صرف قیمتی جواہرات کا بیوپاری ہی نہیں تھا بلکہ برسوں سے سود پر قرض بھی دیتا رہا تھا لیکن شاید بڑی بڑی رقمیں اور وہ بھی 'معقول' قسم کے لوگوں کو اور فوربس بھی یقینی طور پر 'معقول' قسم سے تعلق رکھتا تھا۔ قصبے کی ایک سے زیادہ اور بڑی فرموں میں اس کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ اس کے ایک چچا کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور اس نے ترکے میں فوربس کے لیے ہزاروں پاؤنڈ چھوڑے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ دس ہزار... اور کچھ بیس ہزار بتاتے تھے۔ یہ الگ بات کہ ابھی چند ماہ تک وہ اس ترکے کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ مگر بالآخر وہ اسے ملنا تھا۔ یونانی مسٹر جولیس ایسے آدمی کو قرض دینے سے کیسے انکار کرسکتا تھا' جس کی طرف سے رقم کی واپسی روز روشن کی طرح یقینی ہو۔

لیکن اب فوربس نے اعتراف کیا کہ اس کے چچا اس کے لاابالی پن سے بے زار ہو چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے اپنے ترکے سے محروم کردیا تھا اور اپنی نقدی اور جائداد اہل رشتے داروں کے نام کردی تھی۔ فوربس کو یہ بات معلوم ہوئی تو اسے صدمہ ہوا۔ بے عزتی کی بات تھی اس لیے کہ اُس نے لوگوں کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔ پھر اس نے سوچا کہ ذرائع آمدنی تو اس کے پاس موجود ہیں۔ بس ذرا جی جان سے کوشش کرنی ہوگی۔

فوربس نے مزید قرض کے لیے یونانی سے رابطہ کیا۔ مسٹر جولیس اس متوقع ترکے کے حوالے سے اسے جتنا قرض دے سکتے تھے' درحقیقت اس سے زیادہ دے چکے تھے۔ اس روز جو فوربس نے قرض طلب کیا تو اسے یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ اسے آنجہانی چچا کے ترکے میں سے ایک پھوٹی کوڑی ملنے کی بھی امید نہیں ہے اور مسٹر جولیس نے بھی واضح کردیا

کہ اب وہ قرض کے نام پر اسے سو پاؤنڈ بھی نہیں دیں گے۔ فوربس نے انہیں دھمکی دی کہ وہ قصبے والوں کو بتادے گا کہ وہ سود پر قرض دیتے ہیں۔ دونوں کے درمیان سخت لفظوں کا تبادلہ ہوا لیکن فوربس مسٹر جولیس کو ان کے مؤقف سے نہ ہلا سکا۔

فوربس کا باقی دن پریشانی میں گزرا۔ اسے رہ رہ کر اپنی خراب پوزیشن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا بال بال قرض میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ طے تھا کہ اسے اپنے دوالیا پن کا اعلان کرنا پڑے گا۔ وہ بے عزت الگ ہوگا۔ اور یہ اس کی رنگین سے بھرپور، بے فکری کی زندگی کا اختتام بھی تھا۔

سو اس رات فوربس نے اپنی قرضوں کے اندراجات سے بھری نوٹ بک دوستوں کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ اسے ہمدردی کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے ذہن کا ہر بوجھ ہلکا کر ڈالا۔

ہمدردی اسے جی بھر کے ملی۔ دوستوں نے اس کی خوب طرف داری کی اور مسٹر جولیس کو خوب برا بھلا کہا۔ انہوں نے عہد کیا کہ یونانی نژاد مسٹر جولیس کو جو یہودی بھی تھے اور یہودی بھی بدترین، قصبے میں رسوا کردیں گے۔ قصبے کے ہر شخص کو بتادیں گے کہ وہ سُود خور ہے۔ وہ کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے گا اور قصبہ چھوڑنے پر مجبور ہوجائے گا۔ رائے عامہ ہی اس حد تک اُن کے خلاف ہوجائے گی کہ وہ قصبے میں رہ ہی نہیں سکے گا۔

وہ تینوں غصہ کرتے اور ایک دوسرے کے غصے کو بھڑکاتے رہے۔ ان کا نشہ بڑھتا گیا اور ساتھ ہی ان کے دعوے سنگین تر ہوتے گئے۔ وہ اپنی طاقت، اپنا اثر و رسوخ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے رہے۔ پھر وہ بیٹھ کر یونانی نژاد مسٹر جولیس کو قصبے سے بھگانے کی منصوبہ بندی کرنے بیٹھ گئے۔ شمپین کی ایک اور بوتل منگوالی گئی۔

چاڈ کو دوسروں کی نسبت اپنے دماغ پر زیادہ قابو تھا۔ اسے احساس تھا کہ مسٹر جولیس ایک معزز کاروباری ہیں۔ ایک مقبول کاروبار کے ساتھ سود کا محدود کاروبار کرلینا کوئی بہت بڑا اور سنگین جرم نہیں تھا۔ وہ تینوں ذاتی طور پر مسٹر جولیس کو جانتے تھے۔ وہ نمود و نمائش کے قائل نہیں تھے لیکن بہرحال انہی کی طرح متمول آدمی تھے۔ وہ ان کے بڑوں کے قابلِ احترام دوست رہے تھے۔ ان کے بزرگ مسٹر جولیس کی عزت کرتے رہے تھے۔ وہ تینوں ان کے خوب صورت مکان میں ہونے والی اکا دکا پارٹیوں میں شریک ہوتے رہے تھے۔ مسٹر جولیس کو دعوتیں دینے کا خبط نہیں تھا اور وں کی طرح لیکن ان کی پارٹیاں بے حد منفرد ہوتی تھیں۔ اُن میں کوئی سرپرائز دینے والی تفریح ضرور ہوتی تھی۔ کبھی لندن سے کسی مشہور و مقبول گلوکارہ کو بلوایا جاتا تو کبھی باغیچے کو ہنگری کے ریسٹورنٹ کے انداز میں سجایا اور ترتیب دیا جاتا۔ ایک موقعے پر ڈرائنگ روم میں ہونے والی پارٹی میں ایک مشہور شاعر نے اپنا کلام سنایا تھا۔ اسی موقعے پر وہ تینوں حسین اینا سے ملے تھے۔ اینا قصبے میں بھی کبھی کبھار ہی دیکھی جاتی تھی۔ وہ قصبے میں ہونے والی پارٹیوں میں بھی شرکت نہیں کرتی تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ علم دوست اور خود بھی ہر طرح کی معلومات رکھنے والی لڑکی ہے۔

ان دنوں وہ چینی زبان سیکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ دن میں کئی گھنٹے وہ پیانو بجانے کی مشق کرتی تھی۔ وہ برج اور ٹینس کھیلنے پر اپنے چچا کی لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کرنے یا اپنے میوزک روم میں وقت گزارنے کو ترجیح دیتی۔ درحقیقت اسے کسی کھیل سے دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ ویسی ہرگز نہیں تھی، جیسے کتابی کیڑے ہوتے ہیں۔ وہ بے حد خوش اطوار اور بہت اچھی میزبان تھی۔ اُس کے انکل کو اُس سے عشق تھا۔ اس کے ایک ایک انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ اُس سے والہانہ محبت کرتا ہے۔

چاڈ نے سوچا، اس معاملے کو یہیں ختم کردینا بہتر ہے۔ مسٹر جولیس بہت اچھے آدمی ہیں اور اینا کا تو جواب ہی نہیں۔ فوربس شاید غصے میں آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ اگر اس نے دوستانہ انداز میں مسٹر جولیس سے مدد کی درخواست کی ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی لیکن شاید اُس نے ان کے سامنے اس انداز میں ہاتھ پھیلایا ہوگا، جیسے وہ کوئی عام سُود خور ہوں۔

پھر چاڈ نے یہ رائے پیش کی کہ بات اسی انداز میں کی جانی چاہیے۔۔۔ اور آج ہی۔ بے چارے فوربس کا مسئلہ بھی حل ہوجائے اور تلخی بھی نہ ہو۔ اس لیے کہ دوست فوربس کو پریشان نہیں دیکھ سکتے۔ چاڈ نے کہا "میں نہیں چاہتا کہ فوربس آج رات سونے کے لیے لیٹے تو اس کے دل و دماغ پر کوئی بوجھ ہو۔ اس کا مسئلہ آج ہی حل ہونا چاہیے۔ ہم یہاں سے سیدھے جولیس کے گھر جائیں گے۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی ہے اور گھر جانا ان کی دکان جانے سے بہتر ہوگا۔ یہ معزز انداز ہوگا۔۔۔ کاروباری نہیں۔ جیسے دوست دوستوں سے ملتے ہیں۔"

دس منٹ کے۔۔۔۔ اندر ان کی کاریں قصبے کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ ایک گھنٹے بعد وہ جولیس کے دروازے پر کھڑے

اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا رہے تھے۔
دروازہ اینا نے کھولا۔ اس نے بتایا کہ تمام نوکروں کو سرکس دیکھنے کے لیے چھٹی دے دی گئی ہے۔ چچا کو صبح سے نزلے کی شکایت ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ "اگر آپ واقعی کسی ضروری کام سے آئے ہیں تو انکل آپ سے مل لیں گے، آیئے میرے ساتھ۔"

وہ انہیں اوپر لے گئی۔ جولیس اپنے بیڈ روم میں تھا۔ وہ مشرقی اسٹائل کا ایک ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ سر پر تنگ سی ٹوپی تھی اور اس وقت وہ درحقیقت غیر ملکی ہی لگ رہا تھا۔

میرا خیال ہے، رقم کے متعلق گفتگو میں زیادہ دیر نہیں لگی ہوگی کیونکہ جولیس اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا کہ اب وہ مزید قرض بالکل نہیں دے گا۔ اور پھر اس نے ان لوگوں کو لتاڑنا، آئینہ دکھانا شروع کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کتنی احمقانہ فضول خرچیاں کرتے ہیں۔ کس قدر خود غرض اور کتنے جاہل ہیں۔ معاشرے کے کیے بے کار۔ "میں کیا بتاؤں، اب مجھے کتنا افسوس ہوتا ہے کہ میں نے فوربس کو ابتدا میں ہی رقم کیوں دی۔ افسوس اس لیے نہیں ہوتا کہ میری رقم ڈوب جائے گی۔ دکھ اس بات کا ہے کہ میری دی ہوئی رقم اس نے اپنی وحشتوں کو مزید بڑھانے.... اور بھڑکانے میں خرچ کی۔" اس نے کہا۔

اینا نے اپنے انکل کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے، اسے اشارہ کیا کہ وہ اتنی تندی سے بات نہ کرے۔ لیکن جولیس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر وہ بطور خاص چاؤ کی طرف متوجہ ہوا "اور تم.... تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے والدین کتنے اچھے.... کتنے عزت دار تھے" اس نے غصے سے کہا۔ "تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارے اجداد کا کتنا بڑا نام ہے۔ مگر تم.... تم تو ان سب کے سردار بن گئے ہو۔ صرف اس لیے کہ تمہارے پاس نہ صرف یہ کہ دولت سب سے زیادہ ہے بلکہ تم اسے برباد کرنے کے طریقے دریافت کرنے میں ذہانت بھی زیادہ صرف کرتے ہو۔ ان لوگوں کے اخلاقی زوال اور انحطاط کے ذمے دار بھی تم ہو مسٹر چاؤ...."

چاؤ کو غصہ بہت جلدی اور بہت شدت سے آتا تھا۔ پھر جو کچھ بڈھے جولیس نے کہا تھا، اس میں سچائی اتنی زیادہ تھی کہ اس نے چاؤ کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔ اس نے بڈھے جولیس پر ہاتھ اٹھا دیا۔ چند ہی لمحوں میں جولیس فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ اینا اپنے انکل کو بچانے کے لیے لپکی تھی لیکن نیوسم نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا تھا۔ وہ مضبوط جسم کا آدمی تھا اس کے لیے اینا پر قابو پانا کچھ دشوار نہیں تھا۔

اب میں اس کمرے کا تصور کر سکتا ہوں، جہاں جذبات بری طرح بھڑکے ہوئے تھے۔ ایسے میں ہوس انگیزی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ یونانی نژاد مسٹر جولیس فرش پر بے بس پڑے تھے۔ یہ تین وحشت زدہ نوجوانوں کو آئینہ دکھانے کا شاخسانہ تھا۔ چاؤ غصے میں تھا لیکن اسے طمانیت تھی کہ اس نے توہین کا بدلہ ہاتھ کے ہاتھ لے لیا ہے۔ فوربس پریشان بھی تھا اور تلخ بھی ہو رہا تھا۔ نیوسم کے پاس غصہ کرنے کا جواز سب سے کم تھا۔ نہ وہ جولیس کا مقروض تھا اور نہ جولیس نے اس کی ذات پر براہِ راست کوئی حملہ کیا تھا۔ وہ تو بس چاؤ پر برس رہا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک بے حد حسین لڑکی کو بانہوں میں لیے کھڑا تھا۔

اب کہانی کا وہ حصہ سامنے آتا ہے، جو تصویری معمے کے گمشدہ ٹکڑے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ چاؤ چاہنے کے باوجود نہ کبھی وہ سب کچھ بتا سکا، نہ ہی اس نے وہ اپنی ڈائری میں لکھا۔ اس کے نزدیک وہ بے حد شرم ناک تھا۔ اس کے بارے میں وہ جو کچھ کہتا، اسے بس ایک عذر آمیز چیخ ہی کہا جا سکتا تھا۔ "ہم بہت زیادہ پیے ہوئے تھے۔ نشے میں دُھت تھے" وہ اس طرح صفائی پیش کرتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ جو کچھ ہوا، وہ اس کے نزدیک شرم ناک تھا۔

مجھے اتنا معلوم ہے کہ بعد میں مسٹر جولیس نے خود کو اتنا سنبھال لیا کہ کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے تھے۔ اور لگتا تھا کہ ان کا قد پہلے سے کچھ بڑھ گیا ہے۔ پھر انہوں نے کسی نامعلوم زبان میں بولنا شروع کر دیا۔ نہ وہ لفظ ان کے معلوم ہو رہے تھے نہ آواز۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی سائنسی فارمولے کو زبان سے دہرا رہے ہیں اور ساتھ ہی وہ عجیب سے اشارے کر رہے تھے، جو علامتی معلوم ہوتے تھے۔ یوں بولتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ان تینوں کی طرف بڑھے۔ وہ تینوں گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگے۔
"ہم لوگ گنگ ہو گئے تھے" چاؤ نے بعد میں مجھے بتایا۔ "اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ وہ بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ ہم پیچھے ہٹتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھے اینا کے جسم سے ٹھوکر لگی اور میں لڑکھڑا گیا۔"

وہ تینوں ایک کونے میں گھر گئے۔ جولیس اُسی نامانوس زبان میں جیسے کوئی منتر پڑھتا رہا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ اشارے کرتے رہے۔ پھر جیسے منتر مکمل ہو گیا۔ وہ خاموش ہوا اور ایک کرسی میں ڈھے گیا۔
سب سے پہلے چاؤ نے ہی خود کو سنبھالا۔ اُس نے بہت

بد تمیزی سے پوچھا "کیوں بڈھے' یہ کیا ڈراما ہو رہا تھا۔"

"میں نے... میں نے تم تینوں کو... بددعا دی ہے" جولیس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بتایا۔ اس سے ٹھیک طرح سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا "اب تم لوگ زیادہ عرصہ نہیں جیو گے' جلد ہی مر جاؤ گے۔"

اس بات کا اثر ان لوگوں پر بالکل نہیں ہوا۔ وہ قہقہے لگاتے' لڑکھڑاتے نیچے اترے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ جولیس کو دکھ اور صدمے نے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بکتا جھکتا ان کے پیچھے پیچھے آیا۔ اب وہ انہیں انگریزی میں کوس رہا تھا لیکن آواز لرز رہی تھی اور لفظ ناقابلِ فہم ہو کر رہ گئے تھے۔

وہ تینوں لڑکھڑاتے ہوئے' دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے رہے لیکن نشے کی وجہ سے یہ ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ بڈھے جولیس نے انہیں ایک طرف ہٹا کر خود دروازہ کھولا۔ دروازے سے نکل کر وہ تینوں اوپری سیڑھی پر کھڑے ہو کر ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے رہے۔

"ہم عنقریب پھر آئیں گے" نیوسم نے کہا "اب اینا سے ملنے آیا کروں گا۔ وہ اتنی حسین ہوگی' اس کا تو مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔"

باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دروازے میں کھڑا جولیس بہت خوف ناک لگ رہا تھا۔ وہ بولا تو اس کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی لیکن لہجہ بہت تند اور خوف زدہ کر دینے والا تھا۔ "اب تم جب بھی اس دروازے کو چھوؤ گے... اور جلد یا بدیر تمہیں اس دروازے کو چھونا ہوگا۔ تو اس کے بعد تم ایک ہفتے کے اندر اندر مر جاؤ گے۔ عین ممکن ہے کہ ایک دن میں... بلکہ ایک گھنٹے میں ہی مر جاؤ۔"

اس بات پر تو وہ تینوں ہنس ہنس کے نیم جاں ہو گئے۔ پھر نیوسم یا دہ گوئی کرتے ہوئے' لڑکھڑاتا ہوا بڑھا اور اس نے دروازے کو ہاتھ لگایا۔

اچانک بڑی گمبھیر خاموشی چھا گئی لیکن ہوا کچھ نہیں۔ بعد میں میرے اصرار پر چاڈ نے یاد کر کے مجھے بتایا کہ اسے ایسا لگا تھا' جیسے نیوسم کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہو۔ لیکن وہ یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ چاندنی کی وجہ سے بھی ایسا ممکن تھا۔ بہرکیف وہ لوگ خاموشی سے کار میں بیٹھے اور چاڈ کے گھر آ گئے... شراب کے اثرات آہستہ آہستہ زائل ہو رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور وہ اندر آئے تو مجھے بہت بجھے بجھے لگے۔

میں نے ان کے لیے ڈرنک بنائے' چاڈ نے کہا "تم جانا نہیں۔ ہمارے پاس ہی بیٹھو۔"

میرے لیے یہ بات حیرت انگیز تھی کیونکہ میں ان کی محفل میں نہ کبھی شریک ہوتا تھا اور نہ ہی وہ مجھے شامل ہونے کو کہتے تھے۔ اب سوچتا ہوں کہ شاید وہ لوگ اس رات کے واقعات پر گفتگو کرنے سے بچنا چاہتے تھے۔ میں ان کے ساتھ کوئی گھنٹا بھر بیٹھا رہا مگر نیند سے بے حال ہو رہا تھا۔

اچانک نیوسم بڑے ہولناک انداز میں چیخا!

مجھے اس وقت احساس ہوگیا کہ نیوسم پچھلے آدھے گھنٹے سے پی بھی نہیں رہا تھا اور گفتگو میں حصہ بھی نہیں لے رہا تھا۔ چیخ کے فوراً بعد وہ اپنی کرسی سے گر گیا اور یوں ہاتھ پاؤں چلانے لگا' جیسے کسی شدید اذیت میں مبتلا ہو۔ اس کا چہرہ اذیت سے مسخ ہو رہا تھا۔ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس کا ایک لفظ بھی قابلِ فہم نہیں تھا۔ یہ بات طے ہے کہ وہ اس وقت بدترین اذیت سے گزر رہا تھا۔ ہم نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی مگر اس کے دانت سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔

میں نے فون کر کے چاڈ کے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ ایک گھنٹے بعد نیوسم اسپتال میں تھا۔ وہاں فوری طور پر اس کا اپنڈے سائٹس کا آپریشن ہوا۔ اس میں کسی وجہ سے پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ بہرکیف آپریشن ہر اعتبار سے کامیاب ہوا لیکن نیوسم ہوش میں آنے سے پہلے ہی مر گیا۔

اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ اس رات کیا واقعات پیش آئے تھے' اور نیوسم کی موت کا چاڈ پر اتنا اثر ہونا میرے لیے حیران کن ہرگز نہیں تھا۔ وہ لڑکپن کے زمانے سے ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ وہ اسکول میں... کالج میں ایک ساتھ پڑھے۔ اس کے بعد ہر مرحلے پر' ہر تفریح میں وہ ایک دوسرے کے شریک رہے۔ اتنے قریبی دوست دنیا میں کم ہی ہوتے ہیں' جیسے وہ تھے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ چاڈ کو نیوسم کی صحبت کیوں اس قدر پسند ہے۔ چاڈ بے فکرا تھا۔ کئی اعتبار سے اسے بے وقوف کہا جا سکتا ہے لیکن اس میں بعض بڑی نازک خوبیاں بھی تھیں' ایسے اوصاف بھی تھے' جو نیوسم کی صحبت کی وجہ سے گھٹ کر رہ گئے تھے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ نیوسم میں خوب رُوئی کے علاوہ کوئی خوبی نہیں تھی۔ ہاں' وہ توانائی سے بھرپور جوان تھا۔

نیوسم کی موت کے ایک ہفتے بعد چاڈ اور فوربس اٹلی روانہ ہو گئے۔ جہاں فوربس کے کئی رشتے دار ان کی میزبانی کے لیے موجود تھے۔ ان کا پروگرام چھ ماہ سے بھی زیادہ قیام کا تھا۔ تمام اخراجات چاڈ کے ذمے تھے۔ مجھے فوربس کے

اکاؤنٹ میں بہت تگڑی رقم منتقل کرانا پڑی حالانکہ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی۔ اس کے علاوہ روانگی سے ایک دن پہلے چاؤ نے مجھے ایک مشن سونپا' جو مسٹر جولیس سے متعلق تھا۔

''تم مسٹر جولیس کے پاس جانا اور ان سے کہنا کہ فوربس نے ان سے قرض لیتے وقت جو تحریری اعترافات ان کو دیے ہیں' وہ لوٹا دیں اور وہ جتنی رقم کے بھی ہوں' اتنی رقم مسٹر جولیس کو ادا کردینا۔ فوربس کو اندازہ بھی نہیں کہ کتنی رقم ادا کرنی ہے اور سود کی شرح کیا طے پائی تھی۔ میں جو چیک تمہیں دے رہا ہوں' میرے خیال میں یہ اس ادائیگی کے لیے کافی رہے گا۔ لیکن کم پڑے تو تم بینک سے مزید رقم نکلوا لینا۔ اور مسٹر جولیس جس شرح سے بھی سود لیں' خاموشی سے ادا کردینا۔ یہ قرض ہر قیمت پر مکمل طور پر ادا کرنا ہے تمہیں۔ یہ خیال رکھنا کہ وہ کوئی اعترافی رسید بچا نہ لے' جس کی بنیاد پر وہ بعد میں فوربس کو دھمکا سکے۔''

میری سمجھ میں بعض باتیں نہیں آئی تھیں۔۔۔ خاص طور پر یہ آخری بات۔ بہرحال اتنی معلومات پر میں کام کرسکتا تھا۔

''اور ہاں۔۔۔'' چاؤ نے مزید کہا ''مسٹر جولیس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ دھیان سے سننا اور تفصیل سے لفظ بہ لفظ مجھے لکھ بھیجنا۔۔۔ اٹلی کے پتے پر۔''

اس وقت میں مسٹر جولیس' نیوسم اور اٹلی فرار۔۔۔ ان تینوں میں کوئی تعلق محسوس نہیں کرسکا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ احساس ہوگیا کہ فوربس کے معاملے میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کچھ اس لیے بھی کہ چاؤ نے مجھے تاکید کی تھی کہ رازداری کا خاص طور پر خیال رکھوں۔۔۔۔ اب مجھے مسٹر جولیس سے ملاقات کے بعد امید تھی کہ یہ معاملہ کچھ کھل جائے گا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔

میں اتنا اہم آدمی نہیں تھا کہ مسٹر جولیس نے کبھی مجھے اپنے گھر کسی پارٹی میں مدعو کیا ہوتا۔ میں مسٹر جولیس سے صرف ایک بار ملا تھا۔ چند ماہ پہلے' ایک دوست کے ہاں۔ مجھے اُس کی شخصیت نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ وہ بہت خوب صورت گفتگو کرتا تھا۔۔۔ عجیب سے انداز میں علمیت سے بھرپور گفتگو' جس میں نہ بوجھل پن ہوتا تھا' نہ خشکی اور بوریت۔ نہ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ علمیت کے زور پر مخاطب کو مرعوب کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ گفتگو کے دوران وہ کسی کا بیان کردہ کوئی نکتہ شکرگزاری کے ساتھ قبول کرلیتا۔ وہ شخص یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ اس نے مسٹر جولیس کی معلومات میں اضافہ کردیا ہے لیکن جب اسی موضوع پر گفتگو کا دائرہ وسیع ہوتا تو کسی مرحلے پر اچانک پتا چلتا کہ جو نکتہ شریکِ گفتگو نے اپنی دانست میں مسٹر جولیس کو سمجھایا تھا وہ تو بنیادی نوعیت کا تھا اور مسٹر جولیس یقینی طور پر اس سے بخوبی واقف تھے۔ یہ ان کے مزاج کا انکسار اور سادگی تھی کہ انہوں نے اس نکتے کو یوں سنا' جیسے وہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔

میں نے اپنا ملاقاتی کارڈ بھجوایا۔ مسٹر جولیس نے فوراً ہی مجھے اپنے پرائیویٹ آفس میں بلوالیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ میں ان کے سفید بالوں والے سیکریٹری سے مل رہا ہوں کیونکہ چند ماہ پہلے میں نے مسٹر جولیس کو دیکھا تھا تو وہ بے حد خوب رو اور باوقار آدمی تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ٹوٹا پھوٹا آدمی مسٹر جولیس ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جان کر مجھے شاک لگا۔

بہرحال مسٹر جولیس نے بڑے مہذب انداز میں میرا خیر مقدم کیا۔ ان کی بے تاثر اور خالی خالی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ ان کی آواز میں زندگی کی رمق بھی نہیں تھی۔ مگر جیسے ہی میں نے اپنا مدعا بیان کیا' ان میں جیسے جان پڑگئی لیکن بڑے خوف ناک اور قابلِ رحم انداز میں۔ وہ جیسے اپنی کرسی میں دھنس گئے۔۔۔ نہیں' بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سکڑ اور سمٹ گئے۔ انہوں نے اپنا سر جھکالیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ان کے بال جو پہلے سُرمئی تھے اب بالکل سفید ہوچکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔ کبھی کبھی ان کے جسم پر لرزش کی ایک لہر دوڑتی محسوس ہوتی۔

انہوں نے میری پوری بات خاموشی سے سنی۔ اس کے بعد دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ اٹھے اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک کمرے کے ایک گوشے میں رکھے سیف کی طرف بڑھے۔ انہوں نے سیف کھولا اور کاغذات کا ایک بنڈل نکالا۔

''مسٹر اسٹیونسن۔۔۔ میں ایک عزت دار آدمی ہو'' انہوں نے مجھ سے کہا ''اور میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میرے پاس بس یہی رسیدیں ہیں'' یہ کہہ کر انہوں نے اُن رسیدوں کے پرزے کیے اور آگے بڑھ کر انہیں آتش دان میں ڈال دیا۔ آتش دان میں کاغذ جل اٹھے۔ وہ دوبارہ اپنی کرسی پر آبیٹھے۔

''اب فرمایئے' میں ان کے عوض کتنی رقم ادا کروں؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ ایک پینس بھی نہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے قرضہ کینسل کردیا؟''

''میں کسی رقم کا دعوے دار نہیں۔''

''مسٹر فوربس کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی'' میں نے

احتجاج کیا "اور نہ ہی مسٹر چاڈوک یہ پسند کریں گے۔ میں آپ سے پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ قرض خواہ کتنا ہی ہو' مسٹر چاڈوک کے لیے اسے ادا کرنا بہرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں اور وہ اپنے دوست مسٹر فوربس کی طرف سے یہ قرض ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ہر قیمت پر۔"

"میں نے کہا نا' میرا کوئی دعویٰ ہی نہیں ہے" انہوں نے کہا اور میز پر رکھی گھنٹی بجادی۔

اب مجھے صحیح معنوں میں خوف آنے لگا۔ معاملہ واقعی بہت سنگین تھا۔ فوربس کی تو مجھے کوئی پروا نہیں تھی مگر چاڈ کی خاطر میں چاہتا تھا کہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے۔ میں نے اُس سے التجا کی۔ ہر طرح سے خوشامد کی لیکن انہوں نے جواب تک نہیں دیا۔

اسی دوران ان کا چپراسی آگیا' جسے انہوں نے گھنٹی بجاکر طلب کیا تھا۔

"چارلس۔ معزز مہمان کو عزت واحترام سے باہر چھوڑ آؤ" انہوں نے چپراسی سے کہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "صبح بخیر مسٹر اسٹیونز۔"

میں نے جان لیا کہ اب میری کسی بات کا ان پر اثر نہیں ہوگا لیکن ایک بات بہرحال مجھے ان سے کہنی تھی "مسٹر جولیس۔ اب سے دو دن پہلے مجھے اس قرض کے بارے میں معلوم تک نہیں تھا۔ مسٹر چاڈوک کل ہی اپنے جہاز میں اٹلی چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے مجھے یہ کام سونپا تھا۔ مجھے صرف یہ قرض ادا نہیں کرنا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ آپ کا کوئی پیغام بھی ہے۔۔۔ مسٹر چاڈوک یا مسٹر فوربس کے نام۔ مجھے اس معاملے کی نوعیت کا علم نہیں لیکن مجھے آپ سے یہ پوچھنے کی خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کو اُن سے کچھ کہنا ہے۔ مجھے یہ تاثر دیا گیا تھا کہ آپ کی طرف سے دوستی کا پیغام یا کسی قسم کی یقین دہانی متوقع ہے۔ آپ میری پوزیشن سمجھ رہے ہیں نا؟ اگر کچھ کہنا ہے تو۔۔ میرا مطلب ہے کوئی پیغام۔۔۔" میری زبان لڑکھڑانے لگی۔

انہوں نے ہاتھ سے مجھے خاموش ہوجانے کا اشارہ کیا "میں پوری طرح سمجھ رہا ہوں مسٹر اسٹیونز لیکن مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ کوئی پیغام نہیں بھجوانا ہے۔"

اس کے بعد میرے پاس واپس چلے آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

میں نے سوچا کہ چاڈ کو ٹیلی گرام کردوں مگر پھر میں نے فیصلہ کیا کہ مکمل تفصیل کے ساتھ اس ملاقات کا احوال خط میں لکھنا زیادہ مناسب رہے گا۔ سو میں نے خط لکھ دیا۔ دو ہفتے گزر گئے۔ چاڈ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پھر اچانک مجھے اس کا حیران کن ٹیلی گرام موصول ہوا' جس میں اُس نے اطلاع دی تھی کہ وہ واپس آرہا ہے۔ فوربس اور اس کی آنٹی اس کے ساتھ ہیں' اور وہ اس کے ساتھ ہی قیام کریں گے۔

اب واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میں چاڈ کی ڈائری سے اندراجات پیش کررہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

۴ اکتوبر۔ ہم روم پہنچ گئے۔ امید تھی کہ اسٹیونز کا ٹیلی گرام پہنچے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

۶ اکتوبر۔ ابھی تک اسٹیونز کی طرف سے کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ میں پریشان ہوں۔

۷ اکتوبر۔ اسٹیونز کا خط آگیا ہے۔ مسٹر جے ہمیں معاف کرنے کو تیار نہیں۔ منحوس آدمی۔ خیر۔ ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہم اُس سے اور اُس کے لعنتی دروازے سے بہت دور ہیں۔ اور مجھے تو وہ بددعا حماقت ہی لگتی ہے۔ دیوانگی! میں نے سوچا ہے' آج رات فوربس کے ساتھ زبردست تفریح کروں گا۔

۸ اکتوبر۔ طبیعت بہت بے کیف ہے۔ کل ایک ایسے دروازے کے سامنے سے گزر ہوا' جو بالکل مسٹر جے کے گھر کا دروازہ لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا تو برا حال ہوگیا۔ ساری تفریح غارت ہوگئی۔

۱۱ اکتوبر۔ رات فوربی کا دماغ چل گیا۔ ان دنوں اس کی مے نوشی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ بہت خوف زدہ ہے۔ رات اس کی آنٹی نے اس سے دروازہ کھولنے کو کہا تو وہ چیخنے لگا... میں سب سمجھتا ہوں' یہ مجھے ختم کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔

۱۲ اکتوبر۔ روم مجھے بہت برا لگنے لگا ہے۔ زیادہ وقت گھر میں ہی گزرتا ہے۔ اسی میں عافیت بھی ہے۔

۱۳ اکتوبر۔ رات سو ہی نہیں سکا۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ بڈھا شیطان کوئی چکر چلا رہا ہے۔ کل میں نے سوچا کہ کیا اس دروازے کا بہت چھوٹا سا ٹکڑا بھی اتنا ہی موثر ہوسکتا ہے۔ اگر وہ دروازے کا کوئی ٹکڑا خط میں رکھ کر مجھے یا فوربی کو بھیج دے اور ہم خط کھولیں اور اسے چھوئیں تو کیا ہوگا؟ مگر نہیں۔ یہ سب بکواس ہے۔۔۔ نری خرافات۔ پھر بھی فرض کرو کہ ایسا ہی ہوتا ہے تو۔۔؟

۱۴ اکتوبر۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ مسٹر جے کوئی شیطانی چکر چلا رہا ہے۔ کاش میں وہیں ہوتا۔۔ اس کے قریب اور اس پر نظر رکھ سکتا۔ یا اس سے مل کر بات کرنے کی کوشش

کرتا۔ اس سے درخواست کرتا کہ وہ اپنی بد دعا واپس لے لے۔ فوربی تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ میرا حال بھی کچھ بہتر نہیں۔ نیند اول تو آتی نہیں۔ سوتا ہوں تو بس ذرا دیر۔ بھوک بھی نہیں لگتی۔ مے نوشی بالکل چھوڑ دی ہے۔

۱۵ اکتوبر۔ اب اپنی تشویش اور پریشانی ناقابلِ برداشت ہوگئی ہے۔ آج رات گھر واپس جا رہا ہوں۔ فوربی بھی چلے گا لیکن وہ مُصر ہے کہ اس کی بڈھی آنٹی بھی ہمارے ساتھ جائیں گی۔ کہتا ہے۔۔۔ میں گھر میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ فی الحال سب میرے گھر چلیں گے۔ میں نے اسٹیونز کو تار دے دیا ہے۔

میں اسٹیشن پر انہیں ریسیو کرنے گیا۔ انہوں نے جہاز روم میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے کہ فوربس کی آنٹی کو فضائی سفر سے خوف آتا تھا۔ فوربس کی آنٹی میری توقع سے زیادہ بڈھی ثابت ہوئی۔ اس کی شادی ایک فرانسیسی سے ہوئی تھی، جو چند برس بعد انتقال کر گیا تھا۔ اس کا نام مادام فاور تھا۔ وہ بہت اچھی انگریزی بولتی تھی۔

فوربس کو دیکھ کر مجھے شاک لگا۔ وہ تو سچ مچ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ سونے کے لیے چلا گیا۔ وہ تین چار دن چاڈ کے گھر میں مقیم رہا۔ اس دوران اُس نے خاصی حد تک خود کو سنبھالا۔ اُس کی حالت اتنی تباہ نہیں لگ رہی تھی لیکن اس کی اعصاب زدگی بدستور تھی۔

چاڈ دبلا اور زرد رُو ہوگیا تھا۔ وہ اعصاب زدہ تو نہیں تھا۔ لیکن اس کے انداز میں چوکنّا پن تھا۔ جیسے کسی جانور کا پیچھا کرنے والا شکاری۔ لیکن نہیں۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اس شکار کی طرح چوکنا تھا جس کے پیچھے شکاری لگا ہو۔ اس نے مجھ سے مسٹر جولیس کے متعلق کرید کرید کر پوچھا۔ مسٹر جولیس سے ملاقات کی جزئیات مجھے کئی کئی بار بیان کرنا پڑیں۔

فوربس کی حالت ذرا سنبھلی تو میں نے ان دونوں کے لیے مسٹر جولیس سے ان کے آفس میں ملاقات کا وقت لے لیا۔ وہ وہاں سے واپس آئے تو سیدھے لائبریری میں آئے۔ میں وہاں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر جانے کے لیے اٹھا۔

"خدا کے لیے اسٹیونز۔ تم کمرے سے یوں نکل رہے ہو، جیسے ہم اچھوت ہوں اور تم ہم سے بچ کر بھاگ رہے ہو۔" چاڈ نے کہا اور گھنٹی بجائی۔

چاڈ نے پہلے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہ میں بھی اسے کھری کھری سناؤں اور کمرے سے نکل جاؤں لیکن اس کے چہرے کو دیکھ کر باز رہا۔ اس وقت اسے ہمدردی اور مدد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں بیٹھ گیا۔ وہ آتش دان کے پاس کھڑا اس وقت تک گھنٹی بجاتا رہا، جب تک بٹلر آ نہیں گیا۔ اس نے بٹلر کو برانڈی لانے کی ہدایت کی۔

روم سے واپسی کے بعد سے چاڈ نے شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے اپنے لیے برانڈی کا ایک بڑا جام بنایا۔ یہی نہیں، اس کے بعد وہ جام پر جام لُنڈھاتا رہا۔ درمیان میں فوربس سے باتیں بھی کرتا رہا لیکن بے ربط باتیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی مسٹر جولیس سے ملاقات کا بھی وہی نتیجہ نکلا تھا، جو میری ملاقات کا تھا۔

چاڈ مسٹر جولیس سے مل کر واپس آیا تو اس کے چہرے پر مایوسی کا تاثر تھا۔ برانڈی کے کئی جام حلق سے اترنے کے بعد وہ تاثر معدوم ہوگیا۔ اس کی جگہ بہادری نے لے لی۔ اس نے فوربس سے کہا "کون کم بخت اُس سے یا اُس کے لعنتی دروازے سے خوف زدہ ہے۔"

جواب میں فوربس منمنایا "میں ہوں۔"

"میں بھی ہوں" چاڈ نے کہا "لیکن یہ تو طے ہے کہ جب تک ہم اس دروازے کو نہیں چھوتے، عافیت سے ہیں۔ اور یہی ثابت کرنے کے لیے میں چاہتا ہوں کہ اس سڑک پر سے گزروں اور اس لعنتی دروازے پر ایک پتھر ماروں۔ چلو فوربی میرے ساتھ۔"

مگر فوربی کسی قیمت پر جانے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن چاڈ کے مسلسل اصرار کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے مگر اس کی دو شرطیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں گا اور دوسرے یہ کہ وہ سڑک کے اس طرف چلیں گے۔۔۔ یعنی جولیس کے مکان سے دور۔۔۔ سڑک پار۔ کم از کم اس وقت یہ بات مجھے احمقانہ لگی لیکن میرے خیال میں ان دونوں کی ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ انہیں اپنے طور پر جانے دیا جاتا۔ اور میں انہیں گھر میں رکے رہنے پر قائل نہیں کر سکا۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔

☆ ✱ ☆

وہ موسم خزاں کی ایک خوش گوار سہ پہر تھی۔ دھوپ بھی تھی اور قدرے خنک ہوا بھی چل رہی تھی۔ سڑکوں پر سوکھے پتّے جابجا نظر آ رہے تھے۔ پانچ منٹ میں ہم اس سڑک پر پہنچ گئے، جہاں مسٹر جولیس کا گھر تھا۔ ہم ان کے گھر کے مقابل والے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔

اچانک چاڈ نے ہمیں روک دیا "وہ دیکھو" اس نے

کرتا۔ اس سے درخواست کرتا کہ وہ اپنی بددعا واپس لے لے۔ فوربی تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ میرا حال بھی کچھ بہتر نہیں۔ نیند اول تو آتی نہیں۔ سوتا ہوں تو بس ذرا دیر۔ بھوک بھی نہیں لگتی۔ مے نوشی بالکل چھوڑ دی ہے۔

۱۵ اکتوبر۔ اب اپنی تشویش اور پریشانی ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔ آج رات گھر واپس جا رہا ہوں۔ فوربی بھی چلے گا لیکن وہ مُصر ہے کہ اس کی بڈھی آنٹی بھی ہمارے ساتھ جائیں گی۔ کہتا ہے۔۔۔ میں گھر میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ فی الحال سب میرے گھر چلیں گے۔ میں نے اسٹیونز کو تار دے دیا ہے۔

میں اسٹیشن پر انہیں ریسیو کرنے گیا۔ انہوں نے جہاز روم میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے کہ فوربس کی آنٹی کو فضائی سفر سے خوف آتا تھا۔ فوربس کی آنٹی میری توقع سے زیادہ بڈھی ثابت ہوئی۔ اس کی شادی ایک فرانسیسی سے ہوئی تھی، جو چند برس بعد انتقال کر گیا تھا۔ اس کا نام مادام فاور تھا۔ وہ بہت اچھی انگریزی بولتی تھی۔

فوربس کو دیکھ کر مجھے شاک لگا۔ وہ تو سچ مچ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ سونے کے لیے چلا گیا۔ وہ تین چار دن چاڈ کے گھر میں مقیم رہا۔ اس دوران اُس نے خاصی حد تک خود کو سنبھالا۔ اُس کی حالت اتنی تباہ نہیں لگ رہی تھی لیکن اس کی اعصاب زدگی بدستور تھی۔

چاڈ دبلا اور زرد رُو ہو گیا تھا۔ وہ اعصاب زدہ تو نہیں تھا۔ لیکن اس کے انداز میں چوکنا پن تھا۔ جیسے کسی جانور کا پیچھا کرنے والا شکاری۔ لیکن نہیں۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ اس شکار کی طرح چوکنا تھا جس کے پیچھے شکاری لگا ہو۔ اس نے مجھ سے مسٹر جولیس کے متعلق کرید کرید کر پوچھا۔ مسٹر جولیس سے ملاقات کی جزئیات مجھے کئی کئی بار بیان کرنا پڑیں۔

فوربس کی حالت ذرا سنبھلی تو میں نے ان دونوں کے لیے مسٹر جولیس سے ان کے آفس میں ملاقات کا وقت لے لیا۔ وہ وہاں سے واپس آئے تو سیدھے لائبریری میں آئے۔ میں وہاں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر جانے کے لیے اٹھا۔

"خدا کے لیے اسٹیونز۔ تم کمرے سے یوں نکل رہے ہو، جیسے ہم اچھوت ہوں اور تم ہم سے بچ کر بھاگ رہے ہو۔" چاڈ نے کہا اور گھنٹی بجائی۔

چاڈ نے پہلے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہ میں بھی اسے کھری کھری سناؤں اور کمرے سے نکل جاؤں لیکن اس کے چہرے کو دیکھ کر باز رہا۔ اس وقت اسے ہمدردی اور مدد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں بیٹھ گیا۔ وہ آتش دان کے پاس کھڑا اس وقت تک گھنٹی بجاتا رہا، جب تک بٹلر آ نہیں گیا۔ اس نے بٹلر کو برانڈی لانے کی ہدایت کی۔

روم سے واپسی کے بعد سے چاڈ نے شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے اپنے لیے برانڈی کا ایک بڑا جام بنایا۔ یہی نہیں، اس کے بعد وہ جام پر جام لنڈھاتا رہا۔ درمیان میں فوربس سے باتیں بھی کرتا رہا لیکن بے ربط باتیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی مسٹر جولیس سے ملاقات کا بھی وہی نتیجہ نکلا تھا، جو میری ملاقات کا تھا۔

چاڈ مسٹر جولیس سے مل کر واپس آیا تو اس کے چہرے پر مایوسی کا تاثر تھا۔ برانڈی کے کئی جام حلق سے اترنے کے بعد وہ تاثر معدوم ہو گیا۔ اس کی جگہ بہادری نے لے لی۔ اس نے فوربس سے کہا "کون کم بخت اُس سے یا اُس کے لعنتی دروازے سے خوف زدہ ہے۔"

جواب میں فوربس منمنایا "میں ہوں۔"

"میں بھی ہوں" چاڈ نے کہا "لیکن یہ تو طے ہے کہ جب تک ہم اس دروازے کو نہیں چھوتے، عافیت سے ہیں۔ اور یہی ثابت کرنے کے لیے میں چاہتا ہوں کہ اس سڑک پر سے گزروں اور اس لعنتی دروازے پر ایک پتھر ماروں۔ چلو فوربی میرے ساتھ۔"

مگر فوربی کسی قیمت پر جانے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن چاڈ کے مسلسل اصرار کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے مگر اس کی دو شرطیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں گا اور دوسرے یہ کہ وہ سڑک کے اس طرف چلیں گے۔ یعنی جولیس کے مکان سے دور۔۔۔ سڑک پار۔ کم از کم اس وقت یہ بات مجھے احمقانہ لگی لیکن میرے خیال میں ان دونوں کی ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ انہیں اپنے طور پر جانے دیا جاتا۔ اور میں انہیں گھر میں رکے رہنے پر قائل نہیں کر سکا۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔

✩ ✱ ✩

وہ موسم خزاں کی ایک خوش گوار سہ پہر تھی۔ دھوپ بھی تھی اور قدرے خنک ہوا بھی چل رہی تھی۔ سڑکوں پر سوکھے پتے جابجا نظر آ رہے تھے۔ پانچ منٹ میں ہم اس سڑک پر پہنچ گئے، جہاں مسٹر جولیس کا گھر تھا۔ ہم ان کے گھر کے مقابل والے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔

اچانک چاڈ نے ہمیں روک دیا "وہ دیکھو" اس نے

فوربس کا بازو تھامتے ہوئے کہا "دروازے پر تو اچھے خاصے لوگ جمع ہیں۔"

"تو کیوں نہ ہوں" فوربس نے بے بسی سے کہا "انہیں اس دروازے سے خوف تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو صرف ہم دونوں ہی بدنصیب ہیں۔"

"لیکن یہ لوگ کر کیا رہے ہیں؟" چاڈ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اس وقت ہم دروازے سے خاصا دور تھے۔ ذرا آگے گئے تو پتا چلا کہ چار مزدور دروازے کے ساتھ ہی کوئی کارروائی کر رہے ہیں۔ ہم مخالف فٹ پاتھ پر رک گئے۔

"سڑک پار کر کے جاؤ اسٹیونز۔۔۔ اور دیکھو کہ کیا ہو رہا ہے؟" چاڈ نے مجھ سے کہا۔

میں سڑک پار کر کے گیا۔ چاروں کاریگر دروازے پر کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ وہ ایک فرم کا فورمین کارپینٹر تھا اور کئی بار ہمارے لیے بھی کام کر چکا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور مجھے ہیلو کہا۔

"کہو بھئی، یہ کیا کام ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس کا جواب میں نے چاڈ تک پہنچا دیا۔ مسٹر جولیس نے اپنے گھر کا دروازہ تبدیل کرایا تھا۔ وہ لوگ نیا دروازہ نصب کر رہے تھے۔ فورمین نے کہا تھا کہ وہ خود حیران ہے کیونکہ پرانا دروازہ بہت ہی اچھی حالت میں تھا۔ وہ خوب صورت جارجین انداز کا دروازہ تھا۔ بظاہر اسے تبدیل کرانے کی کوئی تک نہیں تھی۔

دونوں نے میری بات توجہ سے سنی اور چند لمحے خاموش رہے۔ بالآخر فوربس نے خاموشی توڑی "شکر ہے، اس عذاب سے جان چھوٹی" اس نے کہا "نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ بس اب گھر چلو۔ میں آج سکون سے ایک جام پیوں گا۔"

لیکن چاڈ خاموش تھا۔ پھر وہ بولا تو اس کی آواز لرز رہی تھی "پرانا دروازہ کہاں گیا؟" اس نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔

فوربس حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم کچھ بھی نہیں سمجھے بے وقوف" چاڈ نے کہا "وہ یہاں لگا ہوا تھا تو کم از کم ہماری نظروں کے سامنے تو تھا۔ ہم احتیاط برت سکتے تھے۔ مکان کو آگ لگوا دیتے تو قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ آج ہی مجھے یہ خیال آیا تھا لیکن اب۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ بھاگ کر سڑک پار کی اور کاریگروں کے پاس پہنچ گیا۔

"پرانے دروازے کا کیا بنا؟" اس نے فورمین سے تقریباً چیخ کر پوچھا۔

فورمین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ تاہم بڑی تمیز سے جواب دیا "مسٹر جولیس نے آج صبح اسے فروخت کر دیا۔ میں نے خود اسے گاڑی پر لد کر جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی ہم نے کام شروع کیا تھا۔"

"کس نے خریدا ہے وہ دروازہ؟ کہاں لے جایا گیا۔۔؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں جناب۔ جو لوگ دروازہ لے کر گئے، میں انہیں نہیں پہچانتا۔ مجھے تو یہ بات ہی عجیب لگی کہ کسی نے دروازہ خریدا۔ حالانکہ وہ اٹھارویں صدی کا بہت اچھا اور مضبوط دروازہ تھا لیکن ایسے دروازے تو اس شہر میں سیکڑوں ہیں۔"

چاڈ واپس آیا اور بغیر کچھ کہے گھر کی طرف چلنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ فوربس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔

ہم دوبارہ لائبریری میں جا بیٹھے "کچھ پئیں گے؟" میں نے چاڈ سے پوچھا۔

لیکن چاڈ نے انکار کر دیا "میں اپنا ذہن صاف رکھنا چاہتا ہوں" اس نے کہا۔ پھر وہ فوربس سے مخاطب ہوا۔ "اب ہمیں اسٹیونز کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔ میں اور تم یہ کام نہیں کر سکتے۔ کیوں فوربی، میں اسٹیونز کو اتنا بتا دوں، جتنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو؟"

"ہاں۔ بتا دو" فوربس نے کہا۔

تب چاڈ نے مجھے وہ کچھ بتایا، جو میں اب تک بیان کر چکا ہوں۔ سب کچھ سنانے کے بعد اس نے کہا "یہ ہے کل خرافات لیکن تم بھی تسلیم کرو گے کہ ہے بے حد خطرناک خرافات۔ اس لیے کہ ہمارے دماغ پر۔۔۔ اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔ یہ فوربس تو خود کو شراب میں ڈبو کر ہلاک کر لے گا اور شاید میں پاگل ہو جاؤں گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دروازے کو تلاش کیا جائے اور اسے جلا دیا جائے۔ یہ اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ قصبے کی فرنیچر کی ہر دکان چیک کرو۔ معلوم کرو کہ آج صبح اس مقام سے دروازہ وہاں لایا گیا ہے یا نہیں۔ اٹھارہویں صدی کا پینل والا دروازہ۔ معلوم کرو کہ کس نے وہ دروازہ خریدا ہے اور کہاں نصب کیا جا رہا ہے اسے۔ ایسے سیکڑوں دروازے ہیں یہاں، کیا پتا، وہ کسی دوست کے گھر لگے۔ اور ہم کسی دن اس سے ملنے یا اس کے ہاں دعوت میں جائیں۔ اسے چھوئیں اور پھر۔" وہ جھرجھری

لے کر رہ گیا۔ پھر وہ وحشت زدہ انداز میں ہنسنے لگا "ویسے بڈھے کو داد دینی پڑتی ہے۔ اس نے ہم سے بہت شاندار انتقام لیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

میں نے فوری طور پر دروازے کے سلسلے میں پوچھ گچھ شروع کردی۔ پوچھ گچھ کا وہ سلسلہ کئی ہفتے جاری رہا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میرا خیال ہے کہ مقامی کارپینٹرز اور تعمیراتی کمپنیوں والے مجھے پاگل سمجھنے لگے ہوں گے۔ میں نے کاریگروں سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس سلسلے میں مجھے کچھ بتائیں گے تو میں انہیں معلومات کا معقول معاوضہ ادا کروں گا۔ بعض اوقات مجھے معلومات فراہم کی گئیں اور میں ان کے زور پر آگے بڑھا لیکن آگے جاکر معلومات غلط ثابت ہوئیں۔ ایسے بہت سے لوگ ملے، جنہوں نے کسی گھر میں کسی پرانے دروازے کی تنصیب کے متعلق سنا تھا۔ ظاہر ہے، پرانے دروازے خریدے بھی جاتے تھے، فروخت بھی ہوتے تھے اور گھروں میں لگائے بھی جاتے تھے لیکن ان میں میرا مطلوبہ دروازہ کہیں نہیں تھا۔

میرا خیال ہے، پورے انگلینڈ میں کسی کو دروازوں کے متعلق اتنی معلومات نہیں تھیں جتنی مجھے حاصل ہوگئی تھیں۔ مجھے متعدد بار جارجین طرز کے دروازوں کے علاوہ بھی دروازوں کے پیچھے دوڑنا پڑا تھا۔ ان میں وکٹورین طرز کے، ملکہ الزبتھ کے، ملکہ این کے دور کے اور ریجنسی طرز کے دروازے شامل تھے۔ بس مجھے کہیں کسی پرانے دروازے کے لگائے جانے کی خبر ملتی تھی اور میں اس کے پیچھے دوڑ جاتا تھا۔ یہ الگ بات کہ میری بھاگ دوڑ ہمیشہ بے سود ثابت ہوئی۔ تاہم میں نے ایک کام اور کیا۔ بڑی رازداری سے چاڈ کے تمام دوستوں کے گھروں کو چیک کیا۔ اس طرح یہ تسلی ہوگئی کہ ان کے گھروں میں دروازوں کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ کرسمس آنے تک ہم نے دروازے کی جستجو ترک کردی تھی۔

فوربس اپنے گھر واپس چلا گیا تھا اور وہاں اپنی آنٹی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اسے چاڈ کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا، جس نے اس کے مالی معاملات درست کردیے تھے اور وہ اب بھی شاہانہ طریقے سے رہ رہا تھا۔ وہ اور چاڈ اب ایک دوسرے سے بہت کم ملتے تھے۔ فوربس اب بہت بدل گیا تھا۔ اس نے مے نوشی سے چھٹکارہ پالیا تھا اور ان دنوں اسے ورزش کا خبط ہوگیا تھا۔ وہ بہت بھاری ورزشیں کرتا تھا۔ اس برہا سے اس نے ہاکی کھیلنا شروع کردیا۔ اسکواش وہ پہلے بھی کھیلتا تھا لیکن اب اسکواش کی لگن بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ بہت صحت مند نظر آتا تھا۔ اس میں سنجیدگی بھی آگئی تھی۔ تاہم میں نے اس کے ساتھ اسکواش کھیلنے والوں کو یہ کہتے سنا۔ اب وہ پہلے جیسا اسپورٹس مین نہیں رہا ہے۔ اس کی خوش مزاجی رخصت ہوگئی ہے۔

دوسری طرف چاڈ اب گھر سے بھی کم ہی نکلتا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت لائبریری میں گزرتا۔ اس نے اعتراف کیا کہ ابتدا میں وہ خوف کی وجہ سے گھر سے نہیں نکلتا تھا لیکن بعد میں اسے مطالعے کا چسکا لگ گیا۔ اسے پتا چلا کہ مطالعہ بہت اچھی مصروفیت بھی ہے اور اس سے عجیب سی مسرت اور طمانیت ملتی ہے۔ اس کے بعد اُسے گھر سے نکل کر کہیں تفریح کرنا وقت کا زیاں معلوم ہونے لگا۔ یہ میں آکسفورڈ کے زمانے سے جانتا تھا کہ وہ بے حد ذہین ہے۔ مگر اس نے غلط صحبت اختیار کرکے اپنی ذہانت کو بیکار شے بنا کر رکھ دیا تھا۔ مگر اب ہم مل کر مطالعہ کرتے تھے۔ تاریخ ہمارا سب سے پسندیدہ موضوع تھا۔ اس کے علاوہ انگریزی ڈرامے، شاعری اور لاطینی ادب میں بھی چاڈ کو خاص دلچسپی تھی۔

"میں اس مجرم کی طرح ہوں، جسے سزائے موت سنائی جاچکی ہے" اس نے ایک بار مجھ سے کہا "اور میں سوچتا ہوں کہ علم سے محروم کیوں مروں۔"

وہ اکثر اس خوف ناک رات کے اور مسٹر جولیس کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ کبھی رات گئے اسے اُس رات کا خیال آتا۔ وہ ہمیشہ مسٹر جولیس کی اس وقت کی کیفیت کا نقشہ کھینچتا تھا، جب وہ کسی اجنبی زبان میں ان لوگوں کو بددعا دے رہے تھے۔ یا وہ وقت جب وہ چاندنی میں نہائے ہوئے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔

اٹلی سے واپسی کے بعد چاڈ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اینا کے متعلق معلوم کروں کہ اس کا کیا حال ہے۔ میں نے بڑی رازداری سے اس معاملے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے بتایا گیا کہ بہت دنوں سے اینا کو کسی نے نہیں دیکھا ہے اور مسٹر جولیس سے اس سلسلے میں کوئی پوچھے تو وہ کمزور آواز میں کہتے ہیں۔ وہ سفر کررہی ہے۔

اس پر ایک شخص نے پوچھا "آج کل وہ کہاں ہے؟"

"میرا خیال ہے، آسٹریا میں ہے" مسٹر جولیس نے جواب دیا تھا۔

اس شخص نے اگلے روز یہی سوال کیا تو مسٹر جولیس نے اسے بتایا کہ اینا آج کل مصر میں ہے۔

میں نے چاڈ کو یہ سب کچھ بتادیا۔ چاڈ نے اس کے بعد بھی

اینا کے متعلق نہیں پوچھا بلکہ اس نے کبھی اینا کا نام بھی نہیں لیا۔ اس میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ دُبلا اور کمزور ہوگیا تھا۔ وہ بد اطوار تو خیر کبھی نہیں رہا تھا لیکن اب وہ غیر معمولی طور پر نرم خو، مہربان اور دوسروں کا خیال کرنے والا ہوگیا تھا۔ میں پہلے بھی اسے پسند کرتا تھا لیکن اب میرے لیے اس میں اتنی زیادہ کشش تھی کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔

ہمارے گھر لوگ آتے رہتے تھے لیکن چاڈ کو بڈھے ڈاکٹر پن روز اور اس کی بیٹی بیٹرائس کی صحبت بہت پسند تھی۔ بیٹرائس کو وہ بائس، کہہ کر پکارتا تھا۔ پہلے بائس چاڈ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ وہ بڑی نرم خو اور اچھی لڑکی تھی۔ چاڈ کا لاابالی پن اسے برا لگتا تھا لیکن چاڈ بدلا تو وہ بھی بدل گئی۔ اب یہ بات یقین سے کہی جاسکتی تھی کہ وہ دونوں ہر لحہ ایک دوسرے کی محبت میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

کرسمس کی رات میڈم فاور اور فوربس کو چاڈ کے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ ہم لائبریری میں ان کا انتظار کرتے رہے۔ میڈم فاور پہلے آئیں۔ انہوں نے بتایا کہ فوربس کا چہل قدمی کا موڈ تھا۔ لہٰذا وہ انہیں دروازے تک چھوڑ کر خود ٹہلنے کے لیے چلا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دس منٹ میں واپس آجائے گا۔

ہم لوگ کاک ٹیل کی چسکیاں لیتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ چاڈ میڈم فاور سے فرانس کے صنعتی انقلاب کے بارے میں باتیں کررہا تھا۔ میڈم فاور دلچسپ گفتگو کرتی تھیں۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

پھر فوربس آگیا۔ وہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ یہ بات چاڈ نے بھی محسوس کرلی "کیا بات ہے فوربی؟" اس نے پوچھا "تم اس وقت مار کھائے ہوئے کتے کی طرح لگ رہے ہو۔"

"کتے کی طرح؟" فوربس نے دہرایا۔

"ہاں۔ لو یہ جام لو" چاڈ نے کہا۔

"کتے کی طرح؟" فوربس نے جام لیتے ہوئے پھر دہرایا۔

اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ میں نے اسے بہت غور سے دیکھا کہ کہیں وہ نشے میں تو نہیں ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ سوبر تھا، پھر اچانک میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ اس نے اپنی کلائی پر رومال لپیٹ رکھا تھا۔

"کیا بات ہے، کوئی چوٹ لگ گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو... ہاں... میرا مطلب ہے، معمولی چوٹ ہے۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

میں نے رومال ہٹا کر دیکھا۔ وہ چھوٹی سی خراش تھی لیکن بہت خوفناک لگ رہی تھی۔ اور پر خون کا ایک قطرہ موجود

استاد نے شاگرد سے پوچھا "قاتل کا کیا مطلب ہے؟"

"معلوم نہیں" شاگرد نے جواب دیا۔

"اچھا! اگر تم اپنے باپ کو قتل کردو تو تم کیا کہلاؤ گے؟" استاد نے پوچھا۔

"یتیم!" جواب ملا۔

مرسلہ: قیصر رضا، لاہور

تھا۔ میں نے باتھ روم لے جاکر خراش کو دھویا اور اس پر آیوڈین لگادی۔ تب اس نے مجھے وہ واقعہ سنایا جو اسے پیش آیا تھا۔

وہ اپنی آنٹی کے ساتھ آرہا تھا کہ اس کے دل میں اکیلے چہل قدمی کرنے کی ایسی شدید خواہش ابھری کہ جسے دبانا ناممکن تھا۔ اس نے آنٹی کو اندر جانے کو کہا اور خود دروازے سے پلٹ گیا۔ نہ جانے کیوں... لیکن اس کے قدم خود بخود ایلم اسٹریٹ کی طرف اٹھنے لگے۔ ایلم اسٹریٹ قصبے کی وہ واحد سڑک ہے، جہاں ہر مکان مکمل طور پر جارجین طرز کا ہے۔

وہ سڑک کے کارنر پر رک گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر کوئی نامعلوم طاقت اسے اکسا رہی ہے کہ وہ اس اسٹریٹ کے تمام مکانات کے دروازوں کو ہاتھ لگائے۔ اُس نے اسے ردّ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

"مجھے ایسا لگا، جیسے کوئی شخص مجھ سے باتیں کررہا ہے۔" اس نے مجھے بتایا "میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اگر تم نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا تو تم بزدل ہو۔ نامرد ہو۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ اگر اس وقت میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا تو خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔"

چنانچہ اس نے پوری سڑک کا چکر لگایا اور ہر مکان کے دروازے کو چھوا۔ پھر اس نے سڑک پار کی اور دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس طرح کے مکانوں کے دروازوں کو ہاتھ لگایا۔

"پہلے دروازے کو چھوتے ہوئے میں خوف زدہ تھا۔" اس نے کہا "پھر میرا حوصلہ بڑھتا گیا۔ میں نڈر ہوگیا۔ میں نے بڑے غرور اور نفرت سے ہر دروازے کو ہاتھ لگایا اور جب میں ہر دروازے کو چھو چکا تو یقین کرو، مجھے بڑی طمانیت ہوئی۔ میں خود کو بہتر آدمی محسوس کررہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے کوئی بھاری قرض اتار دیا ہے، کسی بڑے بوجھ سے آزاد ہوگیا ہوں میں۔ اسی وقت ایک کتے نے مجھ پر جست

لگائی۔ وہ بڑی جسامت کا سیاہ کتا تھا اور میری گردن میں دانت گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ذرا سی کوشش کے بعد اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ بھونکتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ یہاں آتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میری کلائی سے خون بہہ رہا ہے۔ میں نے اس پر رومال لپیٹ لیا۔"

یہ سب کچھ مجھے بتانے کے بعد اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں چاڈ کو کچھ بھی نہ بتاؤں۔

ہم لائبریری میں واپس آئے۔ کھانا لگایا جا چکا تھا۔ کھانا سکون سے کھایا گیا مگر کھانے کے بعد اس نے پانی کی بلوری صراحی اٹھا کر آتش دان میں پھینک دی۔

انگلینڈ میں ریبیز کا اثر خوف ناک حد تک سُرعت سے ہوتا ہے۔ فوربس نے ہائیڈروفوبیا کی ہر اذیت اٹھائی اور وہ بھی صرف چھ دن۔ مگر چھ دن کی وہ اذیت برسوں کی بیماری پر بھاری تھی۔ ایک ہفتہ گزرنے سے پہلے وہ ختم ہو گیا۔

* * *

یہ حیرت انگیز بات تھی کہ چاڈ پر فوربس کی موت نے کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس نے تسلیم کر لیا کہ بدقسمتی اسے چھوڑے گی نہیں۔ میں نے مایوسی کی اس دھند کو ہٹانے کی کوشش کی۔ اسے بتایا کہ اب کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ دروازہ کس گلی میں ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمیں مکان کے بارے میں علم نہیں مگر یہ احتیاط تو کی جا سکتی ہے کہ اس اسٹریٹ کا ہی رخ نہ کیا جائے۔

لیکن چاڈ نے اس حقیقت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ پُرکشش ہو گیا لیکن اب وہ اپنے اندر سمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے خود کو ایک خول میں بند کر لیا تھا اور اس خول کو توڑنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس سے التجا کی کہ وہ یہاں کی تمام جائداد فروخت کر کے کہیں کسی دور دراز مقام پر چلا جائے۔ ضروری ہو تو وہاں بھی نام بدل کر رہے۔

مگر چاڈ نے صاف انکار کر دیا اور انکار پر ڈٹا رہا۔ "سب بے کار ہے" اس نے کہا "مجھے ہر حال میں حقیقت کا سامنا کرنا ہے تو یہاں کیوں نہ کروں۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہاں میرا گارڈن ہے، میری کتابیں ہیں اور..."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے بائس کا نام اپنی نوکِ زباں پر روک لیا ہے۔ "تم مس پین روز سے شادی کر لو۔" میں نے التجا کی "اسے لے کر یہاں سے چلے جاؤ اور خوش رہو۔ بہت اذیت اٹھائی تم نے۔"

"میں۔ میں اس سے شادی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

میں نے مسٹر جولیس سے ایک بار اور رحم کی اپیل کرنے کا ارادہ کیا اور ان کے دفتر گیا۔ وہاں پتا چلا کہ وہ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اور کئی ماہ بعد آئیں گے۔

"انہوں نے اپنا پتا دیا ہو گا۔" میں نے ان کے سکریٹری سے کہا۔

"انہوں نے سختی سے منع کیا تھا کہ ان کا پتا کسی کو بھی نہ دیا جائے۔" سکریٹری بولا "ہاں، آپ انہیں خط لکھ دیں تو وہ انہیں بھجوا دیا جائے گا۔"

میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب ایک خط کا بھی نہیں ملا۔

اب یہ بات عجیب سی لگتی ہے لیکن وہ موسم بہار ہم نے ہنسی خوشی گزارا۔ چاڈ گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ گارڈن میں چلا جاتا تھا۔ وہ مطالعے کو اور زیادہ وقت دینے لگا تھا۔ یہی نہیں، اس نے مختصر کہانیاں اور ادبی مضامین بھی لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اس کی کہانیوں کے موضوعات انوکھے، دلکش اور نازک تھے اور وہ انہیں ٹریٹ منٹ بھی نازک دیتا تھا۔ بعد میں وہ کہانیاں فرضی نام سے شائع بھی ہوئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ معاملات اس رخ پر نہ گئے ہوتے تو وہ ایک عظیم ادیب ثابت ہوتا۔ ہم اگرچہ خوش تھے لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ یہی رہتا۔ یہ نہ ہوا ہوتا تو ایسا ہوتا۔ کاش... کاش...! خوشی کے باوجود گھر کی فضا جیل کی اس کوٹھری کی سی تھی، جس میں سزائے موت کے قیدی رکھے جاتے ہیں۔ یہ گمان ہوتا کہ گھر میں کوئی بستر مرگ پر پڑا ہے۔

لیکن اس کوٹھری میں بستر مرگ اور اس پر پڑا ہوا کوئی مریض ہی نہیں، ایک ایسی ہستی بھی موجود تھی، جس سے وہ کوٹھری جگمگاتی تھی۔ بائس! بائس کی ماں مر چکی تھی، اب ہمارے ہاں بائس اور ڈاکٹر پین روز کے سوا کوئی نہیں آتا تھا۔ بائس اکثر سہ پہر کو آ جاتی۔ وہ وائلن بجاتی اور چاڈ سنتا۔ پھر اپنے مطب سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر بھی آ جاتا اور ڈنر ہمارے ساتھ ہی کرتا لیکن وہ دونوں چاڈ کی صورتِ حال نہیں سمجھ سکے تھے۔ سمجھے بھی تھے تو بہت تھوڑا لیکن وہ تھوڑا ہی اتنا تھا کہ انہوں نے اسی کی وجہ سے قصبے کی روایات کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ شاید ہی کبھی کوئی دن ایسا گزرتا ہو، جب بائس، چاڈ کے ساتھ تنہائی میں کئی گھنٹے نہ گزارتی ہو۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی اور جانتی تھی کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔

میں نے سوچا، کہیں وہ یہ نہ سمجھتی ہو کہ چاڈ کسی ایسے

ویسے چکر میں بندھا ہونے کی وجہ سے اس سے شادی سے گریزاں ہے۔ چنانچہ میں نے حتی الامکان موضوع کی نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے اسے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

"تم جاڈ سے شادی کرنا چاہتی ہو تو ضرور کرو۔" میں نے اس سے التجا کی۔ یہ کہنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن وہ بہت سمجھ دار لڑکی تھی اس نے یہ کہہ کر میری مشکل آسان کر دی کہ وہ اس معاملے کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ جاڈ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ یہ جاننے کے بعد بائس نے شادی کا خیال دل سے نکال کر' جو کچھ بھی اپنے پاس تھا' سب جاڈ پر نچھاور کر دیا... دوستی' ہمدردی' محبت!

جون کی ایک شام جدائی کی گھڑی آ پہنچی۔ ہم نے شام کی چائے گارڈن میں پی تھی۔ ڈاکٹر اور بائس بھی موجود تھے۔ چائے پینے کے بعد جاڈ اور بائس ٹہلتے ہوئے دریا کی طرف چلے گئے۔ میں اور ڈاکٹر بیٹھے سگریٹ کے کش لیتے رہے۔

موسم گرما تقریباً آدھا گزر چکا تھا۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی موجود نہیں تھا۔ جاڈ اور بائس دیر تک نہیں آئے تو میں ڈاکٹر کو لے کر گھر چلا گیا۔ گیارہ بجے کے قریب بائس گارڈن سے آئی تو اس کی جھولی گلابوں سے بھری ہوئی تھی۔

"یہ فرانسی کے لیے ہیں" اس نے اپنے باپ سے کہا "جاڈ ان کی چھٹائی پر تلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا' ضائع کرنے کی بجائے فرانسی کو دے دیں۔"

وہ پھولوں کو جھولی سے آزاد کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اسے ڈر تھا کہ پھر وہ ان تمام پھولوں کو سمیٹ کر نہیں لے جا سکے گی۔

جاڈ ٹوکری لے آیا۔ پھول ٹوکری میں بھر دیے گئے۔ اب جاڈ مُصر تھا کہ وہ خود پھول لے کر چلے گا اور گھر تک پہنچائے گا۔ یہی نہیں' پھر ڈاکٹر کے گھر بھی چلیں گے... ہم سب۔ اس بات پر بائس بھی رضامند ہو گئی کہ پھول فرانسی کے گھر دیتے ہوئے جائیں گے۔

"یہ فرانسی کون ہے؟" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

ڈاکٹر اپنا پائپ سلگانے کے لیے رک گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ جاڈ اور بائس باہر نکل چکے تھے بلکہ وہ کارنر سے مڑ بھی چکے تھے۔

"بائس کی سہیلی ہے۔ بہت عرصے کے بعد واپس آئی ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کہاں رہتی ہے؟"

نہیں۔ "ایلم اسٹریٹ کے کسی مکان میں۔ نمبر مجھے معلوم

میں نے مضبوطی سے ڈاکٹر کا بازو تھام لیا "پائپ کو چھوڑیں۔ جلدی کریں جناب۔" میں عملاً اس کو کھینچ رہا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے۔" ڈاکٹر نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

میں ڈاکٹر کو چھوڑ کر خود ہی لپکا۔ میں جاڈ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ میں نے بائس کو کہتے سنا "یہی دروازہ ہے جاڈ ڈیئر۔"

تب مجھے اندازہ ہوا کہ شاید سہیلی کو اپنے ہاتھوں سے پھول دینے کی خواہش میں بائس نے پھولوں کی ٹوکری جاڈ سے لے لی تھی۔ فٹ پاتھ اور دروازے کے درمیان ایک ہی قدمچہ تھا۔ جاڈ اس پر چڑھا۔ اس نے پلٹ کر بائس کو دیکھا تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے منہ سے تنبیہی لہجے میں بس ایک لفظ نکلا۔ "جاڈ...!"

لیکن جاڈ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں مزید کچھ نہ کہوں۔

جاڈ نے بڑی محبت سے بائس کو دیکھا اور بے حد شیریں لہجے میں پوچھا "تمہیں یقین ہے ڈیئر کہ یہی وہ دروازہ ہے۔"

"ہاں جاڈ! فرانسی یہیں رہتی ہے۔ پلیز... دستک دو نا۔"

جاڈ نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ پھر رات کی عبا پہنے خوب صورت آسمان کو اور اس سڑک کے دونوں طرف سوئے ہوئے خوب صورت' پُرسکون مکانوں کو یوں دیکھا' جیسے آخری بار دیکھ رہا ہو... جیسے وہ سب کچھ نظر میں بسالینا چاہتا ہو۔

پھر اس نے دروازے پر دستک دی!

خدا کا شکر ہے کہ کوئی بے حد خوف ناک بات نہیں ہوئی۔ بس وہ بڑی آہستگی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اُس کی تیزی سے بے نور ہوتی ہوئی نگاہیں بائس کے چہرے پر جمی تھیں۔ یہ بات طے تھی کہ وہ مر رہا ہے۔

بائس بہت تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ مگر اسی لمحے جاڈ ڈھے گیا۔ بائس کے ہاتھ سے پھولوں کی ٹوکری گری اور خوب صورت گلاب جاڈ کے سینے پر بکھر گئے۔

* * *

بعد میں مَیں نے اس دروازے کے متعلق معلومات کیں۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ مکان ڈیڑھ سو سال پرانا ہے اور اس کا دروازہ آج تک بدلا نہیں گیا۔ وہی ڈیڑھ سو سال پرانا دروازہ اب بھی لگا ہے' جس پر جاڈ نے دستک دی تھی۔

یہ وہ دروازہ نہیں تھا۔ تو پھر یہ سب کیا تھا جاڈ کو کیا ہو گیا؟ وہ کیوں اس طرح مر گیا!

THE DOOR
LENNOX ROBINSON

وقت کے فاصلے

استعارہ

اعتراف

شب احتساب

جرم کے سائے

مافیا یونیورسٹی

ایکشن ری پلے

کٹھ پتلیاں

دروازہ


NOVELS LOVERS
I BOOKS
0342:8678391
RJ